مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اردو و اقبالیات)

اردو میں منٹو شناسی کی روایت (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)

مقالہ نگار

طاہر عباس

64/IU-PhD/2010

نگرانِ مقالہ

ڈاکٹر لیاقت علی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو و اقبالیات

سیشن: بہار ۲۰۱۰ء

شعبۂ اردو و اقبالیات

دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور
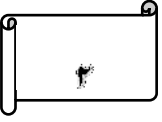
۷۸۶

منٹو اپنی ہر تحریر کا آغاز اِس سے کرتے تھے
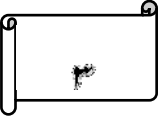
انتساب

لیاقت علی

کے نام

گویا

اپنے نام

حلف نامہ

میں حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ یہ مقالہ بہ عنوان "اردو میں منٹو شناسی کی روایت (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)" میری ذاتی کاوش اور محنت کا ثمر ہے نیز یہ مقالہ اس سے پہلے کسی یونی ورسٹی میں کسی بھی سطح کی ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا گیا۔

مقالہ نگار

طاہر عباس
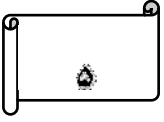
تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ میں نے پی ایچ ڈی شعبۂ اردو و اقبالیات کے اسکالر طاہر عباس کے تحقیقی مقالہ بہ عنوان "اردو میں منٹو شناسی کی روایت (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)" کا مطالعہ دقت نظر سے کیا ہے۔ میں ان کے تحقیقی کام سے مطمئن ہوں۔ اس مقالے کی تیاری کے لیے یونیورسٹی ہذا کے تمام قواعد و ضوابط پورے کر دیے گئے ہیں۔ میں اس امر کی سفارش کرتا ہوں کہ ان کا یہ مقالہ جانچ کے لیے جمع کرا دیا جائے۔

ڈاکٹر لیاقت علی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو و اقبالیات

دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاول پور

ابواب بندی

دیباچہ

خدا خدا کر کے وہ وقت آن پہنچا جب ترتیب کے لحاظ سے مقالے میں شامل سطور کو سب سے آخر میں لکھ رہا ہوں۔ میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں۔ مجھ جیسے اوسط درجے کے طالب علم کے لیے اتنا بڑا سنگِ میل عبور کرنا میرے اللہ کا بہت بڑا انعام ہے جس کا شکر ادا کرنے کے سوا میرے پاس اور کچھ بھی تو نہیں۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے اساتذہ، احباء اور دوستوں کی شفقت، محبت اور مہربانیوں کا اعتراف کروں، پہلے اپنے موضوع تحقیق کا تعارف کراتا چلوں۔

"اُردو میں منٹو شناسی کی روایت" (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ) میرے مقالے کا عنوان ہے جسے پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب، منٹو شناسی کے اولین خدوخال سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن کے اُن ابتدائی نقوش کو تلاشتا ہے جن پر اس سے قبل ہماری تحقیق و تنقید میں کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی۔ یہ باب منٹو کے تخلیقی سفر سے اُس کی زندگی کے اختتام تک کے دور میں اُس پر کی گئی تنقید کے جائزے پر مشتمل ہے۔ دوسرا باب، منٹو پر لکھی گئی کتب کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ منٹو پر لکھی گئی اُن کتابوں کے جائزے پر مشتمل ہے جو ۱۹۴۸ء سے شروع ہو کر ۲۰۱۶ء تک کے درمیانی عرصے میں شائع ہوئیں۔ اس باب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں ایسی کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے جو طبع زاد ہیں۔ ان دستیاب طبع زاد کتب کی تعداد ۴۴ ہے۔ جب کہ دوسرے حصے میں ۴۱ کتب کا جائزہ لیا گیا ہے جو مرتبہ کتب کے زمرے میں آتی ہیں۔ تیسرے باب، ادبی رسائل و جرائد کے منٹو نمبر میں اُن رسائل و جرائد کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے جنہوں نے مختلف اوقات میں سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن کے متعلق خصوصی شمارے شائع کیے۔ اِن دستیاب شدہ رسائل کی تعداد ۱۹ بنتی ہے۔ جب کہ مختلف اوقات میں شائع ہونے والے وہ رسائل جن میں منٹو کے لیے خصوصی گوشے مختص کیے گئے، ۲ ہیں۔ مقالہ ہذا کا چوتھا باب، منٹو پر ہونے والی جامعاتی تحقیق کا جائزہ پی ایچ۔ ڈی، ایم۔ فل اور ایم۔ اے کی سطح پر لکھے گئے ۲۳ مقالہ جات کے تحقیقی و تنقیدی جائزے پر مشتمل ہے۔ جب کہ پانچواں اور آخری باب، اُردو میں منٹو شناسی کی روایت، نتائج و سفارشات گزشتہ ابواب میں کیے گئے مباحث کے نتائج کا مجموعی جائزہ ہے۔

چاہتا تو میں یہی تھا کہ اپنے مقالہ کے دوسرے باب میں ایک جزو کا مزید اضافہ کر کے ایسے مضامین کا تجزیہ کروں جو مختلف تنقیدی، سوانحی اور شخصی خاکوں کی کتب میں شامل ہیں۔ اسی طرح تیسرے باب میں ایسے تمام مضامین کا جائزہ لیا جائے جو مختلف اوقات میں مختلف ادبی رسائل و جرائد اور اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔ لیکن وقت کی کمی، مزاج کی سستی اور مضامین کی تعداد دیکھ کر میں نے ایسے سخت پتھر جانا اور چوم کے چھوڑ دیا۔ آخر منٹو نے بھی تو الاٹ شدہ برف خانہ اسی وجہ سے واپس کر دیا تھا کہ اُسے چلانا اُس کے بس میں نہیں تھا۔ پھر ان متفرق مضامین میں سے بیشتر اہم مضامین مرتبہ کتب اور منٹو پر شائع ہونے والے خصوصی شماروں کی ذیل میں چونکہ بارہا زیر بحث آ چکے تھے اس لیے تکرار کا اندیشہ بھی شامل حال تھا۔ چوں کہ رسائل اور کتب میں شامل ایسے تمام مضامین کا محض اشاریہ دینے پر ہی اکتفا کیا گیا۔ ان تمام کتب، رسائل اور مقالہ جات کا جائزہ لیتے ہوئے زمانی ترتیب کو خاص طور پر ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔

مقالے کے موضوع کے تعارف کے بعد سب سے پہلے میں اپنے شعبہ کے تمام اساتذہ کرام کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ خصوصاً ڈاکٹر روبینہ رفیق کا جنھوں نے میرے لیے اتنی آسانیاں پیدا کیں کہ میں پچھلی تمام مشکلات کو بھول گیا۔ اُن کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ ذیشان تبسم صاحب سے صاحب سلامت اگرچہ کم کم ہی رہی لیکن وہ ہمیشہ مجھے بہت اپنائیت سے ملے۔

میرے بابا اکثر مجھ سے پوچھا کرتے، ''استاجی! کب ختم ہو گی تمہاری پڑھائی؟'' افسوس کہ اُن کی زندگی میں میری پڑھائی ختم نہ ہو سکی۔ یونیورسٹی میں مقالہ جمع کرانے کے بعد میں سیدھا اُن کے پاس جاؤں گا اور کہوں گا، ''بابا! آپ کا کھوٹا سکہ چل گیا''۔ بھائیوں میں راہب اور رشتہ داروں میں صادق اور آصف بھائی کے علاوہ کسی کا نام لینے کو دل نہیں کرتا۔

آخر میں اپنی زندگی بھر کی کمائی یعنی اپنے دوستوں کا ذکر کرتا چلوں، جن سے مجھے ہمیشہ ہمیشہ محبت ملی۔ میرے یہ دوست مختلف طبقوں، مختلف خطوں اور مختلف عمروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ کچھ میرے کلاس فیلوز ہیں، تو کچھ میرے کولیگز، کچھ میرے اساتذہ ہیں تو کچھ میرے شاگرد۔ سب اپنے اپنے موڈ اور مزاج کے لوگ ہیں۔ ان میں اگر کوئی قدر مشترک ہے تو وہ یہ کہ سب کے سب مجھ سے حد درجہ محبت کرتے ہیں اور ہر برے وقت میں جو مجھ پر ہمیشہ رہتا ہے، میرا ساتھ دیتے ہیں۔

ڈاکٹر رب نواز مونس، ڈاکٹر قاضی عابد، ڈاکٹر عامر سہیل، ڈاکٹر کامران کاظمی، ڈاکٹر سجاد نعیم، محمد بخش بلوچ، ڈاکٹر جاوید حسن اختر، ڈاکٹر راشدہ قاضی، ڈاکٹر حماد نقوی، پروفیسر محمد عابد، پروفیسر صابر جروار، ناصر محمود خالد، فہد عارف ملغانی، محمد عدنان ظفر، عاصم کلیانی، عدنان صدیق، سید منیر حسین رضوی اور ہاں مظہر ماموں۔ بس یہی میری کل کائنات ہے۔ ان تمام دوستوں کا خلوص اور حوصلہ افزائی شامل حال نہ ہوتی تو میں بہت پیچھے رہ جاتا۔ عذرا، لیاقت کے ساتھ رفاقت ہماری آدھی عمروں پر محیط ہے۔ ہم تینوں دسمبر ۱۹۹۵ء میں ایک دوسرے کے کلاس فیلو بنے تھے۔ تب سے اب تک جتنا وقت گزرتا جاتا ہے خلوص محبت اور اعتماد اُس سے کئی گنا بڑھتا جاتا ہے۔

نادیہ کے متعلق پہلی بار لکھنا بہت دشوار لگ رہا ہے۔ اُس کی محبت لفظوں کی دسترس سے کوسوں دور ہے۔ وہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں جو کہتے ہیں کہ انسان کو آئیڈیل کبھی نہیں ملتا۔ مقالے کے انتساب کی بات چلی تو اُس نے مجھ پر دوٹوک انداز میں واضح کر دیا کہ خبردار! اگر میرے نام انتساب کیا تو۔۔۔؟ اُسے وہ لوگ زہر لگتے ہیں جو بیوی، بچوں اور یہاں تک کہ والدین کے نام اپنی کتابوں یا مقالوں کا انتساب کرتے ہیں۔ اس فہرست میں نگران کا نام بھی شامل ہے۔ علی دائم اور علی ثانی کا انتظار آج ختم ہو گیا۔ گزشتہ ۶ ماہ سے وہ مسلسل انتظار کر رہے تھے کہ بابا کی پڑھائی جلد ختم ہو تا کہ وہ کھل کر شرارتیں کر سکیں۔

پرویز انجم اور ڈاکٹر امجد طفیل نے اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر، کتابوں کی فراہمی میں میرا بہت ہاتھ بٹایا۔ میں اُن دونوں احباب کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ وسیم عباس کے کمپوز کیے ہوئے مسوّدے کو پروف کرنے میں کمپوزنگ سے زیادہ وقت صرف ہوا۔ شیر علی نے جس احتیاط اور سمجھداری سے غلطیاں لگائیں اُسے میں اُس کے خلوص سے تعبیر کرتا ہوں۔ ان دونوں کے گرو یعنی محمد مقیم کا میں دل سے ممنون احسان ہوں۔ وہ بہت محبت کرنے والا انسان ہے۔ خدا اس کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔ گر میری اماں کی دعائیں شامل حال نہ ہوتیں تو میرا یہ مقالہ کبھی پایہ تکمیل کو نہ پہنچتا۔

باب اوّل:

منٹو شناسی کے اولین خد و خال

بابِ اوّل:

منٹو شناسی کے اولین خدوخال

سعادت حسن منٹو ۱۱/ مئی ۱۹۱۲ء کو سمبرالہ ضلع لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے والد سب جج غلام حسن منٹو کی دوسری اہلیہ سردار بیگم کے بطن سے تھے۔ غلام حسن منٹو نے اپنی پہلی بیوی جان مالی کے اختلال ذہنی کے سبب دوسری شادی کی تھی، جسے ان کے خاندان نے ناپسند کیا۔ چناں چہ سردار بیگم، سعادت حسن منٹو اور ان کی بڑی بہن ناصرہ اقبال کے ساتھ نہ صرف منٹو خاندان کا رویہ بیگانوں کا سا رہا بلکہ خود غلام حسن منٹو بھی ان تینوں کو وہ محبت نہ دے سکے جو پہلی بیوی اور اس کی اولاد کے حصے میں آئی۔ یہی وجہ ہے کہ انیس ناگی منٹو کو "Neglected Child" قرار دیتے ہیں[۱] حقیقت یہی ہے کہ منٹو عمر بھر خاندانی محبت سے محروم رہے۔ ابو سعید قریشی جو منٹو کے لنگوٹیے دوست تھے اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ’’اس کے والد منصف تھے۔ اُنھوں نے دو شادیاں کیں۔ سعادت کی والدہ ان کی دوسری بیوی تھیں۔ منصف صاحب نے اپنی پہلی اہلیہ کی اولادوں کی تعلیم و تربیت پر اتنی توجہ کی کہ ان کی وفات کے بعد چھوٹی بیگم اور ان کی دو اولادوں سعادت اور اس کی بڑی بہن ناصرہ اقبال کے لیے کچھ بھی باقی نہ بچا۔۔۔ تلخ یادوں کے سوا۔‘‘[۲]

خاندان کی بے رُخی، معاشی پسماندگی اور قبولے نہ جانے کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے احساسِ کمتری نے منٹو کو ضدی، شریر اور چڑچڑا بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ چناں چہ تدریسی کتابیں پڑھنے کی بجائے منٹو فلمی رسالے اور گھٹیا و فحش قسم کے ڈائجسٹ پڑھتا، عجیب و غریب شرارتیں کرتا اور پتنگیں اُڑاتا رہا۔ یہاں تک کہ میٹرک کا امتحان تین بار ناکامی کے بعد چوتھی کوشش میں ۲۳ مئی ۱۹۳۱ء کو پاس کیا۔[۳]

باری علیگ کی ’’مساوات‘‘ اخبار میں ملازمت کے سبب امرتسر آمد منٹو کے لیے مبارک ثابت ہوئی۔ معروف مارکسی دانشور باری علیگ نے فلمی ایکٹریسوں کے دلدادہ اور مارلن ڈیٹرخ کی ٹانگوں کے دیوانے سعادت حسن منٹو کو ’’بھگت سنگھ‘‘ سے متعارف کرایا۔ انھی کے اصرار پر منٹو نے پہلا فلمی تبصرہ لکھا اور اس کے بعد روسی اور فرانسیسی ادیبوں کے افسانوں اور فلموں کے تراجم کے ساتھ ساتھ وکٹر ہیوگو کی تصنیف "The Last Days of Condemned" اور آسکر وائلڈ کی کتاب ’’ویرا‘‘ کو اُردو میں منتقل کیا۔ ساتھ ہی ’’ہمایوں‘‘ اور ’’عالمگیر‘‘ کے روسی اور فرانسیسی ادب نمبر بھی مرتب کیے۔ جس طرح منٹو کی پہلی تحریر (فلمی تبصرہ)، باری علیگ کے اخبار ’’مساوات‘‘ میں شائع ہوئی تھی اس طرح منٹو کا پہلا طبع زاد افسانہ ’’تماشا‘‘ بھی باری علیگ ہی کی ادارت میں نکلنے والے رسالے ’’خلق‘‘ میں شائع ہوا۔ یوں سعادت حسن منٹو کو ’’ٹامی‘‘ سے منٹو بنانے میں باری علیگ نے بنیادی کردار ادا کیا۔ منٹو کی ابتدائی ادبی زندگی میں پائی جانے والی انقلابیت، جو اُن کے پہلے افسانے ’’تماشا‘‘ اور افسانوی مجموعے ’’آتش پارے‘‘ کے عنوان اور اس میں شامل افسانوں کے موضوعات سے عیاں ہوتی ہے، باری علیگ ہی کی صحبت کا نتیجہ قرار دی جاتی ہے۔

باری علیگ تو چند مہینے گزارنے کے بعد اپنی ’’رن چھوڑیت‘‘ کے طفیل امرتسر سے سدھار گئے لیکن منٹو کے دل میں ادب و انقلاب کا جو بیج بو گئے تھے وہ مسلسل پرورش پاتا رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ منٹو ایک عرصہ تک انقلاب روس سے متاثر رہے لیکن اُنھوں

نے اپنے آپ کو صرف یہیں تک محدود نہیں رکھا بلکہ سماج میں موجود ہمہ قسمی ناانصافیوں کے خلاف صف آرا گئے۔ چناں چہ ان کے افسانوں میں عام اور نچلے متوسط طبقوں اور پیشوں سے تعلق رکھنے والے افراد اور ان کے استحصال کو خواہ وہ جنسی ہو یا سیاسی، معاشی ہو یا معاشرتی موضوع بنایا گیا۔

راشد الخیری سے لیکر سعادت حسن منٹو کے افسانوی عہد تک کے درمیانی عرصہ میں گو کہ سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھ پوری، حجاب امتیاز علی کے علاوہ درجنوں نام گنے جا سکتے ہیں۔ لیکن سوائے پریم چند کے دیگر کوئی بھی افسانہ نگار فن کی ان بلندیوں کو نہ چھو سکا جو پریم چند کے حصے میں آئیں معاشی و معاشرتی اصلاح پسندی رومانویت اور انگارے گروپ کی بغاوت، منٹو اور اس کے معاصرین کو موضوعات کے لحاظ سے بہت مختصر روایت ورثہ میں ملی۔ اس نوخیز روایت کو منٹو نے سینکڑوں افسانے، ڈرامے، درجنوں مضامین، خاکے فلموں اور تراجم کی صورت میں خوب خوب توانا کیا۔

آج سعادت حسن منٹو کا شمار اُردو ادب کی اُن نابغہ روزگار ہستیوں میں کیا جاتا ہے جن کی تخلیقی و شخصی زندگی ناقدین ادب کو ہمیشہ اپنی جانب متوجہ کرتی رہی ہے۔ منٹو کی تخلیقی، شخصی زندگی کے بیشمار گوشے نصف صدی سے زائد وقت گزرنے کے باوجود آج بھی نت نئے امکانات کے ساتھ ادبی دنیا پر منکشف ہو رہے ہیں۔ ایک بڑے فنکار کی بنیادی نشانی بھی یہی ہے کہ اس کی تفہیم کسی مخصوص عہد یا سماج کے سیاق و سباق کی مرہون منت نہ رہے بلکہ ہر عہد کے اپنے تناظر میں معنوی امکانات کے در وا کرتی رہے۔ یہ خوبی کسی ادیب کو مقامیت کے دائرے سے نکال کر آفاقیت کے دائرے میں لے آتی ہے۔ سعادت حسن منٹو بلاشبہ ادب کے اسی آفاقی معیار پر پورا اترتے ہیں جو اُنھیں اپنے عہد کا معتبر تخلیقی گواہ تو بناتا ہی ہے، آنے والے زمانوں میں بھی زائد المعیاد نہیں ہونے دیتا۔ وہ ان ادیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں جنہوں نے اپنے بعد کی تمام ادبی نسلوں کو متاثر کیا۔ ان کے اسلوب اور موضوعات کا تتبع آج تک جاری ہے۔ منٹو کی تخلیقی زندگی میں دکھائی دینے والی بے باکی، سچ گوئی، بے رحم حقیقت نگاری اور انسانی زندگی کا عمیق مشاہدہ ہی ناقدین کی توجہ کا باعث نہیں بلکہ اُن کی عملی زندگی کے پیچ و خم بھی ہمیشہ موضوع بحث رہے، چناں چہ منٹو شناسی کے باب میں منٹو کی تخلیقی میراث کے ساتھ ساتھ اس کی سوانح کا بھی بڑا حصہ موجود ہے جس پر بہت سے لوگوں نے قلم اٹھایا۔

آج ہم منٹو صدی میں جی رہے ہیں۔ اُس کی ۱۰۰ اویں سالگرہ یعنی ۲۰۱۲ء کو منٹو کا سال قرار دیا گیا ہے۔ بقول ڈاکٹر خالد سنجرانی، منٹو کی شخصیت اور فن پر کئی سیمینار، کانفرنسیں، خصوصی تقریبات، توسیعی خطبات، رسائل و جرائد کے خصوصی نمبر، فن و شخصیت پر درجنوں کتب کی اشاعت، لکشمی مینشن کو قومی ورثہ بنانے کی تجاویز، منٹو کے زیر استعمال رہنے والی اشیاء کی حفاظت، افسانوی کلیات کی اشاعت میں رنگارنگی، سٹیج ڈرامے، فلم فیسٹیول، غرض جو کچھ ممکن تھا ادبی اور حکومتی حلقوں نے کیا۔ ترقی پسند، رجعت پسند، سرکاری، نیم سرکاری، پرائیویٹ ادارے، جامعات، اخبارات، ٹی وی چینلز سب نے منٹو کو یاد کیا اور اس کی فنی عظمت کو سراہا۔ [۴]

زمانہ تبدیل ہو چکا ہے۔ آج منٹو کا نام سنتے ہی نہ کسی کی بھنویں تنتی ہیں اور نہ ہی ماتھوں پہ سلوٹیں پڑتی ہیں۔ ایک تخلیق کار کے ساتھ ماضی کے معاصر ادیبوں نے انتہائی ناروا ادبی سلوک روا رکھا، آج کا ادیب اس کا کفارہ ادا کر رہا ہے۔ منٹو جو پوری کوشش کے باوجود اپنی شخصیت اور فن پر اپنی زندگی میں ایک بھی کتاب (ناخن کا قرض) شائع نہ کروا سکے اور یہ حسرت لیے چلتے بنے، آج وفات کے صرف باسٹھ برس بعد منٹو شناسی کی روایت ایک مضبوط اور توانا صورت میں نقد و ادب کی دنیا میں موجود ہے۔

اپنی طبعی اور ادبی زندگی کا سفر منٹو نے بہت جلدی جلدی طے کیا۔ بائیس سالہ تخلیقی سفر میں منٹو نے بطور ادیب اپنی شناخت بھی پیدا کی اور خود کو منوایا بھی۔ داد بھی خوب وصول کی اور طعن و تشنیع بھی۔ وہ اپنے زمانے کے ایک اہم ادیب تھے جنہیں شدید اختلافات اور تحفظات کے باوجود بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جتنی بحث یا گفتگو منٹو کی شخصیت اور فن کے متعلق ہوئی ہے اتنی ان کے کسی بھی معاصر افسانہ نگار کے متعلق نہیں ہوئی۔ نہ زندگی میں نہ مرنے کے بعد۔ منٹو شناسی کی روایت کے ابتدائی خدوخال کے نمونے اس کی تخلیقی زندگی کے آغاز سے وفات تک بکھری ہوئی صورتوں میں ملتے ہیں۔ سب سے پہلی کڑی اُن رسائل و جرائد سے ملتی ہے جن میں منٹو کی تخلیقات اور تراجم کو بھرپور طریقے سے شائع کر کے منٹو کو ادب کی دنیا سے متعارف کرایا گیا۔ دوسری اہم کڑی کا تعلق اُن ناقدین ادب سے ہے جنہوں نے منٹو کی تخلیقات پر مقدور بھر روشنی ڈالی۔ اس ضمن میں ترقی پسند تحریک اور ناقدین کا رویہ طویل بحث کا متقاضی ہے۔ منٹو شناسی کا ایک اہم گوشہ ان کے افسانوں پر چلنے والے مقدمات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس ضمن میں استغاثہ، صفائی اور عدالتی گواہوں کے بیانات اور جج صاحبان کے فیصلہ جات میں کی گئی منٹو کے افسانوں کی تفہیم بھی منٹو شناسی کے باب میں اولین نمونے قرار پاتی ہے۔ منٹو شناسی کے اس اولین دور میں سب سے بڑے منٹو شناس خود منٹو ہی دکھائی دیتے ہیں افسانوں پر قائم مقدمات کے دفاع میں ان کے عدالتوں میں جمع کرائے گئے تحریری بیانات کے علاوہ ایسے مضامین جن میں خاص طور پر مقدمات کی روداد بیان کی گئی ہے، میں منٹو کو ایک ماہر اور تجربہ کار نقاد کی طرح اپنی تحریروں کا تجزیہ اور دفاع کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ منٹو کی فکری اور فنی تفہیم کے لیے ان سے بہتر تجزیے شاید ہی کسی نے کیے ہوں۔ یہ ہیں وہ مختلف پہلو یا جہتیں جو منٹو شناسی کی اولین صورتیں کہلائی جا سکتی ہیں۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا کہ منٹو شناسی کے اولین دور میں ادبی رسائل، جرائد اور اخبارات کے کردار کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انھی رسائل نے ہی ہماری ادبی دنیا کو سعادت حسن منٹو سے روشناس کرایا، باری علیگ کی ادارت میں نکلنے والے اخبار ''مساوات'' میں منٹو کی سب سے پہلی تحریر ایک فلمی تبصرے کی صورت میں شائع ہوئی۔ پھر تو یہ سلسلہ ایسا چلا کہ رکنے کا نام ہی نہ لیا۔ ساقی، ہمایوں، خلق، ادب لطیف، سویرا، عالمگیر اور بعد میں نقوش غرض کوئی بھی ادبی جریدہ منٹو کی تحریروں کے بغیر نامکمل تصور کیا جاتا اور جب تک مدیر حضرات منٹو سے اس کی کوئی تحریر حاصل نہ کر لیتے تب تک رسالے کی اشاعت روک دی جاتی۔ ان رسائل و جرائد نے بطور فنکار منٹو کی تشکیل و تعمیر کے زمانے سے لے کر اس کے فنی معراج تک بلکہ اس کے بعد آج تک نہ صرف منٹو کی تحریروں کو بلکہ منٹو سے متعلق تحریروں کو مسلسل شائع کر کے منٹو شناسی کی روایت کو بھرپور توانائی بخشی۔ سویرا، ہمایوں، ادب لطیف، نیرنگ خیال، ساقی، عالمگیر اور اس دور کے دیگر رسائل میں منٹو کے افسانے اور تراجم مسلسل اور گاہے بگاہے چھپتے رہے۔ ''ساقی''، ہمایوں'' اور عالمگیر'' اس معاملہ میں سب پر بازی لے گئے۔ ان رسائل میں جہاں منٹو کی ذاتی تحریریں شائع ہوتی رہیں وہیں منٹو نے ان رسائل کے روسی اور فرانسیسی ادب نمبر شائع کر کے اچھا خاصا نام کمایا۔ ''ساقی'' میں منٹو کی شائع شدہ تحریروں کی فہرست سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان رسائل نے منٹو کی قدر و قیمت کا اندازہ ابتدا ہی میں لگا لیا تھا۔ ''ساقی'' میں منٹو کی درج ذیل تحریریں اشاعت پذیر ہوئیں۔

جی آیا صاحب، چوری، خونی تھوک، ترگنیف کی موت، میرا ہمسفر، دیوانہ شاعر، میکسم گورکی، پھاہا، شو شو، ایکٹرس کی آنکھ، محبت کی پیدائش، لالٹین، آؤ خط سنو، آؤ چوری کریں، آؤ کھوج لگائیں، اُس کا پتی، تین تحفے، نپولین کی موت، کبوتروں والا سائیں، دس

روپے، دیہاتی بولیاں، تین موٹی عورتیں، مسز ڈی کوسٹا، نیلی رگیں، ترقی پسند، سجدہ، اگر، دھواں، شاعرہ کی موت، تیمور کی موت، نیا سال، چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد، حسن فریا، کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی، آم کے ٹوکرے، بلاوز، مسز ڈی سلوا، کچھ اور باتیں، ترقی یافتہ قبرستان اور جی زمانی بیگم ،اس طرح ماہنامہ ساقی، میں منٹو کی ذاتی یا ترجمہ شدہ تحریروں کی کم سے کم تعداد ۱۴ بنتی ہے۔[۵] یہ ایک نامکمل فہرست ہے۔یقیناً یہ تعداد قدرے زیادہ ہو گی۔

ماہنامہ ''ہمایوں'' لاہور کے مختلف شماروں میں چھپنے والی تحریروں کی فہرست ملاحظہ کیجئے:۔

شیطان اور شراب، سپاہی اور موت، چھبیس مزدور اور ایک دوشیزہ، میکسم گورکی، تلون، منتر، تماشاگاہ نفس، تحدید اسلحہ، شغل، دست بریدہ، ریچھ، طاقت کا امتحان، پگلا، خودکشی کا اقدام اور نیا قانون۔[٦]

طویل فہرست پیش کرنے کا مقصد یہ اندازہ لگانا ہے کہ منٹو کتنی تیزی سے مختلف رسائل میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھا رہے تھے۔ صرف یہی نہیں کہ رسائل و جرائد میں منٹو کی تخلیقات شائع ہو رہی تھیں بلکہ منٹو کی ان تخلیقات پر نقد و تنقید کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ اگرچہ کہ تنقید کے یہ دھارے منٹو کے حق میں کم بہے اور مخالفت میں زیادہ مگر اس کی پروا منٹو کو کب تھی۔

اُردو افسانے نے بیسویں صدی کے ابتدائی عشرے میں آنکھ کھولی۔ سعادت حسن منٹو کے عہد افسانہ نگاری کو افسانوی روایت کا سن بلوغت کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ منٹو اور اس کے معاصر افسانہ نگاروں کو جو روایت ملی وہ زمانی اعتبار سے مختصر اور تعددی اعتبار سے چند قابل ذکر افسانہ نگاروں پر مشتمل ایک مختصر اور محدود روایت تھی۔ اس دور کے افسانہ نگاروں کے پاس ان کے اپنے ادبی سرمائے میں ایسے ماڈل نہیں تھے جن کو نشان منزل بنا کر آگے سفر کیا جاتا۔

چناں چہ بہت سے ادیبوں نے مختصر کہانی کے فن اور تکنیک کے معاملہ میں غیر ملکی مختصر کہانی نویسوں کی طرف رجوع کیا۔ سعادت حسن منٹو پر موپاساں اور راجندر سنگھ بیدی کی کہانیوں پر چیخوف کے اثرات کا سبب یہی مجبوری تھی۔ اردو افسانہ نگاروں کا مختصر کہانی کے سلسلہ میں مغربی ادیبوں کی تکنیک، ہیئت اور دیگر امور کی پیروی کرنا کوئی ایسی قابل اعتراض بات نہیں۔ اُردو کے جدید ادب سے تعلق رکھنے والی بیشتر اصناف ہم نے مغرب ہی سے مستعار لی ہیں۔ چناں چہ مغرب کی پیروی میں اس عہد کے افسانہ نگاروں نے اسلوب، موضوعات اور تکنیک کے مختلف دھارے منتخب کیے اور خوب نام کمایا۔ رومانویت اور حقیقت پسندی کے دو خانوں میں جکڑے ہوئے ادیب اپنے اپنے مکتب فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے ادب کی تخلیق میں مصروف تھے۔ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ لیکن ہر دو مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کے درمیان اگر کسی موضوع پر بغیر کسی سمجھوتے کے اشتراک پایا جاتا تھا تو وہ جنس کے اوپر تھا۔ جنسی موضوعات کا انتخاب اور وہ بھی طوائف کی صورت میں بلکہ طوائفوں کے نچلے اور غیر مہذب طبقے ''کسبی'' کی شکل میں کھلے عام کیا گیا۔ سجاد ظہیر، رشیدہ جہاں، عصمت چغتائی، حجاب امتیاز علی اور خاص طور پر سعادت حسن منٹو نے سماج کے اس ''طبقہ خاص'' کو خاص طور پر اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ جنسی معاملات کا طوائف کی مدد سے بے باکانہ اظہار مذہبی، ادبی، معاشرتی اور سماجی اخلاقیات کے نام نہاد پروردگان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ بقول منٹو، یہ ایک لطیفہ ہی تو ہے کہ مصلحان معاشرہ طوائف کے وجود کو تو بخوشی قبول ہوئے ہیں لیکن ادب میں ان کے وجود کے تذکرے تک کو قابل گردن زدنی سمجھتے ہیں۔

عبدالماجد دریا آبادی، راجہ صاحب آف محمود آباد، مولانا ماہر القادری، تاجور نجیب آبادی، چودھری محمد حسین اور دیگر ''اخلاق یافتگان'' کے ساتھ ساتھ ادب کے ناقدین کا رویہ بھی ان افسانہ نگاروں کے ساتھ جنہوں نے جنس جیسی ناگزیر حقیقت کو موضوع بنایا قطعاً ہمدردانہ نہیں، بلکہ غیر جانبدارانہ بھی نہیں۔

جب رومانویت، مثالیت، اصلاح اور حقیقت پسندی کی بجائے افسانہ نگار جسم اور جنس کی بھوک کے گرد اپنی کہانیوں کا تانا بانا بننے لگے تو روایت پسند حلقوں کے ساتھ ساتھ ادبی تنقید نگاروں نے بھی ان کے اس رویے کو تلذذ بخش، فحش، سوقیانہ، رجعت پسندانہ اور مریضانہ قرار دیا۔

گو تنقید کا بھی وہی حال تھا جو کہ افسانے کا، یعنی تنقیدی میدان میں بھی افسانے کی طرح ہمارے ادب نے کوئی خاص ترقی نہ کی تھی۔ مقدمہ شعر و شاعری'' کو جس صنف کا باقاعدہ آغاز قرار دیا جاتا ہو، ظاہر ہے کہ اس کے اصول و ضوابط اور ادب کو پرکھنے کے پیمانے ناپختہ اور بذاتِ خود تشکیل کے مراحل میں تھے۔ لٰہذا اُس دور کے تنقیدی سرمائے پر نظر دوڑائیں تو پریم چند کے سوا کوئی بڑا افسانہ نگار سامنے نہیں آتا جس کو اس دور کے ناقدین نے عمومی طور پر سراہا ہو۔

ناقدین نے اس دور کے افسانہ نگاروں کی فنی و فکری خوبیوں کا انفرادی طور پر جائزہ لینے کی بجائے عموماً اجتماعی نوعیت کے مضامین لکھنے پر ہی اکتفا کیا۔ چناں چہ پریم چند کو چھوڑ کر، منٹو سمیت کوئی بھی افسانہ نگار اپنے عہد کے ناقدین کی اتنی توجہ بھی حاصل نہ کر سکا کہ وہ ان کے فن کا جائزہ انفرادی طور پر لیتے۔ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ اس دور کی تنقید نے موضوعات کے لحاظ سے اُردو افسانہ نگاروں کو مسترد کر دیا تو غلط نہ ہو گا۔ اجتماعی نوعیت کے لکھے گئے ان مضامین میں بھی عورت، جنسیت، طوائفیت، عریانیت اور مریضانہ ذہنیت کو افسانہ نگاروں کے اعصاب پر سوار کرا دیا گیا۔

بشیر ساجد اپنے مضمون پنجاب کا ایک افسانہ نگار'' میں افسانہ نگاروں کے جنسی میلان کو، اخلاقی اور ادبی زوال کا باعث سمجھتے ہوئے اور ان رسائل کو جو اس قسم کے افسانوں کو شائع کرتے ہیں، ہدف تنقید بناتے ہوئے ''ادب لطیف'' کے سالنامہ ۱۹۴۲ء میں شامل جنسی افسانوں پر سٹپٹاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''اس میں شامل تیرہ میں سے پانچ افسانے طوائف کے موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ گویا گزشتہ صدی میں ہماری شاعری پر عورت سوار تھی اور اب افسانوی ادب پر چھائی جاتی ہے۔''[۷]

> منٹو نے اپنے مضمون ادب جدید میں اس اعتراض کا خوب جواب دیا تھا کہ ''مرد کے اعصاب پر عورت سوار نہ ہو تو کیا ہاتھی اور گھوڑوں کو سوار ہونا چاہیے۔''[۸]

مولانا صلاح الدین احمد، مدیر ''ادبی دنیا'' نے اپنے مضمون ''اردو افسانے کے جدید رجحانات'' میں جدید افسانہ نگاروں کو جو فرائیڈ، مارکس اور ڈی ایچ لارنس کے معتقد تھے، نہ صرف جوان تھے بلکہ ان میں مرد افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ خواتین افسانہ نگار مثلاً عصمت چغتائی، ڈاکٹر رشیدہ جہاں اور حجاب امتیاز علی بھی شامل تھیں، مجموعی طور پر جنس زدہ قرار دیتے ہیں۔ اُن کے بقول، طوائف کی جو صورت یہ افسانہ نگار دکھاتے ہیں اس سے پہلے کے ادب میں یہ ایسی نہ تھی۔ مولانا صلاح الدین احمد، مرزا ہادی رسوا اور مرزا محمد سعید دہلوی کی تحریروں میں موجود شاہد بازاری کا دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ ان اشاروں کو ضرورتاً اپنی تخلیقات میں گھسیٹ لائے

تھے اور طوائف کی جو قسم اُنھوں نے متعارف کرائی تھی، جدید افسانہ نگار اس قسم کے کردار تخلیق کرنے سے معذور دکھائی دیتے ہیں ان کے بقول:

''اگرچہ اب پھر ہمارے بعض ترقی پسند افسانہ نگار خصوصاً سعادت حسن منٹو اسے نہیں بلکہ اس کی اسفل قسم کو واپس لانے کے لیے مضطرب ہیں۔ ہمارے ناولوں کی زینت تو وہ شائستہ اطوار طوائف تھی جس کے ہاں امیر زادے آداب محفل سیکھنے کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ مگر اب ''ترقی یافتہ'' ادب میں اس کی جگہ کوٹھڑی میں رہنے والی کسبی نے لے لی ہے۔''[۹]

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ فاضل مضمون نگار جدید ادب کی اس کروٹ کو ابھی تک نہیں سمجھ پائے جو اس نے کلاسیکی ادب کے خلاف بدلی تھی۔ اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے موضوعات اور کرداروں کے خلاف ہی تو نئے ادیبوں نے نعرہ لگایا تھا۔ پھر یہ کیسی منصفی اور کیسے معیار کے پیمانے ہیں کہ ایک طرف تو آپ اپنی اولادوں کی تربیت کے لیے طوائفوں کے دروازے کھٹکھٹاتے ہیں، اسے اپنے ناولوں کی زینت اور شائستہ اطوار گردانتے ہیں، محض اس لیے کہ آپ کی پسندیدہ طوائفیں، طوائفیت کے طبقہ اشراف سے تعلق رکھتی ہیں جب کہ جدید افسانہ نگاروں نے طوائف کی پرولتاریہ قسم کو اپنے ادب کا موضوع بنایا۔

مولانا صلاح الدین احمد اپنے ایک اور مضمون ''ہمارے افسانوں کی تشبیہیں اور تمثیلیں'' میں جدید افسانہ نگاروں کے ہاں استعمال ہونے والی عمومی تشبیہات پر بحث کرنے کے بعد سعادت حسن منٹو کے تشبیہاتی نظام کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سعادت حسن منٹو کا کم و بیش ہر افسانہ ایسی تشبیہات سے لبریز نظر آتا ہے جن سے کلاسیکی حسن تو قطعاً غائب ہے لیکن جس سے ہماری معاشرت کی یاسیت اور تلخی امڈ امڈ کر گرتی ہے۔ منٹو ایک ایسی نسل کا نمائندہ ہے جسے ہمارے آسودہ ماضی سے کوئی وابستگی اور دلچسپی نہیں۔''[۱۰]

اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ منٹو کے متعلق مزید لکھتے ہیں کہ:

''ان کے ماحول میں پرانی سماجی قدریں مٹتی جا رہی ہیں اور ان کے ساتھ روایتی ادب کے مظاہر بھی غائب ہو رہے ہیں۔ اس لیے تشبیہیں اگر باغیانہ صورت اختیار کر لیں تو تعجب نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں منٹو کی تشبیہات میں جو ایک شدت اور حملہ پایا جاتا ہے وہ اس سماجی دباؤ کا نتیجہ ہے جس سے فنکار یا اس ٹائپ کا نوجوان دبا جا رہا ہے۔''[۱۱]

آفتاب احمد کے مضمون ''جدید اُردو افسانہ'' میں نئے افسانوی ادب کا معروضی اور مجموعی انداز میں مطالعہ کیا گیا ہے۔ جدید افسانوی روایت کے تذکرے کے حامل اس مضمون میں افسانہ نگاروں کے جنس سے متعلق اختیار کیے گئے رویے اور اُن رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے جو جدید افسانوی ادب میں مرکزی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ بیسوا کے ساتھ ساتھ اچھوتے اور نئے موضوعات کی تلاش کے علاوہ جنس کو اس عہد کا اجتماعی رویہ قرار دیتے ہوئے اُنھوں نے لکھا:

''ہمارے بعض نئے افسانہ نگار اچھوتے پن کے جوش میں اس حقیقت کو فراموش کیے جا رہے ہیں کہ وہ ہمارے سامنے کیا پیش کر رہے ہیں اور ہماری زندگی میں اس کی کیا قدر و قیمت ہے۔''[۱۲]

سعادت حسن منٹو کو بھی وہ انھی میں سے ایک افسانہ نگار قرار دیتے ہیں۔ ذکی الدین پامال، ایم۔ اے، سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کو ترقی پسند افسانہ نگار اور ان کے افسانوں کو فحش اور لذت کے حصول کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''کالی شلوار میں عریانی اتنے جوبن پر نہیں جتنی ''بو'' میں ہے۔ شاید ان کے نزدیک ترقی کی یہ معراج ہو گی مگر یہ ترقی نہیں پستی ہے۔''[۱۳]

اس مضمون میں وہ ''ہتک'' کو جنسی مسائل کے متعلق منٹو کا بہترین افسانہ جب کہ ''بو'' کو اپنے مقصد میں ناکام افسانہ ٹھہراتے ہوئے منٹو کی اس رائے سے اختلاف کرتے ہیں جس میں اُنھوں نے اس ماحول کے خاتمے پر اصرار کیا تھا جو اس قسم کے ادب کی تخلیق کا باعث ہے۔

مضمون نگار کے مطابق اس قسم کے حالات کے خاتمے کے لیے عریاں افسانے اور نظمیں ہر گز ہر گز کام نہیں آ سکتیں۔ اُنھوں نے جنس اور اس کے متعلق لکھے گئے افسانوں اور جدید افسانہ نگاروں کے جنسی رجحانات کو ناپسندیدہ قرار دیا۔ سید وقار عظیم بھی ابتدا میں منٹو کو خاطر میں نہ لائے۔ روش عمومی پر چلتے ہوئے فن افسانہ نگاری پر لکھے گئے ایک مضمون میں اُنھوں نے ضمناً منٹو کا بھی نام لے لیا:

> ''پھر کچھ افسانہ نگاروں کے یہاں عمر کی ایک خاص منزل کے جذبات کی نفسی تحلیل ہے۔ مثلاً منٹو، حسن عسکری، عصمت چغتائی اور ممتاز مفتی میں سے ہر ایک کا موضوع جنس کے جذبہ کا ایک غیر محسوس عمل ہے۔''[۱۴]

ان تمام مضامین میں اردو افسانے کی روایت اور جدید رجحانات کا مجموعی طور پر جائزہ لیا گیا ہے اور منٹو سمیت کسی بھی جدید افسانہ نگار کی فنی و فکری خوبیوں کا انفرادی سطح پر مطالعہ نہیں کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ فحاشی یا جنس نگاری و عریانی کا الزام اکیلے منٹو پر ہی نہیں لگایا گیا بلکہ یہ ایک عمومی رویہ تھا جس کو افسانہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد نے اپنایا۔ چناں چہ اس دور میں شائع ہونے والا کوئی بھی ادبی رسالہ طوائف کے ذکر سے خالی نہ ہوتا۔ اس صورت حال میں عبدالماجد دریا آبادی مولانا تاجور نجیب آبادی جیسے اخلاقیات پسند اور چودھری محمد حسین جیسے بظاہر قانون پسند مگر دراصل سادہ لوح قسم کے افراد کا منٹو کی تحریریں پڑھ کر اضطراب میں آنا بہر حال معنی رکھتا ہے، اسی طرح مولانا صلاح الدین احمد، بشیر ساجد، ذکی الدین پامال اور آفتاب احمد کو بھی رعایت دی جا سکتی ہے کہ وہ فکری اور فطری طور پر جنس اور اس سے جڑے ہوئے دیگر لوازمات، کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن حیرت اُس وقت ہوتی ہے جب ترقی پسند تحریک اور تنقید منٹو کو جنسی، فحش، عریاں نگار، سنکی، سوقیانہ اور رجعت پسند قرار دینے لگی۔ سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن پر جتنی بے دردی سے ترقی پسندوں نے وار کیے اس کی نظیر منٹوانہ تنقید میں کہیں نہیں ملتی۔ منٹو مولویوں، صحافیوں، دوا فروشوں اور حکومتی حلقوں کی تنقید کو بالکل خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اُنھیں اس اہل ہی نہیں سمجھتے تھے کہ وہ کسی ادب پارے کے بارے میں رائے تک دے سکیں۔ لیکن ترقی پسند حلقوں سے اٹھنے والی آوازیں منٹو کو ضرور پریشان کر گئیں۔ ترقی پسند تحریک اور تنقید کا رویہ منٹو کے ساتھ دوہرا رہا۔ وہ اعلانیہ اور فخریہ منٹو کو اپنا حصہ بھی قرار دیتے رہے اور اس کے ترقی پسندانہ وجود کے انکاری بھی ہوئے۔ اس کے فن کے قصیدے بھی پڑھتے رہے اور ہجویات بھی لکھتے رہے۔ لیزلی فلیمنگ ترقی پسندوں کے اس دوہرے یا دوغلے عمل کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''منٹو کے ترقی پسند تحریک میں شمولیت سے واضح انکار کے بعد اس کے کچھ افسانوں کی بنیاد پر ترقی پسندوں نے اس کی شہرت کو داغدار کر دیا۔''[۱۵]

منٹو اور ترقی پسندوں کے درمیان یہ آنکھ مچولی شروع ہی سے چلتی رہی۔ وہ خالص ترقی پسند تھے ان کی تحریریں اس بات کا کھلا ثبوت ہیں۔ مگر وہ ساری زندگی ترقی پسندوں پر طنز کے تیر چلاتے رہے۔ ترقی پسندوں نے ان کے جنسی موضوعات کو خاص طور پر آڑے ہاتھوں لیا مگر اُنھیں اپنا حصہ بھی تسلیم کرتے رہے۔ عزیز احمد ہی کی مثال لے لیجیے، چالیس کی دہائی میں جب نئے افسانہ نگار اردو افسانے کو موضوعاتی سطح پر نئے طرز بیان سے روشناس کرا رہے تھے۔ جن میں سے ایک پیرایہ جنسی اسلوب بیان کا بھی تھا۔ عزیز احمد نے ''ترقی پسند ادب'' لکھ کر ایسے ادیبوں کی خوب کلاس لی، جنھوں نے طوائف یا عورت کی آڑ میں ان کے نزدیک جنسی فحش نگاری کے رجحان کو پروان چڑھایا۔ سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی خاص طور پر ان کی زد میں آئے۔ عصمت چغتائی کے بارے میں ان کا سخت موقف دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ منٹو پر ان کی گرفت کتنی سخت ہو گی:

''عصمت چغتائی کو ترقی پسندوں میں شمار کرنا ترقی پسند ادیبوں کی محض سرپرستی اور خاتون پرستی ہے۔ ان کا رجحان سعادت حسن منٹو سے بھی زیادہ رجعت پسند اور مریضانہ ہے۔''[۱۶]

اُنھوں نے منٹو کے افسانوں کو دلچسپ قرار دیا اور اس دلچسپی کا بڑا سبب منٹو کی افسانوی تکنیک کو گردانتے ہوئے تسلیم کیا کہ منٹو کے افسانوی موضوعات میں بلا کا تنوع ہے۔ مروتاً کی جانے والے عام انداز کی تحسین کے بعد وہ فوراً منٹو کی ''جنسی کمزوری'' کو پکڑتے ہیں۔ دھواں اور بلاؤز کو منٹو کے ایسے افسانے قرار دیتے ہیں جن میں واقعہ نگاری کے سوا کچھ نہیں، ایسی واقعہ نگاری جو زندگی پر صحت منداثر ڈالنے کی بجائے مریضانہ اور مضر اثر ڈالتی ہے۔ لکھتے ہیں:

''دھواں'' کسی کچی لکڑی کا دھواں نہ سہی، لیکن میرے خیال میں یہ ڈی ایچ لارنس کو اچھی طرح ہضم نہ کر سکنے کی وجہ سے بد ہضمی کی ڈکار ہے۔''[۱۷]

عزیز احمد کے مطابق دھواں جیسے افسانوں کی سماجی نقطہ نگاہ سے ایک ہی وجہ جواز ہو سکتی ہے کہ بچوں کو شروع ہی سے جنسی تعلیم ملنی چاہیے۔ لیکن اس خامی کو واضح کرنے کے لیے اس طرح کے ترغیب آمیز افسانے لکھنا جن کو پڑھ کے بچے جنس کو اور زیادہ مریضانہ نظر سے دیکھیں، انقلابی نقطۂ نظر سے ہر گز جائز نہیں۔

عزیز احمد اور دیگر ترقی پسند جنس نگاروں کی مخالفت ہی اسی لیے کرتے تھے کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ جنس کی طرف رغبت نوجوانوں کو اس انقلاب کے راستے سے بھٹکا دے گی جو ترقی پسندوں کا ادبی نظریہ تھا۔ سعادت حسن منٹو پر لکھتے ہوئے جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے گئے ویسے ویسے ان کی تنقید، تنقیص میں تبدیل ہوتی گئی۔ ترقی پسند ادب میں منٹو کے متعلق ان کے لکھے ہوئے اس جملے کی گونج آج تک ادبی دنیا میں موجود ہے کہ:

''جنس نے سعادت حسن منٹو کے یہاں مذہب کی جگہ لے لی ہے۔''[۱۸]

ڈاکٹر خالد اشرف نے عزیز احمد کی اس رائے کو غیر ادبی،، انتہا پسندی اور جلد بازی میں کیا گیا فیصلہ قرار دیا۔[۱۹] ۱۹۴۲ء میں جب عزیز احمد کی یہ کتاب اشاعت پذیر ہوئی اُس وقت اُردو افسانے میں اجتماعی طور پر نہ صرف جنس کو موضوع بنایا جارہا تھا بلکہ اس موضوع پر لکھنے والوں کو ہدف تنقید بھی بنایا جارہا تھا۔ صرف ادب میں ہی نہیں زندگی کے تمام شعبوں میں اختلاف رائے کی گنجائش ہمیشہ موجود رہتی ہے اور یہ ایک صحت مند رویہ ہے لیکن اختلاف رائے جب اختلاف ذات بن جائے تو پھر اس قسم کے اعتراضات سامنے آتے ہیں:

> ''نفس مضمون کی حد تک سب سے بڑا اعتراض منٹو پر یہ عائد ہوتا ہے کہ اس میں انسانیت کا راسخ عقیدہ کہیں نظر نہیں آتا۔''[۲۰]

عزیز احمد کی منٹو سمیت دیگر جنسی افسانے لکھنے والوں پر اس بے جا تنقید کے خلاف رد عمل سوائے متاثرہ افسانہ نگاروں کے اور کسی نے بھی نہ دکھایا۔ ترقی پسند تحریک ادب کے ہر شعبے پر قابض ہو چکی تھی لہٰذا ترقی پسند نظریات یا شخصیات سے اختلاف کی گنجائش یا جرأت شاید اُس وقت کسی بھی نقاد کے بس کی بات نہ تھی۔ و گرنہ کوئی تو عزیز احمد کو ٹوکتا، اور اُنھیں سمجھاتا کہ جو الزام آپ منٹو، عصمت یا ممتاز مفتی پر لگا رہے ہیں، وہ تو خود آپ کی تحریروں پر اُن سے بڑھ کر صادق آتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کا غلبہ چھٹتے ہی ترقی پسند نظریات کے خلاف ادبی سطح پر چہ میگوئیاں زور پکڑنے لگیں اور نقد و تنقید کا معیار نظریے کی بجائے فن کو ٹھہرایا جانے لگا۔ ممتاز شیریں جن کا شمار منٹو کے سنجیدہ ناقدین میں کیا جاتا ہے، عزیز احمد پر خوب برہم ہوئیں اور ان کے رویے اور رائے دونوں پر حیرت کا اظہار کچھ اس طرح کیا:

> ''نظریاتی طور پر عزیز احمد صاحب نے جو باتیں کہی ہیں، خوب کہی ہیں لیکن لطف کی بات تو یہ ہے کہ یہ ناصحانہ انداز، گریز اور ہوس جیسی ناولوں اور نمایاں طور پر جنسیاتی افسانوں کے مصنف نے اختیار کیا ہے۔ عزیز احمد کی تنقید کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس کی ایک ایک بات منٹو، عسکری یا عصمت چغتائی سے کہیں زیادہ خود عزیز احمد پر صادق آتی ہے۔''[۲۱]

خالد اشرف بھی عزیز احمد کے متعلق اسی قسم کے خیالات رکھتے ہیں:

> ''ستم بالائے ستم یہ کہ جب عزیز احمد خود ناول لکھتے ہیں تو جسمانی تلذز کے بیان اور عریاں نگاری میں عصمت چغتائی اور منٹو کو میلوں پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔''[۲۲]

علی سردار جعفری کا منٹو سے رویہ متضاد رہا۔ وہ منٹو کو علی گڑھ کے زمانہ طالب علمی سے جانتے تھے اور ان کے انقلابی نظریات سے بخوبی واقف تھے۔ بطور نقاد منٹو کی فنی خوبیوں کو سراہتے بھی رہے اور بطور ترقی پسند منٹو کی تحریروں سے اختلاف بھی رکھتے تھے۔ منٹو کی زندگی میں بھی وہ اسی طرح قلا بازیاں کھاتے رہے اور اس کے مرنے کے بعد بھی یہ دوہرا معیار برقرار رکھا۔ لیکن تمام تر نظریاتی اختلافات کے باوجود، وہ منٹو کی بہت عزت کرتے تھے اور اسے اُردو کا ایک اہم افسانہ نگار تسلیم کرتے تھے۔ علی سردار جعفری کے مطابق منٹو نے نیا قانون، ترقی یافتہ قبرستان، موتری، کھول دو، موذیل اور ٹوبہ ٹیک سنگھ جیسے شاہکار افسانے بھی لکھے اور بو، ہتک اور سرکنڈوں کے پیچھے، جیسے دردناک مگر فضول اور مہمل افسانے بھی لکھے۔ عزیز احمد کی طرح علی سردار جعفری بھی ہئیت، تکنیک اور

کردار نگاری کو منٹو کی ایسی خوبیاں گردانتے ہیں جو ان کے معاصر افسانہ نگاروں کی نسبت منٹو میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' مطبوعہ ۱۹۵۲ء میں اُنھوں نے منٹو پر سخت گرفت کی اور ان کے مقابلہ میں کرشن چندر کو جو تمام عمر ترقی پسند نظریات کے ترجمان رہے، شعوری طور پر ترجیح دیتے دکھائی دیے۔ ان کے مطابق گورکی کے ترجمے کرنے اور نیا قانون جیسی کہانیاں لکھنے کے بعد منٹو تیزی سے انحطاط کی طرف بڑھ رہے ہیں، فحاشی، مریضانہ ذہنیت اور سنسنی خیزی کے ساتھ ساتھ ان کی بیان کی گئی حقیقتیں ادب کے لیے بہتر نہیں۔

محمد حسن عسکری ۱۹۴۷ء تک منٹو کے تشخص سے لاعلم یا لاتعلق ہی رہے۔ ۱۹۴۸ء میں جب منٹو بطور ادیب شہرت کی ''تکلیف دہ'' بلندیوں کو چھو رہا تھا، اچانک محمد حسن عسکری کو وقت نے کھوٹا کھرا الگ کرنا سکھا دیا تو اُنھیں منٹو ''اُردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار'' لگنے لگا۔ محمد حسن عسکری نے ۱۵ اگست ۱۹۴۸ء کے ''امروز'' اخبار میں تحریر کردہ مضمون میں لکھا کہ :

> ''منٹو کے افسانوں میں پہلے مجھے کوئی گہری دلچسپی نہیں تھی۔ مگر اب جب وقت نے کھرا کھوٹا الگ کرنا شروع کر دیا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ نئے افسانہ نگاروں میں منٹو ہی ایک ایسا آدمی ہے جسے براہ راست انسانی دماغ اور اس کی کیفیت سے دلچسپی ہے۔''[۲۳]

منٹو اور حسن عسکری کا مزاج ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا تھا۔ حسن عسکری بہت کم گو اور شرمیلے تھے جب کہ منٹو ہمیشہ طوفان سر پر اٹھائے رکھتا لیکن جس طرح منٹو ترقی پسندوں کی بے جا تنقید کا شکار تھے، اسی طرح حسن عسکری بھی اپنے نظری اختلافات کی وجہ سے زیرِ عتاب تھے۔ اُنھوں نے ترقی پسندوں کے ساتھ خوب سینگ بھڑائے بلکہ اُنھیں سینگوں پر اٹھائے رکھا۔ شاید اسی قدرِ مشترک نے ہی حسن عسکری کو یہ احساس دلایا کہ ''منٹو ہی ایک ایسا افسانہ نگار ہے'' جو ترقی پسندوں کا مقابلہ کرنے میں ان کا بہترین ہتھیار ثابت ہو سکتا ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو واقعہ یہ ہے کہ ادبی افق پر عسکری، منٹو گٹھ جوڑ کم عرصے کے لیے ہی صحیح، ہو چکا تھا۔ تنقید کے دھارے مسلسل سعادت حسن منٹو کے خلاف بہہ رہے تھے، جن کے آگے حسن عسکری بند باندھنے پہنچ گئے تھے۔ اُنھوں نے منٹو کی افسانہ نگاری کے پوشیدہ اسرار و رموز پر تبصرے شروع کر دیے۔

''سیاہ حاشیے'' میں حسن عسکری کا دیباچہ بہت سوں کو ناگوار گزرا۔ حسن عسکری نے اس دیباچے میں منٹو کے فن افسانہ نگاری کو خوب سراہا اور کہا کہ فسادات کے موضوع پر آج تک جتنا بھی ادب تخلیق ہوا ہے، ان میں اگر کوئی چیز انسانی دستاویز کہلانے کی مستحق ہے تو یہ افسانے ہیں۔ دراصل ''سیاہ حاشیے'' میں شامل حسن عسکری کا دیباچہ اور دونوں کی ادارت میں دوماہی ''اردو ادب کے'' اجراء نے ترقی پسند تحریک میں اشتعال اور بھونچال پیدا کر دیا جس سے احمد ندیم قاسمی جیسا دوست بھی منٹو کے نام کھلا خط لکھنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ طویل خط پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ جیسے یہ منٹو کی بجائے دراصل حسن عسکری کے نام لکھا گیا ہو۔ پورے خط میں محمد حسن عسکری ہی کا رونا رویا جا رہا ہے۔ عسکری نے ادب کو فلاں نقصان پہنچایا، ترقی پسند تحریک کو فلاں نقصان پہنچایا، منٹو کو فلاں نقصان پہنچایا، وغیرہ وغیرہ۔ اس کھلے خط کو پڑھنے کے بعد اس تشویش اور بے چینی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو ترقی پسند حلقوں میں سعادت حسن منٹو اور حسن عسکری کے الحاق سے پیدا ہو چلی تھی۔ اور جس کے متعلق حسن عسکری پہلے ہی بھانپ چکے تھے کہ ''منٹو ہی ایک ایسا شخص ہے۔۔۔۔۔۔''

احمد ندیم قاسمی کے اس کھلے خط کا سعادت حسن منٹو نے بہت برا منایا۔ وہ اس کے جواب میں ''بند چٹھی'' لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن مصلحتاً خاموش رہے۔ احمد ندیم قاسمی کے لکھے گئے اس خط کو وہ زندگی بھر بھلا نہ پائے۔ چناں چہ اس خط کی اشاعت کے بعد دونوں کے تعلقات میں سرد مہری آ گئی۔ اگر چہ قاسمی صاحب بعد میں یہ صفائیاں دیتے رہے کہ شروع شروع میں تو منٹو نے برا منایا تھا لیکن بعد میں اُنھوں نے تسلیم کیا کہ قاسمی نے جو لکھا ہے وہ درست لکھا ہے۔ مختصراً یہ کہ تین وجوہات کی بنا پر ترقی پسند یے منٹو کے ادبی وجود کے اس قدر درپے ہو گئے کہ احمد ندیم قاسمی جیسا دوست بھی ان پر حملہ آور ہو گیا۔ وہ تین وجوہات تھیں منٹو کی انانیت، سیاہ حاشیے پر حسن عسکری کا دیباچہ اور دوماہی ''اردو ادب'' کی اشاعت۔

یہ وہ زمانہ ہے جب کم و بیش تمام ترقی پسندوں نے منٹو کے خلاف اتنا محاذ گرم کر دیا کہ منٹو کا ادبی بائیکاٹ تک کر دیا۔ احمد ندیم قاسمی اور منٹو بہترین دوست تھے۔ منٹو کے لکھے گئے خطوط سے دونوں کے تعلقات کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ افسانوی اور فلمی دنیا میں منٹو نے انگلی پکڑ کر قاسمی کو چلنا سکھایا تھا۔ قاسمی صاحب ان دو چار لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جن کی منٹو دل سے عزت کیا کرتے تھے۔ چناں چہ جب احمد ندیم قاسمی کا کھلا خط شائع ہوا تو منٹو کو بہت دھچکا لگا۔ اس خط میں قاسمی صاحب نے بطور ادیب سعادت حسن منٹو کو ایک بڑا افسانہ نگار تسلیم کیا ہے اور اس کے فنی کمالات کو چیلنج نہیں کیا۔ منٹو کے ساتھ فنی موضوعاتی کی بجائے اختلاف کی نوعیت نظریاتی تھی۔ قاسمی سمیت تمام ترقی پسندوں کی یہ خواہش تھی کہ منٹو حسن عسکری سے جدا ہو جائیں۔ اس کا مطلب یہ ہر گز نہ تھا کہ وہ منٹو کی فنی عظمت کے تہہ دل سے قائل ہو گئے تھے بلکہ اصل ہدف تو حسن عسکری تھے جنہیں منٹو جیسا قد آدم افسانہ نگار تحفظ دے رہا تھا۔ اس خط میں منٹو کے فنی کمالات کا اشارتاً اعتراف ضرور کیا گیا ہے مثلاً یہ جملہ دیکھیے:

''آپ کے ہاتھ میں ایک آتشیں قلم اور آپ کے ذہن میں ایک شدید جذبہ ہے۔''[۲۴]

یا پھر یہ جملہ کہ:۔

''اردو کے تمام زندہ افسانہ نگاروں میں منٹو کی فنی اور شخصی انفرادیت نمایاں ترین ہے۔''[۲۵]

لیکن اس اعتراف کے باوجود تمام خط میں منٹو کو راہ راست پر آنے کے مشورے دینے والے یہ بات جانتے ہوئے بھی بھول گئے کہ منٹو ہدایات اور نصب العین کے تحت ادب کی تخلیق کا قائل نہیں تھا۔ وہ اس بات کا پابند نہیں ہو سکتا تھا کہ لکھنے والوں کو لکھتے وقت کس سمت رخ کر کے کیانیت باندھنی چاہیے، کن موضوعات پر لکھنا چاہیے اور کن سے پرہیز کرنا چاہیے کن مروجہ اقدار کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور یہاں تک کہ کیسے لکھنا چاہیے۔

منٹو کے ہم عصر معروف ترقی پسند نقاد ممتاز حسین نے احمد ندیم قاسمی کے کھلے خط کی طرح منٹو اور عسکری پر طنز کے کھلے نشتر چلائے ہیں۔ اُنھوں نے سیاہ حاشیے کو افسانوں کی بجائے لطیفوں، چٹکلوں اور پہیلیوں کی کتاب قرار دیتے ہوئے اس پر لکھے گئے حسن عسکری کے دیباچے کو زیادہ تر اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ سیاہ حاشیے، کے دیباچے میں حسن عسکری نے منٹو کی جن فنی و فکری خوبیوں پر روشنی ڈالی، ممتاز حسین نے انھی کو منٹو کی خامیوں سے تعبیر کرتے ہوئے بہت سخت لہجہ اختیار کیا۔ ان کے مطابق منٹو کو اپنے افسانوں میں کبھی بھی اس بات سے سروکار نہ تھا کہ گندگی کے معاشی اسباب کیا ہیں وہ زندگی کے گھناؤنے پہلوؤں سے داخلی طور پر نفرت کرتا ہو

تو کرتا ہو خارجی پہلوؤں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ گندگی کے ہیبت ناک گھور میں یہ ڈھونڈتا رہتا ہے کہ آیا انسان بالکل مر گیا ہے یا کچھ کچھ زندہ ہے۔ اگر اسے کہیں انسانیت کی ایک آدھ جوت نظر آ بھی جاتی ہے تو وہ بڑے فخر سے اعلان کرتا ہے کہ دیکھو میں نے کیا ڈھونڈ نکالا۔ اس قسم کے اعتراضات کی ایک جھلک دیکھئے:

> ''ادب ہمیں اپنی گندگی سے اوپر ابھارتا ہے، اپنے گندے ماحول پر غالب آنے کے لیے اکساتا ہے، ہمارے ارادوں میں قوت اور ہماری نگاہ میں مستقبل کی روشنی پیدا کرتا ہے۔ اس کام کے لیے ہیرو کو قوت کا انجکشن دینے کی ضرورت ہے اور نہ خود ادیب کو وہسکی کی چسکی لینے کی ضرورت ہے۔'' [۲۶]

منٹو کی فکر پر حملہ کرتے ہوئے اُنھوں نے واضح انداز میں کہا کہ منٹو نے فسادات کی ننگی تصویروں کو وہی لباس پہنایا ہے جو حکمران پہنانا چاہتے تھے۔ حال آں کہ منٹو کا دعویٰ تھا کہ اس ننگی تہذیب و تمدن کو کپڑے پہنانا اس کا نہیں درزیوں کا کام ہے مگر پھر بھی اس نے ایسا کیا۔ ایک اقتباس دیکھئے:

> ''وہ کپڑا جو ہمارے حکمران فساد کی لاش پر ڈالنا چاہتے ہیں، منٹو نے ایک چابک دست درزی کی طرح اس کپڑے کو کتر بیونت کر کے ایک خوبصورت لباس میں پیش کیا ہے۔ اگر منٹو کے اس فن کی داد نہ دی جائے تو اس کے پیشے کی توہین ہو گی۔ منٹو درزی کیوں بن گیا اب آپ خود سوچئے، منٹو کس کا درزی ہے؟ یہ بھی سوچنے کی بات ہے۔'' [۲۷]

کیا یہ اسی طرح کی منٹو دشمنی نہیں ہے جس کا مظاہرہ خیام آئینہ، پربھات دین و دنیا اور اخوت، وغیرہ نامی اخبارات میں کیا گیا تھا۔ یا پھر وہ دشمنی جو ماہر القادری، تاجور نجیب آبادی، راجہ صاحب آف محمود آباد یا چودھری محمد حسین کے رویوں سے ظاہر ہوئی تھی۔ یہ ایک لطیفہ ہی تو ہے کہ دائیں بازو اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے دونوں طبقوں کے نقادوں نے منٹو کے خلاف زیادہ تر زہر ہی اگلا ہے۔ آخر میں نامور ترقی پسند افسانہ نگار کرشن چندر کے اس مضمون کا ذکر ضروری ہے جو نئے ادب کے معمار کے سلسلہ میں اُنھوں نے ''سعادت حسن منٹو'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ یہ مضمون خاص اہمیت کا حامل ہے جس میں منٹو کو ترقی پسندی کی بجائے دوستی اور ہمدردی کی عینک لگا کر دیکھا گیا ہے۔ مضمون کا زیادہ تر حصہ شخصی واقعات پر مشتمل ہے اور بلاشبہ منٹو کا پہلا اور آخری شخصی خاکہ ہے جو کسی معاصر ادیب نے اس کی زندگی میں لکھا۔ کتب پبلشرز لمیٹڈ نے اسے ۱۹۴۸ء میں بمبئی سے شائع کیا۔ اپنے اس مضمون میں کرشن چندر نے جہاں منٹو کی شخصی خوبیوں کو سراہا وہیں اس کی فنی عظمت کا اعتراف بھی کھلے دل سے کیا۔ ایسے وقت میں ایک ہم عصر ترقی پسند کی یہ رائے حوصلے اور جرأت مندی کی بہترین مثال ہے جب کہ تمام ترقی پسندوں نے منٹو کو عملی طور پر بین کر رکھا ہو:

> ''اس کے ہر افسانے میں محبت کی پکار ہے۔ آپ اس کے انداز پر نہ جائیے۔ وہ اپنی انسانی ہمدردی اور ترقی پسندی پر پردہ ڈالنے کی ہزار کوشش کرتا ہے لیکن اس کا قلم اس کے قابو میں نہیں ہے اور ہر افسانے کے پس پردہ انسانی محبت ابلی پڑی ہے۔'' [۲۸]

منٹو کے افسانے ہتک کو وہ اُردو کی بہترین کہانی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اتنے عمدہ افسانے اُردو میں مشکل سے لکھے جا سکیں گے۔ سوگندھی کی ٹکر کا ایک کردار بھی ناولوں اور افسانوں میں نظر نہیں آتا۔ ہتک کو اُنھوں نے سچے اور روحانی ادب کا جوہر قرار دیتے ہوئے منٹو کے مشاہدے کی داد کچھ یوں دی ہے:

''منٹو زمین کے بہت قریب ہے، اس قدر قریب کہ اکثر گھاس کے خوشے میں رینگنے والے کیڑے بھی اپنے تمام اوصاف کے ساتھ اسے نظر آجاتے ہیں۔ اور جو لوگ زندگی کو ایک اوپری پھسلتی ہوئی نظروں سے دیکھنے کے عادی ہیں وہ اس کے عمیق مشاہدے اور اس کی ژرف نگاہی کی داد دینے سے قاصر رہتے ہیں۔'' [۲۹]

مضمون کا اختتام وہ ان الفاظ پہ کرتے ہیں:

''اس کے جوہر کا غالب حصہ انسانی حسن، انسانی ہمدردی اور انسانیت کو بہتر بنانے کی آرزو کی غمازی کرتا ہے اور یہی اس کے ادب کے گہرے نقوش ہیں۔'' [۳۰]

کرشن چندر واحد ترقی پسند تھے جنھوں نے منٹو کی زندگی میں کسی مخصوص لابی یا نظریے کی بجائے منٹو کی شخصیت اور فن کے متعلق کھل کر اظہار رائے کیا۔ وگرنہ احمد ندیم قاسمی سمیت تمام ترقی پسند ناقدین نے منٹو کے متعلق بہت محتاط رویہ اختیار کیے رکھا۔ اگرچہ وہ منٹو کے فن کے معترف تھے لیکن نظریات کے اختلاف نے اُنھیں منٹو کے فنی کمالات کی تحسین سے باز رکھا۔

ترقی پسند تحریک سے ہٹ کر بھی بعض ناقدین نے منٹو کے بارے میں منفی رائے کا اظہار کیا۔ رشید احمد صدیقی نے ۱۹۴۱ء میں ہی منٹو پر جنسی ذہنیت کا الزام لگاتے ہوئے کہا کہ اسے عورتوں کے کردار بیان کرنے میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی ہے۔ انتظار حسین بھی اس زمانے میں کچھ اسی قسم ہی کے خیالات رکھتے تھے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے منٹو کے کرداروں کو سراہنے کے باوجود اسے بگڑا ہوا اور بھٹکا ہوا بچہ قرار دیا جس کے افسانے 'ٹھنڈا گوشت اور کھول دو' وغیرہ لوگوں کو چونکانے کے لیے لکھے گئے تھے اور ان کی تخلیق کا کوئی ادبی مقصد نہ تھا۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ سعادت حسن منٹو کے تخلیقی عمل کو فکری، فنی اور موضوعاتی سطح پر سب سے پہلے کسی نے جانچنے کی سنجیدہ کوشش کی تو وہ خود ان کی اپنی ہی ذات تھی۔ منٹو کے افسانوں پر چلنے والے مقدمات نے اس وقت کی ادبی فضا میں ایک ہلچل سی مچا رکھی تھی۔ فحاشی اور اس سے متعلق مباحث (خاص کر سعادت حسن منٹو کی تحریروں میں) زیر بحث لائے جا رہے تھے، جن میں ہر دو طرح کے لوگ موجود تھے۔ ایک قسم منٹو کو فحش، سنکی اور جنسی جرم کے پاداش میں قابل گردن سمجھتی تھی جب کہ دوسری قسم ایسے ادبی گروہ سے تعلق رکھتی تھی جو منٹو کو ادیب ہونے کی وجہ سے رعایت کا مستحق سمجھتے تھے، نسبتاً کم تعداد میں تھے۔ ان لوگوں نے بھی منٹو کے تمام ادبی، فکری اور فنی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی بجائے صرف ان افسانوں تک ہی اپنے آپ کو محدود رکھا جن پر مقدمات چل رہے تھے اور وہ بطور گواہ صفائی اپنے بیانات ریکارڈ کروا رہے تھے۔ دوسری طرف استغاثہ کے گواہان بھی محض انھی افسانوں کو ہدف تنقید بنا رہے تھے۔ منٹو کے افسانوں پر چلنے والے ان مقدمات کو اور پھر ان کے نتیجے میں چھڑنے والے مباحث کو منٹو شناسی کی اولین سنجیدہ صورت کہا جائے تو کچھ غلط نہیں۔ اس اولین سنجیدہ کوشش کو چار مختلف خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے افراد اور ان کی ادارت میں شائع ہونے والے ایسے اخبارات ہیں جن میں منٹو اور ان رسائل کے خلاف جن میں یہ کہانیاں چھپی تھیں، طوفان بدتمیزی کھڑا کر دیا گیا۔ ایک لحاظ سے ان اخبارات ہی کے ذریعے چودھری محمد حسین تک یہ پیغام پہنچایا جاتا تھا کہ منٹو کو فلاں کہانی کے الزام میں دھر لو۔ یوں تو منٹو کے افسانے ''کالی شلوار'' پر سب سے پہلا فحاشی کا مقدمہ دائر ہوا تھا جو ماہنامہ ''ادب لطیف'' لاہور کے سالنامہ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا تھا۔ لیکن ۱۹۴۴ء کے سالنامہ میں افسانہ ''بو'' اور مضمون ''ادب جدید'' کی اشاعت کے بعد منٹو اور اس کے فن کی خوب خوب تحقیر کی گئی۔ اس وقت کے منٹو مخالف افراد نے اخبارات کا روپ

دھار کر منٹو کو لچر، فحش، جنسی، سنکی اور غیر تہذیب یافتہ افسانہ نگار قرار دیتے ہوئے سخت سے سخت سزا دینے کا مطالبہ بار بار دہرایا۔ گویا منٹو شناسی کا اولین دور دراصل منٹو دشمنی پر مبنی تھا۔ ان اخبارات نے منٹو اور اس کے فن کی منفی تشہیر کر کے منٹو کی فنکارانہ شخصیت کا مسخ چہرہ عوام کے سامنے رکھا۔ ''خیام''، ''اخوت''، ''عالمگیر''، ''پربھات'' کے علاوہ کئی اخبارات نے اس مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ذیل میں کچھ اخبارات کے تراشے جوں کے توں پیش کیے جاتے ہیں۔ جن سے صورتحال کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ ہفتہ وار ''خیام'' لاہور نے اعلان کیا کہ:

> ''لاہور کے ایک رسوائے عالم رسالے میں جو فحاشی اور بے ہودگی کی اشاعت کو اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے'' ایک افسانہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے بو، اور اس کے مصنف ہیں مسٹر سعادت حسن منٹو۔ اس افسانے میں فوجی عیسائی لڑکیوں کا کریکٹر اس درجہ گندا بتایا گیا ہے کہ کوئی شریف آدمی برداشت نہیں کر سکتا۔ افسانہ نگار نے اظہار مطلب کے لیے جو اسلوب اختیار کیا ہے اور جو الفاظ منتخب کیے ہیں، ان کے لیے تہذیب، شرافت کے دامن میں کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ لیکن حکومت اب تک خاموش ہے۔ حال آں کہ یہی حکومت ہے جو ''لذت النساء'' اور کوک شاستر'' ایسی فنی کتابوں کو بھی قابل مواخذہ سمجھتی ہے لیکن ایسے افسانوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتی جو ادب جدید کے نام سے سفلی جذبات میں ہلچل ڈالنے کا موجب ہیں اور فحاشت نگار ادیبوں کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے وہ قانون کی گرفت سے بے نیاز ہو کر گندگی بکھیرتے رہتے ہیں۔'' [۳۱]

''خیام'' لاہور نے اگرچہ کہ ''بو'' کو فحش اور تہذیب و اخلاق سے عاری افسانہ کہا ہے۔ لیکن ''بو'' کے مرکزی کردار ''گھاٹن'' کی بجائے سارا زور فوجی عیسائی لڑکیوں کے کریکٹر کو گندا ثابت کرنے پر لگایا۔ شاید اس تناظر میں وہ حکومت وقت کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔ روزنامہ ''پربھات'' لاہور نے تو مصنف، پبلشر اور پرنٹرز کے لیے سزا تک خود تجویز کر دی۔ لکھتے ہیں:

> ''لاہور پریس برانچ کے انچارج چودھری محمد حسین نیک خیال کے بزرگ ہیں۔ اس قسم کے افسانے پڑھ کر ان کی روح یقیناً کانپ اٹھی ہے۔ ان کے ہاتھ میں قانون ہے اور وہ اسے نہایت سختی سے استعمال کر سکتے ہیں۔ کیا ان کے لیے ممکن نہیں تھا کہ جس طرح قابل اعتراض مذہبی مضامین لکھنے والوں کے خلاف گورنمنٹ کی مشینری حرکت میں آئی، اسی طرح ان گندے افسانوں کو لکھنے والے سعادت حسن منٹو وغیرہ، بیچنے والے پبلشر جو رسالے کی فروخت سے ہزاروں روپیہ کماتے ہیں اور چھاپنے والے پریس کے مالک کو فوراً گرفتار کر لیتے اور ان میں سے ہر ایک کو تین تین سال کے لیے جیلوں میں بند کرا دیتے۔ ہمیں یقین ہے کہ کوئی بھی عدالت ان افسانوں کو قانون کی زد سے نہیں بچنے دے گی۔ یہ صاف طور سے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں بداخلاقی پھیلاتے ہیں اور عوام کا مذاق بگاڑتے ہیں۔'' [۳۲]

لاہور ہی سے شائع ہونے والے اخبار ''اخوت'' نے اپنا احتجاج ریکارڈ کراتے ہوئے حکومت اور فوج کی بدنامی کا موجب افسانہ قرار دیتے ہوئے فوری ایکشن کا پیغام کچھ یوں بھجوایا:

> ''ادب لطیف نام کا ایک رسالہ لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ یہ کہنے کو تو ایک ادبی ماہنامہ ہے لیکن اگر اسے ادب کثیف کہیے تو بجا ہے۔ اس کا سالانہ نمبر اس وقت ہمارے پیش نظر ہے جس میں ایک لچر اور فحش افسانہ از قلم فحش نگار سعادت حسن

منٹو شائع ہوا ہے۔ جس کے خلاف ہم نہایت پر زور احتجاج کرتے ہیں، فقط اس کے کوک شاسترانہ خیالات کی وجہ سے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ یہ گورنمنٹ عالیہ کی ویمنز آگزالری کور (Wac) کی مساعی رباب جنگ کی راہ میں روڑا اٹکانے والا اور اس کی بدنامی کا موجب ہے۔ حتیٰ کہ اس محکمہ کو بے ہودہ شخصی قحبہ خانہ کا نام دیتا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر گورنمنٹ کی مشینری فوراً حرکت میں آجاتی ہے لیکن اس، خلاف تہذیب مضمون پر اس کی اب تک نظر نہیں پڑی۔ کیا سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ اس بد اخلاق اور بے ادب ''ادیب'' اور رسالہ مذکورہ کے خلاف جلد کوئی کاروائی نہ کریں گے، دیکھنا چاہیے۔'' [۳۳]

یہ ہے اُس زمانے کے پرنٹ میڈیا کا کردار جو فنکار منٹو کو اپنی اخلاقیات کے معیار پر پورا نہ اترنے کی پاداش میں برملا فحاشی اور عریانی پھیلانے والا بے ہودہ، بد اخلاق اور بے ادب افسانہ نگار کے طور پر پیش کر رہی ہے۔ ان تراشوں میں شعوری طور پر کوشش کی گئی ہے کہ حکومت وقت کو یہ احساس دلایا جائے کہ منٹو دراصل ایک باغی شخص ہے جو حکومت میں شامل فوجی عیسائی لڑکیوں کے کریکٹر کو نہ صرف اچھالتا ہے بلکہ ان کے حوصلوں کو پست کر کے جاری جنگ میں روڑے اٹکانے کا خواہش مند ہے۔ یہ بہت خطرناک اشارہ تھا جس پر اگر حکومت سنجیدگی سے غور کرتی تو سعادت حسن منٹو کسی بڑی مشکل میں بھی پھنس سکتے تھے۔ چناں چہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ جب ہر طرف سے منٹو کے متعلق خلاف تہذیب، خلاف معاشرہ، اخلاقیات سے عاری، فحش نگار، جنسی، بے ادب، بے ہودہ، ادب کثیف کا حامل افسانہ نگار کی آوازیں آنے لگیں تو چودھری محمد حسین نے بخوشی انگڑائی لی۔ وہ تو جیسے پہلے ہی انتظار میں تھے۔ چناں چہ منٹو کے مضمون ''ادب جدید'' اور افسانہ ''بو'' پر زیر دفعہ ۲۹۲ اور ۳۸ ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت مقدمہ دائر کر دیا گیا۔ دونوں تحریریں ادب لطیف کے سالنامہ ۱۹۴۴ء میں چھپی تھیں، جس کے ایڈیٹر احمد ندیم قاسمی تھے۔ جو اس تمام صورتحال پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اخبارات میں شائع ہونے والے ان مخاصمانہ تبصروں کا نتیجہ احمد ندیم قاسمی کی زبانی سنیے:

''لیجیے! خیام، عالمگیر، آئینہ بمبئی اور دیگر مہربانوں کے مدد سے ادب لطیف کا سالنامہ زیر دفعہ ۲۹۲ تعزیرات ہند اور ۳۸ ڈیفنس آف انڈیا رولز ۲۹ مارچ کی شام کو ضبط ہو گیا۔ پولیس نے چھاپہ مارا، سالنامے کے باقی ماندہ نمبر لے گئی۔ ابھی پروپرائٹر اور ایڈیٹروں کی گرفتاری عمل میں نہیں آئی لیکن افواہ ہے کہ ہم بہت جلد گرفتار کر لیے جائیں گے۔ یہ ضبطی آپ کے مضمون اور افسانے کی وجہ سے عمل میں آئی ہے۔'' [۳۴]

مقدمے کے قیام اور رسالے کی ضبطی کے حکومتی احسن اقدام کو سراہتے ہوئے ہفتہ وار خیام نے حکومت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا:

''ایک مقامی ماہنامہ نے سعادت حسن منٹو کا ایک فحش افسانہ ''بو'' شائع کیا تھا۔ ''خیام'' میں اس اخلاق سوز حرکت کے خلاف آواز اٹھائی گئی تھی جو حکومت پنجاب کے کانوں تک پہنچے بغیر نہ رہ سکی، چناں چہ معلوم ہوا ہے کہ جس پرچے میں ''بو'' شائع ہوا تھا وہ ضبط کر لیا گیا ہے۔ یہ ضبطی ۲۹۲/۳۸ دفعہ کے ماتحت عمل میں آئی۔ ہم اس فیصلے پر حکومت پنجاب کو مستحق تبریک سمجھتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ اس قسم کی فحاشی کو مستقل طور پر روکنے کے لیے کوئی موثر اقدام اٹھائے گی۔'' [۳۵]

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ افسانوں پر قائم مقدمات نے منٹو کو ذہنی، جسمانی اور مالی صعوبتوں سے دو چار کیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ مقدمات منٹو شناسی کے دو متضاد دھارے متعارف کراتے ہیں۔ اخبارات میں شائع ہونے والے تبصروں کے نتیجے میں قائم مقدمات کے تحت استغاثہ اور صفائی کے گواہان کے ساتھ ساتھ مختلف جج صاحبان کے ریمارکس اور فیصلے منٹو شناسی کے باب کی ایک اہم اولین صورت ہیں۔

یوں تو منٹو کے تین افسانوں، بو، کھول دو اور کالی شلوار پر بھی مقدمات ہو چکے تھے لیکن ''ٹھنڈا گوشت'' پر چلنے والا مقدمہ سب سے ہنگامہ خیز تھا۔ اس مقدمے نے منٹو جیسے شخص کو اعصابی طور پر نڈھال کر دیا۔ منٹو کا افسانہ 'ٹھنڈا گوشت' رسالہ جاوید کے خاص نمبر مارچ ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔ بقول منٹو! پریس برانچ کی باگیں کیوں کہ ابھی تک چودھری محمد حسین صاحب کے ہاتھ میں تھیں، اُنھوں نے ایک جھٹکا مارا اور ''جاوید'' کی ساری کاپیاں جہاں جہاں ملیں ضبط کر لی گئیں۔ معاملہ پریس ایڈوائزری بورڈ کے سامنے پیش ہوا جس کے کنوینئر کرنل فیض احمد فیضؔ ایڈیٹر پاکستان ٹائمز تھے۔ اس بورڈ نے حکومت کی طرف سے افسانے پر اٹھائے گئے اعتراضات کی روشنی میں اس کے فحش یا غیر فحش ہونے کا فیصلہ کرنا تھا۔ سعادت حسن منٹو کے بہت عزیز دوست، رسالہ ''جاوید'' کے مالک، نصیر انور بھی اس بورڈ کا حصہ تھے اور اجلاس میں شریک تھے۔ منٹو نے اپنے مضمون ''زحمت مہر درخشاں'' میں اس اجلاس میں افسانے ٹھنڈا گوشت کے متعلق کی جانے والی بحث کے متعلق نصیر انور کا ایک اقتباس تحریر کیا ہے، اگرچہ یہ خاصا طویل ہے لیکن منٹو کے فن کے متعلق دو مختلف نقطہ ہائے نظر کا عکاس ہے:

> ''پاکستان ٹائمز کے دفتر میں پریس ایڈوائزری بورڈ کی میٹنگ تھی۔ فیض احمد فیضؔ کنوینئر تھے۔ میٹنگ میں ایف ڈبلیو بسٹن (سول ملٹری گزٹ)، مولانا اختر علی (زمیندار)، حمید نظامی (نوائے وقت)، وقار انبالوی (سفینہ) اور امین الدین صحرائی (جدید نظام) شریک تھے۔ چودھری محمد حسین نے ''جاوید'' کا خاص نمبر پیش کیا۔ آپ نے سب سے پہلے پرچے کے باغیانہ اور اشتعال انگیز مضامین نظم و نثر گنوائے۔ ''غلامی سے آزادی تک''، ''رقص بسمل''، ''سیلاب چین'' یہ تھیں نظمیں۔ مضامین میں ''لورین سے فلیٹی تک''۔ ''کھیڑا بہادر کی جے'' اور ''چین کتنی دور ہے'' زیر بحث لائے گئے۔ فیض حکومت کے عائد کردہ الزام کی تردید کرتے رہے۔ دیگر اراکین نے ہاں میں ہاں ملائی اور یوں یہ سیاسی الزام ٹل گیا۔ لیکن نزلہ گرا ''ٹھنڈا گوشت'' پر۔ فیض نے جب اسے غیر فحش قرار دیا تو مولانا اختر علی گرج اٹھے، ''اب ایسا ادب پاکستان میں نہیں چلے گا''۔ جناب صحرائی نے اس پر صاد کیا، وقار صاحب نے افسانے کو ملعون، مطعون قرار دیا۔ حمید نظامی نے نوائے وقت کا ساتھ دیا اور جب ایف ڈبلیو بسٹن کو چودھری صاحب نے انگریزی میں ''ٹھنڈا گوشت'' سمجھایا تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ فرمانے لگے: ''اس کہانی کا تھیم یہ ہے کہ ہم مسلمان اتنے بے غیرت ہیں کہ سکھوں نے ہماری مردہ لڑکی تک نہیں چھوڑی۔۔۔'' مجھے ہنسی تو آگئی تھی، لیکن جب صاحب غلط ترجمانی پر مصر رہے تو مجھے افسوس ہوا۔۔۔ میں نے لاکھ سمجھایا، فیض صاحب نے بھی ہر طرح سے اطمینان دلایا لیکن فیصلہ یہ ہوا کہ اب عدالت ہی اس کا فیصلہ کرے۔'' [۳۶]

چناں چہ مقدمہ عدالت کے سپرد کر دیا گیا۔ کیوں کہ نہ ہی پاکستان میں ایسا ادب چل سکتا تھا اور نہ ہی ہم مسلمان اتنے بے غیرت ہیں۔ اگرچہ فیض صاحب اور خواجہ نصیر انور ٹھنڈا گوشت کو فحاشی کے الزام سے بچانے کی اپنی سی کوششیں ضرور کرتے رہے۔

'ٹھنڈا گوشت' سے پہلے بھی منٹو کے تین افسانے عدالت میں زیر سماعت رہ چکے تھے لیکن ان مقدمات میں پیش کیے گئے گواہانِ صفائی و استغاثہ کے افسانے کے حق یا مخالفت میں دیے گئے بیانات ریکارڈ میں محفوظ نہ رہ سکے، سوائے ''ٹھنڈا گوشت'' کے۔ ''ٹھنڈا گوشت'' کو مزید 'ٹھنڈا' کرنے کے لیے استغاثہ کی طرف سے مسٹر محمد یعقوب ولد میاں غلام قادر کپور آرٹ پریس لاہور، شیخ محمد طفیل حلیم، اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ڈی سی آفس، لاہور، سید ضیاء الدین احمد مترجم پریس برانچ حکومت پنجاب کے علاوہ چند دیگر حضرات بھی رسمی طور پر پیش ہوئے۔ سید ضیاء الدین احمد نے ''ٹھنڈا گوشت'' کی تعبیر تو فحش افسانے کے طور پر کی مگر مصنف کی نیت پر اُنھوں نے شبہ نہ کیا اور کہا کہ جہاں تک نیت کا تعلق ہے وہ ٹھیک ہے مگر نیت سے کیا ہوتا ہے۔ مصنف کا انداز اظہار اور استعمال الفاظ غلط ہے۔ سعادت حسن منٹو کے وکیل مشہور شاعر تصدق حسین خالد نے جب سید ضیاء الدین احمد سے استفسار کیا کہ ''کیا مصنف کو اپنے کردار کے منہ میں ایسے الفاظ نہیں ڈالنے چاہئیں جو اس کی صحیح شخصیت پیش کریں تو سید صاحب کے پاس اس کے علاوہ کوئی جواب نہیں تھا کہ ''جس قسم کا کردار ہو ویسے ہی الفاظ استعمال کرنے چاہئیں''اُنھوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ مصنف کا یہ کام ہے کہ وہ اچھے اور برے کردار تخلیق کرے۔ اس طرح ایک ماہر قانون دان نے استغاثہ کے گواہ کو صفائی کے گواہ میں تبدیل کر ڈالا۔

صفائی کے گواہوں کی فہرست یوں تو ملک بھر کے بتیس ممتاز ادیبوں کے ناموں پر مشتمل تھی مگر میاں سعید مجسٹریٹ درجہ اول نے خفا ہو کر کہا کہ ''میں اتنا ہجوم نہیں بُلا سکتا''۔ بڑی مشکلوں سے وہ چودہ گواہوں کو بلانے پر راضی ہوئے۔

منٹو کے افسانے ''ٹھنڈا گوشت'' کی حمایت میں سب سے پہلے گواہ اردو کے مشہور نقاد اور شاعر سید عابد علی عابد، پرنسپل دیال سنگھ کالج، لاہور تھے۔ اُنھوں نے منٹو کو اُردو کا ممتاز افسانہ نگار قرار دیتے ہوئے ان کے معتوب افسانے کو ایک ادب پارہ قرار دیا۔ عدالت کے ایک سوال کے جواب میں عابد علی عابد نے کہا کہ:

> ''ولی سے لے کر غالب تک سب وہ چیز جسے فحش کہا جاتا ہے لکھتے چلے آئے ہیں لٹریچر کبھی فحش نہیں ہوتا جو ایک بار لٹریچر قرار دیا جا چکا ہے۔''[۳۷]

استغاثہ کی طرف سے کیے گئے اس سوال کے جواب میں کہ ''کیا ادب مقصود بالذات ہے''؟ عابد علی عابد نے جواب دیا کہ ادب تنقید حیات ہے اور اس میں اس سوال کا جواب شامل ہے۔ ہر معقول انسان کے قول اور فعل کا مطلب ہوتا ہے لیکن تمام انسان معقول نہیں ہوتے۔ ہر قول یا فعل سوسائٹی کی نظروں میں اچھا یا برا ہو سکتا ہے۔ اچھے اور برے فعل جانچنے کے لیے بے شمار معیار ہوتے ہیں۔ سید عابد علی عابد نے منٹو کے اس افسانے کو ایک ادب پارہ قرار دیتے ہوئے فحاشی کے الزام کو یکسر مسترد کر دیا۔ اُنھوں نے دلیل دی کہ اس افسانے کو میرے سب بچوں اور بچیوں نے پڑھا ہے اور خاص آدمیوں سے جو کہ ادیب ہیں اس افسانے کے بارے میں میرا تبادلہ خیال ہوا ہے سب نے اس کو خوب سراہا ہے۔

عابد علی عابد کے بیان کے بعد صفائی کے دوسرے گواہ احمد سعید، پروفیسر، دیال سنگھ کالج، لاہور تھے۔ اُنھوں نے ٹھنڈا گوشت کو فحاشیت سے عاری ایک بہت بڑا جنسی مسئلہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ لفظ فحش کی کوئی بنیاد ہی نہیں۔ دوسرے الفاظ میں فحاشی ایک اضافی چیز ہے۔ اور یہ کہ ذہنی طور پر بیمار اشخاص پر ''ٹھنڈا گوشت'' پڑھنے سے برا اثر ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، سابق ڈائریکٹر آف ایجوکیشن کشمیر منٹو کی طرف سے پیش ہونے والے تیسرے گواہ تھے۔ اُنھوں نے افسانے کے مرکزی کردار اور موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ :

"انسانی نفسیات کے اندر جو خیر و شر ہے ادیب کا یہ کام ہے کہ وہ اس کو اس انداز سے پیش کرے کہ جس سے انسانی زندگی کے حقائق سمجھنے میں مدد مل سکے، برے کردار کو اس انداز سے پیش کرے کہ اس کی برائی دیکھ کر نفرت پیدا ہو۔" [۳۸]

یہی وجہ ہے کہ ایشر سنگھ کے کردار سے جنسی رغبت کی بجائے شدید نفرت اور کراہت پیدا ہوتی ہے اور یہ کردار مصنف نے بالکل درست انداز میں پیش کیا ہے۔ ایسے کرداروں پر خاص کیفیتوں کے ماتحت جسمانی حالت درست ہونے کے باوجود نفسیاتی نامردی طاری ہو سکتی ہے۔

اس افسانے پر قائم مقدمے کے ایک گواہ ڈاکٹر سعید اللہ کے دیے گئے بیان کی تفصیل سعادت حسن منٹو نے کچھ یوں پیش کی ہے:

"ٹھنڈا گوشت، پڑھنے کے بعد میں خود ٹھنڈا گوشت بن گیا۔ پژمردگی اور افسردگی۔ یہ تھا اس کا اثر۔ یہ افسانہ شہوانی ہیجان ہرگز پیدا نہیں کرتا، ایشر سنگھ کا کردار، پیش کرنے کے لیے مصنف نے دو تین دفعہ گالی استعمال کی ہے مگر شاید فنکار نے اسے ضروری سمجھا ہو، مگر گالی کی شکل اس نے اس طرح بدلی کہ گالی معلوم نہیں ہوتی۔" [۳۹]

اُنھوں نے بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ :

"اگر وہ گالی جو ایشر سنگھ نے استعمال کی ہے گالی بھی رہتی تو بھی میرے نزدیک افسانہ فحش نہ ہوتا۔ گالی فحش بھی ہو سکتی ہے اور فحش نہیں بھی ہو سکتی۔ اگر فن کار صحیح فنکار ہے تو وہ گالی کو بغیر ضرورت کبھی استعمال نہیں کرتا۔ اس افسانے میں گالی کا استعمال فنکارانہ ہے۔" [۴۰]

مقدمے کے پراسیکیوٹر محمد اقبال نے طنز کرتے ہوئے ڈاکٹر سعید اللہ صاحب سے سوال کیا کہ نفسِ مضمون کے لحاظ سے مختلف ادیبوں کو مختلف القابات دیے گئے ہیں۔ مثلاً راشد الخیری کو مصورِ غم، علامہ اقبال کو مصورِ حقیقت اور خواجہ حسن نظامی کو مصورِ فطرت کہا جاتا ہے اُنھوں نے اپنی بات مکمل نہیں کی تھی کہ سعید اللہ صاحب نے بات سمجھ کر کاٹ دی اور کہا کہ :

"میں ٹھنڈا گوشت کے مصنف کو مصورِ حیات کا لقب دوں گا۔" [۴۱]

کرنل فیض احمد فیض ایڈیٹر پاکستان ٹائمز نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے عدالت کو بیان دیا کہ :

"میری رائے میں افسانہ فحش نہیں ہے۔ ایک افسانے کے الگ الگ الفاظ کو فحش یا غیر فحش کہنے کے کوئی معنی نہیں۔ افسانے پر تنقید کرتے وقت مجموعی طور پر تمام افسانہ زیر نظر ہوگا اور ہونا چاہیے۔ محض عریانی کسی چیز کے فحش ہونے کی دلیل نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس افسانے کے مصنف نے فحش نگاری نہیں کی لیکن ادب کے اعلیٰ تقاضوں کو بھی پورا نہیں کیا۔ کیوں کہ اس میں زندگی کے بنیادی مسائل کا تسلی بخش تجزیہ نہیں ہے۔" [۴۲]

جرح کے جواب میں فیض احمد فیض نے کہا کہ اگر موضوع تقاضا کرے تو اس قسم کے الفاظ مثلاً ''میری بھپیاں لے رہے تھے''، منہ بھر بھر کے بوسے لیے'' اور ''چوس چوس کر اس کا سارا سینہ تھوکوں سے لتھیڑ دیا'' استعمال کرنے کو وہ جائز سمجھتے ہیں۔ اگر چہ کہ یہ الفاظ پارلیمنٹری نہیں لیکن ادبی اعتبار سے جائز ہیں۔

منٹو کی طرف سے مقدمے کے اگلے نامور گواہ صوفی غلام مصطفی تبسم، پروفیسر، گورنمنٹ کالج، لاہور نے بھی افسانے کو جنسی لحاظ سے اخلاق باختہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا:

''انسانی جنسیات کو ادب کا موضوع بنا کر ہمارے لٹریچر کا رجحان ایک صحیح سمت کی طرف جا رہا ہے۔''[۴۳]

اُنھوں نے استغاثہ کی جرح کے جواب میں کہا کہ کسی تحریر، افسانے یا ادب پارے کے نتائج مخرب الاخلاق ہوں مگر مصنف کا مقصد نیک ہو تو بھی وہ اس کو فحش نہیں سمجھتے۔ اگر کسی کے اخلاق پر اس کا برا اثر پڑتا ہے تو بھی مصنف بری الذمہ ہے۔ مخرب الاخلاق تحریر کی وضاحت کرتے ہوئے صوفی غلام مصطفی تبسم نے بہت پتے کی بات کی، اُنھوں نے کہا کہ مخرب الاخلاق ایسی تحریر کو کہتے ہیں جس سے لکھنے والے کا مقصد تخریب اخلاق ہو۔

ڈاکٹر آئی لطیف، ہیڈ آف دی سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ، ایف سی کالج، لاہور نے ''ٹھنڈا گوشت'' کی فکری اور معنوی تشریح کچھ اس انداز سے کی:

''میں نے ٹھنڈا گوشت ابھی ابھی پڑھا ہے۔ یہ ایک غلط رسالے میں چھپا ہے۔ میرا مطلب ہے یہ افسانہ ایک پاپولر رسالے میں نہیں چھپنا چاہیے تھا۔ اگر یہ کسی سائنٹیفک رسالے میں کیس ہسٹری کے طور پر مردی اور نامردی کی تائید یا تردید میں چھپتا تو اس پر فحاشی کا الزام عائد نہیں ہو سکتا تھا۔''[۴۴]

جرح کے جواب میں ڈاکٹر آئی لطیف نے اپنی بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ یہ افسانہ ایسے رسالے میں، جس کو ہر بچہ، بوڑھا، لڑکا، لڑکی پڑھ سکے نہیں چھپنا چاہیے تھا، کیوں کہ ''نازک طبع'' رکھنے والے لوگوں کے جذبات مشتعل ہوتے دیر نہیں لگتی۔ چناں چہ ایسے قارئین کے جذبات بھڑکنے کا خدشہ زیادہ ہے۔ مذکورہ بالا احباب ٹھنڈا گوشت پر چلنے والے مقدمہ کے سلسلے میں سعادت حسن منٹو کی درخواست پر بطور گواہان صفائی پیش ہوئے تھے۔ اُنھوں نے اپنے نام اور مرتبے کے عین مطابق ایک اہم ادبی مسئلے پر اپنی غیر جانبدارانہ اور بصیرت افروز آرا پیش کیں۔ اور منٹو کے افسانہ ''ٹھنڈا گوشت'' کے تناظر میں ادب اور فحاشی کے فرق کو واضح کیا۔

اگلے گواہ شمس العلماء مولانا احسان اللہ خان تاجور نجیب آبادی، پروفیسر دیال سنگھ کالج، لاہور، آغا شورش کاشمیری، ایڈیٹر چٹان، لاہور ابو سعید بزمی، ایڈیٹر احسان، اور ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر، پرنسپل اسلامیہ کالج، لاہور، منٹو کی بجائے عدالت کی درخواست پر بطور گواہ شامل مقدمہ ہوئے۔ سوائے تاثیر صاحب کے دیگر تمام افراد نے افسانے کے معاملے میں حکومتی نقطۂ نظر کی تائید کی۔

اس پیشی پر جس میں یہ چاروں گواہ پیش ہوئے، وکیل کی غیر حاضری کی وجہ سے سعادت حسن منٹو یہ کیس بطور وکیل خود لڑ رہے تھے۔ بحث کے دوران منٹو نے تاجور نجیب آبادی سے یہ بات تسلیم کرائی کہ منٹو سے پہلے بھی ہمارے کلاسیکی ادب میں عموماً اور مثنوی گلزار نسیم، بکاؤلی اور تاج الملوک کی شادی کا تذکرہ، فسانہ عجائب، مثنوی بہار عشق، مثنوی فریب عشق وغیرہ میں خصوصاً فحش حصے

موجود ہیں۔ یہاں تک کہ مثنوی مولانا روم میں موجود حکایت خانم اور کنیز پر بھی یہ اعتراضات اٹھائے جا سکتے ہیں۔ آغا شورش کاشمیری، ایڈیٹر ہفت روزہ ''چٹان'' نے مونچھوں کے اندر مسکراتے ہوئے عدالت کے روبرو بیان دیا:

> ''جہاں تک میرے علم واحساس کا تعلق ہے میں نے ''ٹھنڈا گوشت'' سے اچھے تاثرات فراہم نہیں کیے۔ جس سماج اور گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں اس کے پیش نظر میں ایسا مضمون اپنے پرچے میں شامل نہیں کروں گا۔ میرا مدرسہ فکر اسے گوارا نہیں کرتا۔''[۴۵]

گویا کسی ادب پارے کو اس کی ادبی حیثیت سے پرکھنے کی بجائے وہ اپنے مدرسۂ فکر کی روشنی میں پرکھ رہے تھے۔

ابو سعید بزمی جن پر اسی جج کی عدالت میں جو منٹو کا مقدمہ سن رہا تھا، ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ چل رہا تھا۔ آپ نے بھی منٹو کے افسانے کو مخرب الاخلاق اور معنی و مطالب کے لحاظ سے قابلِ اعتراض قرار دیا۔

عدالت کی طرف سے آخری گواہ محمد دین تاثیر صاحب نے کہانی کو ادبی لحاظ سے ناقص قرار دینے کے باوجود اسے ادبی کہانی قرار دیا۔ اُنھوں نے کہانی میں موجود بعض الفاظ کو غیر ضروری اور ناشائستہ بھی کہا۔ لیکن اُنھیں فحش قرار دینے سے احتراز کر گئے۔ وہ چوں کہ عدالت کے اسرار پر گواہی دینے آئے تھے۔ اور عدالت کی طرف سے پیش کیے گئے باقی تینوں گواہان نے ٹھنڈا گوشت کو فحش اور مخرب الاخلاق کہا، اس لیے ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر سے بھی یہی توقع کی جا رہی تھی مگر اُنھوں نے ایک جملے میں اپنی تنقیدی فہم و فراست اور ادب دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا:

> ''میرے خیال میں جن لوگوں کا میلان بدکاری کی طرف ہے ان کے لیے اس مضمون میں جنسی کراہت ہوگی، جنسی ترغیب نہیں ہوگی۔ ''ٹھنڈا گوشت'' کا مطلب مردہ لڑکی ہے میں اس کہانی کو عام جنسی کہانی سمجھتا ہوں یہ جنسی اخلاق خراب نہیں کرتی۔''[۴۶]

عدالت کے چار اور صفائی کے سات گواہوں کے علاوہ استغاثہ کے پانچ گواہوں نے بھی رسمی طور پر ''ٹھنڈا گوشت'' کو فحش قرار دیا، ان کے نام درج ذیل ہیں:

مسٹر محمد یعقوب منیجر کپور آرٹ پریس لاہور، شیخ محمد طفیل حلیم، اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ڈی سی آفس لاہور، سید ضیاء الدین احمد، مترجم پریس برانچ حکومت پنجاب، مرزا محمد اسلم اور خدا بخش۔

اس طرح مجموعی طور پر استغاثہ، عدالت اور صفائی کے سولہ گواہان نے اپنی اپنی فہم و فراست کے مطابق منٹو کے فن کے ایک گوشے کی جزوی طور پر تفہیم کر کے منٹو شناسی کے باب میں اپنا اپنا حصہ شامل کیا۔ ان گواہوں کے بیانات کی روشنی میں منٹو کے فن کے متعلق شروع سے ہی دو مختلف مکتبہ ہائے فکر دکھائی دیتے ہیں۔

ادیبوں کا نسبتاً زیادہ معروف حلقہ سعادت حسن منٹو سے نظریاتی اور شخصی اختلافات کے باوجود اپنا صحیح ادبی فریضہ ادا کرتے ہوئے اسے فحاشی سے پاک ایک بڑا افسانہ نگار قرار دیتا دکھائی دے رہا ہے جب کہ چودھری محمد حسین کی قیادت میں حکومتی اور نسبتاً کم درجے کے ادیب اسے مخرب الاخلاق قرار دیتے رہے۔ مذکورہ بالا تمام اہل قلم شخصیات نے منٹو کے زیر مقدمہ افسانے ''ٹھنڈا گوشت'' کے پس منظر میں منٹو کی جنس اور فحش نگاری کا دفاع یا مخالفت کی۔ ''ٹھنڈا گوشت'' سے پہلے منٹو کے تین افسانوں کالی شلوار،

بو، اور دھواں بھی اسی قسم کے الزامات کا سامنا کر چکے تھے اور ان مقدمات کے سلسلہ میں بھی گواہانِ صفائی اور استغاثہ ان افسانوں کی فنی و موضوعاتی خوبیوں اور خامیوں پر اپنی اپنی آرا پیش کر چکے ہیں۔ لیکن افسوس کہ ان افسانوں پر چلنے والے مقدمات کا کوئی ریکارڈ منظر عام پر نہ آ سکا۔ منٹو کا افسانہ ''بو'' جو ادب لطیف کے سالنامہ ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا تھا پر چلنے والے مقدمہ کے تحریری فیصلہ میں اس وقت کے ایڈیشنل سیشن جج چودھری مہدی علی خان نے اپیل کرنے والے ملزمان کو بری کرتے ہوئے لکھا:

> ''قابل غور امر ہے کہ ایسے اشخاص ملزمان کی صفائی میں پیش ہوئے ہیں جو اُردو زبان کے عالم ہونے کی حیثیت میں کافی مشہور ہیں۔ مثال کے طور پر خان بہادر عبدالرحمن چغتائی، مسٹر کے ایل کپور، پروفیسر ڈی اے وی کالج، لاہور، راجندر سنگھ بیدی، ڈاکٹر آئی آئی لطیف، پروفیسر ایف سی کالج لاہور بطور گواہان صفائی پیش ہوئے۔''[۴۷]

گواہوں کے دیے گئے بیانات کا خلاصہ لکھتے ہوئے فاضل جج نے مزید لکھا:

> ''ان سب کی رائے ہے کہ مضمون ''بو'' میں کوئی چیز نہیں جو شہوانی حسیات پیدا کرے بلکہ ان لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ مضمون ترقی پسند ہے اور اردو ادب کے ماڈرن رجحان سے تعلق رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ استغاثہ کے گواہ نمبر ۴ بشیر نے بھی دوران جرح میں تسلیم کیا کہ مضمون انسان کے اخلاق پر برا اثر نہیں ڈالتا۔''[۴۸]

افسوس کہ منٹو کے محققین عبدالرحمن چغتائی، کنہیا لال کپور، راجندر سنگھ بیدی اور ڈاکٹر آئی آئی لطیف، باری علیگ اور دیوندر ستیارتھی و دیگر کے عدالت میں دیے گئے ان بیانات کو ابھی تک سامنے لانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ منٹو شناسی کے یہ اولین نقوش یقیناً اپنی جگہ بہت اہم ہیں کیوں کہ ان کی مدد سے اردو ادب میں فحش اور غیر فحش ادب کے مباحث نے جنم لیا اور اپنے زمانے کے نامور اہل علم و ادب نے اس بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

منٹو شناسی کا ایک اور پہلو بھی ان افسانوں سے جڑا ہوا ہے جن پر وقتاً فوقتاً مقدمات چلائے گئے۔ مجموعی طور پر منٹو کی سات تحریریں حکومتی عتاب کا شکار ہوئیں۔ کالی شلوار، دھواں، بو، ٹھنڈا گوشت، کھول دو، اوپر نیچے اور درمیان اور ایک مضمون ادب جدید پر مختلف عدالتوں میں مقدمے چلے، ان مقدمات میں جہاں صفائی اور استغاثہ کے گواہان نے اپنی اپنی آرا پیش کیں وہیں مختلف جج صاحبان نے ان دلائل و آرا کو سننے اور ملکی اور غیر ملکی قوانین فحش نگاری کے تناظر میں اپنے تئیں ان تحریروں کے فحش یا غیر فحش ہونے پر مہر تصدیق مع دستخط ثبت کر دی۔ استغاثہ اور صفائی کے گواہان کی طرح جج صاحبان بھی ہمیں واضح طور پر دو مختلف دھڑوں میں بٹے دکھائی دیتے ہیں۔

ججز کا ایک حلقہ منٹو کو ننگ ادب اور مستحق سزا گردانتے ہوئے میاں اے ایم سعید، مجسٹریٹ درجہ اول، لاہور کی طرح سخت حکم نامہ جاری کرتا دکھائی دیتا ہے تو دوسرا حلقہ مہدی علی صدیقی کی طرح نسبتاً نرم اور ہمدردانہ نقطۂ نظر کا حامل دکھائی دیتا ہے۔ ان جج صاحبان نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے منٹو کو بطور ادیب یا فحش نگار نہ صرف سمجھنے کی کوشش کی بلکہ دلائل کی روشنی میں اپنے موقف یا فیصلے کو سمجھانے کی بھی سعی کی۔ منٹو شناسی کا یہ گوشہ اپنی جگہ خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ ان معزز جج صاحبان کے متنازعہ افسانوں پر دیے گئے فیصلہ جات کی روشنی میں منٹو شناسی کے اس رخ کا جائزہ از حد ضروری ہے۔

ادب لطیف کے سالنامہ ۱۹۴۴ء میں شامل سعادت حسن منٹو کی دو تحریریں افسانہ ''بو'' اور مضمون ''ادب جدید'' کو فحاشی اور بغاوت کے الزامات کا سامنا سب سے پہلے مسٹر بنواری لال کی عدالت میں کرنا پڑا۔ تاہم مقدمے کا فیصلہ کرنے سے پہلے ہی ان کا تبادلہ ہو گیا۔ لیکن وہ جاتے جاتے سعادت حسن منٹو کو بری کر گئے۔ ان کے بعد مقدمے کی سماعت چودھری مہدی علی خان نے کی۔ مقدمے کا فیصلہ سنائے ہوئے اُنھوں نے صرف اتنا کہا: ''سعادت حسن منٹو بری ہے، اس لیے کہ مسٹر بنواری لال اسے پہلے ہی بری کر چکے ہیں'' منٹو کے ساتھ احمد ندیم قاسمی بھی بری کر دیے گئے۔ لیکن چودھری برکت علی اور چودھری نذیر احمد کو ۶۰ روپے فی کس جرمانہ ہوا۔ جس کے خلاف مسٹر ایم آر بھاٹیہ ایڈیشنل جج کی عدالت میں اپیل دائر کی گئی۔

۲۴ نومبر ۱۹۴۵ء کو مسٹر ایم آر بھاٹیہ نے مقدمے کا فیصلہ جاری کرتے ہوئے منٹو کے افسانے ''بو'' پر لگنے والے فحاشی اور بغاوت کے الزام کو یکسر مسترد کر دیا۔ ماتحت عدالت کے جج چودھری مہدی علی خان دراصل منٹو کو ہی اصل مجرم سمجھتے تھے۔ چوں کہ مسٹر بنواری لال اُنھیں بری کر چکے تھے اس لیے وہ منٹو کو اپنی گرفت میں نہ لا سکے۔ مسٹر ایم آر بھاٹیہ نے ماتحت عدالت کے فیصلے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ :

> ''ماتحت عدالت نے اپنے فیصلے میں یہ ریمارک کیا ہے کہ مضمون ''بو'' کا مصنف سوسائٹی کی نظروں میں سخت سزا کا مستحق تھا اور یہ کہ وہی صحیح آدمی تھا جسے قانونی گرفت میں لینا چاہیے تھا۔''[۵۰]

صفائی کے گواہوں کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر ایم آر بھاٹیہ نے لکھا کہ یہ بات قابل غور ہے کہ مصنف کے افسانہ کا دفاع کرنے کے لیے ایسے لوگ پیش ہوئے ہیں جو اردو زبان کے عالم ہونے کی حیثیت سے کافی مشہور ہیں اور ان کا موقف ہے کہ مضمون ترقی پسند ہے اور شہوانی حسیات بیدار کر کے انسان کو مخرب الاخلاق قطعاً نہیں بناتا۔ ماتحت عدالت کے فیصلے پر اپنے تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :

> ''معلوم ہوتا ہے کہ ماتحت عدالت کے خیالات ترقی پسند نہیں۔ ہمیں زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا ہے۔ حسین چیز ایک دائمی مسرت ہے۔ آرٹ جہاں کہیں بھی ملے ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔ آرٹ خواہ تصویر کی صورت میں ہو یا مجسمے کی شکل میں، سوسائٹی کے لیے قطعی طور پر ایک پیش کش ہے، چاہے اس کا موضوع غیر مستور ہی کیوں نہ ہو۔ یہی کلیہ تحریروں پر بھی منطبق ہوتا ہے۔''[۵۱]

چناں چہ اپیل منظور کرتے ہوئے اُنھوں نے ملزمان کو بری کر دیا۔

منٹو کے افسانوں دھواں اور کالی شلوار پر چلنے والے مقدمات کی اتنی ہی تفصیل سامنے آئی ہے جتنی خود سعادت حسن منٹو نے اپنے مختلف مضامین میں لکھی۔ ان مقدمات کے سلسلے میں پیش کیے گئے گواہان استغاثہ و صفائی کے علاوہ معزز جج صاحبان کے فیصلہ جات بھی گوشہ گمنامی میں پڑے ہیں۔ منٹو کی زبانی اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ جسٹس دین محمد اور رائے صاحب لالہ سنت رام نے پہلے ہی سے طے کر رکھا تھا کہ مصنف و دیگر ملزمان کو سزا دینی ہے۔ منٹو نے اپنے مضمون ''لذت سنگ'' میں جسٹس دین محمد کا سماعت کے دوران کہا گیا ایک جملہ یوں درج کیا ہے :

"جسٹس دین محمد صاحب نے قہر آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بڑ بڑائے "ان لوگوں کا وجود ننگ ادب ہے۔" [۵۲]

منٹو کے افسانوں پر چلنے والے مقدمات میں سب سے معرکتہ الآرا مقدمہ "ٹھنڈا گوشت" کے خلاف چلا۔ ٹرائل کورٹ میں دی گئی سزا کو ملزمان نے سیشن کورٹ میں چیلنج کیا۔ سیشن کورٹ نے اپیل منظور کرتے ہوئے ملزمان کو بری کر دیا سیشن کورٹ کے فیصلے کو اس بار استغاثہ نے ہائی کورٹ میں چیلنج کر کے ملزمان کو ایک بار پھر مجرمان میں تبدیل کرا دیا۔ سپریم کورٹ میں جانے کی استطاعت منٹو کے پاس نہ تھی لہٰذا تمام ملزمان تین سو روپے فی کس جرمانہ کے سزاوار ٹھہرائے گئے۔

تین مختلف عدالتوں میں تین مختلف ججوں کے تین مختلف فیصلے ایک فنکار کے فن کی تفہیم کے متعلق دو مختلف رویوں کو تو واضح کرتے ہی ہیں ساتھ ہی ہمارے عدالتی نظام اور جج صاحبان کی اپروچ پر بھی انگلی اٹھاتے ہیں۔ ان جج صاحبان کے فیصلہ جات پر تبصرہ کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ ان کے دیے گئے فیصلہ جات کا جائزہ لے لیا جائے۔

"ٹھنڈا گوشت" پر سب سے پہلے مقدمہ میاں اے ایم سعید مجسٹریٹ درجہ اول، لاہور کی عدالت میں چلا۔ استغاثہ اور صفائی کے گواہان کے بیانات کا خلاصہ پیش کرنے کے بعد اُنھوں نے اپنی اور قانونی رائے میں افسانے کو فحش قرار دیتے ہوئے لکھا:

> "میں نے نہایت غور سے اس کہانی کو پڑھا جو موضوع کی تشکیل کرتی ہے اور دیکھا کہ اس میں گندا طرز بیان اور ناشائستہ گالیاں استعمال کی گئی ہیں۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کہانی میں کئی شہوت پرستانہ مقامات پیش کیے گئے ہیں اور جنسی اشارات کا اکثر ذکر کیا گیا ہے۔" [۵۳]

میاں اے۔ ایم سعید نے کہانی کو فحش یا غیر فحش ثابت کرنے کے لیے عالمی معیار کی بجائے خود ساختہ معیار اپنایا اور دلیل یہ دی کہ ہر معاشرے کے اپنے اپنے معیارات زندگی ہوا کرتے ہیں۔ ان کے بقول پاکستان کے مروجہ اخلاقی معیار قرآن پاک کی تعلیم کے حوالے سے بہت صحیح طور پر معلوم ہو سکتے ہیں نہ کہ سعادت حسن منٹو اور ان کے پیش کیے گئے گواہوں کی زبانی۔ اگر ادبی مذاق کے اس معیار کو تسلیم کر لیا جائے جسے صفائی کے گواہوں نے بیان کیا ہے تو زندگی کے پہلوؤں کا حقیقت نگارانہ اظہار اچھا ادب ہو سکتا ہے لیکن پھر بھی یہ ہمارے معاشرے کے اخلاقی معیار کی خلاف ورزی کرے گا۔ معزز جج کے اس فیصلے سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

> "ملزم سعادت حسن منٹو کی لکھی ہوئی کہانی ایک سوقیانہ آدمی کے کردار کو پیش کرتی ہے جو اپنی معشوقہ سے، جسے بہت شہوت پرست دکھایا گیا ہے، وحشیانہ اور سوقیانہ انداز سے جنسی فعل کا طالب ہوتا ہے۔ جنسی تضمین کے ساتھ غیر شائستہ گالیوں کا استعمال عام کیا گیا ہے۔ جنسی نوع کے افعال کے سلسلے میں نسوانی جسم کے بعض پوشیدہ اعضاء کا ذکر نہایت بد تہذیبی سے کیا گیا ہے۔ ساری کہانی ایک ناشائستہ جنسی معاملے پر مرکوز ہے۔ در حقیقت جنسی بد تہذیبی ہی اس کہانی کا بنیادی تصور ہے۔" [۵۴]

اُنھوں نے اسے غیر شائستگی کو تقویت بہم پہنچانے اور قارئین کے اخلاق بگاڑنے کی حامل کہانی ٹھہراتے ہوئے سعادت حسن منٹو کو فحش نگاری کے الزام میں زیر دفعہ ۲۹۲ پی پی سی تین ماہ قید بامشقت اور تین سو روپے جرمانے کی "نرم" سزا سنا دی۔ کیوں کہ جج صاحب کے مزاج سے بعید نہیں تھا کہ وہ ۳۰سو کوڑے بھی ملزم کو لگوا دیتے۔ میاں اے۔ ایم سعید نے منٹو کے اس افسانے کو ادبی معیار

سے جانچنے کی بجائے مذہب اور مذہبی کتاب کو اپنا معیار بنایا۔ جب آپ قرآن اور اسلام کے پیمانوں پر ادب کو پرکھیں گے تو پھر تمام کا تمام ادبی سرمایہ تلف کرنا پڑے گا۔

میاں اے ایم سعید کے فیصلہ کے خلاف اپیل ایڈیشنل سیشن جج لاہور میاں عنایت اللہ خان کی عدالت میں دائر کی گئی۔ میاں عنایت اللہ خان نے مقدمے کا فیصلہ ماتحت عدالت کے بالکل برعکس سنایا اور ان تمام اعتراضات کو یکسر رد کر دیا جس کی بنیاد پر ماتحت عدالت کے معزز جج اے ایم سعید نے ملزمان کو سزا تجویز کی تھی۔ میاں عنایت اللہ خان نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ یہ معاملہ ماہرین کی آرا سے ہر گز طے نہیں کیا جا سکتا۔ جب کہ گواہوں کی ایک جماعت اسے فحش قرار دینے پر مصر ہو اور دوسری جماعت اسے ادبی شہ پارہ سمجھتی ہو، جس میں کوئی غیر اخلاقی چیز نہیں۔ اُنھوں نے ماتحت عدالت کی اس بات کو تسلیم کیا کہ فحاشی کی اصطلاح اس ماحول کے ساتھ متعلق ہے جس میں اس کے متعلق فیصلہ کیا جاتا ہے اور مزید یہ کہ مختلف قوموں اور سوسائیٹیوں کے معیار مختلف ہو سکتے ہیں لیکن اس سے اگلی بات کو وہ اے ایم۔ سعید کی غلطی تصور کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس نے غلطی وہاں کی جب اس نے یہ سمجھا کہ پاکستان کے مروجہ اخلاقی معیار قرآن پاک کی تعلیم کے سوا اور کہیں سے زیادہ صحیح طریقے پر معلوم نہیں ہو سکتے۔ پھر وہ یہ کہتا ہے کہ اس کے مطابق غیر شائستگی اور شہوت پرستی شیطان کی طرف سے ہے۔''[۵۵]

میاں عنایت اللہ کے مطابق یہ ہمارا آدرش تو ہو سکتا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے سماج کی حقیقی صورت کیا ہے؟ اپیل کرنے والوں کو اسی حقیقت کے تناظر میں جانچنا چاہیے جس طرح کہ ہماری سوسائٹی ہے نہ کہ اس طرح جیسا کہ اسے ہونا چاہیے۔ زیر نظر مضمون سے کہیں زیادہ قابل اعتراض تحریریں آج بھی مارکیٹ میں سر عام فروخت ہو رہی ہیں۔ سینماؤں میں تماشوں کی نمائش پر کوئی پابندی نہیں۔ پھر کیوں ایسی تحریر جو کم قابل اعتراض ہے، پر تو پابندی لگا دیں اور دیگر کو کھلی چھوٹ دے دیں۔ اپنے فیصلے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''چوما چاٹی اور بغل گیری ایک ایسی چیز ہے جو ہر روز سینماؤں میں پیش کی جاتی ہے۔ بدکاری وہ عام اور بنیادی زمین ہے جس پر ''سچی کہانیاں'' اور دائمی مثلثیں استوار کی جاتی ہیں۔ در حقیقت یہی تمام انگریزی اور مغربی ناولوں کا بنیادی پلاٹ ہے۔ اگر ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا تو مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم کیوں ان نوجوانوں پر سختی کریں۔''[۵۶]

چناں چہ میاں عنایت اللہ خان نے تینوں ملزموں کو باعزت بری کرتے ہوئے جرمانہ واپس کرنے کا حکم دے دیا۔ ایڈیشنل سیشن جج کے اس فیصلے کے خلاف حکومت نے ہائی کورٹ میں اپیل کر دی۔ محمد منیر چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ نے مقدمے کی سماعت کے بعد اس کا تفصیلی فیصلہ جاری کیا۔ بقول انیس ناگی، وہ ہائی کورٹ کے اس فیصلے کی نقل پہلی مرتبہ اپنی کتاب ''سعادت حسن منٹو کے مقدمات'' میں سامنے لائے۔[۵۷]

انیس ناگی نے 'ٹھنڈا گوشت' کے متعلق شائع ہونے والی ججمنٹ کو سب سے پہلے شائع کرنے کا دعویٰ غلط کیا ہے ان کی کتاب 'سعادت حسن منٹو کے مقدمات' ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی۔ یہ ججمنٹ اسی کتاب کا حصہ بنائی گئی ہے۔ ہائی کورٹ کی یہ ججمنٹ 'دستاویز'

مرتب نواز چودھری، میں اس سے پہلے اشاعت پذیر ہو چکی ہے۔ پاکستان میں مکتبہ شعر و ادب، لاہور نے اِسے بغیر سن اشاعت کے شائع کیا۔

جسٹس محمد منیر نے فیصلے میں کہانی کا خلاصہ، استغاثہ کے گواہوں کے اعتراضات کا جائزہ لیا۔ اپنے فیصلے میں اُنھوں نے گواہان استغاثہ کے ان اعتراضات کو درج کیا جس میں اُنھوں نے افسانے میں موجود فحش الفاظ، جنسی استعارے، جذبات، کو برانگیختہ کرنے والی منظر نگاری، پتہ پھینکنے اور پھینٹنے کی اصطلاحوں کی وجہ سے اسے مخرب الاخلاق قرار دیا تھا۔ حیرت ہے کہ معزز جج صاحب نے صفائی کے گواہان کے ناموں کا تذکرہ محض کر کے ان کے افسانے کے حق میں دیے گئے دلائل سے صرف نظر و قلم کیا اور محض حیرت کا اظہار کیا کہ اس کہانی کے فحش ہونے کے متعلق ادیب دو گروہوں یا جماعتوں میں کیوں کر تقسیم ہیں۔ اُنھوں نے قانونی نقطۂ نظر سے افسانے کو فحش اور جنسی ہیجان کو بیدار کرنے کا ذریعہ بتاتے ہوئے مصنف کی منشا اور نیت کو اہمیت دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ لکھتے ہیں:

> ''یہ بات غیر اہم ہے کہ کہانی کے مصنف کی کیا غایت تھی۔ ایسے مقدمات میں ارادے کی بجائے رجحان زیادہ اہم ہوتا ہے۔'' [۵۸]

جسٹس محمد منیر نے افسانے کے اس حصے کو جس میں جنسی تفاصیل بیان کی گئی ہیں بیحد فحش قرار دیتے ہوئے لکھا کہ بیشک یہ دونوں جنسوں کے نوجوان بلکہ ان سے زیادہ عمر کے لوگوں میں بھی فحاشی اور شہوت کو ابھارے گا۔ قابل مواخذہ مواد میں ان ذہنوں کو بداخلاقی کی طرف مائل کرنے کا رجحان موجود ہے جو برے اثرات کو قبول کرنے کے لیے آمادہ رہتے ہیں جب ایسے لوگوں کے ہاتھ یہ تحریر لگ جائے گی تو اس وقت اس کی اشاعت کا مقصد اسے فحش ہونے سے نہیں روک سکتا۔ انیس ناگی نے اپنی کتاب ''سعادت حسن منٹو کے مقدمات''، میں پنجاب ہائی کورٹ بنچ کے اس فیصلے کو جو جسٹس محمد منیر اور جسٹس جان پر مشتمل تھا، مسترد کرتے ہوئے لکھا:

> ''پنجاب ہائی کورٹ کے بنچ کا فیصلہ عامیانہ ہے جس میں عدالت کا فیصلہ سخت اور جانبدارانہ لگتا ہے۔ ''ٹھنڈا گوشت'' کو فحش ثابت کرنے کے لیے اس فیصلے میں جو مثال دی گئی ہے وہ بذات خود فحاشی کے زمرے میں آتی ہے کہ ایک ننگی عورت مال روڈ پر اپنے جسم پر نقش و نگار بنا کر ٹہل رہی ہے، وغیرہ وغیرہ۔'' [۵۹]

انھی مقدمات سے جڑا ہوا منٹو شناسی کا سب سے روشن باب سعادت حسن منٹو کے وہ بیانات ہیں جو اُنھوں نے بطور مصنف عدالتوں میں جمع کرائے۔ اپنے ان تحریری بیانات میں (جو تا حال دستیاب ہیں) منٹو نے بہت وضاحت کے ساتھ ان افسانوں اور اپنے فن کی غرض و غایت کا تجزیہ کیا۔ ان بیانات کے علاوہ سعادت حسن منٹو کے ایسے مضامین جن میں ان مقدمات کی تفصیلات اور اپنا فنی نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے خاصے کی چیز ہیں۔ گنتی کے دو چار مضامین اور جمع کرائے گئے ان بیانات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اپنے عہد میں منٹو کی حقیقی معنی میں تفہیم و تعبیر اگر کسی نے کی ہے تو وہ خود سعادت حسن منٹو کی ذات ہے۔ زیادہ تر مضامین منٹو کی کتاب لذت سنگ میں شامل ہیں۔ منٹو نے ان مضامین میں اپنے فنی و فکری نقطۂ نظر کو بھرپور طریقے سے بیان کیا۔ ان مضامین میں اٹھائے گئے مباحث آج بھی منٹو کے ناقدین، حوالے کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور ان نکات پر جو منٹو نے اٹھائے تھے کئی کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ ذیل میں ہم سعادت حسن منٹو کے عدالتی بیانات اور مضامین کی روشنی میں اپنے فن کے متعلق کی گئی گفتگو کا جائزہ لیں گے جس سے ادبی نظریے کی ترجمانی اور وضاحت کے علاوہ سعادت حسن منٹو اپنے فن کی بہت سی الجھی گتھیاں بھی سلجھاتے نظر آئیں گے۔ ساقی بک ڈپو،

دہلی کی مطبوعہ چوبیس افسانوں پر مشتمل منٹو کی کتاب 'دھواں' کے دو افسانوں دھواں، اور کالی شلوار پر چلنے والے مقدمہ کے سلسلہ میں منٹو نے عدالت میں جمع کرائے گئے بیان میں اپنے فن کے تناظر میں ''دھواں'' افسانے کی فنی و فکری خوبیوں سے عدالت کو آگاہ کیا۔ عدالت میں جمع کرائے گئے اس بیان کو تنقیدی نقطۂ نظر سے جانچیں تو معلوم ہو گا کہ منٹو ایک ماہر نقاد کی طرح کسی فن پارے کی قدر قیمت کا تعین کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

دھواں اور کالی شلوار پر مقدمہ منٹو کی ادبی زندگی کے کم بیش ابتدائی دور سے تعلق رکھتا ہے، اور یہ وہ وقت ہے جب منٹو شخصی و ادبی طور پر جوان تھے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ ''دھواں'' کے ضمن میں جمع کرائے گئے بیان میں ایک جوان شخص کی للکار موجود ہے۔ اپنے بیان میں اُنھوں نے اپنے مخالفین کو ادبی طور پر معذور قرار دیتے ہوئے اُنھیں اس اہل بھی نہ سمجھا کہ وہ ان کے افسانوں کے بارے میں رائے تک دے سکیں۔ لکھتے ہیں:

> ''کسی ادب پارے کے متعلق ایک روزانہ اخبار کے ایڈیٹر، ایک اشتہار فراہم کرنے والے اور ایک سرکاری مترجم کا فیصلہ صائب نہیں ہو سکتا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ تینوں کسی خاص اثر، کسی خاص غرض کے ماتحت اپنی رائے قائم کر رہے ہوں اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ تینوں حضرات ایسی رائے دینے کے اہل ہی نہ ہوں۔ کیوں کہ کسی بڑے شاعر، بڑے افسانہ نگار کے افسانوں پر صرف وہی آدمی تنقید کر سکتا ہے جو تنقید نگاری کے فن کے تمام عواقب و عواطف سے آگاہ ہو۔''[۶۰]

گو یا کسی بھی نقاد کے لیے اس فن پارے کے متعلق جس پر تنقید کی جا رہی ہو ضروری ہے کہ وہ علمی اور فنی دونوں حوالوں پر قدرت رکھتا ہو۔ اُنھوں نے افسوس کا اظہار کیا کہ صاحبان استغاثہ نے ان کے افسانوں کے متعلق کوئی بصیرت افروز تنقید نہیں کی۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

> ''صرف اتنا کہہ دینے سے کہ یہ دونوں افسانے فحش ہیں، اس آدمی کی جو روشنی کا خواہشمند ہے، جو اپنے عیوب و محاسن جاننا چاہتا ہے اور ان کی اصلاح کرنا چاہتا ہے ہر گز ہر گز تسلی نہیں ہوتی۔''[۶۱]

منٹو نے زبان میں موجود الفاظ کو فحش سمجھنے کی بجائے الفاظ کے طریق استعمال کو ایک ایسی چیز بتایا جو پاکیزہ سے پاکیزہ الفاظ کو بھی فحش بنا دیتا ہے۔ اسی ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

> ''تحریر میں، شعر و شاعری میں، سنگ سازی و صنم تراشی میں فحاشی تلاش کرنے کے لیے سب سے پہلے اس کی ترغیب ڈھونڈنی چاہیے، اگر یہ ترغیب موجود ہے، اگر اس کی نیت کا ایک شائبہ بھی نظر آرہا ہے تو وہ تحریر، وہ تقریر، وہ شعر، وہ بیت قطعی طور پر فحش ہے۔''[۶۲]

اپنے افسانے ''دھواں'' کو اُنھوں نے اس قسم کی کسی بھی ترغیب سے یکسر عاری قرار دیتے ہوئے زیر عتاب افسانے میں موجود فکری اور فنی خوبیوں کو اجاگر کیا۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ کسی بھی تخلیق کار سے بہتر تجزیہ اپنی تخلیق کا کوئی اور کب کر سکتا ہے۔ منٹو لکھتے ہیں کہ ''دھواں میں شروع سے لے کر آخر تک ایک کیفیت، ایک جذبے، ایک تحریک کا نہایت ہی ہموار نفسیاتی بیان ہے۔ اصل موضوع سے ہٹ کر اس میں دور از کار باتیں نہیں کی گئیں اور اس میں ہمیں کہیں بھی ایسی ترغیب نظر نہیں آتی جو قارئین

کو شہوانی لذتوں کے دائرے میں لے جا کر ان کے اخلاق بگاڑے۔ اس لیے کہ افسانے کا موضوع شہوت ہے ہی نہیں۔ استغاثہ اگر ایسا سمجھتا ہے تو یہ اس کی کم نظری ہے۔'' منٹو نے اس ضمن میں ایک نقطہ یہ بھی واضح کیا کہ وہ بے نام لذت جو مسعود کو محسوس ہو رہی تھی اس میں مسعود کے علاوہ کسی اور کو شریک نہیں کیا گیا اور یہی ایک اچھے فنکار کے قلم کی خوبی ہے۔ عدالت کو دیے گئے اس بیان کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''خدا جانے استغاثہ اس افسانے کو فحش کیوں سمجھتا ہے جس میں فحاشی کا شائبہ تک موجود نہیں۔ اگر میں کسی عورت کے سینے کا ذکر کرنا چاہوں گا تو اسے عورت کا سینہ کہوں گا۔ عورت کی چھاتیوں کو آپ مونگ پھلی، میز یا استرہ نہیں کہہ سکتے۔''[۶۳]

بیان کے آخر میں اُنھوں نے ایک مرتبہ پھر واضح کیا کہ ان کے افسانے تندرست اور صحت مند لوگوں کے لیے ہیں، ان انسانوں کے لیے جو عورت کے سینے کو عورت کا سینہ ہی سمجھتے ہیں اس سے آگے نہیں بڑھتے اور جو کسی ادب پارے کو ایک ہی دفعہ نگل نہیں جاتے۔

''دھواں'' کے بعد منٹو کا ''ٹھنڈا گوشت'' کے سلسلہ میں عدالت کو جمع کروایا گیا بیان بھی منٹو خود شناسی کی بہترین مثال ہے۔ منٹو کے بقول یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ ادب ہر گز ہر گز فحش نہیں ہو سکتا۔ افسانہ ٹھنڈا گوشت کو اگر ادب کے دائرے سے باہر کر دیا جائے تو اس کے فحش ہونے یا نہ ہونے کا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ دھواں کی طرح ٹھنڈا گوشت کا بھی فنی و فکری جائزہ لے کر منٹو نے عدالت کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ان کی کہانی میں فحاشی قسم کی کسی چیز کا شائبہ تک موجود نہیں۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

''افسانہ ٹھنڈا گوشت کے بطن میں جو کچھ بھی ہے ظاہر ہے کہ فحش نہیں۔ عنوان ہی ایک بین ثبوت ہے کہ افسانہ پڑھنے والوں کے دل و دماغ میں شہوت کی گرم لہریں نہیں دوڑائے گا۔ جو حادثہ ایشر سنگھ کو پیش آیا، وہ کیسے کسی قاری کو شہوانی جذبات کی طرف مائل کر سکتا ہے۔''[۶۴]

منٹو کے مطابق ایشر سنگھ کا انداز گفتگو اس کا اپنا ہے۔ ہزاروں آدمی روزمرہ کی زندگی میں اس طرح کی گالیوں کا استعمال عام کرتے ہیں اور نہ ہی اس کی حرکات و سکنات غیر فطری ہیں۔ منٹو نے غالب کے خطوط سے اقتباسات پیش کر کے ان میں درج گالیوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ گالیاں ہونے کے باوجود ان سے فحاشی کا تاثر پیدا نہیں ہوتا۔ استغاثہ بھی افسانے میں موجود جن الفاظ کو گالیاں کہتا ہے در حقیقت وہ گالی نہیں ہیں۔ ایشر سنگھ کے کردار کو مد نظر رکھیں تو منٹو کی یہ دلیل کافی وزنی لگتی ہے کہ:

''ایشر سنگھ جیسے اجڈ اور گنوار آدمی سے شائستہ کلامی کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔ اس کے منہ میں اگر مصنف نے مہذب اور شائستہ الفاظ ڈالے ہوتے تو افسانے میں حقیقت نگاری کا خاتمہ ہو جاتا۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ افسانہ ایک نہایت ہی بھونڈی شکل اختیار کر لیتا اور آرٹ کی سطح سے بہت ہی نیچے خرافات کے کھنڈ میں جا گرتا''[۶۵]

عدالت کو مصنف کے اس مطمع نظر کو سمجھنا چاہیے کہ اس افسانے کا موضوع انسانیت ہے نہ کہ فحاشی و جنس نگاری۔ ایشر سنگھ گندہ ذہن سہی، افسانے کا موضوع گھناؤنا سہی، لیکن کیا اس کو پڑھنے کے بعد ہمیں انسانیت کی وہ رمق دکھائی نہیں دیتی، جو ایشر سنگھ کے

سیاہ قلب میں خود اس کا مکروہ فعل پیدا کرتا ہے۔ بقول منٹو یہ ایک صحت مند چیز ہے کہ اس افسانے کا مصنف انسانوں اور انسانیت سے مایوس نہیں ہوا۔ لیکن افسانے کا مصنف اس امر پر افسوس کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے:

> ''مجھے افسوس ہے کہ وہ تحریر جو انسانوں کو بتاتی ہے کہ وہ انسان سے حیوان بن کر بھی انسانیت سے علیحدہ نہیں ہو سکتے، فحش اور شہوت ابھارنے والی سمجھی جا رہی ہے۔''[۶۶]

چناں چہ ایسے لوگ جو ''ٹھنڈا گوشت'' پڑھ کر اپنے جذبات مشتعل کر بیٹھتے ہیں اُنھیں چاہیے کہ وہ کسی ذہنی معالج سے رجوع کریں۔ کرداروں کی زبان کے متعلق رائے دیتے ہوئے منٹو نے اعتراف کیا کہ بلاشبہ ان کی زبان بھدی اور گندی ہے مگر عدالت مصنف سے ان پڑھ اور غیر مہذب لوگوں کے منہ میں شائستہ زبان ڈال دینے کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتی۔ بیان کے آخری حصے سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں اور دیکھیں کہ منٹو افسانے کے فنی و فکری پہلوؤں کا کتنی باریک بینی سے جائزہ لے رہا ہے:

> ''افسانہ ٹھنڈا گوشت ایک سچی تصویر ہے۔ اس میں کوئی ابہام نہیں۔ بڑی ہی بیباکانہ صاف گوئی سے اس میں ایک نفسیاتی حقیقت کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ اگر اس میں کہیں گندگی اور غلاظت ہے تو اسے مصنف کے ساتھ نہیں بلکہ افسانے کے کرداروں کی ذہنی سطح کے ساتھ منسوب کرنا چاہیے۔''[۶۷]

یوں تو سعادت حسن منٹو کی پانچ کہانیوں کے خلاف فحاشی کے مقدمات چلے اور منٹو نے یہ تمام مقدمات بذات خود بھگتے۔ یقیناً اُنھوں نے تمام افسانوں کو غیر فحش ثابت کرنے کے لیے مختلف عدالتوں میں اپنے بیان جمع کرائے ہوں گے۔ لیکن بدقسمتی سے صرف ''دھواں'' اور ''ٹھنڈا گوشت'' کے ضمن میں جمع کرائے گئے بیانات اس وقت تک منظر عام پر آ سکے۔ اگر یہ سارا عدالتی سرمایہ دستیاب ہو جاتا تو یقیناً وہ ادبی سرمایے میں تبدیل ہو چکا ہوتا۔ منٹو نے وسیع تناظر میں نہ صرف اپنے افسانوں کا دفاع کیا بلکہ ادب و فن کو جانچنے کے معیار بھی مقرر کیے۔

منٹو کے افسانے ''کالی شلوار' پر بھی مقدمہ چلا تھا۔ ''کالی شلوار'' کے متعلق منٹو کا مضمون بعنوان ''سفید جھوٹ'' اگرچہ عدالتی بیان نہیں ہے لیکن اس مضمون میں بھی ہم منٹو کی تنقیدی بصیرت کے قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ان عدالتی بیانات کے بعد اب ہم منٹو کے ان مضامین کا جائزہ لیں گے جو خاص طور پر ''لذت سنگ'' میں موجود ہیں۔ ان مضامین میں منٹو نے اپنے نظریہ فن کی روشنی میں خود اپنے ہی فن کا جائزہ لیا ہے۔

''ادب جدید'' کے نام سے منٹو نے ایک مضمون جنوری ۱۹۴۴ء میں جوگیشوری کالج، بمبئی میں طالب علموں کو پڑھ کر سنایا تھا۔ جو بعد میں ادب لطیف کے سالنامہ ۱۹۴۴ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ دھواں کے ساتھ زیر تذکرہ مضمون پر بھی مقدمہ چلایا گیا تھا۔ منٹو نے اپنے اس مضمون میں کھل کر اپنے ادبی نظریے کا پرچار کیا۔ منٹو کی ترقی پسندی پر انگلی اٹھانے والے ترقی پسند نقادوں کو ان کا یہ مضمون ضرور پڑھنا چاہیے جس میں وہ خود کو ترقی پسند ادب کا لازمی عنصر قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بعض لوگ ادب جدید المعروف نئے ادب یعنی ترقی پسند ادب کو سعادت حسن منٹو بھی کہتے ہیں اور جنھیں صنف کرخت پسند نہیں وہ اسے عصمت چغتائی بھی کہہ لیتے ہیں۔''[۶۸]

سعادت حسن منٹو نے اس مضمون میں بڑے طمطراق سے خود کو ترقی پسند ظاہر کیا ہے۔اس حقیقت پر کسی کو شک و شبہ نہیں کرنا چاہیے کہ اپنے موضوعات اور کرداروں کی پیش کش کے حوالے سے اگر کوئی افسانہ نگار ترقی پسند فکر کے سب سے زیادہ قریب رہا ہے تو وہ منٹو ہی ہیں۔مزاج کی تندی و تلخی اور حسن عسکری کی قربت نے سعادت حسن منٹو کو ترقی پسندوں کی صفوں سے ضرور نکال باہر کیا مگر ایک وقت تھا جب منٹو ترقی پسندی کے نعرے بڑھ چڑھ کر لگا رہا تھا۔ادب جدید سے ایک اقتباس دیکھیے:

''کہا جاتا ہے کہ سعادت حسن منٹو ترقی پسند انسان ہے۔۔۔۔۔ یہ کیا بے ہودگی ہے! سعادت حسن منٹو انسان ہے اور ہر انسان کو ترقی پسند ہونا چاہیے۔ترقی پسند کہہ کر لوگ میری صفت بیان نہیں کرتے بلکہ اپنی برائی کا ثبوت دیتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود ترقی پسند نہیں۔''[۶۹]

اُنھوں نے قدیم اور جدید ادب کا تقابل کرتے ہوئے آج کے ادیب کو بدلے ہوئے حالات کے تناظر میں ماضی کے ادباء سے مختلف قرار دیا ہے۔ان کے نزدیک یہ فرق فطری ہے کیوں کہ وقت کے ساتھ ساتھ انسان کی ترجیحات بھی بدلتی رہتی ہیں۔قدیم عہد کے ادیب فارغ البال، عیش پرست اور آرام پسند تھے اور وہ جنوں اور پریوں کی داستانیں لکھ کر نام کماتے تھے۔مگر آج کا افسانہ نویس ان مردوں اور عورتوں کی کہانیاں لکھتا ہے جو جنوں اور پریوں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہیں۔ماضی کا ادیب مطمئن انسان تھا، آج کا ادیب غیر مطمئن انسان ہے۔اپنے ماحول، اپنے نظام، اپنی معاشرت حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی۔آج کے ادیبوں کے موضوعات پر ہونے والی نقطہ چینیوں کے متعلق جو خاص طور پر جنسی موضوعات کے متعلق تھیں اور اس عہد کے ادیبوں کا اجتماعی رویہ تھا، منٹو لکھتے ہیں:

''یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آج کے ادیبوں کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔سچ تو یہ ہے کہ ہبوطِ آدم سے لے کر اب تک ہر مرد کے اعصاب پر عورت سوار رہی ہے اور کیوں نہ رہے، مرد کے اعصاب پر کیا ہاتھی گھوڑوں کو سوار ہونا چاہیے۔''[۷۰]

منٹو کے بقول جو اس قسم کے ادب یعنی ترقی پسند ادب کا خاتمہ کر دینا چاہتے ہیں اُنھیں چاہیے کہ وہ پہلے ان اسباب کو ختم کریں جو اس قسم کے ادب کی تخلیق کا باعث ہیں۔

راجہ صاحب آف محمود آباد، ماہر القادری اور حکیم مرزا حیدر بیگ منٹو سے خاص مخاصمت رکھتے تھے اور منٹو پر حرف ملامت بھیجنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔منٹو نے ان سے مخاطب ہوتے ہوئے اپنے نظریہ فن کی وضاحت کچھ یوں کی ہے:

''راجہ صاحب آف محمود آباد اور ان کے ہم خیال کہتے ہیں یہ سراسر بے ہودگی ہے۔تم جو کچھ لکھتے ہو خرافات ہے۔میں کہتا ہوں بالکل درست ہے۔اس لیے کہ میں بے ہودگیوں اور خرافات ہی کے متعلق لکھتا ہوں۔''[۷۱]

اپنے ادبی موضوعات اور انتخاب کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

''میرے پڑوس میں اگر کوئی عورت، ہر روز اپنے خاوند سے مار کھاتی ہے اور پھر اس کے جوتے صاف کرتی ہے تو میرے دل میں اس کے لیے ذرا برابر بھی ہمدردی پیدا نہیں ہوتی۔لیکن جب میرے پڑوس میں کوئی عورت اپنے خاوند سے لڑ کر اور خودکشی کی دھمکی دے کر سینما دیکھنے چلی جاتی ہے اور میں خاوند کو دو گھنٹے سخت پریشانی کی حالت میں دیکھتا ہوں تو مجھے دونوں سے ایک عجیب و غریب قسم کی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔''[۷۲]

اور یہ مشہور و معروف اقتباس تو ضرب المثل کا درجہ امتیاز کر چکا ہے کہ:

''چکی پیسنے والی عورت جو دن بھر کام کرتی ہے اور رات کو اطمینان سے سو جاتی ہے میرے افسانوں کی ہیروئن نہیں ہو سکتی۔ میری ہیروئن چکلے کی ایک ٹکھیائی رنڈی ہو سکتی ہے جو رات کو جاگتی ہے اور دن کو سوتے میں کبھی کبھی ڈراؤنا خواب دیکھ کر اٹھ بیٹھتی ہے کہ بڑھاپا اس کے دروازے پر دستک دینے آرہا ہے۔'' [۷۳]

اپنے اوپر خاص طور پر اور دیگر ادیبوں پر عمومی طور پر لگنے والے جنسی اور فحش ادب کی تخلیق کے الزامات کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ میں نے اس موضوع کا انتخاب محض اس لیے کیا ہے کیوں کہ یہ موضوع مجھے پسند ہے۔ مجھ میں جو برائیاں ہیں وہ اس عہد کی برائیاں ہیں اس ضمن میں ایک اقتباس دیکھیے:

''میری تحریر میں کوئی نقص نہیں۔ جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے۔ میں ہنگامہ پسند نہیں، میں لوگوں کے خیالات اور جذبات میں ہیجان پیدا کرنا نہیں چاہتا۔'' [۷۴]

اپنے افسانے کے دفاع کے متعلق منٹو کے اس بیان کا اگر غیر جانبداری سے مطالعہ کیا جائے اور اس بات سے قطع نظر کہ یہ منٹو کا نقطۂ نظر ہے اپنے فن کے بارے میں، تو کیا یہ وہ بنیادیں نہیں جن کے اوپر آج تک کی جانے والی منٹوانہ تنقید کی بڑی بڑی عمارات کھڑی ہیں۔ ''لذت سنگ'' ہی میں شامل اپنے دوسرے مضمون ''سفید جھوٹ'' میں منٹو نے اس افسانے کو فحش قرار دینے کے عمل کو سفید جھوٹ سے تعبیر کیا ہے۔ پورے کا پورا مضمون منٹو کے نظریہ فن کا عکاس ہے۔ افسانے کے تجزیہ کے ذریعے منٹو نے ان لوگوں کی عقل پر ماتم کیا ہے جو کالی شلوار کو فحش سمجھتے ہیں۔ اس جیسے بے ضرر افسانے پر مقدمہ چلنا اس دور کے ادبی رویوں اور منٹو کی تحسین پر سوالیہ نشان ہے۔ منٹو نے انتہائی جرأت مندی سے اعلان کیا کہ:

''افسانہ نگاری میرا پیشہ ہے۔ میں اس کے تمام آداب سے واقف ہوں۔ اس سے بیشتر اسی موضوع پر کئی افسانے لکھ چکا ہوں۔ ان میں سے کوئی بھی فحش نہیں۔'' [۷۵]

طوائف یا جنس کا موضوع ان کے وجود کی طرح بہت پرانا ہے۔ ہزارہا سال سے ہمارے سماج کا حصہ رہنے والے اس طبقے کے متعلق لکھنے پر اس قدر منہ کیوں بسورے جاتے ہیں۔ ہم جب ہر اہم اور غیر اہم موضوع پر لکھ سکتے ہیں اور کوئی پوچھنے تک نہیں آتا، اس طبقے کے ذکر پر کیوں سوالات کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی ہے۔ جو چیز سامنے ہو گی اس کا ذکر بھی ہو گا۔ اگر طوائفوں کے ذکر کو ختم کرنا ہے تو پہلے اس کے وجود کو ختم کریں، اس کا ذکر خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اس ضمن میں منٹو لکھتے ہیں:

''میں جو کچھ دیکھتا ہوں، جس نظر اور جس زاویے سے دیکھتا ہوں، وہی نظر، وہی زاویہ میں دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہوں۔'' [۷۶]

اپنے افسانے کا تجزیہ کرتے ہوئے منٹو نے اس میں موجود تشبیہی و استعاراتی نظام کو سراہتے ہوئے لکھا کہ ذہین پڑھنے والوں کے لیے اس سے اچھے اشارے اور کیا ہو سکتے ہیں جن میں سلطانہ کی زندگی کا صحیح نقشہ ان اشاروں اور کنایوں کی مدد سے کامیابی سے پیش
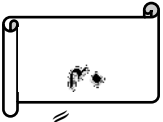
کیا گیا۔ کالی شلوار کے پہلو بہ پہلو منٹو نے سلطانہ کی بہن سوگندھی کا تذکرہ کرتے ہوئے اس افسانہ کے انجام کا منظر یاد دلایا اور گویا ہوئے:

''کون ہے جو یہ تصویریں دیکھ کر لذت حاصل کرنے کے واسطے ان ویشیاؤں کے کوٹھے پر جائے گا۔ میری ''سلطانہ'' اور میری ''سوگندھی'' تنہائی میں دیکھنے والی تصویریں نہیں ہیں جن کے اشتہار آئے دن اخباروں میں چھپتے رہتے ہیں۔۔۔وہ کوئی لچھے دار آپ بیتی نہیں سناتیں کہ شہوانی جذبات ابھر آئیں۔''[۷۷]

افسانے کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد اُنھوں نے سوال اٹھایا کہ یہ افسانہ پڑھ کر دل و دماغ پر کیا اثر ہوتا ہے؟ کیا اس کا پلاٹ یا اس کا انداز بیان لوگوں کو ویشیاؤں کی طرف کھینچتا ہے؟ منٹو نے خود ہی اس سوال کا جواب کچھ یوں دیا:

''ہرگز نہیں۔ اس لیے کہ یہ اس مقصد کے لیے نہیں لکھا گیا، اگر اس کو پڑھ کر ایسا اثر پیدا نہیں ہوتا تو یہ افسانہ اخلاقیات سے گراہوا نہیں ہے۔''[۷۸]

بقول منٹو! کالی شلوار جیسے افسانے تفریح کی خاطر نہیں لکھے جاتے، ان کو پڑھ کر شہوانی جذبات کی رال نہیں ٹپکنے لگتی اور اس کو لکھ کر وہ کسی شرمناک فعل کے مرتکب نہیں ہوئے۔ منٹو نے اس افسانے میں موجود فحش موضوع یا الفاظ کو یکسر مسترد کیا اور کلاسیکی شعری سرمائے میں موجود مثنویوں کے کچھ اشعار درج کرنے کے بعد اپنے ناقدین اور قارئین کو فحش اور غیر فحش کا فرق سمجھایا۔

افسانہ نگار اور جنسی مسائل، منٹو کے نظریہ فن کا بہترین عکاس ہے۔ منٹو نے جنسی بھوک کو بھی جسم کی بھوک کی طرح انسان فطرت یا جبلت قرار دیا اور انسانوں پر ان دونوں اقسام کی بھوک کے غلبہ کو تسلیم کیا۔ چناں چہ ہر دور کے ادب میں جنس کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جنسی مسائل جس طرح آج کے نئے ادیبوں کے پیش نظر ہیں اسی طرح پرانے ادیبوں کے بھی پیش نظر رہے، وہ اپنے اور ہم اپنے رنگ میں اس موضوع پر لکھ رہے ہیں۔ اُنھوں نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ لوگ ان سے جنسی مسائل کے اوپر بار بار کیوں سوالات کرتے ہیں؟ شاید اس لیے کہ لوگ اُنھیں ترقی پسند سمجھتے ہیں یا پھر اس لیے کہ اُنھوں نے جنسی مسائل کے اوپر کچھ کہانیاں لکھی ہیں۔ ایک اقتباس سے ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جائے گی:

''کچھ بھی ہو، لیکن یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ دنیا کا ادب صرف ان دو رشتوں ہی سے متعلق ہے۔ الہامی کتابیں بھی، جن کو آسمانی ادب کہنا چاہیے، روٹی اور پیٹ، عورت اور مرد کے تذکروں سے خالی نہیں۔''[۷۹]

چناں چہ وہ لکھتے ہیں کہ اگر آج کے ادیبوں یا سعادت حسن منٹو کی تحریروں میں عورت اور مرد کے تعلقات کا ذکر زیادہ نظر آتا ہے تو یہ ایک فطری سی بات ہے۔ دنیا کی ہر چیز ایک دوسرے سے الگ کی جاسکتی ہے مگر کوئی سیاست، کوئی عقیدہ، کوئی قانون عورت اور مرد کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتا۔ مضمون کے آخر میں اُنھوں نے لکھا کہ جو سمجھتے ہیں کہ نئے ادب نے جنسی مسائل پیدا کیے ہیں، غلطی پر ہیں کیوں کہ حقیقت یہ ہے کہ جنسی مسائل نے نئے ادب کو جنم دیا ہے۔

''لذت سنگ''، ہی میں شامل مضمون ''کسوٹی''، میں بھی منٹو کے ادبی نظریے کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ منٹو کا خیال ہے کہ ادب ایک فرد کی ذاتی زندگی کی تصویر نہیں۔ جب کوئی ادیب قلم اٹھاتا ہے تو وہ اپنے گھریلو حالات کا روزنامچہ نہیں لکھتا۔ اپنی ذاتی
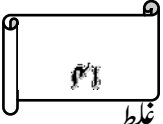
خوشیوں، رنجشوں، بیماریوں اور تندرستیوں کا ذکر نہیں کرتا۔ چناں چہ ان بیماریوں پر کسی ادب پارے کو پرکھنا بہت بڑی غلطی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہر ادب پارہ ایک خاص فضا، ایک خاص اثر، ایک خاص مقصد کے لیے پیدا ہوتا ہے اگر اس میں وہ خاص فضا، ایک خاص اثر اور وہ خاص مقصد محسوس نہ کیا جائے تو ایک بے جان لاش رہ جائے گی۔''[۸۰]

سعادت حسن منٹو کے عدالتوں میں جمع کرائے گئے ان بیانات اور لکھے گئے مضامین سے ان کے نظریہ فن کی وضاحت بخوبی ہوتی ہے۔ تخلیقی سفر کے آغاز سے اختتام تک کے درمیانی زمانے میں اگرچہ منٹو کی شخصیت اور فن کی تعبیر کے مختلف زاویے ہمارے سامنے آتے ہیں لیکن جو گہرائی، بصیرت اور فہم و فراست منٹو کے بیانات اور مضامین سے جھلکتی ہے، ان کی معاصر تنقید اس فہم و فراست سے محروم رہی، چناں چہ منٹو شناسی کے اس اولین دور میں سب سے پہلا، باقاعدہ اور بڑا منٹو شناس خود ان کی اپنی ہی ذات کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

حواشی

۱۔ دیکھیے، انیس ناگی، سعادت حسن منٹو، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۳۰۔

۲۔ ابو سعید قریشی، منٹو، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۸۸ء۔ ص ۲۷۔

۳۔ ڈاکٹر علی ثناء بخاری نے پی ایچ ڈی کے مقالہ ''سعادت حسن منٹو سوانح اور ادبی کارنامے'' میں تمام دستاویزات/ریکارڈ کی مدد سے اس غلط فہمی کو دور کیا کہ منٹو میٹرک میں دوبارہ فیل ہوئے۔ مقالہ نگار کے لکھے گئے ایک مضمون، مشمولہ، انگارے، ملتان کے منٹو نمبر، ص ۲۳، جنوری ۲۰۰۵ء میں بھی اس بحث کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ خالد سنجرانی، ڈاکٹر ''پاکستان میں سماجی تبدیلیاں اور منٹو کے افسانے، مشمولہ، منٹو اور ہم، مرتبہ، الطاف احمد قریشی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۲۰۱۳ء۔ ص ۵۵۔

۵۔ ماہنامہ ''ساقی'' کراچی میں منٹو کی شائع شدہ تحریروں کی فہرست ملاحظہ ہو:

۱۔ جی آیا صاحب، جلد ۱۱، شمارہ ۲ جنوری ۱۹۳۵ء۔ ۲۔ چوری، جلد ۱۱، شمارہ ۵، مئی ۱۹۳۵ء۔ ۳۔ خونی تھوک، جلد ۱۲، شمارہ ۲، اگست ۱۹۳۵ء۔ ۴۔ ترگنیف کی موت، جلد ۱۲، شمارہ ۶، دسمبر ۱۹۳۵ء۔ ۵۔ میرا ہم سفر، جلد ۱۳، شمارہ ۴، اپریل ۱۹۳۶ء۔ ۶۔ دیوانہ شاعر، جلد ۱۴، شمارہ ۱، جولائی ۱۹۳۶ء۔ ۷۔ میکسم گورکی، جلد ۱۴، شمارہ ۲۔ اگست ۱۹۳۶ء۔ ۸۔ پھاہا، جلد ۹، شمارہ ۱، جنوری ۱۹۳۹ء۔ ۹۔ شوشو، جلد ۱۹، شمارہ ۴، اپریل ۱۹۳۹ء۔ ۱۰۔ ایکٹرس کی آنکھ، جلد ۲۰، شمارہ ۴، اکتوبر ۱۹۳۹ء۔ ۱۱۔ محبت کی پیدائش، جلد ۲۰، شمارہ ۵، اکتوبر ۱۹۳۹ء۔ ۱۲۔ لالٹین، جلد ۲۱، شمارہ ۱، جنوری ۱۹۴۰ء۔ ۱۳۔ آؤ خط سنو، جلد ۲۱، شمارہ ۳، مارچ ۱۹۴۰ء۔ ۱۴۔ آؤ چوری کریں، جلد ۲۱، شمارہ ۵، مئی ۱۹۴۰ء۔ ۱۵۔ آؤ کھوج لگائیں، جلد ۲۱، شمارہ ۶، جون ۱۹۴۰ء۔ ۱۶۔ اس کا پتی، جلد ۲۲، شمارہ ۱ جولائی ۱۹۴۰ء۔ ۱۷۔ تین تحفے، جلد ۲۲، شمارہ ۳۔ ستمبر ۱۹۴۰ء۔ ۱۸۔ نپولین کی موت، جلد ۲۲، شمارہ ۵، نومبر ۱۹۴۰ء۔ ۱۹۔ کبوتروں والا سائیں، جلد ۲۲، شمارہ ۶، دسمبر ۱۹۴۰ء۔ ۲۰۔ دس روپے، جلد ۲۳، شمارہ ۳، مارچ ۱۹۴۱ء۔ ۲۳۔ مسز ڈی کوسٹا، جلد ۲۳، شمارہ ۴، اپریل ۱۹۴۱ء۔ ۲۴۔ نیلی رگیں، جلد ۲۳، شمارہ ۵، مئی ۱۹۴۱ء۔ ۲۵۔ ترقی پسند، جلد ۲۳، شمارہ ۶، جون ۱۹۴۱ء۔ ۲۶۔ سجدہ، جلد ۲۴، شمارہ ۱، جولائی ۱۹۴۱ء۔ ۲۷۔ اگر، جلد ۲۴، شمارہ ۳، ستمبر ۱۹۴۱ء۔ ۲۸۔ دھواں، جلد ۲۴، شمارہ ۵، نومبر ۱۹۴۱ء۔ ۲۹۔ شاعرہ کی موت، جلد ۲۴، شمارہ ۶، دسمبر ۱۹۴۱ء۔ ۳۰۔ تیمور کی موت، جلد ۲۴، شمارہ ۶، دسمبر ۱۹۴۱ء۔ ۳۱۔ نیا سال، جلد ۲۵، شمارہ ۲، فروری ۱۹۴۲ء۔ ۳۲۔ چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد، جلد ۲۵، شمارہ ۳، مارچ ۱۹۴۲ء۔ ۳۳۔ مس فریا، جلد ۲۵، شمارہ ۴، اپریل ۱۹۴۲ء۔ ۳۴۔ کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی، جلد ۲۵، شمارہ ۵، مئی ۱۹۴۲ء۔ ۳۵۔ آم کے ٹوکرے، جلد ۲۵، شمارہ ۶، جون ۱۹۴۲ء۔ ۳۶۔ بلاؤز، جلد ۲۶، شمارہ ۱، جولائی ۱۹۴۲ء۔ ۳۷۔ مسز ڈی سلوا، جلد ۲۶، شمارہ ۲، اگست ۱۹۴۲ء۔ ۳۸۔ کچھ اور باتیں، جلد ۲۶، شمارہ ۴، اکتوبر ۱۹۴۲ء۔ ۳۹۔ ترقی یافتہ قبرستان، جلد ۲۷، شمارہ ۱، جنوری ۱۹۴۳ء۔ ۴۰۔ بی زمانی بیگم، شمارہ ۱، جنوری ۱۹۴۶ء۔

۶۔ ماہنامہ ''ہمایوں'' لاہور کے مختلف شماروں میں منٹو کی درج ذیل پندرہ تحریریں اشاعت پذیر ہوئیں:

۱۔ شیطان اور شراب، جلد ۲۵، شمارہ ۱، جنوری ۱۹۳۴ء۔ ۲۔ سپاہی اور موت، جلد ۲۵، شمارہ ۶، جون ۱۹۳۴ء۔ ۳۔ چھبیس مزدور اور ایک دوشیزہ، جلد ۲۶، شمارہ ۲، اگست ۱۹۳۴ء۔ ۴ میکسم گورکی، جلد ۳۶، شمارہ ۶، دسمبر ۱۹۳۴ء۔ ۵۔ تلون (ڈراما)، جلد ۳۸، شمارہ ۵، نومبر ۱۹۴۰ء۔ ۶۔ منتر (افسانہ)، جلد ۳۵، شمارہ ۲، فروری ۱۹۳۹ء۔ ۷۔ تماشا گاہ نفس (ڈراما)، جلد ۲۹، شمارہ ۲، فروری ۱۹۳۶ء۔ ۸۔ تحدید اسلحہ، جلد ۳۱، شمارہ ۱، جنوری ۱۹۳۷ء۔ ۹۔ شغل (افسانہ)، جلد ۳۱، شمارہ ۵، مئی ۱۹۳۷ء۔ ۱۰۔

دست بریدہ (افسانہ)، جلد ۲۸، شمارہ ۴، اکتوبر ۱۹۳۵ء۔ ۱۱۔ ریچھ (ڈراما)، جلد ۲، شمارہ ۱، جنوری ۱۹۳۵ء۔ ۱۲۔ طاقت کا امتحان (افسانہ)، جلد ۲۸، شمارہ ۳، مارچ ۱۹۳۵ء۔ ۱۳۔ پگلا (افسانہ)، جلد ۳۶، شمارہ ۶، دسمبر ۱۹۳۹ء۔ ۱۴۔ خودکشی کا اقدام (افسانہ)، جلد ۳۴، شمارہ ۱، جولائی ۱۹۳۸ء۔ ۱۵۔ نیا قانون (افسانہ)، جلد ۳۳، شمارہ ۱ (سالگرہ نمبر، جنوری ۱۹۳۸ء۔

۷۔ بشیر ساجد، پنجاب کا ایک افسانہ نگار، مشمولہ، ہمایوں، جلد ۴۴، شمارہ ۵، نومبر ۱۹۴۲ء۔ ص ۴۸۳۔

۸۔ منٹو، سعادت حسن، ادب جدید، مشمولہ، کلیات منٹو، مدون، امجد طفیل، جلد ششم، ص ۱۸۲۔

۹۔ صلاح الدین احمد، مولانا، اردو افسانے کے جدید رجحانات، ادبی دنیا، جلد ۲۱، شمارہ ۱، جنوری ۱۹۴۳ء، ص ۱۱۔

۱۰۔ صلاح الدین احمد، مولانا، ہمارے افسانوں کی تشبیہیں اور تمثیلیں، ہمایوں، جلد ۴۵، شمارہ ۱، جنوری، ۱۹۴۴ء ص ۲۹۔

۱۱۔ ایضاً __________، ص ۲۹۔

۱۲۔ آفتاب احمد، جدید اردو افسانہ، ہمایوں، جلد ۴۴، شمارہ ۲، اگست، ۱۹۴۳ء، ص ۲۳۰۔

۱۳۔ ذکی الدین پامال، ایم اے، ترقی پسند ادب، ادبی دنیا، جلد ۲۳، شمارہ ۶، جون ۱۹۴۵ء، ص ۵۵۔

۱۴۔ وقار عظیم، مختصر افسانہ کے پچیس سال، ہمایوں، جلد ۵، سلور جوبلی نمبر، ۱۹۴۷ء، ص ۴۹، ۵۰۔

۱۵۔ لیزلی فلیمنگ، منٹو، میرے مطابق، مترجم سلیم شہاب، مکتبہ جدید، لاہور (س ن) ص ۲۳۔

۱۶۔ عزیز احمد، ترقی پسند ادب، کاروان ادب، ملتان، ۱۹۹۴ء۔ ص ۱۵۱۔

۱۷۔ ایضاً __________، ص ۱۴۸۔

۱۸۔ ایضاً __________، ص ۱۴۹۔

۱۹۔ خالد اشرف، فسانے منٹو کے اور پھر بیاں اپنا، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۶۰۔

۲۰۔ عزیز احمد، ترقی پسند ادب، ص، ۱۵۰۔

۲۱۔ ممتاز شیریں، منٹو نوری نہ ناری''، مرتبہ، آصف فرخی، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۵ء۔ ص ۱۶۹۔

۲۲۔ خالد اشرف، ''فسانے منٹو کے اور پھر بیاں اپنا، ص ۱۶۰۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۶۶، ۱۶۷۔

۲۴۔ احمد ندیم قاسمی، منٹو کے نام کھلا خط، مشمولہ، منٹو نامے، مرتبہ: پرویز انجم، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۶۳۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۵۲۔

۲۶۔ ممتاز حسین، سیاہ حاشیے، مشمولہ نقد حیات، الہ آباد پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد، ۱۹۵۰ء، ص ۱۸۱۔

۲۷۔ ایضاً __________، ص ۱۸۳۔

۲۸۔ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، کتب پبلشرز، لمیٹڈ، ۱۹۴۸ء، ص ۹۔

۲۹۔ ایضاً __________، ص ۲۶۔

۳۰۔ ایضاً __________، ص ۲۷۔

۳۱۔ انیس ناگی، سعادت حسن منٹو کے مقدمات، جمالیات، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۴۵۔

۳۲۔ ایضاً __________، ص ۴۶: ۱۔

۳۳۔ ایضاً __________ ص ۴۷: ۴۶۔
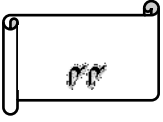
۳۴۔ ایضاً ________ ص۴۸۔
۳۵۔ ایضاً ________ ص۴۷۔
۳۶۔ منٹو، سعادت حسن، لذت سنگ، مشمولہ، کلیات منٹو، جلد ششم، مدون، امجد طفیل، نیر یٹو پرائیویٹ لمیٹڈ، اسلام آباد، جون ۲۰۱۲ء، ص۲۱۷۔
۳۷۔ ایضاً ________، ص۲۲۰۔
۳۸۔ ایضاً ________، ص۲۲۰۔
۳۹۔ ایضاً ________، ص۲۲۲۔
۴۰۔ ایضاً ________، ص۲۲۲۔
۴۱۔ ایضاً ________، ص۲۲۲۔
۴۲۔ ایضاً ________، ص۲۲۲۔
۴۳۔ ایضاً ________، ص۲۲۲۔
۴۴۔ ایضاً ________، ص۲۲۳۔
۴۵۔ ایضاً ________، ص۲۲۴۔۲۲۵۔
۴۶۔ ایضاً ________، ص۲۵۵۔
۴۷۔ ایضاً ________، ص۱۸۶۔
۴۸۔ ایضاً ________، ص۱۸۶۔
۴۹۔ ایضاً ________، ص۱۸۵۔
۵۰۔ ایضاً ________، ص۱۸۵۔
۵۱۔ ایضاً ________، ص۱۸۹۔
۵۲۔ ایضاً ________، ص۲۳۴۔
۵۳۔ ایضاً ________، ص۲۳۶۔
۵۴۔ ایضاً ________، ص۲۳۶۔
۵۵۔ ایضاً ________، ص۲۴۳۔
۵۶۔ ایضاً ________، ص۲۴۴۔
۵۷۔ انیس ناگی، سعادت حسن منٹو کے مقدمات، ص۶۔
۵۸۔ ایضاً ________ ص۱۰۰۔
۵۹۔ ایضاً ________ ص۱۶۔
۶۰۔ ایضاً ________ ص۳۲۔
۶۱۔ ایضاً ________ ص۳۳۔
۶۲۔ ایضاً ________ ص۳۴۔

۶۳۔ ایضاً__________ص۷۳۔

۶۴۔ ایضاً__________ص۷۳۔

۶۵۔ ایضاً__________ص۷۴۔

۶۶۔ ایضاً__________ص۷۵۔

۶۷۔ ایضاً__________ص۷۸۔

۶۸۔ منٹو، سعادت حسن، لذت سنگ، مشمولہ کلیات منٹو مدون، امجد طفیل، ص۱۸۰۔

۶۹۔ ایضاً__________ص۱۸۰۔

۷۰۔ ایضاً__________ص۱۸۲۔

۷۱۔ ایضاً__________ص۱۸۲۔

۷۲۔ ایضاً__________ص۱۸۲۔

۷۳۔ ایضاً__________ص۱۸۳۔

۷۴۔ ایضاً__________ص۱۸۳۔

۷۵۔ ایضاً__________ص۱۹۶۔

۷۶۔ ایضاً__________ص۱۹۶۔

۷۷۔ ایضاً__________ص۱۹۹۔

۷۸۔ ایضاً__________ص۲۰۰۔

۷۹۔ ایضاً__________ص۲۰۴۔

۸۰۔ ایضاً__________ص۲۰۸۔
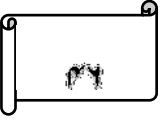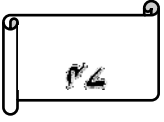
باب دوم:

منٹو پر لکھی گئی کتب کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

(الف) طبع زاد کتب

(ب) مرتّبہ کتب

باب دوم:

منٹو پر لکھی گئی کتب کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

(الف) طبع زاد کتب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن پر سوانحی، تنقیدی، تحقیقی اور مرتّبہ کتب کی تعداد سو (۱۰۰) کے لگ بھگ ہے۔ یہ کتب منٹو کی وفات سے لے کر تاحال مختلف اوقات میں اشاعت پذیر ہوئیں۔ ذیل میں ان تمام طبع زاد اور مرتّبہ کتب کا زمانی اعتبار سے جائزہ لیا جائے گا۔

''سعادت حسن منٹو''، کرشن چندر:

زمانی اعتبار سے سعادت حسن منٹو کی شخصیت/فن پر لکھی جانے والی یہ سب سے پہلی تصنیف ہے۔ اس کا امتیاز یہ ہے کہ منٹو کی زندگی میں اُن پر لکھی گئی یہ واحد اور اکلوتی کتاب ہے جسے کتب پبلی شرز لمیٹڈ، بمبئی نے ۱۹۴۸ء میں نئے ادب کے معمار، کے سلسلے میں شائع کیا۔ ۶۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ کرشن چندر کے طویل مضمون پر محیط ہے جس میں کرشن نے منٹو کی شخصی خوبیوں کو زیادہ اور فنی خوبیوں کو کم کم موضوع بناتے ہوئے، منٹو کی زندگی میں اُس کی شخصیت و فن پر خامہ فرسائی کی۔ جب کہ دوسرے حصے میں سعادت حسن منٹو کی تین تحریروں ''ترقی یافتہ قبرستان''، نیا قانون'' اور ''باتیں'' کو بطور انتخاب شامل کیا گیا ہے۔

کرشن چندر کا مضمون اس وقت ہندوستان سے شائع ہوا جب پاکستان میں منٹو اپنی زندگی کا سب سے مشکل ترین دور گزار رہے تھے۔ کیا ترقی پسند، کیا رجعت پسند، سب نے منٹو کا نان نفقہ بند کر رکھا تھا۔ ایسے عالم میں ایک ترقی پسند افسانہ نگار کا منٹو کی شخصی اور فنی خوبیوں کا کھلا اعتراف، کرشن چندر کی اپنی عظمت اور بڑائی کا اعلان بھی ہے۔ کرشن چندر کے اس مضمون میں اگرچہ شخصیت اور فن کے متعلق کی گئی گفتگو کو خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ لیکن یہ شاید ان کی مجبوری بھی تھی۔ کیوں کہ منٹو کی شخصیت اور فن ایک دوسرے میں اس قدر پیوست ہیں کہ غیر شعوری طور پر ایک میں دوسرے کا دخول ہو ہی جاتا ہے۔

منٹو کا سراپا، مصنف اور منٹو کی ملاقاتیں، شراب نوشی، آل انڈیا ریڈیو پر ملازمت، اوپندر ناتھ اشک سے چپقلش، فلمی دنیا سے منٹو کی وابستگی، اور اُس کے مزاج و کردار کے متعلق بہت سی باتوں کے علاوہ منٹو کے افسانوں پر جذباتی قسم کا یہ مضمون ہمدردانہ نقطۂ نظر کا حامل ہے۔ جس میں شخصیت کے ساتھ ساتھ فن پر بھی فنکارانہ تبصرہ ملتا ہے۔ منٹو کے افسانوں کے متعلق کرشن چندر لکھتے ہیں:

> ''منٹو کے افسانے اس کے مزاج اور ماحول کے آئینہ دار ہیں، منٹو اپنے افسانوں کا لباس نفاست سے تیار کرتا ہے۔ ان میں کہیں جھول نہیں آتا، کہیں کچے ٹانکے نہیں ہوتے''[۱]

مصنف منٹو کی کہانی ''ہتک'' کو ایک لازوال اور اردو کی بہترین کہانی اور سوگندھی کو اُردو کے تمام ناولوں اور افسانوی کرداروں سے ممتاز قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"ایک ایک کر کے منٹو نے موجودہ سیاسی نظام کے اندر بسنے والی طوائف کی زندگی کے چھلکے اتار کر الگ کر دیے ہیں۔اس طرح کہ اس افسانے میں نہ صرف طوائف کا جسم بلکہ اس کی روح بھی ننگی نظر آتی ہے۔"[۲]

پچیس صفحے کے اس طویل مضمون میں کرشن چندر نے افسانوی انداز میں منٹو کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالی ہے۔ اس مضمون کی اصل اہمیت اس کا زمانہ اشاعت ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ منٹو کی نظر سے یہ مضمون گزرا تھا یا نہیں۔ لیکن ایک معاصر اور ترقی پسند افسانہ نگار کا منٹو کے ساتھ اس والہانہ محبت کا اظہار بہت سے معاصر ترقی پسندوں کے لیے ضرور تکلیف دہ ثابت ہوا ہو گا۔ کیوں کہ یہی وہ دن تھے جب سرحد کے اس پار منٹو پر عرصہ حیات تنگ کرنے کے منصوبے پر باقاعدہ عمل درآمد شروع کر دیا گیا تھا۔ ترقی پسندوں نے منٹو کا بائیکاٹ جب کہ حکومت نے اُس پر مقدمات قائم کر دیے تھے۔

"منٹو"، ابو سعید قریشی:

ابو سعید قریشی کی کتاب "منٹو" زمانی اعتبار سے منٹو کی شخصیت اور فن پر پاکستان میں شائع ہونے والی سب سے پہلی کتاب ہے۔ ابو سعید قریشی کا شمار منٹو کے قریب ترین دوستوں میں ہوتا ہے۔ منٹو کے ساتھ ان کی دوستی زمانہ طالب علمی سے قائم ہوئی اور تادمِ مرگِ منٹو قائم رہی۔ اس کتاب کا مقصد بھی ایک دوست کے ساتھ بیتی ہوئی یادوں کو مجتمع کرنا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ابو سعید قریشی، حسن عباس اور سعادت حسن منٹو نے ایک ساتھ بہت سا وقت گزارا اور تینوں کے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات انتہائی بے تکلفانہ تھے۔ منٹو کی موت سے پیدا ہونے والے خلا کو اُنھوں نے اس طرح پُر کیا کہ اس کی یادوں کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ زیرِ نظر کتاب انھی یادوں کا مجموعہ ہے جو ایک دوست کی دوسرے دوست کے ساتھ وابستہ تھیں۔ ابو سعید قریشی کی یہ کتاب ادارہ فروغ اُردو، لاہور سے فروری ۱۹۵۵ء میں پہلی بار زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔[۳] مضامین کی فہرست جسے "ترتیب" کا نام دیا گیا ہے دس عنوانات پر مشتمل ہے، جس کی ترتیب اس طرح ہے: تمغہ، رحم دل دہشت پسند، تنا ہو یا ھو، زخمی فصیل، مسجد کے زیر سایہ، بجھتے دیے، کالی روشنیاں، اینٹی فلو جسٹن، کھمبے، یہ منجدھار اور پس ازاں۔

پہلا مضمون جسے "تمغہ" کا نام دیا گیا ہے منٹو کے مضمون "جیب کفن" کے طویل اقتباس پر مشتمل ہے۔[۴] جس کے ذریعے مفلوک الحال، افسردہ اور حساس منٹو سے ہماری ملاقات ہوتی ہے۔ منٹو جس کے بارے میں عمومی تاثر یہی ہے کہ وہ صرف حال میں زندہ رہنے والا شخص تھا، اس اقتباس میں ہمیں اپنی بیوی اور بچیوں کے مستقبل کے لیے فکر مند نظر آتا ہے۔

"رحم دل دہشت پسند" میں منٹو کی تاریخ پیدائش کے ساتھ وہ مشہور و معروف کتبہ درج کیا گیا ہے جو سعادت حسن منٹو نے ظفر زبیری کی آٹو گراف بک پر، نصیر انور کے گھر، ۱۸/اگست ۱۹۵۴ء کو درج کیا تھا۔ اس مضمون کا آغاز بھی ایک طویل اقتباس سے کیا گیا ہے۔ یہ اقتباس ابو سعید قریشی کی اس تحریر کا ہے جو منٹو کی وفات کے بعد ۱۹/جنوری ۱۹۵۵ء کو ریڈیو پاکستان، پشاور سے براڈ کاسٹ ہوئی تھی۔ اس اقتباس میں مصنف نے منٹو سے ابتدائی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کی بے وقت موت پر اظہار افسوس کیا ہے۔ مضمون کے اگلے حصے میں سعادت حسن منٹو کے کمرے کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

"ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی دائیں ہاتھ، یہی کمرہ منٹو کی تحریروں میں دارالاحمر کے نام سے منسوب ہے۔ دروازے کے قریب ہی دیوار کے ساتھ دو کھوکھے رکھ کر ان پر گدا اور گدے کے اوپر ملتانی کھیس بچھا دیا گیا تھا۔ سامنے شمالی دیوار کے
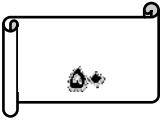
ساتھ، کھڑکی کے قریب لکھنے کی میز تھی۔ اس کے دائیں جانب دیوار میں ایک چھوٹی سی الماری، جو کتابیں الماری میں نہیں سما سکتی تھیں، میز پر دیوار کے سہارے پڑی رہتیں۔ میز کے بائیں جانب آتش دان تھا جس پر بھگت سنگھ کا بُت رکھا رہتا۔ مجسمے کے ایک طرف پیتل کا ٹیبل لیمپ تھا اور دوسری طرف پرانی وضع کے ٹیلی فون کا ریسیور۔" [۵]

مضمون میں منٹو کی شرارتوں، مشاغل، عادات و اطوار، والد کی سخت گیری اور خاندانی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ منٹو کے آخری سالوں کا ذکر کرتے ہوئے اُنھوں نے منٹو کی کثرت شراب نوشی کو اُن کی جلد موت کا سبب قرار دیا۔ کیوں کہ ان دنوں سعادت حسن منٹو ہر وقت نشے میں دھت رہنے لگے تھے۔ وہ سب سے بے نیاز ہو گئے سوائے شراب کے۔ منٹو کے ساتھ ساتھ ابو سعید قریشی اور حسن عباس بھی باری علیگ کی صحبت میں رہ چکے تھے اس لیے ضمنی طور پر مضمون نگار نے باری علیگ کے ساتھ گزرے روز شب اور ان کے اثرات کا ذکر بھی کیا ہے۔ منٹو کے سینے میں دبی بغاوت کی چنگاری کو سلگانے کا سہرا اُنھوں نے باری علیگ کے سر رکھا ہے۔

منٹو بے باک شخصیت کا حامل تھا اور یہ اس کے مزاج ہی کی بے باکی تھی جو اس کی تحریروں میں بھی در آئی تھی۔ چناں چہ وہ عمر بھر ریاکاری کے پیرہن تار تار کرتا رہا۔ مصنف نے منٹو کے افسانہ "صاحب کرامات" کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ منٹو مذہب کی آڑ میں جرائم کرنے والوں کو نہ صرف پہچان لیتا ہے بلکہ اُنھیں بے نقاب بھی کرتا ہے۔

منٹو کی تخلیقی کاوشوں کی ابتدا تراجم کو قرار دینے کے بعد، منٹو کے انقلاب پسند رویے کو مد نظر رکھتے ہوئے ابو سعید قریشی اعتراف کرتے ہیں کہ منٹو میں بھگت سنگھ بننے کی تمام تر صلاحیتیں موجود تھیں۔ "تماشا"، "ہندوستان کو لیڈروں سے بچاؤ" اور "باتیں"، منٹو کی عدل سیاست پر بھرپور طنزیہ تحریریں ہیں۔ ابو سعید قریشی کے مطابق "منٹو" کا پہلا افسانہ "تماشا" خلق کے شمارے میں فرضی نام سے شائع ہوا۔ اپنے مضمون کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"میں نے بھی اپنی دانست میں ایک بڑا انقلاب انگیز مضمون لکھا، "مزدور" یہ مضمون "آدم" یا شاید "ابن آدم" کے فرضی نام سے شائع ہوا۔" [۶]

ابو سعید قریشی کے اس بیان کے بعد اس غلط فہمی کو دور ہو جانا چاہیے کہ "تماشا" منٹو نے آدم کے فرضی نام سے لکھا تھا۔ ابتدائی تراجم، روسی و فرانسیسی ادب نمبروں کی اشاعت اور باری علیگ کی "گمشدگی" کے بعد مصنف نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے دونوں کی ('منٹو' اور مصنف) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ روانگی اور قیام کا تفصیلی ذکر کیا، منٹو کے یونیورسٹی سے اخراج کا سبب وہ رپورٹس تھیں جن کے مطابق منٹو کو دق کا مریض قرار دیا گیا تھا۔

ابو سعید قریشی کا یہ مضمون اسی عنوان سے نقوش کے منٹو نمبر میں بھی شائع ہوا۔ یہ اس کتاب کا سب سے طویل مضمون ہے اور اس کا بڑا حصہ منٹو کی شخصی زندگی کے حوالے سے ہے۔ چوں کہ منٹو کی شخصیت اور فن ایک دوسرے میں گتھے ہوئے ہیں اور منٹو کے فن کو سمجھنے کے لیے اُن کی شخصیت کا سہارا بعض اوقات ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس مضمون میں بھی ہمیں یہی صورت حال دکھائی دیتی ہے۔ مصنف منٹو کی شخصیت کو زیر بحث لاتے ہوئے غیر ارادی طور پر اس کے افسانوں اور دیگر تحریروں کا تذکرہ بھی کرنے لگتے ہیں۔ لیکن جلد ہی اُنھیں احساس ہو جاتا ہے اور وہ دوبارہ اپنی بات کا سلسلہ منٹو کی شخصیت سے جوڑ دیتے ہیں۔ اس طرح یہ مضمون بیک وقت منٹو کی شخصیت اور فن دونوں کا احاطہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔

''تننا ہو یا ہو'' وہ نعرۂ مستانہ ہے جسے دوستوں کا یہ گروہ نشہ کی حالت میں باری علیگ کے حجرے میں لگایا کرتا تھا۔ اسی نعرہ کی مناسبت سے یہ عنوان منتخب کیا گیا ہے۔ مضمون میں مصنف اور منٹو کی اُس ملاقات کا ذکر ہے جو لاہور میں ہوئی تھی۔ مصنف کی تحریر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ منٹو اپنے کسی مقدمہ کے سلسلہ میں لاہور آئے تھے۔ لکھتے ہیں:

> ''سعادت نے معاشرے کی سوگند توڑ ڈالی تھی۔ اُس نے میر امن کے چوتھے درویش کی طرح ''ملک صادق'' (جنوں کے بادشاہ) کی محبوبہ ''گھاٹن'' بو کی ہیروئن پر وہ تیل مل دیا تھا جس سے ''ملک صادق'' کو اپنی سفلی خواہشات کی سڑاند سنگھائی دی تھی۔ یہ بدبو سارے بدن میں پھیل گئی تھی۔ چناں چہ شاہ جنات اپنی اس برہنگی کو دیکھ کر سٹپٹا اُٹھا تھا اور اُس نے دیووں کو بھیج کر اس گستاخ نوجوان کو جس نے اس کی شہوت کا راز افشا کیا تھا، بمبئی سے لاہور کھینچ بلایا تھا تاکہ اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے۔''[۷]

اقتباس اگرچہ طویل ہے لیکن بہت ہی اہم ہے۔ مصنف کے مطابق منٹو تیرہ دسمبر ۱۹۴۰ء کو فرنٹیئر میل کے ذریعے اپنے کسی افسانے پر چلنے والے مقدمہ کے سلسلہ میں لاہور میں آیا تھا۔ متن منٹو کے افسانہ ''بُو'' کی نشان دہی کرتا ہے لیکن تاریخی شواہد مصنف کے اس بیان کی تصدیق نہیں کرتے اور بہت سے شبہات کو جنم دیتے ہیں۔ سب سے پہلا سوال تو یہ اُٹھتا ہے کہ ۱۹۴۰ء میں منٹو کے کون سے افسانے پر مقدمہ چلا تھا؟ دوسرے یہ کہ ''بُو'' کی اشاعت ادب لطیف کے سالنامہ ۱۹۴۴ء میں ہوئی تھی۔ منٹو کے افسانے ''کالی شلوار'' پر سب سے پہلا مقدمہ ۱۹۴۲ء میں ادب لطیف کی اشاعت کے بعد چلایا گیا تھا۔ قیاس اغلب ہے کہ مصنف سے تاریخ اور سال کے بیان میں غلطی ہوئی ہے۔ اگر ایسا کوئی مقدمہ ۱۹۴۰ء میں بنا ہے تو اس کے متعلق کوئی دستاویزی ثبوت میسر نہیں ہے۔

''زخمی فصیل'' کا تعلق دہلی کی یادوں سے ہے۔ مصنف نے منٹو سے دہلی میں ہونے والی ملاقاتوں اور یادوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اُنھوں نے لکھا کہ آل انڈیا ریڈیو پر منٹو نے جب اپنے سو ڈرامے/فیچر مکمل کر لیے تو وہ ریڈیو کے رسالے کے سرِورق پر اپنی تصویر لگوانا چاہتا تھا۔ جب اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو اس کا دل ریڈیو سے اچاٹ ہو گیا اور اس نے بمبئی کے فلمی حلقوں سے خط و کتابت شروع کر دی۔

سرورق پر تصویر کی اشاعت میں ناکامی اور بیٹے کی موت، یہ وہ دو محرک ہیں جنھوں نے منٹو کو دہلی چھوڑنے پر مجبور کیا۔ اوپندر ناتھ اشک کے اس دعویٰ پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے جس کے مطابق اُنھوں نے منٹو کو آل انڈیا ریڈیو سے نکال باہر کرنے کے متعلق لکھا ہے۔ ان کی بات محض اسی حد تک ہی درست تسلیم کی جا سکتی ہے کہ منٹو کی آل انڈیا ریڈیو دہلی میں یہ آخری لڑائی یا شکست تھی۔

''اینٹی فلو جسٹن'' میں منٹو کی کردار نگاری کو ان کے کرداروں بابو گوپی ناتھ، خان، صادق، دودا پہلوان اور ممد بھائی کے ذریعے اُجاگر کیا گیا ہے۔ ان کرداروں کو منٹو کے کامیاب کردار گردانتے ہوئے۔ ''بابو گوپی ناتھ'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''بابو گوپی ناتھ منٹو کی کردار نگاری کا کمال ہے۔ اس کی رندی پر ہزار پارسائی قربان کی جا سکتی ہے۔''[۸]

اگلے مضمون بعنوان ''کھمبے'' میں منٹو کے ایسے کرداروں کو موضوع بنایا گیا ہے جن کا پیشہ دلالی ہے۔ مصنف نے کھمبے کے ساتھ کھڑے ایک شخص کے سائے کو جب اپنی طرف بڑھتے دیکھا جو دراصل دلال تھا تو اسے منٹو کے افسانے سراج کا ایک کردار

''ڈھونڈو'' یاد آگیا جو ہمیشہ ایرانی ہوٹل کے پاس کھمبے سے لگ کر کھڑا رہتا تھا۔ اُنھوں نے ''ڈھونڈو'' کا تجزیہ کرتے ہوئے منٹو کی کردار نگاری اور واقعات کو حقیقت پر مبنی قرار دیا۔ اسی طرح ''سہائے'' کو پیشہ ورانہ طور پر پست قرار دینے کے باوجود اس کے کردار کو بہت بلند قرار دیتے ہیں۔ یہ ''منجدھار'' منٹو کے لکھے گئے ڈراموں پر تبصرہ ہے۔ اس باب میں مصنف نے منٹو کے ڈراموں ''جرنلسٹ''، ''نقشِ فریادی''، ''جیب کترا'' اور ''اس منجدھار میں'' کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ جب کہ آخری مضمون ''پس ازاں'' میں اُنھوں نے منٹو پر لکھے گئے تنقیدی مضامین کو تعصّبانہ قرار دیا۔ چاہے وہ ان کی حمایت میں لکھے گئے یا مخالفت میں۔

دس مضامین پر مشتمل ابو سعید قریشی کی یہ کتاب بیک وقت سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن کے احاطہ کی ابتدائی کوشش ہے۔ چوں کہ منٹو اور ابو سعید قریشی ایک دوسرے کے بہت گہرے دوست تھے لہٰذا منٹو کی موت نے اُنھیں بہت صدمہ پہنچایا۔ اس کتاب میں ابو سعید قریشی کا جذباتی انداز جگہ جگہ چھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر انیس ناگی نے ابو سعید قریشی کی اس کتاب کو ''چوں چوں کا مربہ'' قرار دیا کیوں کہ اُن کے مطابق اس میں شخصیت اور فن کو گڈمڈ کر دیا گیا ہے۔ منٹو پر لکھی گئی سوانحی کتب کا جائزہ لیتے ہوئے انیس ناگی کی یہ رائے درست ہے کہ:

> ''عناصر ترکیبی کے اعتبار سے یہ کتاب چوں چوں کا مربہ ہے۔ سوانح، تنقید، یادیں، سب کچھ آپس میں گڈمڈ ہیں۔ شروع سے لے کر آخر تک شدید جذباتی رنگ تحریر پر چھایا ہوا ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں منٹو کے افسانوں کی جو تشریحات کی گئی ہیں وہ بھی جذباتی ہیں۔''[۹]

دو حصوں پر مشتمل اس کتاب کے پہلے چار مضامین کا تعلق شخصیت سے جب کہ دوسرے حصے ''مسجد کے زیرِ سایہ'' میں شامل مضامین منٹو کے فن کا احاطہ کرتے ہیں۔ گو انداز جذباتی ہے اور انیس ناگی کی رائے حقیقت پر مبنی ہے مگر منٹو پر شائع ہونے والی اولین پاکستانی کتاب کی حیثیت سے اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

''منٹو میرا دوست''، محمد اسد اللہ:

محمد اسد اللہ کی کتاب ''منٹو میرا دوست''، منٹو میموریل سوسائٹی، کراچی کے زیرِ اہتمام ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔ انتساب ''لیلیٰ کے خطوط'' کے مصنف قاضی عبدالغفار کے نام ہے، جس کے بعد ''منٹو'' کے عنوان سے ایک صفحہ پر مشتمل منٹو کی سوانح کا ادھورا خاکہ دیا گیا ہے۔ ''حرفِ آغاز'' ہے جسے کتاب کا مقدمہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے، میں کتاب کی اشاعت میں پیش آنے والی مشکلات اور اپنی مصروفیات کی تفصیلات بتائی گئی ہیں۔ مشکلات کا تعلق مواد کی عدم فراہمی سے ہے جب کہ مصروفیات کا ذمہ دار نامور ادیبوں کی مصنف کے ساتھ وقت بے وقت ملاقاتوں کو ٹھہرایا گیا۔

اپنے اگلے مضمون ''نقطۂ نگاہ'' میں مصنف بیان کرتے ہیں کہ موت کے بعد جن دو لوگوں کو زیادہ اہمیت ملی اُن میں اقبال کے بعد دوسرا نام منٹو کا ہے۔ مصنف نے کتاب کی تصنیف کا مقصد بتاتے ہوئے لکھا کہ:

> ''میں نے کوشش کی ہے کہ میں منٹو کو فرشتہ کے روپ میں دیکھوں اور نہ سرتاپا منٹو کی برائیوں پر نگاہ رکھوں۔ میں منٹو کو ایک انسان کی طرح دیکھنا اور دکھانا چاہتا ہوں۔''[۱۰]

''یادیں'' جو اس کتاب کا اصل باب ہے اور ۱۲۶ صفحات پر مشتمل ہے، میں مصنف نے منٹو کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات سے لے کر منٹو کی موت تک ان سے وابستہ تمام اچھی اور بری یادوں کو مجتمع کیا ہے۔ ان یادوں کا تعلق منٹو کی لاہور کی زندگی سے ہے۔ پاکستان میں مصنف کی منٹو سے پہلی باقاعدہ ملاقات ''سویرا'' کے دفتر میں ہوئی۔ اس کے بعد دونوں کی ملاقاتیں روزانہ صبح وشام ہونے لگیں۔ شاید یہ ان ہی ملاقاتوں کا نتیجہ ہے کہ منٹو کی نجی اور سماجی زندگی میں موجود تمام کمزوریاں اُن کے ہاتھ لگ گئیں۔ مصنف نے اس باب میں منٹو کی بیوی صفیہ کے حوالے سے بھی بہت سی باتیں لکھی ہیں۔ صفیہ مصنف کو اکثر کہا کرتی تھیں کہ منٹو کو دو میں سے ایک چیز چھوڑ دینی چاہیے، افسانہ نگاری یا شراب۔ وہ منٹو کے دوستوں کو بھی برا بھلا ٹھہراتی ہیں خصوصاً پاکستان میں موجود دوستوں کو، اسی طرح صفیہ اُن کے افسانوں کو بھی ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ اس حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''صفیہ کہتی تھیں کہ میں صرف سعادت کو پڑھا کرتی تھی۔ اب یہ جس قسم کی چیزیں لکھتے ہیں وہ قطعاً گھٹیا ہیں۔''[۱۱]

منٹو کو ضدی اور سنکی قرار دیتے ہوئے مصنف کا بیان ہے کہ بہت سے کام وہ ضد میں کیا کرتے تھے۔ ''اس منجدھار میں'' کا شان نزول بتاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ منٹو نے یہ عظیم الشان ڈراما وہسکی کی ایک بوتل کے لیے لکھا تھا۔ لوگ جس چیز سے چڑتے تھے وہ اسے چوک میں لا کر رکھ دیتا تھا اور منع کرنے پر وہ ضد میں آ کر اس کے خدوخال بیان کرنے لگتا تاکہ اس چیز کی حقیقت مزید نمایاں ہو۔ بقول مصنف، منٹو خود تو ہر کسی پر تنقید کرتے تھے لیکن اپنے معاملے میں وہ کسی کو ایک لفظ بھی مخالفت میں بولنے کا اختیار نہیں دیتے تھے۔ وقار عظیم نے جب ایک مضمون میں منٹو کے پاکستان میں لکھے جانے والے افسانوں کو کمزور قرار دیا تو منٹو اس کے خلاف ہو گئے اور جب وہ حد سے بڑھنے لگے تو مصنف نے اُنھیں ایسا کرنے سے سختی سے منع کر دیا:

> ''ایک دن میں نے اُنھیں سختی سے ٹوکا اور کہا آپ کس وہم کس مغالطے میں پڑ گئے ہیں۔ یہ گمان قطعی غلط ہے۔ تنقید کو برداشت کیجیے۔ لوگوں کو اپنے متعلق اپنا نقطۂ نظر بھی پیش کرنے دیجیے اور وقار عظیم جیسے باوقار ناقد کے بارے میں آپ جو کچھ کہ رہے ہیں اس پر ذرا غور کیجیے۔''[۱۲]

اُنھوں نے سبط حسن، علی سردار جعفری، سجاد ظہیر، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، خلش کاشمیری، برج موہن، شیام، اشوک کمار، شاہد لطیف، رفیق غزنوی، خورشید انور، دلیپ کمار، چراغ حسن حسرت، ایس مکرجی اور محسن عبداللہ کے ساتھ منٹو کے تعلقات کا جائزہ لیا۔ مصنف کے مطابق صفیہ ''شیام'' کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی تھی جب کہ منٹو دیوندر ستیار تھی کو۔

آخری دور میں منٹو کی زود نویسی اور شراب نوشی کے لیے ایک ایک سے پیسے مانگنے کی عادت کو مصنف نے ہدف بناتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا کہ عمر کے اس حصے میں منٹو صرف اور صرف شراب کے لیے جیتے تھے اور حصول شراب کے لیے وہ ہر قسم کی زیادتی پر اتر آتے:

> ''منٹو صاحب سے بے شمار لوگ ملنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ آخری دور میں البتہ صرف وہ لوگ آنے لگے جو پہلے کبھی نہ آئے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ منٹو صاحب زیادتی پر اُتر آتے تھے۔ آپ کا ایک پرستار آپ سے ملنے کے لیے آئے تو کیا یہ زیادتی نہیں ہے کہ آپ اس سے دس، پندرہ، بیس روپیہ مانگ بیٹھیں اور لیے بغیر جانے نہ دیں۔''[۱۳]

مصنف نے دعویٰ کیا ہے کہ منٹو کئی بار اس کی جیب پر بھی ہاتھ صاف کر چکے تھے اور اس معاملہ میں وہ کسی قسم کی رعایت نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ مصنف کا مستقبل بھی داؤ پر لگ گیا' وہ امتحان کی فیس جمع نہ کرا سکے اور یوں اُن کا ایک سال ضائع ہو گیا۔ اس طرح کے دو واقعات اور بھی اُنھوں نے درج کیے ہیں جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ منٹو اپنی شراب کی عادت پوری کرنے کے لیے دوستوں کو مصیبت میں ڈال دیتے تھے۔

مصنف کے مطابق منٹو کو آخری عمر میں پیسوں کی اتنی قلت ہو گئی تھی کہ وہ تانگے والے کو کھڑا کر کے اس کا کرایہ ادا کیے بغیر غائب ہو جاتے۔ اپنے پرانے افسانوں کو نیا نام دے کر اشاعت کے لیے دے دیتے اور پبلی شرز سے مکرر معاوضہ لے آتے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اصلاح کے لیے طالب علموں کے دیے گئے افسانوں پر بھی چھری چلانے لگے۔ اُنھوں نے اس الزام کے حقیقی ہونے کی دلالت اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کو قرار دیا۔ مصنف نے منٹو کو اپنا مجموعہ 'نگر نگر کے افسانے' اشاعت سے پہلے دیکھنے کے لیے دیا لیکن:

> ''ایک دن جب میں اُن کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ اس مجموعہ میں سے اُنھوں نے ایک افسانہ نقل کیا تھا اور اس کے خاتمہ پر سعادت حسن منٹو لکھ کر تاریخ درج کر دی تھی اور کہیں باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔''[۱۴]

مصنف کے استفسار پر منٹو کا جواب ملاحظہ ہو:

> ''یار کیا کیا جائے، کچھ لکھا نہیں ہے، پینے کے لیے پیسے نہیں ہیں، سوچا کہ تمہارا ہی افسانہ ٹھکانے لگا آئیں۔''[۱۵]

اس سلسلہ میں مصنف نے مرزا ادیب کی ایک روایت بھی بیان کی ہے کہ گورنمنٹ کالج، لاہور کے کچھ طلبہ منٹو کے پاس اپنے افسانے بغرض اصلاح چھوڑ آئے تھے جو بعد میں ادب لطیف میں منٹو کے نام سے شائع ہوئے تھے۔ مصنف کے بقول 'اعتماد کی کمی، احساس محرومی اور تشنگی نے احساس برتری کی شکل اختیار کر لی اور منٹو اپنے آپ کو واحد عظیم افسانہ نگار کہنے لگا۔ ''ناخن کا قرض'' اور ''دستور'' کے منٹو نمبر کی اشاعت کی خواہش اسی احساس برتری کا نتیجہ ہیں۔ اس سلسلہ میں ادباء اور شعرا سے مضامین لکھوانے کے لیے منٹو کی کوششوں کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ منٹو کی شخصی خامیوں کے ساتھ ساتھ (اگرچہ ان کا ذکر زیادہ ہے) مصنف نے منٹو کو دوست پرور، بچوں سے محبت کرنے والا اور سب کی مدد کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہنے والا شفیق انسان بتایا ہے جو کسی کو بھی مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا۔ مصنف نے تین خطوط کا متن بھی مضمون میں شامل کیا ہے۔ جو منٹو نے ڈاکٹر باقر، پروفیسر عزیز احمد اور اے بی حلیم کو لکھے تھے۔ ان خطوط میں مصنف کو درپیش مسائل کے حل کے لیے مذکورہ شخصیات سے سفارش کی گئی ہے۔ مصنف کو چاہیے تھا کہ ان خطوط کی نقول بھی ضمیمے کے طور پر شامل کرتے۔ اُنھوں نے محض یہ بتانے پر ہی اکتفا کیا ہے کہ یہ خطوط ان کے پاس محفوظ ہیں۔ مصنف کے مطابق منٹو اس بات پر پچھتاتے تھے کہ ''سیاہ حاشیے'' کا مقدمہ اُنھوں نے حسن عسکری سے کیوں لکھوایا تھا اور یہ کہ حسن عسکری کے ساتھ تعلقات کی وجہ سے ہی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیب اور اس کے دوست اس سے ناراض ہو گئے تھے۔ مزید یہ کہ پاکستان میں اس کو دی جانے والی گالیوں کی ابتدا بھی اسی کا نتیجہ تھی۔

''دستور'' کے منٹو نمبر کی اشاعت میں ناکامی کے بعد منٹو ''ناخن کا قرض'' کے نام سے اپنے متعلق ہم عصر ادیبوں کی آرا پر مشتمل ایک کتاب شائع کرانا چاہتے تھے۔ مضمون کے آخری صفحات میں منٹو کی ان کوششوں کی تفصیل دی گئی ہے۔ مصنف کے

مطابق حسن عسکری کے علاوہ باقی تمام ادیبوں نے کچھ نہ کچھ لکھا تھا لیکن حسن عسکری نے اس موضوع پر بات کرنا بھی پسند نہ کی۔ جب کہ آخر میں منٹو کے افسانہ ''اوپر نیچے اور درمیان'' پر چلنے والے مقدمہ کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ منٹو نے اُنھیں یہ تمام تفصیلات خود بتائی تھیں اور یہ مصنف ہی تھے جنھوں نے منٹو کو مشورہ دیا تھا کہ ''اوپر نیچے اور درمیان'' مجموعے کا انتساب وہ مہدی علی صدیقی کے نام کریں۔

محمد اسد اللہ کی اس کتاب میں منٹو ایک ضدی، سنکی، مغرور اور فراڈ قسم کے انسان کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک ایسا انسان جس کی زندگی کا واحد مقصد شراب پینا ہے۔ واقعات کے انتخاب اور بیان کے انداز سے انیس ناگی کی یہ بات سو فیصد درست ہے جس میں اُنھوں نے ''منٹو میرا دوست'' کو منٹو کی کردار کشی کی منظم سازش قرار دیا تھا۔[۱۶]

کم عمری کے باوجود مصنف کی منٹو سے بے تکلفی، منٹو کی بیوی صفیہ کے ساتھ گھنٹوں باتیں، صفیہ کا مصنف کو ''اسد صاحب'' کہہ کر ہمیشہ بلانا، منٹو کو اس کی غلطیوں پر ٹوکنا وغیرہ اور اس قسم کے درجنوں واقعات کا بیان کچھ اس انداز سے کیا گیا ہے کہ ہمیں منٹو کا قد مصنف کے مقابلہ میں بھی چھوٹا دکھائی دیتا ہے۔ کتاب کے مطالعہ کے بعد منٹو کی شخصیت منفی تاثر چھوڑتی ہے۔ اگر ان واقعات کو جو مصنف نے درج کیے ہیں سچ جان لیا جائے تو بھی ان کا انداز بیاں بہت سطحی اور غیر ادبی ہے۔ محمد نوید اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں:

> ''اسد اللہ ان کی خامیوں اور کمزوریوں کو آرٹ نہ بنا سکے بلکہ خامیوں کو برائی بنا کر پیش کیا ہے۔''[۱۷]

کتاب میں حسن عسکری اور منٹو کے تعلق کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے وہ مصنف کے نظریات کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ ڈاکٹر انیس ناگی نے اپنی کتاب ''سعادت حسن منٹو'' میں اسد اللہ کی اس کتاب کا تحقیقی جائزہ لیتے ہوئے بہت پتے کی باتیں کی ہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ مصنف نے منٹو کے ساتھ اپنے گہرے تعلقات ظاہر کرنے کے لیے حد درجہ تخیل اور مبالغہ سے کام لیا ہے۔ وہ ان واقعات کو من گھڑت قرار دیتے ہیں اور مصنف کو خود پسند، جو اپنے آپ کو اُردو ادب کی بہت اہم شخصیت تصور کرتا ہے اور پاکستان کا ہر معروف ادیب اس کا ذاتی دوست ہے اور ہندوستان کی ہر معروف ہستی سے اس کے تعلقات ہیں۔ انیس ناگی مزید لکھتے ہیں:

> ''منٹو میرا دوست کی تصنیف کے وقت مصنف کی عمر ۲۲ سال کی تھی۔ وہ حیدر آباد کا رہنے والا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں وہ پاکستان آیا یعنی ۱۸ سال کی عمر میں وہ دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا دوست تھا اور ہر ادیب اس کا یار غار تھا۔''[۱۸]

یہ بات حیرت انگیز ہے کہ منٹو کے ساتھ اتنی قربت کے باوجود بھی منٹو سمیت اس کے کسی دوست یا نقاد نے منٹو پر لکھے جانے والے اپنے مضامین میں اسد اللہ کا ذکر تک نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسد اللہ ایک عام سا نوجوان تھا جو زمانہ طالب علمی میں ادبی محفلوں میں شریک ہوتا تھا۔ ظاہر ہے اس شراکت کے طفیل ان محفلوں میں شریک تمام ادیبوں کے ساتھ مصنف کی شناسائی ایک فطری امر تھا۔ مصنف نے اس شناسائی کو گہری دوستی کا نام دے کر محض سستی شہرت کے حصول کے لیے ہی یہ کتاب لکھی۔ انیس ناگی نے محمد اسد اللہ کو فراڈ کا خطاب دیتے ہوئے کتاب کو ربط سے عاری، اُسلوب کو بے ڈھنگا اور زبان کو ڈھیلا قرار دیا ہے جس میں منٹو کو ایک گھٹیا قسم کا دریوزہ گر اور معمولی فنکار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

''منٹو میرا دشمن''، اوپندر ناتھ اشک:

منٹو کی شخصیت پر لکھے جانے والے چند بہترین سوانحی مضامین یا خاکوں میں سے ایک بہترین تحریر اوپندر ناتھ اشک کا یہ مضمون ہے۔ جو سب سے پہلے نقوش کے منٹو نمبر میں ''منٹو میرا دشمن'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ مضمون کی ضخامت کے پیش نظر مدیر رسالہ محمد طفیل نے اسے دو حصوں میں شائع کیا۔ بقول مصنف، ان کے اس ''حفاظتی اقدام'' سے مضمون کا سارا تسلسل ٹوٹ گیا اور قارئین نے اسے واقعی منٹو دشمنی سے تعبیر کیا۔ حال آں کہ مصنف نے مضمون اسی شرط پر چھپنے کے لیے دیا تھا کہ اسے مکمل صورت میں شائع کیا جائے گا۔ چناں چہ منٹو کی موت کا تازہ زخم کھائے اردو دانوں نے فوری رد عمل دکھاتے ہوئے صاحب مضمون کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ یہ تمام کہانی اوپندر ناتھ اشک کے ان اقتباسات سے بآسانی سمجھی جاسکتی ہے جو ان کی کتاب کے دیباچہ نما مضمون گزارش احوال، سے لیے گئے ہیں اور ان سے مصنف کی پشیمانی کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔

> ''اور ستم ظریفی یہ کہ پہلی قسط کے آخر میں ''مزید اگلے ایشوع میں'' یا ''ناتمام'' یا کوئی ایسا ہی اشارہ بھی نہیں دیا جس سے معلوم ہو کہ مضمون نامکمل ہے۔''[۱۹]

اس ضمن میں وہ مزید لکھتے ہیں:

> ''یہی نہیں بلکہ اُنھوں نے یہ بھی ظلم کیا کہ اسے دو الگ مضامین کا روپ دینے کے لیے دو حصوں کو جوڑنے والا ایک نہایت اہم پیرا بھی کاٹ دیا جس کی وجہ سے بہت سے ناظرین نے محسوس کیا کہ میں نے یہ مضمون منٹو سے انتقام لینے کے لیے لکھا تھا۔''[۲۰]

نقوش میں اس مضمون کی اولین اشاعت کے بعد مصنف نے بائیس برس بعد یعنی ۱۹۷۷ء میں پہلی مرتّبہ کتابی صورت میں شائع کر کے اس قرض کا بوجھ اپنے دل سے اتارا۔ مصنف کا یہ مضمون منٹو کے ساتھ ہونے والی چپقلشوں کا مفصل بیانیہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کے اوپندر ناتھ اشک اور سعادت حسن منٹو ایک دوسرے کو ناپسند کرتے تھے، لیکن دونوں نے بہت سا وقت اکٹھے گزارا۔ خاص کر ریڈیو اور فلمی دنیا میں گزارے گئے اوقات کے واقعات کے ذکر سے تمام مضمون بھرا پڑا ہے۔ اوپندر ناتھ اشک کا شمار بھی اس زمانے کے متحرک ادیبوں میں کیا جاتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ سعادت حسن منٹو کے مقابلے میں ان کی اہمیت کچھ خاص نہیں تھی لیکن بہر حال وہ ایسے ادیب تھے جو اُردو کے علاوہ ہندی میں بھی کہانیاں لکھتے تھے اور اردو سے بھی زیادہ لکھتے تھے۔ اگر اُنھیں ہندی کا ادیب کہا جائے تو بھی کوئی حرج نہیں ہوتا۔ مقصد یہ کہ ادبی اور شخصی طور پر منٹو کا قد کاٹھ ان سے قدرے بلند تھا۔ آج اردو ادب کی دنیا اگر اوپندر ناتھ اشک کے نام سے بخوبی واقف ہے تو اس کی وجہ وہی مناقشے ہیں جو منٹو اور اشک کے درمیان جاری رہے اور جنھیں مضمون کا روپ دے کر اُنھوں نے شائع کیا۔ اگر وہ یہ کتاب نہ لکھتے تو شاید قصہ پارینہ بن چکے ہوتے۔

منٹو اور اشک کے مزاج و کردار میں بعد زمانی، مکانی تھا، اور یہی وجہ تھی کہ دونوں کے درمیان ہمیشہ ٹھنی رہی وہ لکھتے ہیں:

> ''منٹو کی اور میری افتاد طبع میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ لڑکپن ہی سے دینو یا فضلو کمہار کی دکانوں کے اوپر جمنے والی جوئے کی محفلوں میں شامل ہوتا اور رات کو خواب بھی فلاش ہی کے دیکھتا تھا اور میں نے کبھی تاش کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ

رند بلانوش تھا اور میں نے، شراب تو دور رہی، سگریٹ بھی پہلی بار ۱۹۴۲ء میں پیا۔ اس نے کنٹرہ گھونگیاں ہو، ہیرا منڈی ہو یا فارس روڈ۔ اس بازار کی خوب سیر کی تھی اور میں نے ادھر جھانک کر بھی نہیں دیکھا۔" [۲۱]

مزاج کا یہ فرق دونوں کے تعلقات کی خوشگواری میں ہمیشہ حائل رہا۔ مصنف نے اپنی کتاب میں جتنے بھی واقعات بیان کیے ہیں تمام کی تان کسی نہ کسی مناقشے ہی پر ٹوٹتی ہے۔ اختلافات کا یہ سلسلہ دونوں کی ملاقات سے بھی قبل شروع ہو گیا تھا جب مصنف نے راجندر سنگھ بیدی کی موجودگی میں منٹو کے افسانے "خوشیا" پر سخت رائے دیتے ہوئے اسے "دو کوڑی کی کہانی" قرار دیا تھا۔ جسے بیدی نے منٹو کے آگے ہو بہو دہرا دیا۔ [۲۲] یہ وہ نقطہ آغاز تھا جس نے زندگی بھر دونوں کو ایک دوسرے کے قریب نہ آنے دیا۔ حال آں کہ اوپندر ناتھ اشک منٹو کی مخالفت کا رسک لینے کے حق میں نہیں تھے اور اس سے ٹکرانا نہیں چاہتے تھے لیکن وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کیوں کہ منٹو بطور انسان اور ادیب اوپندر ناتھ اشک کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور بقول مصنف ان سے ہمیشہ تحقیر آمیز لہجے میں بات کرتے تھے۔ چناں چہ منٹو کو نیچا دکھانے کے لیے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مصنف مختلف سازشیں کر کے اسے زچ کرتے رہے۔ منٹو کی کہانیوں پر خواہ مخواہ کے اعتراضات کر کے اسے سیخ پا کرتے رہے، اس کے ڈراموں کے اسکرپٹ میں اصلاح کروا کے دہلی ریڈیو چھوڑنے پر مجبور کرتے رہے، اسے جنس زدہ قرار دیتے رہے اور اپنے آپ کو منٹو سے بڑا نہیں تو اس کی برابری کا دعویٰ کرتے رہے۔ ایک اقتباس دیکھیے:

"میں دانستہ منٹو کے اچھے افسانوں کا ذکر چھوڑ جاتا اور اس کے کمزور افسانوں کی تنقید بڑے زوروں سے کرتا۔۔۔" [۲۳]

لیکن اس تمام تر مخالفت کے باوجود مصنف کی ذات میں منٹو کا پیار مضمون کی آخری سطور میں بخوبی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے جس میں اُنھوں نے کرشن چندر کے اس مضمون کا ذکر کیا ہے جو اُنھوں نے منٹو کی وفات کے بعد "خالی بوتل بھرا ہوا دل" کے عنوان سے لکھا تھا۔ لکھتے ہیں:

"والد سے تو خیر مجھے محبت نہ تھی، لیکن میری ماں جب مریں تو بھی آنسو میری آنکھوں میں نہ آئے اور اب اس مضمون کو پڑھتے ہوئے، جسے میں خام سمجھتا تھا، بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔" [۲۴]

منٹو کی شخصیت پر لکھا گیا یہ طویل مضمون یقینی طور پر بہت خلوص اور اپنے تئیں دیانت داری سے لکھا گیا ہے۔ لیکن ایک چیز جو تمام تر خوبیوں کے باوجود کھٹکتی ہے وہ یہ کہ مصنف نے منٹو کو تو گرفت میں لیا لیکن اپنی سازشوں اور مرتبے کا خیال نہ کیا۔ برابری کی سطح پر جب آپ کسی ایسے شخص کا موازنہ کرتے ہیں جو آپ سے مکمل طور پر مختلف المزاج اور مختلف المرتبہ ہو یقیناً انصاف پر مبنی عمل نہیں۔ اوپندر ناتھ اشک کے ساتھ بھی یہی مسئلہ درپیش رہا۔ شخصی اور ادبی اعتبار سے وہ منٹو کے مقابلے کے آدمی نہ تھے' یہ الگ بات کہ فطری طور پر کوئی بھی شخص اس سچائی کو دل سے قبول نہیں کرتا۔ بہر حال مضمون بہت اچھا اور واقعات مبنی بر صداقت صحیح، اُنھیں اپنی پسند اور اپنے نقطۂ نظر کے ساتھ خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ہمیں منٹو کی شخصیت اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز دکھائی دیتی ہے۔ منٹو کی شخصیت کے اعلیٰ و ارفع پہلو بھی سامنے آتے ہیں اور ادنیٰ و پست پہلو بھی، اس کی تمام بلندی، پستی، فراخ دلی، کم

ظرفی، عظمت اور کم مائیگی غرض تمام خوبیوں اور خامیوں کو انتہائی خلوص اور محبت اور دشمنی کے اعتراف کے ساتھ خوب صورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ یقیناً منٹو کے متعلق لکھے جانے والے سوانحی مضامین میں یہ مضمون منفرد مقام رکھتا ہے۔

''سعادت حسن منٹو اپنی تخلیقات کی روشنی میں (ایک نفسیاتی تجزیہ)''، پروفیسر محمد محسن

۱۲۸ صفحات پر مشتمل، بیس مختصر مضامین کے ساتھ پروفیسر محمد محسن کی یہ کتاب دارالاشاعت ترقی، دہلی نے ۱۹۸۲ء میں شائع کی۔ پاکستان میں یہی کتاب اسی عنوان اور انھی مضامین اور ڈاکٹر اکرام شیخ کے ایک اضافی مضمون کے ساتھ، سٹی پوائنٹ کراچی نے ۲۰۱۲ء میں شائع کی۔ لیکن پبلشر جلد بازی میں ایک سنگین غلطی کا ارتکاب کر بیٹھے اور وہ غلطی یہ تھی کہ کتاب کے مصنف کا نام محمد محسن کی بجائے محمد حسن چھاپ دیا۔ پروفیسر محمد محسن کی طرح ڈاکٹر محمد حسن بھی نہ صرف یہ کہ اُردو کے معروف نقاد ہیں بلکہ منٹو کے متعلق اُن کی تنقید حوالے کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ منٹو کے ہم عصر تھے اور منٹو کی وفات کے بعد اُن کا ایک مضمون ''ایک شہید کی یاد میں'' مشرب کراچی کے خاص نمبر ۱۹۵۵ء میں بھی شائع ہوا تھا۔ منٹو کی موت پر اُن کا یہ جملہ خاصا مشہور ہوا تھا کہ ''آج دوسری بار برناڈ شا کی موت واقع ہوئی''اس کے علاوہ بھی اُنھوں نے کئی مضامین میں منٹو کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے۔

پروفیسر محمد محسن کی یہ تصنیف منٹو شناسی کی روایت میں اپنے منفرد اور اچھوتے طریق مطالعہ کی وجہ سے خاصی اہمیت اور شہرت رکھتی ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں سعادت حسن منٹو کی شخصیت کے تناظر میں اُن کی فنی اسرار و رموز کا علم نفسیات کی روشنی میں جائزہ لیا ہے۔ منٹو پر کی گئی اب تک کی تنقید میں یہ اپنی نوعیت کی واحد اور اکلوتی مثال ہے۔ اپنی کتاب کے پیش لفظ میں اُنھوں نے قارئین کو تاکید کی ہے کہ کتاب کے مندرجات حقائق پر مبنی ہیں اور اُنھیں منٹو کی تخلیقات سے ہی اخذ کیا گیا ہے۔ لہذا مطالعہ کرتے وقت ان نکات کو ذہن نشین کر لیں و گرنہ وہ اس تجزیے کی معقولیت کو کماحقہ پرکھ نہ سکیں گے۔

کتاب کے بغور مطالعے کے بعد مصنف کی اس تاکید میں صداقت بھی دکھائی دیتی ہے۔ کتاب کا نصف اول حصہ منٹو کے خاندانی حالات، منٹو کی ابتدائی زندگی، منٹو کی فلمی دنیا سے وابستگی، منٹو کی زندگی کا آخری دور، منٹو کی ازدواجی زندگی، منٹو کی عادات و خصائل، منٹو کا مزاج اور افتاد طبع، منٹو کے جنسی رجحانات، منٹو کی فحش نگاری اور منٹو کے افسانوں کے کلیدی کردار پر مشتمل ہے، سرسری مطالعہ کرنے والوں کو ان مضامین میں کوئی خاص بات یا نیا پن دکھائی نہیں دیتا۔ والد کی سختی، منٹو کی شرارتیں اور مشغلے، فلمی دنیا کا ماحول، پاکستان میں منٹو کی حالت زار، بیوی اور بچوں سے محبت وغیرہ ایسی حقیقتیں ہیں جن پر سعادت حسن منٹو کے بیشتر ناقدین، محققین اور سوانح نگار بارہا روشنی ڈال چکے ہیں۔ لیکن کتاب کے نصف آخر حصے میں مصنف نے ان حالات و واقعات کے نتیجے میں منٹو کی شخصیت پر پڑنے والے اثرات اور شخصیت کی تعمیر میں جو کردار ادا کیا اُن اثرات کا اظہار بقول مصنف، منٹو کی تحریروں میں در آیا۔ پروفیسر محمد محسن کے مطابق یہ بات درست ہے کہ منٹو کی پوری زندگی جنسی آلودگی سے پاک رہی لیکن یہ بھی درست ہے کہ وہ جنس کے ساتھ رغبت رکھتے تھے۔ ورنہ مارلن ڈیٹرخ کی ٹانگیں اور کشمیری چرواہی کی کہنی اُسے بے تاب نہ رکھتی۔ وہ جنسی خواہشات جن سے زندگی بھر بظاہر منٹو لاتعلق رہے اور شعوری طور پر ان سے اجتناب برتتے رہے، اُن کی تحریروں میں وہ لاتعلقی اور اجتناب سرے سے مفقود ہے۔ فلمی ستاروں کے لکھے گئے خاکے اور بعض افسانے اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ مصنف کے بقول منٹو کے افسانوں میں جہاں مختلف جنسی اشارے ملتے ہیں وہیں عورت کے سینے کے مختلف پہلوؤں کا ذکر خاص طور پر قابل غور ہے:

"ان میں سے اکثر افسانوں میں منٹو عورت کے سینے کا مختلف پہلوؤں سے ذکر کرتا ہے۔ اور بعض افسانوں میں اس کی تکرار اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار کے خیال میں عورت کے جسم کا سب سے مرغوب اور پر کشش حصہ اس کا سینہ ہی ہے۔" [۲۵]

بقول مصنف ایسے افسانوں میں منٹو اپنے آپ کو کردار کے طور پر شامل نہیں کرتے۔ حال آں کہ اپنے اکثر افسانوں میں منٹو خود کو کرداروں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ ایسے افسانوں کی تعداد اچھی خاصی ہے جن میں عورت کے سینے اور اس کی جزئیات پر منٹو اپنے قارئین کو دعوت نظارہ دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ بقول مصنف:

"یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شاید ہی اُردو کے کسی افسانہ نگار نے عورت کے سینے کی ایسی تفصیلی تشریح و بیان اتنے تواتر سے کیا ہوگا۔" [۲۶]

کتاب میں شامل مضمون "منٹو کی شخصیت کا تضاد اور بے ربطی" میں سعادت حسن منٹو کی شخصیت کے تضادات کا بیان خوب ہے۔ ایک شراب کے رسیا شخص سے عموماً جس قسم کی بد مذاقیوں کی توقع کی جاتی ہے منٹو کے ہاں اُن کا چلن دور دور تک دکھائی نہیں دیتا۔ شراب پی کر اُنھیں کبھی بہکتا یا لہکتا ہوا نہیں دیکھا گیا۔ آخری عمر تک وہ خانگی ذمہ داریوں کو مقدور بھر نبھاتے رہے۔ شراب کا رسیا ہونے کے باوجود شراب کو سماج کے لیے لعنت گردانتے تھے۔ اس کے باوجود کہ اُن پر اُن کی فحش تحریروں کی وجہ سے متعدد بار مقدمات چلائے گئے لیکن:

"عورت کی عریانی کا منظر منٹو کی آنکھوں میں کھٹکنے لگتا ہے وہ اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ نور جہاں کی کھڑکیوں والی جالی دار شلوار اور قمیض کی طرف سے اپنی "زخمی نگاہیں" ہٹا کر منٹو سوبھنا سمر تھ کے پاس چلا جاتا ہے جو "مستور" تھی۔" [۲۷]

لیکن اپنی تحریروں میں منٹو ایک بالکل متضاد شخصیت کے طور پر سامنے آتے ہیں جو جنسی رغبت کی زیادتی کی وجہ سے رفیق غزنوی کو تو حرامزادہ کہہ دیتے ہیں لیکن اپنے افسانے "اللہ دتہ اور کتاب کا خلاصہ" میں وہی منٹو باپ بیٹی کے جنسی تعلقات کو موضوع بناتا ہے۔

شخصیت کے ان تضادات کی فہرست میں وہ ان تفصیلات کی کمی کا ذکر بھی کرتے ہیں جو منٹو کی شادی کے متعلق ہیں حال آں کہ اُن کی ازدواجی زندگی انتہائی خوشگوار تھی۔

"منٹو کے بعض افسانوں میں عورت کے سینے کی اشتعال انگیز تصویر کشی" میں مصنف ایک بار پھر منٹو کے اس مرغوب جنسی حصے کو اپنا موضوع بناتے ہوئے اسے منٹو کے لاشعور کا کرشمہ گردانتے ہیں۔ مصنف کے نزدیک منٹو عورت کے سینے کو محض اضطراری طور پر بلا سوچے سمجھے اپنے افسانوں کی زینت بناتے ہیں۔ منٹو کی شراب نوشی اور پھر ان کا رند بلا نوش ہونے کا ڈنکا پیٹنے کے پیچھے بھی مصنف کو نفسیاتی عوارض کی کار فرمائی دکھائی دیتی ہے۔ بقول مصنف:

"اس طرح مئے نوشی پر اخلاقی پابندی کی خلاف ورزی کر کے وہ غیر اخلاقی حیوانی تقاضوں کی پاسداری کا ثبوت پیش کرتا تھا۔" [۲۸]

پروفیسر محمد محسن نے اپنی کتاب میں سعادت حسن منٹو کی شخصی اور تخلیقی زندگی کا نفسیاتی نقطۂ نظر سے بہت عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ خاص کر اُس زمانے میں جب منٹو پر رسائل کے خصوصی شماروں میں چھپنے والے مضامین، گنتی کی چند جذباتی اور تاثراتی کتب کے علاوہ منٹوانہ تنقید کا میدان سنجیدہ تنقید سے بالکل خالی پڑا تھا۔

''منٹو کا فن''، سید وقار عظیم:

سید وقار عظیم کا یہ طویل مضمون اعجاز پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی نے ۱۹۸۲ء میں کتابی صورت میں شائع کیا۔ سب سے پہلے یہ مضمون نقوش لاہور کے منٹو نمبر مطبوعہ ۱۹۵۵ء میں منٹو کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ بعد میں یہی مضمون صہبا لکھنوی کی مرتّبہ ''منٹو ایک کتاب'' مطبوعہ ۱۹۹۴ء اور غلام زہرہ کی تالیف ''منٹو کیا تھا'' مطبوعہ ۲۰۰۳ء کے علاوہ سید وقار عظیم کی تنقیدی کتاب ''داستان سے افسانے تک'' مطبوعہ ۲۰۰۲ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

سید وقار عظیم کا دو حصوں پر مشتمل یہ طویل مضمون فنی اور فکری سطح پر منٹو کا ایسا تفصیلی جائزہ ہے جس میں اس کی خوبیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ تمہید میں اُنھوں نے منٹو کے باب میں کی جانے والی تنقید کو غیر جانبدار کم اور جانبدارانہ زیادہ کہا ہے۔ یہ جانبداری اس کے حق میں بھی برتی گئی اور مخالفت میں بھی بقول مصنف:

> ''کچھ نظریں اس بات کی عادی ہو گئی ہیں کہ اسے حسن کا مجسمہ سمجھ کر دیکھیں اور کچھ نگاہوں کو اس میں برائی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔''[۲۹]

اس جانبدارانہ رویے اور شدت پسندی نے منٹو کی اصل حقیقت تک پہنچنے اور کھوٹے کھرے کو پہچاننے کا موقع ہی فراہم نہیں کیا۔ اس جانبداری اور اختلافی نقطۂ نظر کے باوجود جو منٹو کے موضوعات خصوصاً جنس کے موضوع پر ناقدین نے روا رکھا، منٹو کی اصل پہچان اس کا فن ہے۔ منٹو نے متنازعہ اور غیر متنازعہ موضوعات کی پیش کش اپنے پڑھنے والوں کے لیے کس انداز میں کی اصل چیز یہ دیکھنے والی ہے۔ مصنف نے فنی نقطہ نگاہ سے منٹو کی ان خوبیوں کا تفصیلی ذکر کیا جو بطور افسانہ نگاران کے کسی دوسرے معاصر کو حاصل نہ تھیں۔ افسانے کی تمہید، وسط، اختتام اور پھر وحدت تاثر؛ یہ وہ خوبیاں ہیں جو منٹو کا طرہ امتیاز ہیں۔ مصنف نے منٹو کے بہت سے افسانوں کے تمہیدی اور اختتامی جملے بطور اقتباس درج کر کے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ منٹو کے افسانوں کی ساخت، ترتیب، تشکیل اور تعمیر کا ذکر کرتے ہوئے اُنھوں نے منٹو کے افسانوں کی تمہید، اس کی اٹھان، واقعات کا اتار چڑھاؤ، پیچ اور الجھاؤ کے بعد افسانے کا نقطہ عروج، ظاہرہ ہیئت اور اس ہیئت کے مجموعی تاثر کا تذکرہ عمدگی سے کیا۔ مصنف کے بقول منٹو کا یہ کمال ہے کہ وہ معمولی سے معمولی بات کے اظہار کے لیے بھی غیر معمولی انداز اختیار کرتا ہے۔ اُنھوں نے منٹو کی دیگر فنی خوبیوں، مثلاً جذبات نگاری، جزئیات نگاری، مرقع نگاری، تشبیہات و استعارات اور کنایوں کا استعمال، الفاظ اور فقروں کی تکرار اور ان کے استعمال میں تضاد کی نشاندہی بھی خوب کی ہے۔

منٹو کی کامیاب کہانیوں کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے منٹو کی ناکام کہانیوں کا بھی کتاب کے آخر میں ذکر کیا ہے۔ مصنف کے مطابق:

''ان ناکام کہانیوں کے پیچھے اس خطرناک زود نویسی کا ہاتھ ہے جو عمر کے آخری دور میں منٹو نے اپنے فن کے ساتھ برتی۔ مثلاً ''منٹو کے مجموعے'' ٹھنڈا گوشت کے سب افسانے (سوائے ٹھنڈا گوشت) ۲۳ اور ۳۱ جولائی ۱۹۵۰ء کے درمیان لکھے گئے ''بادشاہت کا خاتمہ'' کے سب افسانے یکم جون ۱۹۵۰ء اور ۱۴ جون ۱۹۵۰ء کے درمیان لکھے گئے۔ اسی طرح 'یزید' کے سب افسانے ۱۴ اکتوبر اور ۱۵ نومبر ۱۹۵۱ء کے درمیان لکھے گئے۔''[۳۰]

مضمون کے اختتام پر وہ منٹو کے افسانوں میں درج ذیل خامیوں جن میں سکینڈل کو افسانوں کا موضوع بنانا، گرمی اور ہنگامہ پیدا کرنے کے لیے چونکا دینے والی باتیں کہنا، طنز کو اصلاح کی بجائے زہر خند بنانا اور جنس پر توجہ کرنا وغیرہ شامل ہیں، کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لیکن ان خرابیوں کے باوجود ان کا مشاہدہ، تخیل، کردار نگاری، فکر و احساس، غیر معمولی قوت و توانائی اسے کبھی مرنے نہیں دے گی۔

''منٹو: نوری نہ ناری''، ممتاز شیریں:

ممتاز شیریں کی کتاب ''منٹو: نوری نہ ناری'' پہلی بار ۱۹۸۵ء میں آصف فرخی نے مرتّب کر کے مکتبہ اُسلوب کراچی سے شائع کی۔ جب کہ دوسری مرتّبہ شہر زاد، کراچی نے اسے ۲۰۰۴ء میں شائع کیا۔ پہلے ایڈیشن میں آصف فرخی (مرتّب) کے ''حرف چند'' (مقدمہ) اور ایک مضمون ''ممتاز شیریں فن و شخصیت'' کے علاوہ مظفر علی سید کا مضمون ''منٹو: ممتاز شیریں کی نظر میں'' بطور دیباچہ شامل ہے 'جب کہ دوسرے ایڈیشن میں خالدہ حسین کے تبصرہ نما مضمون ''نوری نہ ناری'' کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ خالدہ حسین کا مضمون کتاب کی اولین اشاعت کے بعد ''ماہ نو'' میں شائع ہوا تھا۔ علاوہ ازیں پہلے ایڈیشن میں شامل مرتّب کے ''حرف چند'' کو دوسرے ایڈیشن میں بطور مقدمہ شامل کیا گیا ہے۔ دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کے اسباب اور تفصیلات ''دیباچہ طبع دوم'' میں بیان کیے گئے ہیں۔

اشاعت اول میں ممتاز شیریں کے مندرجہ ذیل نو (۹) مضامین شامل ہیں:

۱۔ یہ خاکی اپنی فطرت میں ۲۔ ترغیب گناہ ۳۔ کفارۂ گناہ ۴۔ دوسرا گناہ
۵۔ منٹو اور بیدی پر مغربی افسانے کا اثر ۶۔ منٹو کا تغیر اور ارتقا ۷۔ منٹو کی فنی تکمیل
۸۔ ادب میں انسان کا تصور ۹۔ منٹو ایک اخلاقی فنکار

ان مضامین کے علاوہ ''بنیادی گناہ: جنس''، ''منٹو کی بہترین اور نمائندہ تحریریں'' اور ''منٹو کی یاد میں'' بطور ضمیمہ جات شامل تھیں۔ دوسری اشاعت میں ''بنیادی گناہ جنس'' کو جو اشاعت اول میں بطور ضمیمہ شامل تھا، مضامین میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اس طرح دوسرے ایڈیشن میں شامل مضامین کی تعداد دس (۱۰) بنتی ہے۔ ضمیمہ جات اب بھی تین ہیں اور ان میں ممتاز شیریں کے مضمون ''منٹو ہمارا موپساں'' کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مقدمہ میں آصف فرخی نے کتاب کی اشاعت کے سلسلہ میں پیش آنے والی مشکلات، ممتاز شیریں کے خاوند جاوید شاہین کی معاونت اور کتاب میں شامل مضامین کی تلاش کا احوال بیان کیا ہے۔ ممتاز شیریں کے یہ مضامین جن رسائل میں شائع ہوئے تھے مرتّب نے ان کی نشان دہی بھی کر دی ہے۔ مقدمہ کے بعد ''ممتاز شیریں فن اور شخصیت'' میں مرتّب نے مصنفہ کی شخصیت اور فن کا تنقیدی اور ارتقائی جائزہ لیا۔

چوں کہ ممتاز شیریں منٹو پر اپنی کتاب مکمل کرنے سے پہلے ہی انتقال کر گئیں اس لیے اُنھوں نے کتاب کا جو خاکہ تجویز کیا تھا، دو مضامین کی عدم دستیابی کے سبب مرتّب کو اس میں تبدیلی لانا پڑی' چناں چہ اُنھوں نے منٹو سے متعلق ممتاز شیریں کے لکھے گئے تمام مضامین کو اس کتاب میں یک جا کر دیا۔ مظفر علی سید کا مضمون ''منٹو: ممتاز شیریں کی نظر میں دیباچے کے طور پر شامل کیا گیا ہے، مظفر علی سید کا یہ مضمون اس سے پہلے ''قند'' کے ممتاز شیریں نمبر میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں مظفر علی سید اُن وجوہات کا جائزہ لیتے ہیں جن کی وجہ سے ممتاز شیریں پہلے منٹو سے گریز کرتی رہیں اور بعد میں ایسی گرویدہ ہوئیں کہ بس اسی کی ہو کر رہ گئیں۔

خالدہ حسین کا تبصرہ نما مضمون ''نوری نہ ناری'' پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد ''ماہِ نو'' میں شائع ہوا تھا۔ مضمون نگار نے اس کتاب کو نہ صرف منٹو کی بازیافت قرار دیا بلکہ مصنفہ کے انکشاف ذات سے بھی تعبیر کیا۔

ان تعارفی اور ابتدائی مضامین کے بعد ممتاز شیریں کا مضمون ''یہ خاکی اپنی فطرت میں'' منٹو کے فطری انسان سے بحث کرتا ہے۔ ممتاز شیریں کی بھی محمد حسن عسکری کی طرح یہ رائے ہے۔ کہ منٹو آخری دور میں فن کی بلندیوں کو پہنچا اور اس دور کا آغاز ''بابو گوپی ناتھ'' سے ہوتا ہے۔

منٹو کے افسانوں میں موجود انسانوں کو فطری انسان قرار دیتے ہوئے ممتاز شیریں لکھتی ہیں کہ منٹو کا وہ انسان جس کے دفاع میں اس نے موجودہ ماحول، مروجہ اخلاقی قدروں اور سماجی پابندیوں سے بغاوت کی تھی فطری انسان تھا گو کہ ترقی پسند تحریک کے قیام نے ادب میں سیاسی انسان کا تصور پیش کیا اور ہمارے بیشتر ادیب انسان کے سیاسی تصور کو پیش کرنے لگے 'لیکن منٹو واحد ایسا فنکار تھا جس کے ہاں انسان اپنی فطری حالت میں ملتا ہے۔ گو کہ اپنے ابتدائی دور میں منٹو نے ''شغل''، ''نعرہ'' اور ''نیا قانون'' لکھے جن میں انسان کا سیاسی تصور موجود ہے لیکن ان افسانوں میں بھی منٹو کا مطمع نظر فطرت کی عکاسی ہی تھا۔ اس حوالے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''منٹو کی تحریروں میں کہیں کہیں سیاسی انسان کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے چناں چہ ابتدائی دور میں جب منٹو پر روسی ادب، خصوصیت سے گور کی کا اثر تھا۔ مثلاً ''شغل''، ''نعرہ''، ''نیا قانون'' وغیرہ میں سیاسی انسان موجود ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ فرق سطحی ہے کیوں کہ منٹو کا یہ سیاسی انسان بھی فطری انسان ہی کا پر تو ہے۔'' [۳۱]

اُنھوں نے ''شغل''، ''نعرہ''، ''نیا قانون''، ''بُو'' اور ''ٹیڑھی لکیر'' کے کرداروں کو فطرت کے عین مطابق قرار دیا۔ وہ سردار جعفری کی اس رائے سے اختلاف کرتی ہیں جس میں اُنھوں نے کہا تھا کہ ''منٹو نے ان افسانوں میں ایسے کردار پیش کیے ہیں جن سے سرمایہ داری نظام نے ان کی انسانیت چھین لی ہے۔

ممتاز شیریں کے مطابق منٹو نے ان افسانوں میں مختلف حالات و واقعات کے تحت انسان کی اصل فطرت کو ابھارا ہے۔ اسی طرح سجاد ظہیر کی ''بو'' کے بارے میں دی گئی اس رائے سے کہ ''یہ بورژوا طبقے کے ایک فرد کی بے کار، بے مصرف، عیاشیانہ زندگی کا تجزیہ ہے'' اختلاف کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''مارکسی تنقید کسی نزاکت اور گہرائی کو سمجھے اور محسوس کیے بغیر، ہر چیز کو 'طبقاتی شعور' کی لاٹھی سے ہانک دیتی ہے۔'' [۳۲]

ممتاز شیریں کے مطابق معاشرتی اقدار اور بند شیں انسان کی فطری جبلتوں اور خواہشوں کے آگے رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ چناں چہ اس طرح فطری انسان گھٹن اور کجروی کا شکار ہو جاتا ہے۔ منٹو کے ہاں اس گھٹن، کجی اور گمراہی کے حامل فطری انسان کے کئی روپ سامنے آتے ہیں۔ یہ انسان کبھی ''بانجھ پن'' اور ''گھٹن'' کا شکار دکھائی دیتا ہے اور کہیں بزدل اور ریاکار، کہیں ''میرا نام رادھا ہے'' کا راج کشور اور کہیں ''پانچ دن'' کا ریاکار پروفیسر۔

''بابو گوپی ناتھ'' کو وہ منٹو کے فطری انسان کی ارتقائی صورت قرار دیتی ہیں۔ یہاں پہنچ کر منٹو کا فطری انسان اب ''نامکمل انسان'' کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اُنھوں نے ''بابو گوپی ناتھ'' راج کشور'' کے متضاد کرداروں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ راج کشور اپنے ریاکار اور میلے باطن پر نوری قبا اوڑھے جھوٹ موٹ کا فرشتہ بنا ہوا ہے جب کہ گوپی ناتھ اور شیام پر کٹے فرشتے سہی، بہر حال فرشتے ہیں۔ لیکن منٹو، نوری فرشتوں سے جن میں گناہ کرنے کی صلاحیت ہی نہیں کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ وہ تو انسان اور اُس کی جرأت گناہ کا قائل ہے۔ اس حوالے سے مصنفہ مضمون کے آخر میں لکھتی ہیں:

> ''منٹو کا انسان نوری ہے نہ ناری، منٹو کا انسان آدم خاکی ہے۔ وہ وجود خاکی جس میں بنیادی گناہ، فساد، قتل وخون وغیرہ کا امکان ہونے کے باوجود جس کے سامنے خدا نے نوری فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا۔'' [۳۳]

''ترغیب گناہ'' میں منٹو کے ان کرداروں سے بحث کی گئی ہے جن میں عورت گناہ اور ترغیب کا مجسمہ دکھائی دیتی ہے۔ مصنفہ کے مطابق عورت میں گناہ کی ترغیب روز ازل سے رکھ دی گئی ہے۔ اس لیے وہ مردوں کے مقابلہ میں گناہ کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ منٹو کے افسانوں میں اس ترغیب کی مختلف صورتیں دکھائی دیتی ہیں لیکن منٹو نے صرف عورت کو برائی یا ترغیب ہی کا منبع قرار نہیں دیا بلکہ اسے معصومیت اور معصیت کا مجموعہ بھی قرار دیا۔ اس طرح منٹو کے افسانوں میں موجود عورت بیک وقت ترغیب بھی دیتی ہے اور معصوم بھی دکھائی دیتی ہے۔

''کفارۂ گناہ'' میں عورت میں موجود مامتا پر بحث کی گئی ہے۔ عورت جو اولین گناہ کے بعد اس کا کفارہ زچگی کی صورت میں ادا کرتی ہے، اس کا تعلق سماج کے کسی بھی طبقے سے کیوں نہ ہو فطری طور مامتا کے جذبے سے معمور ہوتی ہے۔

وہ عورت کی فطرت میں مادرانہ اور نفسیاتی جذبات کی بیک وقت موجودگی پر یقین رکھتی ہیں۔ جانکی، زینت، شاردا، برمی لڑکی، شوبھا، ممی، سوگندھی اور سلطانہ کے کرداروں کا تفصیلی تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اُنھوں نے ان کرداروں میں طوائفیت کے باوجود عورت اور مامتا کے جذبات پر بحث کی ہے۔ منٹو کے افسانوی کرداروں میں یہ دونوں عناصر اُس کے ابتدائی دور سے لے کر آخری دور تک کے افسانوں میں برابر دکھائی دیتے ہیں۔

''دوسرا گناہ'' میں ممتاز شیریں یہ استدلال قائم کرتی ہیں کہ جنس کی طرح قتل و غارت بھی انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ چناں چہ فسادات میں ان جذبوں کا بیک وقت مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ لیکن منٹو اس قتل و غارت اور درندگی کے باوجود بنیادی جذبہ انسانیت کو قرار دیتے ہیں۔ انسان چاہے وہ کسی بھی حالت میں ہو منٹو اس سے مایوس نہیں ہوتے۔

''منٹو اور بیدی پر مغربی افسانے کا اثر'' میں منٹو کو موپساں سے جب کہ بیدی کو چیخوف سے متاثر قرار دیا گیا ہے۔ چیخوف اور موپساں کے فن کا تفصیلی جائزہ لیتے کے بعد اُنھوں نے اُردو کے ان دونوں افسانہ نگاروں کے موضوعات اور تکنیک کا چیخوف اور موپساں سے تقابل اور اثرات پر روشنی ڈالی۔

موپساں ہی کا اثر ہے کہ منٹو کے دوسرے دور کے افسانوں میں انسان کا وہ تصور اُبھرتا ہے جو انسان کے وحشیانہ اور ہیجانی جذبات سے تعلق رکھتا ہے جب کہ بیدی کا رویہ چیخوف کی طرح ان موضوعات پر ہمدردانہ اور مشفقانہ ہے۔ منٹو اور چیخوف کے موضوعات کا تقابل کرتے ہوئے مصنفہ لکھتی ہیں:

> ''منٹو نے بھی موپساں کی طرح زندگی کا زہر اس طرح چکھا تھا کہ اس کی تلخی کام و دہن سے اتر کر قلب و روح تک پہنچ گئی لیکن پھر بھی منٹو نے موپساں کی طرح ہمیں یہی احساس دلایا کہ انسان میں بدی ہے، بدصورتی ہے، گندگی ہے، حیوانیت ہے، لیکن انسان پھر بھی خوبصورت ہے۔'' [۳۴]

''منٹو کا تغیر اور ارتقاء'' ممتاز شیریں کے تنقیدی مجموعہ ''معیار'' سے لیا گیا ہے۔ اس سے قبل یہ مضمون ''منٹو ایک فنکار'' کے عنوان سے ''افکار'' کے منٹو نمبر میں اشاعت پذیر ہوا۔ مضمون نگار کے مطابق تقسیم کے بعد منٹو کے افسانوں میں ایک نمایاں ارتقا پایا جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ منٹو نے پہلے دور میں اچھے افسانے نہیں لکھے تھے بلکہ دوسرے دور میں قد کے لحاظ سے ''بابو گوپی ناتھ'' ٹھنڈا گوشت'' کے علاوہ ان کے مجموعوں میں شائع ہونے والے دیگر افسانوں کو وہ خاص اہمیت نہیں دیتیں۔ لیکن موضوع، اُسلوب اور تکنیک کے اعتبار سے تقسیم کے بعد کے افسانے ایک اہم تغیر اور ارتقاء کا پتہ دیتے ہیں۔ ''ٹھنڈا گوشت'' کو وہ منٹو کے فن کا مکمل نمونہ قرار دیتی ہیں جس میں ایک لفظ کی بھی کمی بیشی نہیں کی جاسکتی۔ مضمون نگار کے مطابق ''ٹھنڈا گوشت'' اور ''بابو گوپی ناتھ'' میں منٹو کا فطری انسان ترقی کرتا ہوا'' نامکمل انسان'' بن گیا ہے۔ فطری اور نامکمل انسان اور سیاسی و سماجی انسان کے مباحث جو وہ اپنے گزشتہ مضامین خصوصاً ''منٹو اور بیدی پر مغربی افسانے کا اثر'' میں بیان کر چکی ہیں یہ مضمون اُن نتائج کی تکرار محض ہے۔

''منٹو کی فنی تکمیل'' بھی تنقیدی مجموعہ ''معیار'' سے لیا گیا ہے۔ ''بابو گوپی ناتھ'' کو منٹو کے فن کا ایک اہم موڑ قرار دیتے ہوئے مضمون نگار منٹو کی دو تحریروں سڑک کے کنارے اور ڈراما 'اس منجدھار میں' کو منٹو کی ادبی تکمیل کا مظہر گردانتی ہیں۔ ان دو تحریروں میں ایک تکمیل، ایک وسعت اور کائناتی گہرائی کا احساس موجود ہے۔

ان کے مطابق ''اس منجدھار میں'' کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ منٹو کے ویژن میں وہ وسعت پیدا ہو چلی تھی جو انفرادی اور خصوصی کو آفاقی اور کائناتی میں تحلیل کر دے۔ ''سڑک کے کنارے'' میں بھی ایک خاص واقعہ ہی کو بیان کیا گیا ہے لیکن یہاں بھی خصوصیت آفاقیت میں حلول کر گئی۔ منٹو نے اخبار میں چھپنے والی چند سطروں میں جو المیہ تلاش کیا ہے وہ عورت اور ماں کا المیہ ہے۔ گو کہ منٹو کا تصور جنس ہمیشہ صحت مندانہ رہا ہے اور وہ اسے ازلی اور فطری سمجھتا رہا ہے لیکن پہلے منٹو کے ہاں جنس کا تصور محض جسمانی تھا۔ 'سڑک کے کنارے' میں منٹو کا تصور جنس اتنا بلند ہو چکا ہے کہ اسے منٹو نے وجود کی تکمیل اور روحوں کے ملاپ سے تعبیر کیا ہے، لکھتی ہیں:

''خارجی حقیقت کا پردہ چاک کر کے منٹو ہمیں یہ باطنی حقیقت دکھاتا ہے تو صرف ایک روح نظر آتی ہے۔ ایک عورت اور ایک ماں کی زخمی، پھڑ پھڑاتی ہوئی روح۔''[۳۵]

''ادب میں انسان کا تصور'' اور منٹو ایک اخلاقی فنکار'' پہلی بار ''قند'' کے ممتاز شیریں نمبر میں شائع ہوئے۔ یہ دونوں مضامین ممتاز شیریں نے عمر کے آخری حصے میں لکھے۔ ''منٹو ایک اخلاقی فنکار'' کی ابتدائی لائنوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مضمون اُنھوں نے منٹو کی پندرہویں برسی کے موقع پر لکھا تھا۔ اس طرح اس مضمون کا سن تصنیف ۱۹۷۰ء بنتا ہے۔

ممتاز شیریں کے مطابق منٹو نے ادب میں گرے ہوئے لوگوں کی دنیا آباد کی۔ طوائفیں، دلال، تماش بین، گاہک، فلمی دنیا کے عیاش، بدکار عورتیں اور ان کی پناہ گاہیں، گویا منٹو نے جان بوجھ کر بدی کی دنیا تخلیق کی تاکہ وہ اخلاقیات کا درس دے سکے۔ لیکن وہ اس بات کا خیال رکھتی ہیں کہ منٹو کا مقصد ان معنی میں اخلاقیات کا پرچار کرنا نہیں تھا کہ لوگ اسے مبلغ اخلاق سمجھنے لگیں۔ ایسے افسانے جنھیں فحاشی کی ذیل میں لایا جاتا ہے، کے متعلق ممتاز شیریں کہتی ہیں کہ:

''منٹو کی کوئی تحریر ایسی نہیں جس میں برائی اور بدکاری کو خوبی کی حیثیت سے دکھایا گیا ہو۔ منٹو کے افسانے اپنے کرداروں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی ترغیب نہیں دیتے، نہ معقول آدمیوں کے دل و دماغ میں ہیجان پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔''[۳۶]

''بنیادی گناہ جنس'' اشاعت اول میں بطور ضمیمہ شامل تھا لیکن اشاعت دوم میں اسے مضامین کی ذیل میں رکھا گیا ہے۔ مرتّب کے مطابق یہ اس کتاب کا بنیادی مقالہ ہے جو نامعلوم وجوہات کی بنا پر اشاعت پذیر نہ ہو سکا۔ مرتّب کو تلاش بسیار کے باوجود یہ مسودہ نہیں ملا۔ کتاب میں شامل مضمون دراصل اسی مقالے کے نوٹس ہیں جن میں منٹو کے مضامین سے دو اقتباسات، عزیز احمد کے مقالے ''ترقی پسند ادب'' کے اقتباسات اور خود مصنفہ کا مختصر تبصرہ شامل ہے۔ ''منٹو ہمارا موپساں'' اشاعت اول میں شائع نہیں کیا گیا تھا۔ دوسری اشاعت میں اسے بطور ضمیمہ شامل کیا گیا ہے۔ یہ مضمون سب سے پہلے ماہنامہ ''پگڈنڈی'' امرت سر، منٹو نمبر ۱۹۵۵ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس مضمون میں ممتاز شیریں نے افسانہ کی فنی تشکیل، مرکزی تھیمز، موضوعات، نظریۂ حیات اور رویوں میں مطابقت کی وجہ سے منٹو کو موپساں کے مماثل قرار دیا۔ یہ نہیں کہ منٹو نے موپساں کی پیروی کی کوشش کی تھی بلکہ منٹو بجائے خود موپساں تھا۔

''منٹو کی منتخب اور نمائندہ تحریریں'' میں منٹو کی چودہ تحریروں کی فہرست درج ہے۔ یہ فہرست ممتاز شیریں کا انتخاب ہے جو سب سے پہلے ''قند'' کے ممتاز شیریں نمبر میں شائع ہوئی تھی جب کہ اگلا اور آخری ضمیمہ منٹو کے انتقال پر قائم کی جانے والی یادگاری کمیٹی کی رپورٹ پر مشتمل ہے جو ممتاز شیریں نے بطور سیکریٹری لکھی تھی۔ یہ رپورٹ پہلی بار ماہنامہ ''نقش'' کراچی، ۱۹۵۵ء کے منٹو نمبر میں شائع ہوئی۔

ممتاز شیریں کی کتاب ''نوری نہ ناری'' منٹو شناسی کی سنجیدہ کوشش ہے۔ وگرنہ اس سے قبل تو ''منٹو''، ''منٹو میرا دوست'' اور ''منٹو میرا دشمن'' قسم کی کتابیں ہی لکھی گئی تھیں۔ جن میں منٹو کی شخصیت پر زیادہ اور فن پر کم توجہ دی گئی۔ ممتاز شیریں نے جس وسیع عالمی ادبی تناظر میں منٹو کا فنی و فکری جائزہ لیا اس کی مثال شاید ہی ہمارے افسانوی ادب کی تنقید میں ملے۔ ان کے اس طریقِ

مطالعہ کی مخالفت کرنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ چناں چہ ممتاز شیریں کے منٹو پر التفات کو بھی محمد حسن عسکری کی ملی بھگت تعبیر کیا گیا۔ ترقی پسند تحریک اور حسن عسکری کے مخالفین نے تحریری اور مجلسی تنقید میں ممتاز شیریں کے اس تعقلاتی نظام کو مسترد کر دیا جس پر ممتاز شیریں نے منٹو کے مطالعے کی بنیاد استوار کی۔ کتاب کی اولین اشاعت کے بعد قاضی جاوید نے تبصرہ کرتے ہوئے ترقی پسندوں اور محمد حسن عسکری کے نظریاتی اختلافات بیان کرنے کے بعد ممتاز شیریں کو محمد حسن عسکری کا پیرو کار ثابت کیا۔ ساتھ ہی اس تعقلاتی نظام کو بھی بالکل ردّ کر دیا جس کے سہارے ممتاز شیریں منٹو کو سمجھنے چلی تھیں۔ قاضی جاوید کے مطابق:

''یہ سارا نظام سامی مذاہب سے مستعار ہے اور محض یہی حقیقت اسے کسی جنوبی ایشیائی تخلیقی ادیب کو سمجھنے کے لیے غیر متعلق بنا دیتی ہے۔''[۳۷]

اُنھوں نے ممتاز شیریں کے طریق کار کو ردّ کرتے ہوئے خیال ظاہر کیا کہ منٹو کو سمجھنے یا سمجھانے کے لیے ڈی ایچ لارنس کے نظام کے بجائے ہندوستان کے نو آبادیاتی نظام کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

قاضی جاوید کی طرح انیس ناگی بھی اپنے مضمون ''منٹو کی انسان دوستی'' میں ممتاز شیریں کے طریق کار کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ منٹو کا انسان اور انسان دوستی کا تصور اتنا سیدھا نہیں جتنا اسے ممتاز شیریں نے بنا دیا ہے:

''ممتاز شیریں نے منٹو کے انسان کا تصور مرتّب کرنے کے لیے انسان کے جس طرح حصے بخرے کیے ہیں (فطری آدمی، ناری آدمی، سیاسی آدمی) اس سے جو نتیجہ بر آمد ہوتا ہے وہ انسان کا کرسچین تصور ہے کہ انسان اپنی معصومیت کھو بیٹھا ہے اور زندگی میں وہ احساسِ گناہ کا بوجھ لیے پھرتا ہے۔''[۳۸]

اصغر ندیم سیّد دبے لفظوں میں ممتاز شیریں پر طنز کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ممتاز شیریں نے منٹو کو ایک اور نظر سے دیکھنے کی کوشش ضرور کی مگر وہ بھی اپنے مطالعے کی شان و شوکت سے باہر نہ آ سکیں۔ اگرچہ مطالعہ بُرا نہیں تھا اور اس وقت کا سکہ رائج الوقت تھا۔''[۳۹]

ان اعتراضات کے باوجود منٹو شناسی کے باب میں ممتاز شیریں کے مضامین کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ واحد ایسی نقاد ہیں جنھوں نے سب سے پہلے منٹو کا سنجیدہ مطالعہ ایک وسیع تناظر میں کیا اور اس کے کرداروں کا تقابل مغربی افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں سے کیا۔ ہندوستان کے سیاسی و سماجی تناظر میں دیگر درجنوں ناقدین منٹو کا جائزہ لے چکے ہیں۔ لہٰذا ممتاز شیریں کے فریم آف ورک سے اختلاف کے باوجود اس کی انفرادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہی اس کتاب کی اہمیت ہے۔

''سعادت حسن منٹو: حیات اور کارنامے''، ڈاکٹر برج پریمی:

ڈاکٹر برج پریمی کی یہ کتاب اُن کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کی کتابی صورت ہے۔ سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن کے متعلق ۱۹۷۴ء میں کسی بھی پاکستانی یا ہندوستانی یونیورسٹی میں لکھا گیا پی۔ ایچ۔ ڈی کی سطح کا یہ پہلا مقالہ تھا۔ مرزا پبلی کیشنز، سری نگر نے ۱۹۸۶ء میں اسے ۳۹۳ صفحات کی کتابی صورت میں شائع کیا۔ چھے ابواب پر مشتمل اس کتاب میں منٹو کی شخصیت اور فن کے تمام پہلوؤں کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ ابواب کی تقسیم کچھ اس انداز سے کی گئی ہے۔ پہلا باب۔ (ا) حیات، (ب) شخصیت کے ترکیبی عناصر، دوسرا باب۔ اُردو کا مختصر افسانہ۔ منٹو تک۔ تیسرا باب منٹو کی افسانہ نگاری، چوتھا باب۔ منٹو کے مضامین، انشائیے اور خاکے،

پانچواں باب۔ مکتوبات جب کہ چھٹے باب بعنوان، دوسرے ادبی کارنامے، منٹو کے تراجم، ڈرامے، ناول اور صحافتی زندگی کی تفصیلات پر مبنی ہے۔

پہلا باب جو دو حصوں پر مشتمل ہے، میں سعادت حسن منٹو کی سوانح حیات اور شخصیت کے عناصر ترکیبی کا ۱۴۷ صفحات پر مبنی جائزہ، جس سنجیدگی، تفصیل اور تحقیقی بصیرت کے ساتھ لیا گیا ہے۔ اُس کو دیکھ کر انیس ناگی کا وہ شکوہ دور ہو جانا چاہیے۔ جو اُنھوں نے اپنی کتاب میں شامل ایک مضمون ''منٹو کے سوانح نگار'' لکھتے ہوئے کیا تھا۔ کہ ابھی تک منٹو کی کوئی مبسوط سوانح عمری نہیں لکھی گئی۔ حال آں کہ انیس ناگی کی کتاب کی اشاعت سے پہلے ہی ڈاکٹر برج پریمی کی کتاب اشاعت پذیر ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر برج پریمی نے کتاب کے اس طویل باب میں خاندانی پس منظر سے لے کر سعادت حسن منٹو کی زندگی میں وقوع پذیر ہونے والے کم و بیش تمام قابل ذکر واقعات کو اس حصے میں محفوظ کر لیا ہے۔ خاندان کے شجرہ نسب کی تفصیلات سے شروع ہونے والے اس باب میں سعادت حسن منٹو کے خاندان، خاندان کا منٹو فیملی کے ساتھ رویہ، والد کی سختی، والدہ کی شفقت، تعلیمی سفر، دوستوں کی محفلیں، باری علیگ کی صحبت، ذرائع معاش، قیام علی گڑھ، بٹوٹ، دہلی، بمبئی، صحافت، فلم اور آل انڈیا ریڈیو کے ساتھ وابستگی، شادی، بیوی، بچے، پاکستان آمد، معاصر ادیبوں کا برتاؤ، شراب نوشی گویا وفات تک کی تمام تفصیلات بہت محنت سے درج کی گئی ہیں۔ اسی باب کے دوسرے حصے یعنی شخصیت کے عناصر ترکیبی، میں سعادت حسن منٹو کی گھریلو زندگی، مذہب، سیاسی مسلک، خوراک، لباس اور نفاست پسندی کے ساتھ ساتھ منٹو کے افسانوں پر چلنے والے مقدمات کی روداد بیان کی گئی ہے۔

دوسرے باب، بعنوان، ''اردو کا مختصر افسانہ، منٹو تک'' میں سعادت حسن منٹو کو ورثے میں ملنے والی اُردو افسانے کی مختصر روایت کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ اس جائزہ کا مقصد اردو افسانوی روایت کی ماہیت کا اندازہ لگانا تھا تا کہ یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ منٹو نے اس میراث کی کیسے توسیع کی۔

کتاب کے تیسرے باب میں ''منٹو کی افسانہ نگاری'' کے ارتقائی سفر کا مختلف ادوار کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔ پہلے دور کو ابتدائی تخلیقی سفر سے ۱۹۳۶ء تک دوسرے دور کو ۱۹۴۷ تک جب کہ تیسرا اور چوتھا دور ۱۹۴۸ء سے منٹو کی وفات تک کے زمانے پر محیط ہے۔ پہلے دور میں منٹو کی ترجمہ نگاری کے ساتھ ساتھ اُن اشتراکی موضوعات کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے جو باری علیگ کی صحبت کے نتیجے کے میں منٹو کی شخصیت کا خاصا بنے۔ افسانہ نگاری کے دوسرے دور یعنی ۱۹۴۷ء تک کے زمانے کو مصنف منٹو کی افسانہ نگاری کا ارتقائی دور قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ سارا زمانہ منٹو کے فنی ارتقاء کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں ان کے قلم میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوئی۔'' [۴۰]

مصنف کے نزدیک یہی وہ زمانہ ہے جب منٹو نے انقلاب کے گیت گانے کی بجائے طوائف اور جنس کے قصیدے پڑھنا شروع کر دیے۔ حال آں کہ منٹو کا انقلابی افسانہ ''نیا قانون'' بھی اس دور یعنی ۱۹۳۸ء میں تخلیق ہوا لیکن جنسی موضوعات نے دیگر امور کی طرف کسی کی توجہ نہ جانے دی۔ اس دور میں لکھے گئے۔ افسانوں کے موضوعات اور فنی و فکری خوبیوں کا جائزہ اُنھوں نے منٹو کے بعض معروف اور بدنام افسانوں مثلاً، بو، دھواں، کالی شلوار اور بابو گوپی ناتھ، وغیرہ کے تجزیوں کی روشنی میں کیا۔ منٹو کے افسانوں پر چلنے والے مقدمات پر بحث بھی کافی معلومات افزا ہے۔ اگر چہ کہ ان مقدمات کے سلسلے میں اب کوئی بھی پہلو پوشیدہ نہیں رہا۔ ابتدا سے

لے کر آج تک جتنی بھی تفصیلات اس باب میں میسر آئی ہیں۔ ان سب کو مصنف زیر بحث لانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری کے تیسرے اور چوتھے دور کو مصنف تقسیم اور تقسیم کے بعد کے زمانے سے مشروط کرتے ہیں۔ مصنف کے مطابق اس دور سے قبل منٹو نے جو کچھ لکھا وہ ہلکے پھلکے رومانی، جنسی بلوغت، سیاسی اور سماجی مسائل اور جنسی نفسیات کے بعض پہلوؤں پر محیط تھا۔ لیکن تقسیم کے نتیجہ میں جب منٹو پاکستان چلے گئے تو موضوع اور تکنیک کے لحاظ سے ان کے افسانوں میں ایک نیا موڑ پیدا ہوا۔ بیان کی شگفتگی، خیالات کی ندرت، کردار نگاری، اور مشاہدے کی باریکی کو اس دور کی خصوصیات کہا جاسکتا ہے۔ اگرچہ اس زمانے میں منٹو حد سے زیادہ زود نویسی کا شکار ہوئے۔ اور بہت سے کامیاب افسانے مثلاً کھول دو، بابو گوپی ناتھ، ٹھنڈا گوشت، اور خاص طور پر ٹوبہ ٹیک سنگھ، لکھے لیکن اسی زمانے میں اُن کے قلم سے کئی کمزور افسانے بھی تخلیق ہوئے۔ مصنف نے کمزور افسانوں کی فہرست میں سرکنڈوں کے پیچھے، شاردا، مس ٹین والا، اللہ دتہ، لالٹین اور پڑھیے کلمہ کے نام گنوائے ہیں۔ یہ الگ بات کے عہد حاضر کے ایک نقاد شمس الرحمٰن فاروقی منٹو کے افسانے پڑھیے کلمہ، کے متعلق مصنف کی رائے سے یکسر اختلاف کرتے ہوئے اسے اُن کے بہترین افسانوں میں گردانتے ہیں۔[۴۱] ''اللہ دتہ'' میں باپ کے ہاتھوں بیٹی کا جنسی استحصال بھی مصنف کو ہضم ہوتا نظر نہیں آتا۔ حال آں کہ اس قسم کے واقعات کتاب کی تصنیف سے لے کر آج تک ہمارے معاشرے کا مستقل حصہ رہے ہیں۔ منٹو کے اس دور میں لکھے گئے کمزور افسانوں کے ضمن میں مصنف اپنی رائے کا اظہار کچھ اس طرح کرتے دکھائی دیتے ہیں:

> ''منٹو کے کمزور افسانوں میں ایسے افسانے شامل کیے جا سکتے ہیں جن کو طویل مکالموں کی بنا پر تخلیق کیا گیا ہے۔ یہ مکالمے اکثر طویل، بوجھل اور سپاٹ ہیں۔ جن سے نہ افسانے کی وحدت قائم رہتی ہے اور نہ ہی کوئی صحت مند تاثر مرتّب ہوتا ہے۔''[۴۲]

مصنف کے مطابق منٹو کے ایسے افسانے پلاٹ اور اسلوب کے لحاظ سے بھی کمزور ہیں جو اُنھوں نے زندگی کے آخری دور میں لکھے۔ مصنف اُنھیں شراب کے حصول کی خاطر لکھے گئے افسانوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی باب میں منٹو کے فکری حوالوں کے ساتھ ساتھ فنی خوبیوں کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ منٹو کے افسانوں کے آغاز اور انجام کی تکنیک کے علاوہ وحدت تاثر، اسلوب بیان، نادر تشبیہات کا استعمال، مشاہدہ اور کردار نگاری کو مصنف، معاصر افسانہ نگاروں سے انفرادیت اور امتیاز کا باعث قرار دیتے ہیں۔ چوتھے باب میں منٹو کے مضامین کو ادبی، سیاسی اور فلمی خانوں میں تقسیم کرتے ہوئے ان موضوعات پر لکھے گئے مضامین کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ مضمون نگاری کے ابتدائی دور میں منٹو نے بہت سے مضامین فرضی ناموں سے بھی لکھے۔ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''بمبئی کے ابتدائی زمانہ قیام میں وہ کامریڈ سعادت حسن منٹو، مفکر، وٹنم، آسکر وائلڈ اور برناڈ شا کے فرضی ناموں سے مضامین لکھا کرتے تھے۔''[۴۳]

مصنف کے نزدیک منٹو کے لکھے گئے ادبی مضامین تعداد کے لحاظ سے قلیل ہیں۔ ان میں زیادہ تعداد ایسے مضامین کی ہے جن میں منٹو نے اپنے افسانوں پر لگنے والے فحاشی کے الزامات کا جواب اور اپنا ادبی نقطۂ نظر بہت عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے۔ سیاسی اور سماجی مسائل پر لکھے گئے مضامین اور خاص طور پر فلمی شخصیات کے متعلق خاکے منٹو کو بہترین مضمون نگار کے طور پر سامنے لاتے ہیں۔ پانچویں باب میں منٹو کے لکھے گئے خطوط کی روشنی میں ان کی شخصیت اور فن کے پوشیدہ اسرار اور رموز کا جائزہ ملتا ہے۔ اس ضمن میں

صرف احمد ندیم قاسمی کو لکھے گئے خطوط سے ہی سروکار رکھا گیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے نام لکھے گئے یہ خطوط اگرچہ تعداد میں اتنے ضرور ہیں کہ ان سے نہ صرف منٹو بلکہ قاسمی صاحب کی شخصیت اور فنی مقام و مرتّبے کی بھی بہت سی گرہیں کھلتی نظر آتی ہیں۔ لیکن کیا ہی اچھا ہوتا ہے کہ اگر دیگر مشاہیر کے نام سعادت حسن منٹو کے لکھے ہوئے خطوط کو بھی تلاشا جاتا۔ کتاب کے آخری باب میں سعادت حسن منٹو کے تراجم، ریڈیائی ڈرامے، ناول اور صحافتی تحریروں کا محاکمہ ان کے فنکارانہ نمونوں کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ مصنف اس بات کو تسلیم کرنے سے صاف انکاری ہیں کہ اُن سے منسوب ناول، بغیر عنوان کے'' کا آخری حصہ ممتاز شیریں نے لکھا تھا۔ مصنف کے بقول:

''مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں۔ اس لیے کہ ناول کا اسلوب اور اس کی اٹھان اول سے آخر تک ایک جیسی ہے۔ اور اس میں ممتاز شیریں سے زیادہ منٹو کا اپنا اسلوب ملتا ہے۔'' [۴۴]

جب کہ کتاب کے آخر میں ''منٹو ایک نظر میں'' کے عنوان سے سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن کی چیدہ چیدہ خصوصیات کا مفصل اشاریہ کافی محنت سے تیار کیا گیا ہے۔ چھے ابواب پر مشتمل ڈاکٹر برج پریمی کی یہ کتاب تحقیقی اعتبار سے سعادت حسن منٹو کی سوانح اور فن کا عمدہ محاکمہ ہے۔ خاص طور پر ایسے ایام میں جب منٹو شناسی کی روایت ابھی گھٹنوں کے بل چل رہی تھی۔ کرشن چندر کے کتابچے اور ابو سعید قریشی، محمد اسد اللہ اور اوپندر ناتھ اشک کی تاثراتی وجذباتی کتابوں اور احمد ندیم قاسمی کے نام لکھے گئے منٹو کے خطوط، پروفیسر محمد محسن اور ممتاز شیریں کی کتاب کے علاوہ منٹو کی شخصیت اور فن کا سنجیدہ مطالعہ مفقود تھا۔ ڈاکٹر برج پریمی کی یہ کتاب تحقیقی نقطۂ نظر سے منٹو شناسی کی اولین سنجیدہ کوشش قرار پاتی ہے۔

''سعادت حسن منٹو (کتابیات)''، ڈاکٹر علی ثناء بخاری:

ڈاکٹر علی ثنا بخاری کی تحقیقی کتاب ''سعادت حسن منٹو (کتابیات)'' ۱۹۸۶ء میں مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد سے شائع ہوئی۔ اس مختصر سی کتاب میں جو کہ ۲۶ صفحات پر مشتمل ہے، مصنف نے منٹو کے سوانح اور تخلیقات کا خاکہ پیش کیا ہے۔ نیز منٹو پر شائع ہونے والی تنقیدی و سوانحی کتب اور مختلف رسائل و جرائد اور اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین کے علاوہ جامعات میں منٹو پر کی جانے والی تحقیق کا اشاریہ بھی شامل ہے۔

کتاب کے آغاز میں ''مختصر سوانحی خاکہ'' کے عنوان سے منٹو کی تاریخ پیدائش سے لے کر تاریخ وفات تک کے درمیانی عرصہ میں ان کی پیشہ ورانہ زندگی کے بارے میں معلومات دی گئی ہیں، جن میں منٹو کی مختلف اخبارات کے علاوہ فلم کمپنیوں سے وابستگی اور علیحدگی کا گوشوارہ سنین کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ ''منٹو کی ابتدائی تحریر'' میں تراجم کی تفصیل کے بعد منٹو کی ''مطبوعہ کتب'' کی فہرست دی گئی ہے۔ یہ فہرست منٹو کی افسانوی تخلیقات سے متعلق ہے اور اس میں منٹو کی زندگی میں شائع ہونے والے ۱۲ افسانوی مجموعوں کے سن اشاعت اور پبلی شرز کی فہرست زمانی ترتیب سے دی گئی ہے۔ منٹو کی موت کے بعد شائع ہونے والے افسانوی مجموعوں کی مکمل فہرست بھی دی گئی ہے۔ اسی طرح منٹو کی موت کے بعد شائع ہونے والے افسانوی مجموعوں، منٹو کے تراجم، ڈرامے، خاکے، خطوط اور مضامین کے علاوہ منٹو کے افسانوں کے دیگر زبانوں میں کیے گئے تراجم اور افسانوی مجموعوں کی مکمل فہرست بھی ترتیب دی گئی ہے۔
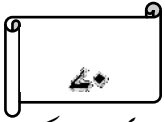
مختلف جامعات میں منٹو پر کیے گئے پی ایچ ڈی اور ایم اے کی سطح پر ہونے والے تحقیقی مقالہ جات کے علاوہ پی ایچ ڈی اور ایم اے کے ایسے مقالے جن میں منٹو کے متعلق ابواب لکھے گئے ہیں، ان کا گوشوارہ بھی شامل ہے۔ منٹو پر لکھی گئی سوانحی اور تنقیدی نوعیت کی سات کتابوں کے اشاریے کے بعد تنقیدی کتب میں شائع ہونے والے مضامین کے علاوہ ایسے مضامین کی فہرست بھی دی گئی ہے جن میں منٹو کا حوالہ ملتا ہے۔ اس فہرست کے بعد ایسے رسائل کی تفصیل دی گئی ہے جنھوں نے منٹو پر خصوصی نمبر شائع کیے۔ کتاب کی اشاعت کے وقت ان رسائل کی تعداد آٹھ تھی جب کہ آخر میں مختلف اخبارات اور رسائل میں منٹو پر شائع ہونے والے مضامین کا اشاریہ دیا گیا ہے۔ ۲۶ صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ تحقیقی اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے اور اس میں منٹو کی سوانح اور فن کا خاکہ مختصر مگر جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

''منٹو نامہ''، جگدیش چندر ودھاون:

منٹو کی وفات کے بعد اس کی دوستی کا دم بھرنے اور عقیدت، احترام اور محبت کے جذبہ سے سرشار افراد کی تعداد میں ایک دم ناقابلِ یقین حد تک اضافہ ہو گیا۔ وہ لوگ بھی جو منٹو کو آتا دیکھ کر غسل خانوں میں چھپ جایا کرتے تھے اس کی دوستی کے ترانے پڑھنے لگے۔ مرنے کے بعد صحیح اُنھیں منٹو کے ادبی قد کاٹھ کا اندازہ ہو ہی گیا۔ اس جم غفیر میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے منٹو کے ساتھ ظاہری تعلق کا دعویٰ تو نہ کیا لیکن وہ منٹو کے ساتھ دیوانگی کی حد تک محبت کرتے تھے اور اُنھوں نے اپنی ادبی زندگی کا اوڑھنا بچھونا سعادت حسن منٹو کو بنا لیا۔ دہلی سے تعلق رکھنے والے جگدیش چندر ودھاون بھی منٹو کے عاشق قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ منٹو کی شخصیت اور فن سے متعلق ان کی کتاب ''منٹو نامہ'' ۵۱۹ صفحات پر مشتمل ہے جسے ۷۰ برس کی عمر میں مکمل کیا گیا۔ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں منٹو کی شخصیت جب کہ دوسرے حصے میں فن کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ پہلا حصہ ''شخصیت''، منٹو کے آباء و اجداد اور شجرہ نسب کے ذکر سے آغاز ہوتا ہے۔ ۲۸۴ صفحات پر مشتمل اس حصہ میں منٹو کی شخصیت کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ منٹو، منٹو کے بھائی، بہن، ابتدائی تعلیم، بمبئی میں قیام، ہجرت پاکستان اور منٹو کی وفات کا احوال ''حیات'' کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے۔ جب کہ اسی باب کے دوسرے حصہ ''شخصیت کے عناصر ترکیبی'' میں منٹو کا ناک نقشہ، لباس، خوراک، یادداشت، مزاج، گالیاں دینے کی عادت، بارعب اور بے باک شخصیت، مخالفانہ رائے دینے کی عادت، مہمان نوازی، غم خواری اور احسان شناسی، شوخیِ طبع، حاضر دماغی، محبت، عشق، شادی، بطور خاوند اور باپ، انانیت، خود پسندی، خود ستائی، رعونت، درشت مزاجی، نفاست پسندی، منٹو کی لکھی گئی فلمی کہانیاں اور فلمی دنیا پر منٹو کا اثر، افسانوں پر چلنے والے مقدمات کی روداد، مذہبی عقائد، سیاسی نظریات، معاشی حالت، تنگ دستی، کشادہ دلی، مئے نوشی اور پنجابی لوک گیتوں سے محبت، غرض منٹو کی زندگی کے کم و بیش تمام پہلوؤں کو بہت تفصیل کے ساتھ نہایت ہی سادہ اور عام فہم اُسلوب میں اس طرح قارئین کے سامنے رکھا گیا ہے کہ منٹو کی زندگی کا فلم آنکھوں کے سامنے چلنے لگتا ہے۔ مصنف نے بہت جچے تلے انداز میں منٹو کی مناسب تجسیم کی ہے۔ اگرچہ کہ وہ منٹو کے عقیدت مندوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اور اس رائے کا اظہار اُنھوں نے اپنی کتاب کے دیباچے میں خود اور قمر رئیس نے کتاب میں شامل اپنے مضمون بعنوان ''پیش لفظ'' میں کچھ اس طرح کیا ہے:

> ''ایک بزرگ فون پر وقت لے کر مجھ سے یونیورسٹی میں ملنے آئے۔ تعارف ہوا۔ نام جگدیش چندر۔۔۔۔ پوچھا آپ کی صحت کا راز؟'' بولے ''منٹو اور اس کی کہانیوں سے عشق۔'' [۴۵]

شاید یہی وہ جذبہ تھا جس نے مصنف سے ایسی کتاب تحریر کرائی جس میں ہر ممکن حد تک کوشش کی گئی کہ منٹو کی شخصیت اور فن کا کوئی بھی پہلو مبہم اور غیر واضح نہ رہے۔ اور خاص کر ایسے وقت جب منٹو پر لکھی گئی کتب کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہو۔ کتاب کے دوسرے حصے میں منٹو کی فنی زندگی کا مطالعہ اور محاکمہ کیا گیا ہے۔ ''فن'' کے عنوان سے شامل حصے کو دو اجزاء میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے جزو میں درج ذیل مضامین ''فن کے تین ادوار، تخلیقی اسلوب اور طریقہ کار، مرقع نگاری، مکتوبات اور طنز و مزاح، شامل ہیں۔ پہلے دور میں منٹو کی تراجم نگاری اور ابتدائی دور کے افسانوں اور افسانوی مجموعوں کو شامل کیا گیا ہے یہ دور ابتدا تراجم سے ۱۹۳۶ء تک کے ادب کا احاطہ کرتا ہے۔ دوسرا دور ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۷ء تک کے ادب کا جب کہ تیسرے دور کا تعلق منٹو کے قیام پاکستان سے اس کی وفات تک کے تخلیقی ادب کے جائزے پر مشتمل ہے۔ دوسرے مضمون بعنوان ''تخلیقی اسلوب اور طریقہ کار'' میں وہ زور بیان، لطافت بیان، اصطلاحات پر گرفت، فکر انگیز جملوں، نامانوس الفاظ اور عمدہ تشبیہات کو منٹو کے اسلوب کے اجزائے ترکیبی گردانتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ان سب عناصر کی آمیزش سے جو مرکب بنتا ہے وہ منٹو کو بہ لحاظ صاحب اسلوب انشاءپرداز کے فنکاروں کی صف اول میں لا کھڑا کرتا ہے۔''[۴۶]

مرقع نگاری کے عنوان سے شامل مضمون میں اُنھوں نے منٹو کی خاکہ نگاری پر مشتمل دو کتابوں ''گنجے فرشتے'' اور لاؤڈ اسپیکر'' میں شامل ۲۲ خاکوں کے مطالعے کے بعد اُنھیں ایک کامیاب مرقع نگار قرار دیا ہے۔ منٹو کی خطوط نگاری کے پہلو کو ''مکتوبات'' کے عنوان سے صرف ان خطوط کو زیر بحث لایا گیا ہے جو منٹو نے احمد ندیم قاسمی کے نام لکھے تھے۔ قاسمی صاحب نے ۱۹۶۱ء میں اُنھیں پہلی بار کتابی شکل میں شائع کیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس ایک کتاب کے علاوہ بھی منٹو کے خطوط کو ڈھونڈ کر اس کی شخصیت کا وسیع تناظر میں جائزہ لیا جاتا۔ کیوں کہ کتاب کی تصنیف کے وقت منٹو کے بہت سے خطوط قاسمی صاحب کے علاوہ مختلف رسائل اور کتب میں شائع ہو چکے تھے۔ ان خطوط کی تعداد اچھی خاصی ہے اور اس بات کا اندازہ حال ہی میں مرتّب ہونے والی پرویز انجم کی کتاب ''منٹو نامے''[۴۷] سے لگایا جا سکتا ہے جب کہ ''طنز و مزاح'' نامی اس حصے کے آخری مضمون میں منٹو کی طنز و مزاحیہ تحریروں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب کے حصہ دوم کی جزو 'ب' میں منٹو کے اہم افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس حصہ میں جنسی، سیاسی و سماجی احتجاج اور تحلیل نفسی کے افسانے شامل ہیں۔ مصنف کی فکری بلندی اور طرز تحریر کی سادگی ان کے تجزیوں کو مؤثر اور فکر انگیز بناتی دکھائی دیتی ہے۔ مکتبہ شعر و ادب لاہور نے منٹو فہمی کے اس مربوط سلسلے کو ۱۹۸۹ء میں شائع کیا۔

''سعادت حسن منٹو''، انیس ناگی:

''سعادت حسن منٹو'' انیس ناگی کی تصنیف ہے۔ اس میں منٹو کی شخصیت اور فن پر مشتمل بارہ (۱۲) مضامین کے علاوہ ضمیمہ کے طور پر منٹو کے افسانوی مجموعوں کا کیٹلاگ اور کتابوں کی فہرست کو شامل کیا گیا ہے۔ فیروز سنز لمیٹڈ لاہور نے ۱۹۸۹ء میں اس کا پہلا ایڈیشن شائع کیا۔ کتاب میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں:

۱۔ منٹو کے سوانح نگار   ۲۔ افسانہ مجھے لکھتا ہے۔   ۳۔ سعادت حسن منٹو، ایک غیر مکمل سوانح

۴۔ منٹو اور مارکسزم ۵۔ نیکی+بدی=منٹو ۶۔ منٹو کا فن

۷۔ منٹو، فسادات اور ہجرت ۸۔ منٹو کی عورتیں ۹۔ منٹو، فحاشی اور جنس

۱۰۔ منٹو اور نیا اُردو افسانہ ۱۱۔ بابو گوپی ناتھ سے ملاقات ۱۲۔ منٹو کی انسان دوستی

کتاب کے آغاز میں چودہ (۱۴) تصاویر (بلیک اینڈ وائٹ) لگائی گئی ہیں۔ آٹھ تصاویر میں منٹو کی مختلف زاویوں سے لی گئی الگ الگ تصاویر کے علاوہ منٹو کی والدہ سردار بیگم اور بڑی بہن ناصرہ اقبال کی علیحدہ علیحدہ تصاویر بھی شاملِ کتاب ہیں۔

پہلے مضمون ''منٹو کے سوانح نگار'' میں انیس ناگی نے اس واقعہ کو اُردو ادب کے باب میں ستم ظریفی سے محمول کیا کہ ابھی تک منٹو کی مبسوط سوانح عمری نہیں لکھی گئی۔ اُنھوں نے منٹو کے تین سوانح نگاروں کرشن چندر، ابو سعید قریشی اور محمد اسد اللہ کی کتابوں کو منٹو کی سوانح عمری تسلیم کرنے سے معذوری ظاہر کی ہے۔

مصنف نے سوانحی نقطۂ نظر سے لکھی گئی محمد اسد اللہ کی کتاب ''منٹو میرا دوست'' میں بیان کیے گئے واقعات کو من گھڑت اور منٹو کی کردار کشی کی ایک منظم کوشش قرار دیا۔ اُنھوں نے تحقیق سے یہ بات ثابت کی کہ منٹو کی محمد اسد اللہ کے ساتھ ایسی بے تکلفی نہیں تھی جیسی اُنھوں نے کتاب میں بیان کی۔ نہ صرف یہ کہ واقعات من گھڑت اور بھونڈے ہیں بلکہ پیش کش کا انداز بھی ادبی نہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''مجموعی طور پر اس کتاب میں منٹو کی زندگی کے آخری دور کا حال درج ہے۔ یہ کتاب ذاتی یادداشتوں سے مرتّب کی گئی ہے اس لیے ربط سے عاری ہے۔ اس کا اُسلوب بے ڈھنگا اور زبان ڈھیلی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ منٹو کی کردار کشی کی یہ پہلی منظم کوشش ہے۔'' [۴۸]

ابو سعید قریشی کی کتاب ''منٹو'' کو انیس ناگی ''چوں چوں کا مربہ'' قرار دیتے ہیں جس میں سوانح، تنقید اور یادیں گڈ مڈ کر دی گئی ہیں۔ نیز اس میں منٹو کے خانگی حالات، قیامِ بمبئی اور پاکستان ہجرت کا باب بھی تشنہ ہے۔ ان سوانحی کتابوں کا جائزہ لینے کے بعد وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ منٹو کی غیر جانب دار سوانح عمری منٹو کی تفہیم کے لیے بہت ضروری ہے۔

''افسانہ مجھے لکھتا ہے'' میں منٹو کے مزاج اور فن کی ہم آہنگی پر روشنی ڈالتے ہوئے منٹو کو درپیش مشکلات جب کہ ''سعادت حسن منٹو ایک غیر مکمل سوانح'' میں انیس ناگی نے منٹو کے سوانحی حالات کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ یہ مضمون دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں منٹو کے سوانحی حالات کے ساتھ ساتھ اُن کے فنی ارتقا کا بھی عہد بہ عہد جائزہ لیا گیا۔ منٹو کے افسانوی مجموعہ ''دھواں'' کا سن اشاعت ۱۹۳۹ء بتاتے ہوئے لکھے ہیں:

> ''دہلی میں اس کی ملاقات شاہد احمد دہلوی سے ہوئی جنھوں نے اس کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''دھواں'' ۱۹۳۹ء میں ساقی بک ڈپو کے زیرِ اہتمام شائع کیا۔'' [۴۹]

''دھواں'' ۱۹۴۱ء میں ساقی بک ڈپو، دہلی نے شائع کی تھی۔ مضمون کے دوسرے حصے میں انیس ناگی نے منٹو سے ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء کی صبح گورنمنٹ کالج میں دو بجے دوپہر ہونے والی ملاقات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اُن کے مطابق منٹو ۱۸ جنوری کی صبح شراب کے لیے کرامت حسین جعفری اور جی ایم اثر سے پیسے مانگنے گورنمنٹ کالج آئے تھے۔ ڈاکٹر علی ثناء بخاری نے انیس ناگی کے اس استدلال کو

سختی سے رَد کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ انیس ناگی نے جس وقت اور جس دن کا ذکر کیا ہے وہ غلط ہے۔۱۸ جنوری کی صبح ساڑھے دس بجے منٹو انتقال کر چکے تھے۔

محققین اور منٹو کے لواحقین اس بات پر متفق ہیں کہ منٹو ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء کی صبح ساڑھے دس بجے انتقال کر گئے تھے۔ لہٰذا اس بیان میں کوئی صداقت نہیں کہ وہ ۱۸ جنوری کو دوپہر دو بجے گورنمنٹ کالج آئے تھے انیس ناگی نے حال ہی میں ایک مرتبہ پھر اس ملاقات کا ذکر ''گورنمنٹ کالج لاہور میں منٹو کا آخری دن'' کے عنوان سے لکھی گئی اپنی تحریر میں بھی کیا ہے۔ یہاں اُنھوں نے اپنی تحریر میں ترمیم کرتے ہوئے اسے ۱۷ جنوری کا واقعہ قرار دیا ہے۔

''نیکی+بدی=منٹو'' میں مصنف نے منٹو کی فکر اور کرداروں کو نیکی اور بدی کے تصور سے ماورا قرار دیتے ہوئے اُنھیں ان دونوں کا مجموعہ قرار دیا۔ منٹو نے نیک کرداروں میں گناہ کا عنصر اور بظاہر بد کرداروں میں نیکی کا مادہ تلاش کیا ہے۔ منٹو کے بیشتر کردار انھی تضادات میں زندگی بسر کرتے ہیں۔اگلے مضمون ''''منٹو کا فن'' میں منٹو کی فنی زندگی کو چار ادوار میں تقسیم کرنے کے بعد ہر دور کا الگ الگ فکری و فنی اور موضوعاتی جائزہ لیا گیا ہے۔ مضمون میں قاضی جاوید کی اس رائے سے بھی اختلاف کی گیا ہے جس میں اُنھوں نے کہا تھا کہ منٹو نے روسی حقیقت نگاروں کے بنائے ہوئے افسانوی سٹرکچر کا اتباع کیا ہے۔

''منٹو، فسادات اور ہجرت'' دو حصوں میں منقسم مضمون ہے۔ پہلے حصے میں منٹو کی شخصی زندگی پر ہجرت اور فسادات کے اثرات جب کہ دوسرے حصے میں فنی زندگی پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مصنف نے فسادات پر منٹو کے افسانوں کی تین اقسام بیان کی ہیں:۔اول؛ایسے افسانے جن میں فسادات کو پس منظر کے طور پر پیش کیا گیا ہے، دوم؛ایسے افسانے جن میں فسادات کو براہِ راست موضوع بنایا گیا ہے جب کہ تیسری قسم کے افسانوں میں فسادات کے بعد کی صورت حال کو پیش کیا گیا ہے۔اُنھوں نے حسن عسکری کے اس بیان کو عمومی اور مدرسانہ قرار دیا جس کے مطابق منٹو نے فسادات کے حوالے سے اپنے افسانوں میں انسانی صداقت اور انسانی معنویت کو تلاش کیا ہے۔انیس ناگی ان سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''منٹو نے ان افسانوں میں انسانی صداقت اور انسانی معنویت کو تلاش نہیں کیا۔ اس نے ایک تاریخی عمل کو انسانی سلوک conduct کے حوالے سے پیش کر کے ایک مؤرخ اور فنکار کا منصب ادا کیا۔''[۵۰]

''منٹو کی عورتیں'' میں مصنف نے منٹو کے نسوانی کرداروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ منٹو کے ہاں نسوانی کرداروں کے انتخاب کا ایک خاص معیار ہے۔اس میں عام اور گھریلو عورتوں کی بجائے خاص قسم کی عورتوں کا عمل دخل ہے۔ایسی عورتیں جو ردِ عمل کی صلاحیت رکھتی ہوں، منٹو کے افسانوی کردار کے طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ منٹو نے جن عورتوں کو افسانے کا موضوع بنایا ہے ایسی عورتیں اس سے قبل ہماری افسانوی روایت میں ناپید تھیں۔ وہ کالج کی لڑکیاں ہوں یا پیشہ ور طوائفیں، منٹو نے ان کے اندر چھپی انسانیت اور مامتا کو کرید کرید کر جس انداز سے پیش کیا ہے۔ وہ منٹو ہی کا خاصہ ہے۔ منٹو کے طوائف سے متعلق افسانے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ طوائف کے سینے میں بھی انسانی دل دھڑکتا ہے۔

''منٹو، فحاشی اور جنس''، جنسی موضوعات پر لکھے گئے افسانوں کا تجزیہ ہے۔ مصنف کے مطابق یہ رائے درست نہیں کہ منٹو محض جنسی موضوعات پر ہی افسانے لکھتا تھا۔ ان کے مطابق منٹو پیٹ کی بھوک اور جنس کی بھوک کو بنیادی ضرورتیں سمجھتا تھا چناں چہ وہ صحت مند معاشرے کے قیام کے لیے ہمہ قسمی بھوک سے چھٹکارا چاہتا تھا۔

منٹو جنس کے معاملہ میں واضح نقطۂ نظر رکھتا تھا اور اپنی تحریروں کو فحش یا قابلِ گردن زدنی نہیں سمجھتا تھا۔ مضمون نگار کے مطابق اپنی بہت سی تحریروں میں منٹو نے اپنا جنسی نقطۂ نظر بیان کیا ہے اور اپنے خلاف دائر مقدمات کا اس نے دیدہ دلیری سے مقابلہ کیا ہے۔ اگلے مضمون ''منٹو اور نیا اُردو افسانہ'' میں منٹو کو نئے اُردو افسانے کا معمار قرار دیتے ہوئے اس کے افسانوں ''فرشتہ''، ''پھندنے'' اور ''بارده شمالی'' کو نئے اردو افسانے کی اولین مثالیں قرار دیا۔

''بابو گوپی ناتھ سے ملاقات'' کتاب کا اگلا مضمون ہے جس میں منٹو کے افسانے ''بابو گوپی ناتھ'' کے مرکزی کردار کا جائزہ لیا گیا' جب کہ کتاب کے آخری مضمون ''منٹو کی انسان دوستی'' میں منٹو کے افسانوں میں انسان دوست رجحانات کا جائزہ لیا گیا۔ انیس ناگی کے مطابق منٹو نے انسان کی جبلت اور شخصیت کی دریافت اخلاقی نظام سے ہٹ کر کی ہے۔ وہ انسان کی توقیر بحال کرنا چاہتا ہے، اس کی کی شرائط حیات بدلنا چاہتا ہے اور یہی منٹو کی انسان دوستی اور تصور انسان کی اساس ہے۔ کتاب کے آخر میں منٹو کے اٹھارہ افسانوی مجموعوں کا کیٹلاگ پیش کرنے کے علاوہ منٹو کی کتابوں کی فہرست بحوالہ پبلی شرز اور سنین نیز منٹو کے افسانوں کے انتخاب پر مشتمل شائع ہونے والے مجموعوں کی فہرست بھی دی گئی ہے۔

''منٹو ادبی عدالت میں''، حمید کاشمیری:

پاکستان ٹیلی ویژن سے نشر ہونے والے سات ڈراموں پر مشتمل حمید کاشمیری کی اس کتاب میں شامل ڈراما ''منٹو ادبی عدالت میں'' جسے کتاب کا عنوان بھی بنایا گیا ہے، کتابی صورت میں مقبول اکیڈمی لاہور نے ۱۹۹۳ء میں شائع کیا۔ کتاب کا پہلا جملہ جو مصنف کے دیباچے کی تمہید بھی ہے میں مصنف نے بہت عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے لکھا کہ :

> ''میں بغیر کسی تمہید کے مذکورہ چھے ڈراموں کا واقعی مختصر تعارف پیش کرنا چاہتا ہوں۔'' [۵۱]

اور اس کے بعد بغیر کسی تمہید کے اُنھوں نے ان ڈراموں کا واقعی مختصر تعارف پیش کر دیا۔ لیکن کتاب میں موجود ڈراموں کی تعداد اور فہرست مضامین کے مطابق یہ ڈرامے چھے کی بجائے سات ہیں فہرست کے مطابق ان کی ترتیب کچھ اس طرح ہے:۔

منٹو ادبی عدالت میں، پت جھڑ کے بعد، کافی ہاؤس، کھیت کھیت ہریالی، ہیں کواکب کچھ۔۔۔، پائیلٹ، اور مان۔

منٹو شناسی کی روایت میں ریڈیو، ٹی وی اور سٹیج کا ایک اہم کردار رہا ہے۔ منٹو کی عوامی شہرت کا ایک بڑا سبب ان کے وہ ریڈیائی ڈرامے رہے ہیں جو اُنھوں نے آل انڈیا ریڈیو، دہلی اور بمبئی کے لیے بطور اسکرپٹ رائٹر یا ڈراما نویس لکھے تھے۔ بقول منٹو ان کی تعداد سو سے بھی زیادہ ہے۔ اسی طرح ہندوستان اور پاکستان کے ٹیلی ویژن بھی منٹو کی بیشتر کہانیوں کو ڈرامائی شکل میں پیش کر کے منٹو اور اس کے افسانوں کی تفہیم کا سبب بنتے رہے ہیں۔ ''منٹو ادبی عدالت میں'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ حمید کاشمیری نے اس ڈرامے میں منٹو کے افسانوں پر چلنے والے مقدمات کو موضوع بناتے ہوئے استغاثہ / پراسیکیوٹر کے لگائے گئے الزامات کی روشنی میں منٹو کے

جوابات 'جو اُنھوں نے اپنے مختلف مضامین میں ان مقدمات اور اپنے نظریہ فن کے متعلق لکھے ہیں، مکالموں کی صورت میں ڈھال دیا ہے۔ ساتھ ہی منٹو کے مختلف کرداروں کو بھی عدالت میں لا کھڑا کر کے ان کی اصل تصویر قارئین کے سامنے پیش کر دی۔

اکیس مناظر پر مشتمل یہ ایک عمدہ ڈراما ہے۔ جسے دیکھنے کے بعد ناظرین منٹو پر لگنے والے سب سے بڑے الزام (فحش نگار منٹو) کی حقیقت سے پردہ اُٹھتا دیکھ سکتے ہیں۔ منٹو نے بہت مدلل انداز میں ان الزامات کو رد کرتے ہوئے اپنے ادبی نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ بعض اوقات یہ وضاحت اتنی طویل ہو جاتی ہے کہ ڈرامے کے اس حصہ پر مضمون یا افسانے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ڈراما دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے کے منظر نمبر سات پر منٹو کا پراسیکیوٹر کے سوال کا دیا گیا جواب کتاب کی تئیس سطور پر محیط ہے، اسی طرح دوسرے حصے کے پہلے منظر میں ایک مکالمہ پندرہ سطور کا احاطہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ صورتحال پورے ڈرامے میں دکھائی دیتی ہے اختتامی صفحات پر منٹو کا ایک مکالمہ چوہتر سطور پر پھیلا ہوا ہے۔[۵۲] ظاہر ہے یہ ڈرامانویسی کے نقطۂ نظر سے قابل قبول نہیں ہے کہ کردار مکالموں کی بجائے تقریریں کرنے لگ جائیں۔ مجموعی طور پر یہ ایک عمدہ ڈراما ہے جس نے ایک فحش نگار منٹو کو ملکی عدالت کے پردے میں دراصل ادبی عدالت میں پیش کر کے ناظرین کو دعوت فکر دی ہے کہ یہ دیکھو، یہ کہانیاں ہیں، یہ کردار ہیں، یہ مصنف ہے اور یہ الزامات ہیں۔ اب سب کی زبانی ان کی حقیقت سنو اور خود فیصلہ کرو کہ الزام علیہ کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔

دو حصوں پر مشتمل اس ڈرامے کا پہلا حصہ دس جب کہ دوسرا حصہ گیارہ مناظر پر مشتمل ہے ڈرامے کے زیادہ تر مکالمات منٹو کی ذاتی تحریروں سے منقول ہیں، گویا منٹو کی زبان میں منٹو کا دفاع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سعادت حسن منٹو کا کردار ایس ایم سلیم نے جب کہ وکیل استغاثہ کا کردار قربان جیلانی نے کمال محنت سے نبھایا۔ ۱۱۳ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں منٹو کے کھاتے میں صرف ۳۹ صفحات ہی آئے ہیں۔

''منٹو کتھا''، ڈاکٹر برج پریمی:

چھے ابواب پر مشتمل ڈاکٹر برج پریمی کی یہ کتاب ''منٹو کتھا'' دیپ پبلی کیشنز، جموں نے مصنف کے فرزند پریمی رومانی کی معاونت سے ۱۹۹۴ء میں شائع کی۔ ابواب کی تقسیم کچھ اس طرح ہے:

(۱) شخصیت (۲) فکر و فن (۳) خطوط (۴) معاصرین (۵) فلم (۶) تراجم

پہلا باب جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ منٹو کے سوانحی حالات اور عادات و اطوار سے متعلق ہے۔ منٹو کا خاندان اور ان کی منٹو کے حوالے سے سخت گیری کے واقعات، منٹو کی شخصیت کے مختلف روپ، باری علیگ اور منٹو کا تعلق اور اس تعلق کے منٹو کی شخصیت کی تعمیر پر پڑنے والے اثرات، منٹو کا گھر میں بطور بیٹا، خاوند اور باپ کے رویہ، کشمیر سے اس کی محبت اور کشمیری النسل ہونے پر اظہار تفاخر کے علاوہ شراب نوشی، یہاں تک کہ وفات تک کے چیدہ چیدہ حالات و واقعات کو خوبصورت پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے باب ''فکر و فن'' میں منٹو کی ایک متنازعہ تحریر ''بغیر عنوان کے'' جس سے منٹو کو بحیثیت ناول نگار جانچا جاتا ہے' حال آں کہ بعض محققین اسے منٹو کی تحریر ہی نہیں سمجھتے، کے جائزے کے علاوہ منٹو شناسی کے حوالے سے شائع ہونے والی کتب اور رسائل کے خصوصی نمبروں کی فہرست دی گئی ہے اس باب کی خاص تحریر ''منٹو کی تحریروں میں ذکر غالب'' کے عنوان سے شامل ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے منٹو کی غالب پرستی پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ دونوں کے شخصی و معروضی حالات و مزاج اور انا کے اشتراک کو

منٹو کی غالب میں دلچسپی کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو اپنی تحاریر اور گفتگو میں اکثر اوقات غالب کے اشعار اور شخصیت کا حوالہ دیتے ہیں۔ مصنف نے بھی اس جائزے میں منٹو کی تحریروں میں استعمال ہونے والے اشعار کے حوالے دیے ہیں۔ منٹو، فکر و فن کے چند پہلو'' میں منٹو کی فکری اور فنی خوبیوں کا جائزہ خوب ہے۔ ''خطوط'' کے عنوان سے شامل حصے کو چار اجزاء میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی جزو ''منٹو کے خطوط۔ ایک جائزہ'' میں منٹو کی مکتوب نگاری پر بحث کی گئی ہے۔ اس حصے میں صرف ان خطوط کو موضوع بنایا گیا ہے جو احمد ندیم قاسمی کے نام لکھے گئے۔ کتاب کی تصنیف کے وقت چوں کہ منٹو کے خطوط کا یہی ایک مجموعہ سامنے آیا تھا اور جس بھی ناقد نے منٹو کی مکتوب نگاری پر قلم اٹھایا اس نے صرف انھی خطوط کو ہی مد نظر رکھا۔ اگرچہ کہ منٹو کے خطوط کی تعداد اس کی زود گوئی کے پیش نظر اچھی خاصی ہو گی۔ پرویز انجم کی مرتّبہ کتاب ''منٹو نامے'' میں شامل منٹو کے ۱۵۳ ایسے خطوط شامل ہیں جو اُنھوں نے احمد ندیم قاسمی کے علاوہ دیگر لوگوں کو لکھے تھے۔ دوسری جزو میں منٹو کے نام مختلف شاہیر ادب کے ۹ خطوط اصل متن کے ساتھ شائع کیے گئے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے نام دو خطوط کے علاوہ جاوید اقبال، راجہ مہدی علی خان، کنہیا لال کپور، فکر تونسوی سلام مچھلی شہری اور عبدالسلام خورشید کے نام ایک ایک خط شامل ہے۔ جب کہ ''منٹو کے چند اہم خطوط'' کے عنوان سے محمد طفیل کے نام دو، ممتاز شیریں کے نام تین، سلام مچھلی شہری اور نصیر انور کے نام ایک ایک خط شامل کتاب ہے۔ ''چند تصویر بتاں'' میں کتاب کے مصنف برج پریمی کے نام ایسے سترہ خطوط شامل ہیں جو منٹو کے معاصرین نے اُنھیں لکھے ان خطوط میں کسی نہ کسی انداز میں منٹو ہی کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔ کرشن چندر اور شاعر کشمیر مہجور کے ساتھ منٹو کے روابط اور رویوں کو ''معاصرین'' نامی باب میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ اگلا باب ''فلم'' منٹو کی فلمی دنیا سے وابستگی کی ایک بھرپور داستان ہے۔ جب کہ کتاب کے آخری باب بعنوان ''تراجم'' میں منٹو کی فرانسیسی اور روسی ادب کے تراجم کے بعد بحیثیت ترجمہ نگار خصوصیات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ برج پریمی کی یہ کتاب منٹو شناسی کے ساتھ ساتھ منٹو دوستی کا بھی ایک خوبصورت اظہاریہ ہے۔ اُنھوں نے اس کتاب میں منٹو کی شخصیت اور فن کا ہمدردانہ نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے۔

''منٹو: ایک مطالعہ''، وارث علوی:

منٹوانہ تنقید کے زمرے میں اگر وارث علوی کو زمانی لحاظ سے منٹو کا تیسرا بڑا یا سنجیدہ نقاد کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہو گا۔ ان سے پہلے ڈاکٹر محمد محسن اور ممتاز شیریں منٹو پر قدرے طویل اور سنجیدہ نوعیت کے مباحث کا آغاز اپنی مشہور زمانہ کتاب ''سعادت حسن منٹو، اپنی تخلیقات کی روشنی میں'' اور ''منٹو نوری نہ ناری'' میں کر چکی ہیں۔ وجے پبلی شرز، دہلی نے ۱۹۹۷ء میں اسے شائع کر کے منٹو کے فن افسانہ نگاری کے متعلق بہت سے فکری سوالات اٹھائے۔ ۲۲۴ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں درج ذیل مضامین شامل ہیں:۔

منٹو کا ادبی شعور، حیات اور موت کی کشمکش، منٹو اور سنسنی خیزی، عشق محبت کی کہانیاں، جنسی نفسیات اور پرورش کے افسانے، منٹو کے افسانوں میں عورت، منٹو کی خاکہ نگاری، بابو گوپی ناتھ، بو اور بوئے آدم زاد، ہتک، ٹوبہ ٹیک سنگھ، اور بابو گوپی ناتھ پر مزید گفتگو۔

''منٹو کا ادبی شعور'' سے مصنف کی مراد اس کے تنقیدی شعور سے ہے۔ منٹو نے مختلف مواقع پر ادب، ادیب، فحاشی اور ترقی پسندی پر جو خامہ فرسائی کی ہے اس کا تفصیلاً ذکر اس مضمون میں موجود ہے۔ منٹو کی ادبی زندگی کا آغاز اگرچہ تراجم سے ہوا لیکن اس کے تنقیدی شعور کی ابتدائی کڑیاں احمد ندیم قاسمی کے نام لکھے گئے خطوط میں بآسانی دکھائی دیتی ہیں۔ مصنف نے منٹو کے ایک نظر انداز شدہ

مضمون کے حوالے سے، جو اس وقت کی فلمی زندگی پر تبصرہ تھا، منٹو کے کٹیلے اسلوب کی خوب تعریف کی۔ اسی طرح مختلف مضامین اور مقدمات کے ضمن میں پیش کیے گئے نقطۂ نظر سے بھی منٹو کو ایک واضح تنقیدی اور ادبی شعور کا حامل ادیب قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ان مضامین سے ثابت ہوتا ہے کہ منٹو کس قدر باشعور فنکار تھا۔ یہ شعور آرٹ کے ڈسپلن کا بھی تھا اور زندگی کی بصیرت کا بھی۔''[۵۳]

مصنف ''منٹو اور سنسنی خیزی'' کے عنوان سے لکھے گئے مضمون میں منٹو پر کیے گئے اس اعتراض کو رد کرتے ہیں کہ اُس کے افسانوں میں موجود کردار سنسنی پھیلانے کا باعث بنتے ہیں۔ خاص کر فسادات کے متعلق، بقول مصنف! فسادات پر لکھے گئے منٹو کے افسانے تشدد کا بیان نہیں بلکہ تشدد میں گھرے ہوئے آدمیوں کی کہانی ہیں:

> ''منٹو کی فنکارانہ خوبی دیکھئے کہ فسادات پر وہ افسانہ وہاں ختم کرتا ہے جہاں خوں چکانی کا آغاز ہوتا ہے اور اگر تشدد کے واقعات کا بیان منظور بھی ہو تو یا تو ظرافت اس کی شدت کم کرتی ہے یا صحافتی واقعہ نگاری اسے دردناک بننے نہیں دیتی۔''[۵۴]

اس ضمن میں ان کا ایک قابل غور جملہ دیکھئے:

> ''فسادات پر منٹو کے افسانے سنسنی خیز کم اور معنی خیز زیادہ ہیں۔''[۵۵]

منٹو کے افسانوں میں قتل و غارت گری اور زنا و زیادتی کے واقعات ضرور موجود ہیں لیکن یہ قاری نہیں بلکہ کرداروں کو متاثر کرتے ہیں۔ منٹو کے افسانوں کے انجام میں جو چونکا دینے کا عنصر غالب ہے وہ بھی شاید اسی سنسنی خیزی سے بچنے ہی کا ایک طریقہ ہے۔ کیا 'کھول دو' کی سنسنی خیزی کو محسوس کرنے کا عمل منٹو نے اپنے ذمہ لیا ہے یا قاری پر چھوڑ دیا ہے۔ عشقیہ کہانیاں منٹو کے ابتدائی دور کے افسانوں کا موضوع خاص رہی ہیں۔ منٹو کی ایسی کہانیوں کا تجزیہ مصنف نے ''عشق و محبت کی کہانیاں'' کے عنوان سے شامل مضمون میں کیا ہے۔ لالٹین، مصری کی ڈلی، موسم کی شرارت، بیگو، نامکمل تحریر، ایک خط اور چغد ایسے افسانے ہیں جن کا تعلق منٹو کی رومانی زندگی سے ہے۔ وارث علوی ان افسانوں کو منٹو کے ناکام افسانے گردانتے ہیں۔

''جنسی نفسیات اور پرورژن کے افسانے'' منٹو کے ہر دل عزیز موضوع یعنی جنس پر لکھے گئے افسانوں کے تجزیے پر محیط ہے۔ مصنف کے مطابق جنس کی کارفرمائی منٹو کے بیشتر افسانوں میں نظر آتی ہے لیکن ان میں صرف جنس ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت کچھ ہے۔ کرداروں کی شخصیت کے دیگر پہلو بھی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ خاص کر طوائف کے موضوع پر لکھے گئے افسانوں میں دلچسپی کا مرکز جنس نہیں بلکہ دوسرے نفسیاتی اور اخلاقی عوامل ہیں۔ منٹو کے نسوانی کرداروں کا جائزہ اُنھوں نے اپنے طویل مضمون ''منٹو کے افسانوں میں عورت'' میں لیا ہے۔ موذیل، شاردا، سلطانہ، سکینہ، سوگندھی، رکما بائی، ہلاکت اور دیگر کرداروں کا تجزیہ اس بات کا غماز ہے کہ منٹو نے اُردو افسانے کو کئی ایک متحرک اور مستقل نسوانی کرداروں سے متعارف کرا دیا ہے۔ ''منٹو کی خاکہ نگاری'' کی خوبی کو سراہتے ہوئے وارث علوی نے ''لاؤڈ سپیکر اور گنجے فرشتے'' میں شامل خاکوں کو ہر دور اور ہر نسل کے لیے دلچسپی کا سامان رکھنے والے خاکے قرار دیا ہے۔ جن میں معمولی باتوں کو غیر معمولی بنا کر پیش کرنے کی کوشش سرے سے مفقود ہے۔ بقول مصنف ان خاکوں میں منٹو کا تخلیقی طریقہ کار ایک منجھے ہوئے فنکار کا ہے۔

بابو گوپی ناتھ، بو، ہتک اور ٹوبہ ٹیک سنگھ پر الگ الگ تجزیاتی مضامین بھی خاصے کی چیز ہیں۔ جیسا کہ شروع میں کہا گیا کہ وارث علوی کی یہ کتاب منٹو شناسی کے باب میں بہت قدر و قیمت کی حامل ہے۔ منٹو کا اس طرح سنجیدہ مطالعہ ان سے پہلے خال خال ہی دکھائی دیتا ہے۔ عالمی ادب اور ادیبوں کی کہانیوں اور نظریات سے تقابل کی روش جو ممتاز شیریں نے اختیار کی تھی اس کی پیروی فاضل مصنف کے ہاں بھی ملتی ہے۔ جو مصنف کے وسیع العلم ہونے کے ساتھ ساتھ منٹو کی آفاقیت اور عالمگیریت کی بھی دلالت کرتی ہے۔ المختصر منٹو کے متعلق وارث علوی کی یہ کتاب ہمیشہ عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

''منٹو شناسی (سعادت حسن منٹو کے افسانوں پر گفتگو)''، شکیل الرحمٰن:

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کی یہ تصنیف اردو مرکز، عظیم آباد پٹنہ نے ۱۹۹۷ء میں شائع کی۔ جسے جابر حسین نے مرتّب کیا۔ دیباچہ ''اپنی بات'' کے بعد مصنف کی منٹو کے افسانوں کے متعلق کی گئی پر مغز بحث کا آغاز ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے منٹو کی درج ذیل پندرہ کہانیوں، ٹوبہ ٹیک سنگھ، بابو گوپی ناتھ، بو، ہتک، ممی، سرکنڈوں کے پیچھے، موذیل، خوشیا، سہائے، کھول دو، شاردا، شاہ دولے کا چوہا، ٹھنڈا گوشت، سرمہ اور ممد بھائی کو موضوع گفتگو بنا کر منٹو کے فن کی تفہیم کی۔ کتاب کے مرتّب جابر حسین مقدمے میں منٹو کی فنی خوبیوں خصوصاً کردار نگاری کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ منٹو کے کردار آنکھوں میں کرچیوں کی طرح چبھتے ہیں، جو خدا کی ہر تخلیق میں صرف اچھائی اور حسن، دلکشی اور رنگینی دیکھنے کی عادی ہوتی ہیں۔ ایسی آنکھوں کو اپنی سماجی بینائی کھونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں اندرونی نفسیاتی تصادم کا منظر پیش کرتے ہیں۔ ان کے کردار صرف وہی نہیں بولتے جو الفاظ کی شکل میں ان کی زبان سے ادا ہوتا ہے بلکہ ان کے کردار سماجی تجزیہ کی تاریک گہرائیوں سے ابھرتے ہیں۔ منٹو کی کہانیاں ان گہرائیوں سے ابھرنے والی داستانیں ہیں جو ایک منفرد نفسیاتی شناخت رکھتی ہیں۔ مصنف کی اس کاوش کو اُنھوں نے منٹو کے ساتھ تخلیقی انصاف قرار دیا۔

۱۵۵ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں سب سے پہلے منٹو کی شہرہ آفاق کہانی ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ کے عہد سے منسوب گڈریے کی کہانی کو بنیاد بنا کر جس میں ایک گڈریا اپنی گمشدہ لیکن سب گھر والوں کی ناپسندیدہ بھیڑ کو پانے کے بعد اسے اپنے کاندھوں پہ ڈال کر باقی تمام بھیڑوں کو فراموش کر کے اپنے گھر والوں کو اس کی حالت دکھانے کے لیے سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ بھیڑ جو لاغر اور بیمار ہے اور جسے اس کے گھر والے اس کی ظاہری نقاہت کمزوری اور بدصورتی کی وجہ سے پسند نہیں کرتے، اُنھیں اس کی اصل حالت دکھا کر رہے گا۔

بقول مصنف، سعادت حسن منٹو اور اس کی کہانیوں کو پڑھتے ہوئے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ منٹو بھی اس گڈریے کی طرح بار بار انسانوں کے جنگل میں جاتے ہیں اور کسی نہ کسی بیمار، کمزور، بدصورت، دھتکارے ہوئے شخص کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے دوڑتے چلے آتے ہیں اور اُنھیں ان کی اصل حالت میں سماج کے آگے لا کر رکھ دیتے ہیں۔ کبھی ان کے کاندھوں پر ٹوبہ ٹیک سنگھ ہوتا ہے تو کبھی موذیل، سوگندھی، ممد بھائی، کبھی کلونت کور، شوشو اور منگو تو کبھی بابو گوپی ناتھ، سکینہ اور سلطانہ، اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں کے برخلاف:

''منٹو کا معاملہ یہ ہے کہ جب اُنھیں کوئی موضوع ملا، کوئی کردار نظر آ گیا، وہ اسے لے کر دوڑے ہیں، یہ بتانے کے لیے کہ دیکھو! انسانوں کے اس جنگل میں یہ سب بھی ہیں، اُنھیں بھی دیکھو، اُنھیں بھی پہچانو، مسائل اور کردار کو ہجوم سے علیحدہ کر کے دیکھنے دکھانے کی بات اس طرح کہیں اور نہیں ملتی۔''[۵۶]

تقسیم، ہجرت اور فسادات کے متعلق ایک وقیع سرمایہ ہمارے ادب میں موجود ہے لیکن اس المیے کا سب سے بڑا عنوان، سعادت حسن منٹو کے افسانے ٹوبہ ٹیک سنگھ، کو قرار دیتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کا قصہ تمثیل کا حسن لیے ہوئے ہے، تمثیل کے جوہر نے اس کہانی کو ڈراما بنا دیا ہے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے متعلق لکھتے ہیں:

''ٹوبہ ٹیک سنگھ درد کے رشتے کی لازوال کہانی ہے، برصغیر کا ایسا شہر آشوب ہے کہ جس میں فنکار نے ایک کردار کے ذریعہ ایک بڑی وحدت کے ٹوٹنے کا ماتم کیا ہے۔ ایسا ماتم کہ محسوس ہوتا ہے جیسے زمانے کا کلیجا پھٹ گیا ہو اور اس کا پورا وجود اندر باطن میں لہولہان ہو۔''[۵۷]

وارث علوی نے ٹوبہ ٹیک سنگھ کو ہندوستان کی تاریخی، سماجی، تہذیبی اور نفسیاتی عوامل کے قصے کی ایک معنی خیز علامت بلکہ ایک معنی خیز استعارہ قرار دیا۔

بابو گوپی ناتھ کا تجزیہ کرتے ہوئے مصنف نے منٹو کی حقیقت نگاری کو محض حقیقت نگاری سے آگے کی چیز قرار دیا۔ ان کے بقول منٹو کے یہ کردار یقیناً اپنا حقیقی وجود رکھتے ہوں گے اور منٹو کا ان سے میل ملاقات بھی ہو گا۔ لیکن منٹو نے ان کی جو تصویریں دکھائی ہیں وہ محض فوٹو گرافی نہیں بلکہ ان کرداروں کی تشکیل میں منٹو کے تخیل، نفسیات رومان اور جمالیاتی فکر و نظر کے ساتھ ساتھ کہانی لکھنے کی تکنیک کا بھی اچھا خاصا عمل دخل ہے۔ گویا ان کرداروں کو افسانہ نگار نے از سر نو تخلیق کر کے دنیا کو دکھایا ہے۔ مصنف نے بابو گوپی ناتھ کی ایک بڑی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وہ فریب میں رہنے اور فریب کو ناپسند کرنے کے باوجود خود کسی کو فریب نہیں دیتا۔ منٹو کے افسانہ ''بو'' کے حسن اور تاثیر کے متعلق لکھتے ہیں:

''افسانے (بو) کا حسن یہ ہے کہ سچائی کے انکشاف کے بعد بھی اس کی پر اسراریت قائم رہتی ہے۔ کسی قسم کی کوئی تشریح یا منطقی تشریح نہیں ہو سکتی۔ اس افسانے نے ایک ''وژن'' دیا ہے 'وجدان عطا کیا ہے۔ اس وژن اور وجدان کی تشریح ممکن نہیں۔''[۵۸]

''ہتک'' کو اردو فکشن کا ایک شاہکار افسانہ قرار دیتے ہوئے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ منٹو نے اس کہانی میں اپنی تشنگی، اپنے باطنی کرب کے ساتھ ہمیں اس طرح دی ہے کہ ہم اپنی پیاس اور اپنے درد کے تئیں زیادہ بیدار اور آگاہ ہو گئے ہیں۔ فنکار اور اس کے موضوع اور اس کے کردار کی پیاس قاری کی پیاس سے مل گئی ہے اور درد بڑھ گیا ہے۔ کرب میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ان کے بقول یہ درد ہی دراصل سچائی کا عرفان ہے۔ افسانے کے فنی اور موضوعاتی حسن کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہتک کا ایک بڑا حسن یہ ہے کہ اس میں ماحول اور فرد کے تجربوں کی وجہ سے بڑے خوبصورت ارتعاشات پیدا ہو گئے ہیں۔ نفسیات کی مختلف سطحوں نے ان خوبصورت ارتقاشات کو اور بھی محسوس اور توجہ طلب بنا دیا ہے۔۔۔ اردو فکشن کا یہ کردار ہمیشہ یاد رہے گا، اس لیے کہ سوگندھی زندگی کے المیہ کا خود جواب بن گئی ہے۔''[۵۹]

افسانہ ''ممی'' کے متعلق اپنی رائے وہ کچھ یوں دیتے ہیں:

''اس کہانی میں کئی فنی خامیاں ہیں۔ سب سے بڑی خامی اس کی طوالت ہے۔ غیر ضروری واقعات، تھیم کو دھندلا کر دیتے ہیں۔ دونوں کرداروں یعنی ممی اور چڈھا کا فطری ارتقاء ہو سکتا تھا۔ غیر ضروری باتیں ہوتی ہیں، چند غیر متعلق کردار شامل ہوتے ہیں، باتیں مختلف سمتوں میں جاتی ہیں، اس لیے مختصر افسانے کا فطری تسلسل قائم نہیں رہ سکا۔''[۶۰]

''سرکنڈوں کے پیچھے'' میں موجود خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اُنھوں نے کئی سوالات اٹھائے۔ مثلاً ہلاکت کو ہیبت خان اور نواب کے رشتے کی خبر کس طرح ملی؟ ہیبت خان اسے سرکنڈوں کے پیچھے لے کر کیوں آیا؟ نواب کا قتل ہو جانا، ہڈیاں اور گوشت الگ ہونا، پھر گوشت کے خاص حصے کا پکنا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونا، ہیبت خان کا ہلاکت کو اکیلا چھوڑ کر خود باہر چلے جانا وغیرہ۔ مصنف ان سوالات کی روشنی میں افسانے کو فنی طور پر ناکام قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس افسانے میں موجود نفسیاتی مسئلے کو بہتر انداز سے پیش کیا جا سکتا تھا۔

افسانہ ''موذیل'' کو مصنف اپنے تعمیری حسن اور مؤثر مناظر کی وجہ سے منٹو کے زندہ افسانوں میں شمار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ المیہ کے حسن کا ایسا فنکارانہ اظہار سعادت حسن منٹو کے کسی افسانے میں نہیں ہوا۔

''سہائے'' کو وہ انسان دوستی کا مظہر جب کہ کھول دو کو تکلیف دہ اور اذیت ناک المیہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے بقول فسادات پر لکھے گئے افسانوں میں اتنا تکلیف دہ اور اذیت ناک المیہ آج تک نہیں لکھا گیا۔ اس افسانے سے فنکار کے وژن، مشاہدے، گہرائی اور باریک بینی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے ''کھول دو'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''افسانے کی تکنیک اور موضوع کی ہم آہنگی اور وحدت تاثر کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ فنکار کہانی میں جذب ہو گیا ہے۔ اس طرح کہ جس طرح بڑا رقاص اپنے رقص میں جذب ہو کر گم ہو جاتا ہے۔''[۶۱]

''ٹھنڈا گوشت'' کو منٹو کے فن کا ایک عمدہ نمونہ قرار دیتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ اس کہانی کا حسن اس کی ٹریجڈی میں پوشیدہ ہے۔ تقسیمِ ہند کی ٹریجڈی کے پس منظر میں ایشر سنگھ کی ٹریجڈی ابھرتی ہے۔ اس کا حسن وہ نفسیاتی گرہ ہے جس کا شدید ردعمل ایشر سنگھ کو ایک بڑی نعمت سے محروم کر دیتا ہے۔

'ممد بھائی' کو بھی مصنف منٹو کا ایک یادگار کردار تصور کرتے ہیں جب کہ آخر میں ''سیکس'' میں سیکس کے آفاقی اور بین التہذیبی مباحث کی روشنی میں اس جبلت کی ناگزیریت اور برتاؤ کے سبب سعادت حسن منٹو کو جنس نگار یا فحش نگار تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے یہ محسوس کرتے ہیں کہ منٹو نے سیکس کو صرف چھوا ہے اور بس:

''وہ جنسی ترغیب اور جنسی لذتوں کے فنکار نہیں ہیں۔ پھر بھی ان پر مقدمے چلے، علامہ تاجور نجیب آبادی سے سجاد ظہیر اور علی سردار جعفری تک ان پر اور ان کے افسانوں پر برسے۔''[۶۲]

۱۵۵ صفحات پر مشتمل یہ کتاب سعادت حسن منٹو کے افسانوں کا ایک عمدہ تجزیہ ہے۔ مصنف نے کم و بیش تمام افسانوں کے تجزیات سے پہلے کسی حکایت، قدیم روایت یا معروف واقعہ کو پیش کر کے، اس سے نکلنے والے نتیجے کی روشنی میں منٹو کی کہانیوں اور

کرداروں کا جائزہ لیا ہے جو منٹو کے باب میں اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ ہے۔ اس لیے مرتّب کی اس رائے سے بخوشی اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ پہلی بار منٹو کے ساتھ تخلیقی انصاف ہوا ہے۔

''معمار افسانہ نگار: سعادت حسن منٹو''، انیس ناگی:

انیس ناگی نے اپنی اس کتاب کو سعادت حسن منٹو کی حیات اور فن پر ایک مسلسل اور مختصر مونو گراف قرار دیتے ہوئے اس کی اشاعت کا مقصد اُردو ادب کے نئے قارئین کو ایک بڑے فنکار کی زندگی کی مہمات اور ادبی کارناموں سے تعارف قرار دیا ہے۔

''معمار افسانہ نگار: سعادت حسن منٹو'' مصنف کے ذاتی اشاعتی ادارے ''جمالیات'' لاہور سے ستمبر ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی۔ چار حصوں پر مشتمل اس کتاب میں منٹو کی سوانحی معلومات، فن پر گفتگو اور منٹو کی تین تحریروں کے انتخاب کے علاوہ منٹو کی کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔

پہلا حصہ جو کہ منٹو کی سوانحی معلومات سے متعلق ہے۔ اس میں منٹو کے خاندان، والدین، پیدائش، تعلیم، ادبی زندگی کا آغاز، منٹو کا لاہور، بمبئی اور دہلی میں قیام، شادی، فلمی دنیا سے وابستگی، پاکستان آمد اور وفات، غرض منٹو کی سوانح سے متعلق تمام اہم امور کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس میں مصنف کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اول یہ کہ اُنھوں نے پرانی معلومات کو از سرِ نو دہرا دیا ہے اور ان معلومات کا ماخذ بھی نہیں بتایا۔ دوم یہ کہ تحقیقی اعتبار سے یہ حصہ خاصا کمزور ہے اور مصنف سے بہت سی تحقیقی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر منٹو کی سوتیلی والدہ ''جان مالی'' کا نام اُنھوں نے ''جان بی بی'' لکھا ہے۔ منٹو کے والد غلام حسن منٹو کی تاریخ وفات کے متعلق لکھتے ہیں: ''اُنھوں نے ۱۹۳۰ء میں امرت سر میں ۶۷ برس کی عمر میں وفات پائی۔'' ڈاکٹر علی ثنا بخاری کی تحقیق کے مطابق غلام حسن منٹو کا انتقال ۱۹۳۲ء میں ہوا تھا۔ اسی طرح منٹو کے قیام لاہور، قیام بمبئی اور قیام دہلی کے متعلق بھی مصنف کے دیے گئے سنین درست نہیں منٹو کے بیٹے کا نام اُنھوں نے خالد بتایا ہے جب کہ اس کا نام عارف تھا۔ یہ نام منٹو کی بیگم صفیہ کی پسند پر رکھا گیا تھا۔

مقامِ حیرت ہے کہ منٹو کی تاریخ پیدائش و وفات کے متعلق مصنف اپنی غلطی کو بار بار دہراتے چلے آرہے ہیں۔ اُنھوں نے منٹو کی تاریخ پیدائش ۱۱ مئی ۱۹۱۳ء اور تاریخ وفات ۱۷ جنوری ۱۹۵۵ء درج کی ہے۔ اس سے قبل اپنی دیگر کتابوں اور ''دانشور'' کے منٹو نمبر میں بھی اُنھوں نے یہی تواریخ اور سنین درج کیے ہیں۔ نقد و ادب کی تاریخ میں انیس ناگی ایسے واحد ''نقاد'' ہیں جو انھی تواریخ پر اصرار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وگرنہ اصل تواریخ ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء اور ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء ہی ہیں۔ واضح رہے کہ تمام معلومات (درست یا غلط) فراہم کرتے ہوئے مصنف نے اپنے ماخذات کی نشان دہی نہیں کی۔

دوسرا حصہ جو سعادت حسن منٹو کے فن سے متعلق ہے، میں انیس ناگی نے منٹو کے تخلیقی ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے فنی خوبیوں کو اجاگر کیا۔ اُنھوں نے منٹو کی تخلیقی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کر کے، ہر دور کا علیحدہ علیحدہ مختصر جائزہ لیتے ہوئے ''پھندنے''، ''بار دہ شمالی'' اور ''فرشتہ'' کو جدید افسانوں کی اوّلین صورت قرار دیا۔ منٹو کا پہلا افسانوی مجموعہ ''دھواں'' کو قرار دیتے ہوئے۔ لکھتے ہیں کہ ''منٹو اپنے پہلے مجموعہ ''دھواں'' (۱۹۳۹ء) میں یک لخت بے حد پختگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔''، ''دھواں'' منٹو کا پہلا افسانوی مجموعہ نہیں ہے۔ اس کی اشاعت ۱۹۴۱ء میں ہوئی تھی جب منٹو دہلی میں مقیم تھے۔ منٹو کا پہلا افسانوی مجموعہ ''آتش پارے'' ۱۹۳۶ء میں اشاعت

پذیر ہوا تھا۔ منٹو کی مرقع نگاری اور مضمون نگاری پر تبصرہ کرنے کے بعد مصنف اپنی لکھی ہوئی گزشتہ بات کا رد کچھ اس طرح کرتے ہیں: ''لیکن جب اس کا پہلا افسانوی مجموعہ ''منٹو کے افسانے'' ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تو منٹو نے افسانے کے واقعاتی سٹرکچر سے دُور ہٹنے کی کوشش کی۔ اس حصے میں مصنف نے منٹو کی تکنیک، کردار نگاری اور زبان و بیان کو سراہا ہے۔

''منٹو کے مقدمات'' کے عنوان سے منٹو کے افسانوں پر چلنے والے مقدمات کی مختصر تفصیل پیش کی گئی ہے، یہ معلومات اس سے قبل ان کی کتاب ''منٹو کے مقدمات'' میں خاصی تفصیل سے دی گئی تھیں۔ آخر میں منٹو کی وفات کے بعد شائع ہونے والے رسائل اور مختلف جامعات میں ہونے والے تحقیقی کام کو اُنھوں نے منٹو، کی کامیابی سے تعبیر کیا۔ اگلا حصہ منٹو کی تحریروں کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ اس میں منٹو کی تین تحریروں ''بابو گوپی ناتھ''، ''خاکہ 'تین گولے''' اور'' مضمون ''افسانہ نگار اور جنسی مسائل'' کو شامل کیا گیا ہے۔ جب کہ آخر میں ''سعادت حسن منٹو کی کتابیں'' مع سن اشاعت و پبلشرز درج کی گئی ہیں۔ اس فہرست میں بھی تحقیقی اعتبار سے بہت سی اغلاط ہیں۔ مثلاً ''ایک اسیر کی سرگزشت'' روسی افسانے''، ''گورکی کے افسانے''، ''چغد''، ''گنجے فرشتے''، ''شکاری عورتیں''، اور ''برقعے'' کے سن اشاعت درست نہیں۔ ان پے درپے اغلاط کی وجہ سے کتاب تحقیقی اعتبار سے بہت سی غلطیوں کا مجموعہ بن گئی ہے۔ یہ کتابت کی اغلاط ہوں یا بقول ڈاکٹر علی ثنا بخاری، مصنف کی جلد بازی، لاعلمی یا پھر ان کا ذہنی انتشار، وجہ چاہے کوئی ہو، اُردو ادب کے نئے قارئین کو ایک بڑے افسانہ نگار کی تخلیقی و سوانحی جہتوں سے متعارف کرانے کا خواب اس کتاب میں پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔

''منٹو اور بیدی: تقابلی مطالعہ'' ڈاکٹر کہکشاں پروین:

اُردو کے دو نامور اور ہم عصر افسانہ نگار سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی کے فنی تقابل پر مبنی ڈاکٹر کہکشاں پروین کی یہ تصنیف ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی سے ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی۔ منٹو اور بیدی اردو کے ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے ہاں فن اور فکر کی متعدد جہتیں موجود ہیں۔ دونوں افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے تراجم دنیا کی کئی زبانوں میں کیے جا چکے ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس سے پہلے اور بعد میں ان دونوں کے فکر و فن کا تقابلی جائزہ کتابی صورت میں نہیں ملتا۔ وارث علوی نے ''دو ادیب'' نامی کتاب میں مذکورہ افسانہ نگاروں کو یکجا ضرور کر دیا ہے لیکن یہ یکجائی تقابل کے صورت قطعاً اختیار نہیں کرتی۔

ڈاکٹر کہکشاں پروین نے اپنی تصنیف میں دونوں افسانہ نگاروں کی انفرادیت اور یکسانیت کو تلاش کرتے ہوئے واضح نتائج تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کے تبصرے ''کتاب سے پہلے'' اور مصنفہ کے ابتدائیہ کے بعد سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی کے سوانحی حالات پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی ہر دو افسانہ نگاروں کی شائع شدہ کتب کے نام بھی درج کیے گئے ہیں۔ مصنفہ کے نزدیک جنس ایسا موضوع ہے جس پر ان دونوں افسانہ نگاروں نے کہانیاں لکھیں۔ لیکن بدنامی صرف منٹو کے حصے میں آئی اس حوالے سے لکھتی ہیں:

> ''منٹو پوری زندگی اپنی جنس زدگی کے لیے بدنام رہے۔ مقدمات اور جیل کی بھی باری آئی۔ لیکن اپنے مزاج اور انداز پیش کش میں وہ ذرا برابر تبدیلی لانے کے روادار نہیں ہوئے۔'' [۶۳]

یہ حقیقت ہے کہ جنسی موضوعات کی وجہ سے منٹو کے حصے میں بدنامی کے ساتھ ساتھ شہرت بھی آئی اور اُنھیں اس فن میں مقدمات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ لیکن مصنفہ کی اس بات سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ منٹو کو جیل بھی جانا پڑا۔ منٹو کے کسی دوست یا سوانح نگار نے اس قسم کی صورتحال کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا۔ وارنٹ ضرور نکلتے تھے لیکن گرفتاری سے پہلے ہی ضمانت کرالی جاتی۔ راجندر سنگھ بیدی کے حالات زندگی والے باب سے جڑے ہوئے صفحات میں ہی مصنفہ نے دونوں ادیبوں کا فنی محاکمہ بھی شروع کر دیا۔ سعادت حسن منٹو کے افسانہ ''بو'' کو اُردو کا لازوال افسانہ قرار دینے کے لیے مختلف ناقدین کی اس افسانہ کے بارے میں دی گئی متضاد آرا، خاص کر ترقی پسند ناقدین اور اکابرین، جن میں علی سردار جعفری اور ممتاز حسین سرفہرست ہیں، کا جائزہ لینے کے بعد مصنفہ یہ نتیجہ نکالتی ہیں کہ :

> ''یہ افسانہ (بو) کسی بھی طرح مخرب الاخلاق نہیں۔ موضوع، تکنیک جزئیات نگاری اور زبان و بیان کے لحاظ سے ''بو'' ایک ارفع و اعلیٰ افسانہ ہے۔'' [۶۴]

دھواں، ٹھنڈا گوشت، شاردا موذیل اور کھول دو وغیرہ میں اگرچہ جنس یا اس سے متعلق کچھ خاص اشارے موجود ہیں لیکن منٹو نے ان موضوعات کو کبھی بھی لذت پسندی کے لیے منتخب نہیں کیا۔

سعادت حسن منٹو کے ساتھ ساتھ مصنفہ نے راجندر سنگھ بیدی کی جنسی موضوعات پر لکھی گئی کہانیوں کی تفصیل پیش کی۔ لیکن منٹو اور بیدی کی پیش کش کے مختلف انداز نے ایک کو رسوا اور دوسرے کو محترم بنا دیا۔ جنسی موضوعات پر جس بے دردی اور بے خوفی سے منٹو نے قلم چلایا ہے وہ راجندر سنگھ بیدی تو کیا عصمت چغتائی کے بس کی بھی بات نہ تھی۔ چناں چہ اس موضوع پر مصنفہ سعادت حسن منٹو کو دیگر تمام معاصر افسانہ نگاروں کے مقابلے میں تنہا و یکتا قرار دیتی ہیں۔

''منٹو اور بیدی کے اہم کردار'' نامی مضمون میں مصنفہ نے دونوں کے کرداروں اور کردار نگاری کی خصوصیات کا تقابلی جائزہ لیا ہے۔ بیدی کے کرداروں کو وہ منطقی بنیادوں پر کم اور جسمانی یا جبلی سطح پر زیادہ ابھرتا ہوا دیکھتی ہیں۔ ان کے کردار محض کٹھ پتلی بننے کی بجائے انسانی زندگی کی پیچیدگیوں کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ کردار نگاری کے اعتبار سے مصنفہ بیدی کا دائرہ زیادہ وسیع قرار دیتی ہیں۔ کیوں کہ بیدی کے مقابلے میں منٹو کے کردار نسبتاً نچلے اور پست طبقے سے تعلق رکھنے والے اور مسترد کیے ہوئے لوگ ہیں۔ اپنے مضمون کا اختتام وہ اس نتیجے پر پہنچ کر کرتی ہیں :

> ''منٹو کے نسوانی کردار بھیڑ میں صاف پہچانے جاتے ہیں۔ اس لیے بیدی کی کردار نگاری کو واقعات کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔۔۔ کہہ سکتے ہیں کہ بیدی کا دائرہ وسیع ہے اور ڈائمنشن بھی زیادہ ہے لیکن اس Dimension کی قوت ان کے کردار میں اختصاص نہیں پیدا ہونے دیتی۔ اور ایک خاص قسم کے کردار کی تشکیل میں منٹو تنہا و یکتا مانے جاتے ہیں۔'' [۶۵]

منٹو اور بیدی کے کرداروں کے تقابل کے بعد مصنفہ نے دونوں کی کہانیوں میں موجود پلاٹ سازی کا تجزیہ کتاب میں شامل اگلے مضمون بعنوان ''پلاٹ'' میں کیا ہے۔ منٹو کے پلاٹ سادہ جب کہ بیدی کے ہاں اُنھیں الجھاؤ اور پیچیدگی دکھائی دیتی ہے لیکن پھر

بھی دونوں کے ہاں پلاٹ کی تکمیل کا احساس موجود ہے۔اس کے باوجود کہ بیدی کے ہاں جزئیات نگاری زیادہ اور منٹو کے ہاں نہ ہونے کے برابر ہے، مصنفہ یہ حتمی نتیجہ نکالتی ہیں:

"منٹو کے یہاں زندگی میں بدصورتی ہے، گندگی ہے، حیوانیت ہے، لیکن انسانیت پھر بھی خوب صورت شکل میں ملتی ہے۔ مجموعی طور پر احساس ہوتا ہے کہ بیدی سے منٹو بڑا فنکار ہے۔"[۶۶]

"اُردو افسانے میں منٹو اور بیدی کی دین" میں مصنفہ نے ہر دو افسانہ نگاروں کی فکری، فنی، موضوعاتی اور اسلوبیاتی صفات کو اُردو افسانے کی نوزائندہ روایت کی افزائش کا باعث قرار دیا۔ ہر چند کہ مصنفہ نے دونوں افسانہ نگاروں کی ان خوبیوں کا الگ الگ جائزہ تو لیا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکالا۔ گزشتہ تمام مضامین میں کی گئی بحث کا نتیجہ کتاب کے آخری مضمون "اختتامیہ" میں کچھ اس انداز سے نکالتی ہیں:

"اُردو افسانہ کے سفر میں منٹو اگر ایک اہم موڑ ہے تو بیدی بھی ایک منزل ہے۔اس طرح یہ دو موڑ مل کر اُردو افسانے کے بہت سے سفر بناتے ہیں اور آئندہ آنے والی نسلیں ان دوراہوں پر چل کر اپنے فن کو جلا بخشتی رہیں گی۔"[۶۷]

۱۴۰ صفحات پر مشتمل اپنی نوعیت کی واحد کتاب میں راجندر سنگھ بیدی اور سعادت حسن منٹو کے سوانحی حالات کے علاوہ دونوں کے موضوعات، خصوصاً جنس کے حوالے سے، اہم کردار، پلاٹ اور اُردو افسانے کی روایت میں ان کی دین کے متعلق عمدہ گفتگو کی گئی ہے۔

"منٹو کا سرمایہ فکر و فن"، نگار عظیم:

سعادت حسن منٹو کے فکر و فن اور دس افسانوں کے تجزیے پر مشتمل نگار عظیم کی یہ کتاب بزم ہم قلم اے یچ-۳ بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی کے زیر اہتمام، ۲۰۰۲ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔

ہندوستان کے معروف منٹو شناس، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، جگدیش چندر ودھاون اور ڈاکٹر خالد اشرف کے طرز مطالعہ کو اپناتے ہوئے نگار عظیم نے بھی کہانیوں کے تجزیوں کے ذریعے سعادت حسن منٹو کی فکری و فنی عظمت کو ثابت کیا۔

"منٹو کا سرمایہ فکر و فن"، جسے کتاب کا عنوان بھی ٹھہرایا گیا ہے، کے عنوان سے شامل مضمون میں مصنفہ نے منٹو کی تخلیقی جہتوں کا ارتقائی جائزہ پیش کیا۔ روایتی قسم کے اس مضمون میں منٹو کے بچپن، لڑکپن اور اسلاف کے تذکرے، تخلیقی زندگی کے ابتدائی دور یعنی تراجم نگاری سے لے کر آخری دور تک کے افسانوی سفر کی مکمل داستان مختصراً لکھ دی گئی ہے۔ وہی باپ کی سختی، وہی پتنگیں اڑانا، شرارتیں کرنا، پڑھائی پر توجہ نہ کرنا، آوارہ گردی، ترجمے کرنا، اشتراکیت کے اثرات، تقسیم کے بعد کے افسانے، وہی آتش پارے، وہی انقلاب، وہی مقدمے، تقسیم سے پہلے کے افسانے، تقسیم کے بعد کے افسانے، وہی شراب نوشی اور اس کے نتیجہ میں زندگی کی بازی ہار جانا، غرض کچھ بھی تو نیا نہیں جو قاری کے لیے دلچسپی یا معلومات کا باعث بنے۔ صرف شخصی ہی نہیں بلکہ مصنفہ نے منٹو کی فکری خوبیوں کی تفصیلات لکھتے ہوئے بھی ۱۹۵۵ء کے وقار عظیم اور ۱۹۸۶ء کے ڈاکٹر برج پریمی کی یاد تازہ کر دی۔

مذکورہ بالا دونوں ناقدین نے منٹو کی فنی خوبیوں کا جن جن پیمانوں پر مطالعہ کیا تھا، مصنفہ کے ہاں بھی انھی کو معیار بنایا گیا۔ منٹو کے افسانوں کے آغاز فوراً اپنی طرف قاری کی توجہ مبذول کراتے ہیں، انجام جھنجھوڑ کے رکھ دیتے ہیں، وحدت تاثر کے حامل ہیں،

تشبیہات و جزئیات کمال کی ہیں، کرداری نگاری کا ملکہ رکھتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ البتہ مضمون کے آخری حصے میں اُنھوں نے روایت سے ہٹ کر منٹو کے دو سابق نقاد ممتاز شیریں اور وقار عظیم کی آرا سے کھل کر اختلاف کیا۔ مذکورہ بالا دونوں ناقدین نے منٹو کے آخری دور میں لکھے گئے افسانوں کو زوال کا شکار قرار دیا تھا۔ وقار عظیم نے تو صاف اعلان کیا تھا کہ تقسیم کے بعد منٹو اپنی عظمت کو برقرار نہیں رکھ سکے جب کہ ممتاز شیریں کو بابو گوپی ناتھ کے سوا کچھ بھی سجھائی نہ دیا۔ اسی طرح مصنفہ نے ڈاکٹر برج پریمی کی اس رائے سے بھی اختلاف کیا جس کے مطابق منٹو کے آخری زمانے میں لکھے گئے افسانے صرف پیسہ کمانے کی خاطر تھے۔ مصنفہ نے ان تینوں ناقدین کی تحریروں میں موجود تضادات کی نشاندہی کرنے کے بعد آخری دور میں سعادت حسن منٹو کے فن کا محاکمہ کچھ یوں کیا:

> ''یہ حقیقت ہے کہ اقتصادی مسئلہ منٹو کے لیے اہم مسئلہ تھا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آخری زمانے میں، ٹھنڈا گوشت، کھول دو، گورمکھ سنگھ کی وصیت، ۱۹۱۹ء کی ایک بات، ممی، اوپر نیچے درمیان، سڑک کے کنارے، نطفہ، سو کینڈل پاور کا بلب اور ٹوبہ ٹیک سنگھ جیسے لافانی شاہکار منٹو ہی تخلیق کر سکا۔'' [۶۸]

ٹوبہ ٹیک سنگھ کو وہ منٹو اور اردو ادب کا ایک نادر شاہکار قرار دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''ٹوبہ ٹیک سنگھ منٹو کا وہ شاہکار ہے جس کا اندازہ شاید منٹو کو بھی نہیں تھا۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کی اشاعت کے وقت اگر منٹو زندہ ہوتا تو بلاشبہ اس پر چھٹا مقدمہ دائر ہو گیا ہوتا۔'' [۶۹]

مضمون کے آخر میں مصنفہ نے سعادت حسن منٹو کو ایک ایسا آفاقی افسانہ نگار قرار دیا ہے جو صرف اپنے زمانے ہی میں نہیں بلکہ فی زمانہ بھی اُن کی تحریریں ہمارے سیاسی و سماجی مسائل کی نمائندگی کرتی دکھائی دیتی ہیں:

> ''۔۔۔ سکینہ آج بھی کھول دو کے عذاب میں مبتلا ہے۔ آج بھی پگڑی اچھالتے ہوئے موذیل چلا رہی ہے۔ لے جاؤ اس کو۔ اپنے اس مذہب کو'' مدبھائی اور ڈھونڈو آج بھی بمبئی میں مصروف ہیں، سوگندھی آج بھی فارس روڈ پر خارش زدہ کتوں کو جھیل رہی ہے۔'' [۷۰]

اس مختصر ابتدائیہ اور مضمون کے بعد ''منٹو کی چند کہانیاں اور اُن کا تجزیاتی مطالعہ'' کے عنوان کے تحت سعادت حسن منٹو کی دس درج ذیل کہانیوں کا تجزیہ قاری کی سہولت کے لیے کہانیوں کے متن کے ساتھ کیا گیا ہے۔ نیا قانون، ڈھارس، ۱۹۱۹ء کی ایک بات، نطفہ، ٹھنڈا گوشت، ممی، ٹوبہ ٹیک سنگھ، پانچ دن، کھول دو اور بابو گوپی ناتھ۔ بعض ایسے افسانوں کو بھی اس انتخاب میں شامل کر دیا گیا ہے جو ناقدین کی نظر میں فنی حیثیت سے منٹو کے کمزور افسانے گردانے جاتے ہیں۔ مصنفہ نے دعویٰ کیا ہے کہ اپنے مطالعہ سے ان کمزور افسانوں میں پوشیدہ فنی باریکیوں کو اُنھوں نے اجاگر کیا ہے۔ 'نیا قانون' کا تجزیہ ان سطور سے آغاز ہوتا ہے:

> ''منٹو کا یہ شاہکار افسانہ وقت کی قید و بند سے آزاد ہے۔ یہ اگرچہ ۱۹۳۸ء میں لکھا گیا تھا لیکن طرز بیان کی اثر انگیزی اور موضوع کی انفرادیت کے تحت اس افسانے کو جو آفاقیت اور ابدیت حاصل ہوئی ہے اس سے یہ افسانہ عالمی ادب کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔'' [۷۱]

'نیا قانون' کو وہ موضوع، ماحول، کردار، تشبیہات، جزئیات نگاری، مکالمہ نگاری اور وحدت تاثر کے طفیل ایک مکمل فن پارہ اور تاریخی دستاویز گردانتی ہیں۔ ڈھارس، کو مصنفہ نازک جذبات کا احاطہ کرنے والی کہانی سمجھتی ہیں۔ ان کے نزدیک عورت کے جذبات واحساسات کی عکاسی کرتے وقت سعادت حسن منٹو خود عورت بن جاتے ہیں، لکھتی ہیں:

"۔۔۔عورت کے کردار کو جو بالادستی منٹو نے عطا کی ہے وہ اردو ادب کے لیے بے مثل ہے۔" [۷۲]

۱۹۱۹ء کی ایک بات کو مصنفہ نے طنزیہ جزئیات نگاری اور مؤثر واقعہ بندی کی بہترین مثال قرار دیا۔ "نطفہ" منٹو کا ایسا عجیب و غریب افسانہ ہے جس کا نعم البدل اُنھیں اردو کے افسانوی سرمائے میں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ٹھنڈا گوشت، کے گواہ صفائی ڈاکٹر سعید اللہ سے مصور حیات کا لقب پانے والے سعادت حسن منٹو کے اس افسانے کو مصنفہ ظلم، تشدد بربریت کی بجائے انسانی نفسیات کا حامل افسانہ قرار دیتی ہیں۔ منٹو کا یہ افسانہ ماحول۔ پلاٹ، زبان وبیان، مکالموں کی چستی، فسادات کی خونریز سچائیوں اور انسانی نفسیات کے تمام جنسی اسرار ورموز کے ساتھ انسانی فطرت کا عکاس ہے۔

"ممی"، کو وسیع کینوس کا حامل افسانہ جب کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کو ایسا افسانہ تصور کرتی ہیں جس کی تخلیق سے اس کے مصنف نے انسان دوستی کا فرض اور مادر وطن سے محبت کا قرض چکانے کی کامیاب سعی کی ہے۔

"پانچ دن"، میں موجود فنی خامیوں کے اعتراف کے باوجود مصنفہ اسے اچھوتے احساسات سے لبریز ایک مثالی فن پارہ سمجھتی ہیں۔

"کھول دو"، تقسیم کے موضوع پر لکھا جانے والا ایسا افسانہ ہے جس کو لکھتے وقت منٹو کے اندر کی پھڑ پھڑاتی روح آہستہ آہستہ کاغذ پر منتقل ہوتی رہی۔ بقول مصنفہ:

"اُس (منٹو) نے سماج کے اس گھناؤنے سچ سے پردہ اٹھانے کی جسارت کی اور کہا، لو دیکھو، پہچانو، یہ ہم ہیں۔ ہمارا مذہب یہ ہے، ہمارا سماج یہ ہے، اب بتاؤ! ہم کون ہیں؟ انسانوں کے بھیس میں چھپے ہوئے درندے جو مردار کھانے والے گدھوں سے بھی بدتر ہیں۔" [۷۳]

مصنفہ "کھول دو" کو انسانی روح کی ایسی المناک ٹریجڈی سمجھتی ہیں جس کی جڑیں انسان کے مردہ ضمیر میں اندر تک پیوست ہیں۔ آخر میں 'بابو گوپی ناتھ'، کو مصنفہ ابو سعید قریشی اور ممتاز شیریں کی طرح ایک عظیم افسانہ قرار دیتی ہیں۔ نگار عظیم کی یہ تصنیف ۲۳۴ صفحات پر محیط ہے۔

"منٹو کے نسوانی کردار"، امجد جاوید:

امجد جاوید کی کتاب "منٹو کے نسوانی کردار"، علم وعرفان پبلی شرز، اُردو بازار، لاہور سے ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں مصنف کے ایک مضمون "منٹو کے عہد کی المیاتی تصویریں" کے علاوہ منٹو کے چودہ (۱۴) نسوانی کرداروں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ان کرداروں میں ممی، نکی، سلطانہ، گھاٹن لڑکی، پیرن، رکما بائی، کلونت کور، شانتی، شاردا، محمودہ، جانکی، لتیکا رانی، سوگندھی اور موذیل شامل ہیں۔ یہ کردار منٹو کے افسانوں: "ممی"، "کالی شلوار"، "نکی"، "بو"، "پیرن"، "پڑھیے کلمہ"، "ٹھنڈا گوشت"، "شانتی"، "دو قومیں"، "محمودہ"، "جانکی"، "لتیکا رانی"، "ہتک" اور "موذیل" سے لیے گئے ہیں۔ اپنے مضمون "منٹو کے عہد کی المیاتی

تصویریں''، میں مصنف نے مختلف ناقدین کی آرا کی روشنی میں دیگر افسانہ نگاروں کے تصور عورت کے بعد منٹو کے تصور عورت پر بحث کی ہے۔ مصنف نے علی سردار جعفری کی اُس رائے سے اختلاف کیا ہے جس میں اُنھوں نے منٹو کو جنسی مریض اور تلذذ زدہ افسانہ نگار قرار دیا تھا۔

امجد جاوید کے مطابق منٹو کے ایسے افسانے جن کا تعلق جنس سے ہے لذت کش کی بجائے کراہت آمیز ہیں۔ ایسے افسانوں کو جنسی تناظر میں دیکھنے کی بجائے ان کی اصل معنویت پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ منٹو کے ایسے افسانوں میں اس ظلم کے خلاف ایک احتجاج ہے جو صدیوں سے عورت پر ڈھایا جاتا رہا۔ اُن کے مطابق عورت پر سب سے زیادہ ظلم اور ناانصافی جنسی بنیادوں پر کی گئی۔ مصنف نے ایک ہی اخبار کی جرائم سے وابستہ درجنوں خبروں کی سرخیوں کو پیش کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے۔ کہ آج کے دور میں بھی زیادہ تر جرائم جنسی بنیادوں پر ہوتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اخبارات میں ان کی اشاعت کے خلاف تو کوئی واویلا نہیں مچایا جاتا لیکن اگر منٹو انھی واقعات کو فنکارانہ انداز میں قلم زد کرتا ہے تو اس پر مقدمات قائم کر دیے جاتے ہیں۔ مختلف ناقدین کی تحریروں کے اقتباسات کے ذریعے مصنف نے منٹو کے نظریۂ فن پر روشنی ڈالتے ہوئے منٹو کو اپنے عہد کا عکاس قرار دیا جس نے اپنے کرداروں کے ذریعے اس دور کی کئی جیتی جاگتی تصویروں سے ہمیں متعارف کرایا۔

مضمون کا زیادہ تر حصہ دیگر ناقدین کی آرا پر مشتمل ہے اور ان ہی آرا کی روشنی میں مصنف نے منٹو کے نسوانی کرداروں کا جائزہ لیا ہے۔ بہت سے مقامات پر اقتباسات درج کرتے ہوئے مصنف نے صاحب اقتباس کا نام نہیں لکھا۔ گو کہ عبارات واوین میں دی گئی ہیں جس سے مصنف کی نیت پر شک نہیں کیا جا سکتا لیکن بہتر ہوتا اگر وہ صاحبِ تحریر کا مکمل حوالہ دیتے۔

ایک اقتباس جو علی سردار جعفری کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' سے لیا گیا اس کی ذیل میں بار بار مصنف نے عزیز احمد کا نام لکھ دیا ہے۔ چوں کہ ''ترقی پسند ادب'' کے نام سے ان دونوں صاحبان کی کتابیں موجود ہیں شاید اس لیے مصنف سے یہ غلطی سرزد ہو گئی۔ ایک اور مقام پر ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی منٹو کے متعلق رائے اقتباس کی صورت میں پیش کرتے ہوئے اُنھوں نے منٹو کی اپنی تحریر کا اقتباس شامل کر دیا ہے۔

منٹو کے کرداروں کے اس عمومی جائزے کے بعد ایک ایک کر کے منٹو کے مندرجہ بالا چودہ (۱۴) نسوانی کرداروں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ کرداروں کے اس جائزہ میں مصنف کو زیادہ ذہنی مشقت نہیں اُٹھانا پڑی۔ اُنھوں نے افسانوں میں شامل ان کرداروں کو پیش آنے والے واقعات، اقتباسات کی صورت میں پیش کر دیے ہیں۔ یہ کردار کس قسم کی گفتگو کرتے ہیں یا ان کا حلیہ کیا ہے وغیرہ وغیرہ، تمام تفصیلات وہی ہیں جو منٹو نے ان افسانوں میں درج کر دی ہیں۔ ان تجزیوں کو منٹو کے افسانوں کا خلاصہ قرار دیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ مصنف نے بغیر کوئی نتیجہ نکالے یہ فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا کہ وہ جو چاہے مقصد نکالتا پھرے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان کرداروں کے ذریعے منٹو کے تصور عورت پر بحث کی جاتی۔ یہ بات طے ہے کہ منٹو کے نسوانی اور مردانہ کرداروں کا محور انسانیت ہی ہے لیکن عورت (خصوصاً طوائف) کو جس انداز میں منٹو نے متعارف کرایا ہے اس سے قبل اُردو افسانے میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ منٹو کے ان کرداروں کا جائزہ اگر سیاسی و سماجی پس منظر میں لیا جاتا تو یہ کتاب گہری معنویت کی حامل ٹھہرائی جاتی۔ کیوں کہ منٹو کے یہ نسوانی کردار معاشرے کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ گو کہ ان میں زیادہ تر طوائفیں ہیں لیکن کیا یہ بات از خود اہمیت کی حامل نہیں کہ

طوائف اس معاشرے میں کتنی ناگزیر تھی جس سے کہ ان افسانوں کا تعلق ہے۔ مختصر یہ کہ مصنف نے ان کرداروں کو وسیع تناظر میں دیکھنے کی بجائے منٹو کے افسانوں کی تلخیص کر دی ہے۔

منٹو کے یہ کردار کون سے مجموعے اور افسانے سے لیے گئے ہیں مصنف نے اس بارے میں بھی بہت کم معلومات درج کی ہیں اور چودہ میں سے صرف چھے افسانوں کے نام بمعہ مجموعہ درج کیے ہیں۔ حال آں کہ ان سب افسانوں کے نام ضرور دیے جانے چاہئیں تھے جن سے کہ کرداروں کا انتخاب کیا گیا۔

''سعادت حسن منٹو: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ''، ڈاکٹر اورنگزیب عالمگیر:

ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر کی کتاب ''سعادت حسن منٹو: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ'' سنگت پبلی شرز، لاہور نے ۲۰۰۵ء میں شائع کی۔ سعادت حسن منٹو کے شخصی کوائف کے ساتھ ساتھ ان کی تصنیفات کا اشاریہ/فہرست اور مختلف جامعات میں ہونے والے تحقیقی مقالوں کا گوشوارہ ابتدائی تیرہ (۱۳) صفحات میں دیا گیا ہے۔ جب کہ مصنف کے ایک مضمون بعنوان ''سعادت حسن منٹو کا فن'' میں منٹو کے افسانوں کا فنی و فکری جائزہ لیا گیا ہے۔ منٹو کے پانچ افسانوں ''نیا قانون''، ''نعرہ''، ''ممد بھائی''، ''سہائے'' اور ''گورمکھ سنگھ کی وصیت'' کا تجزیہ اس کتاب کا بنیادی موضوع ہے۔ ان پانچوں افسانوں کا متن بھی کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

جہاں تک منٹو کے سوانحی کوائف کا تعلق ہے مصنف نے اُنھیں پیش کرنے میں بہت اختصار برتا ہے جس کی وجہ سے اس حصہ میں اچھی خاصی تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ اس مختصر حصے میں بھی مندرجہ ذیل اغلاط در آئی ہیں۔ مثلاً منٹو کے والد کی تاریخ وفات ۱۹۳۳ء، والدہ کا نام ''بی بی جان'' اور منٹو کی شادی کا سال ۱۹۳۲ء قرار دیا گیا ہے۔ [۴۷] حال آں کہ منٹو کے والد کا انتقال ۱۹۳۲ء میں ہوا، والدہ کا نام سردار بیگم جب کہ منٹو کی شادی کا سال ۱۹۳۹ء ہے۔ اسی طرح تصنیفات و تخلیقات کی فہرست بھی نامکمل ہے اور مصنف نے محض سولہ (۱۶) تخلیقات/تصنیفات کو فہرست میں شامل کیا ہے جب کہ ان کی تعداد کم و بیش اڑتیس (۳۸) ہے۔ کتابیات کی فہرست میں مختلف جامعات میں ہونے والے گیارہ (۱۱) تحقیقی مقالہ جات کے اندراج کے بعد محض دو تنقیدی کتب کا حوالہ درج کیا ہے حال آں کہ اس کتاب کی اشاعت کے وقت منٹو کی سوانح اور فن پر تیس (۳۰) سے زائد کتب شائع ہو چکی تھیں۔ کتاب کا یہ حصہ جو تیرہ (۱۳) صفحات پر مشتمل ہے اور جسے تحقیقی حصہ قرار دیا گیا ہے۔ ناقص اور نامکمل ہے۔

''سعادت حسن منٹو کا فن'' میں مصنف نے مختلف ناقدین کی آرا کی روشنی میں منٹو کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے منٹو کو ایک کامیاب افسانہ نگار قرار دیا، جس نے تمام تر مخالفت اور ردِ عمل کے باوجود اپنا سکہ منوایا۔ اُنھوں نے منٹو کی کہانیوں کے آغاز، وسط اور انجام پر منٹو کی گرفت، پلاٹ کی بُنت، منظر نگاری، طرزِ بیان اور کردار نگاری کو منٹو کی فنی خوبیاں گردانا۔

کتاب کے آخری حصہ میں منٹو کی کہانیوں کا انتخاب اور تجزیہ شامل کیا گیا ہے۔ اس کا پیرایۂ بیان کچھ اس طرح ہے کہ افسانے کا متن دینے کے بعد اس کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر اس میں پانچ افسانے اور اُن کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ مصنف کے پیش کردہ تجزیے بہت سطحی ہیں اور ان میں ان کہانیوں کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ تجزیے پڑھتے ہوئے بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے جیسے افسانے کو از سرِ نو پڑھا جا رہا ہے۔ مصنف نے سیاسی، سماجی یا نفسیاتی حوالوں سے ان افسانوں میں شامل کرداروں کا جائزہ لینے کی بجائے

کہانی کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ منٹو کی شخصیت اور فن پر نچلے درجے کی ایک کتاب ہے جسے ''کتاب برائے کتاب'' کے لیے ہی شائع کیا گیا ہے۔[۷۵]

''سعادت حسن منٹو: ایک نئی تعبیر''، پروفیسر فتح محمد ملک:

پروفیسر فتح محمد ملک کی کتاب ''سعادت حسن منٹو۔ایک نئی تعبیر'' سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور نے ۲۰۰۵ء میں شائع کی۔ زیرِ نظر کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں پیش لفظ کے علاوہ مصنف کے چھے مضامین ''منٹو کی پاکستانیت''، ''منٹو اور جنگ آزادی کشمیر''، ''انقلاب پسند منٹو اور نام نہاد ترقی پسند''، ''منٹو کی فکری صلابت اور نظریاتی استقامت''، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ، ایک نئی تعبیر'' اور ''منٹو کی مثالیت پسندی'' شامل ہیں۔ جب کہ دوسرا حصہ دس ''ضمیمہ جات'' پر مشتمل ہے۔ اس میں منٹو کی تین تحریروں کے علاوہ محمد حسن عسکری کے چار اور ظہیر کاشمیری کا ایک جب کہ فتح محمد ملک کا زمانۂ طالب علمی میں لکھا گیا ایک مضمون ''گنجا فرشتہ'' شامل ہے۔

اس طرح یہ کتاب بیک وقت تصنیف بھی ہے اور مرتّبہ بھی، جس میں منٹو کی زندگی کے آخری سات سالوں یعنی قیام پاکستان کے دور کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر علی ثنا بخاری نے دیگر مصنّفین کے مضامین کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے زیر نظر کتاب کو مرتّبہ کتابوں میں شمار کیا ہے۔

''منٹو کی پاکستانیت'' میں فتح محمد ملک نے منٹو کو پاکستان کا ادیب قرار دیتے ہوئے اُن وجوہات پر بحث کی ہے جو منٹو کے بمبئی چھوڑنے کا سبب بنیں۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ منٹو قیامِ پاکستان کو رجعت پسندانہ مطالبہ قرار دیتے رہے لیکن جب فسادات کی آگ بھڑکی اور ہندوستانی دوستوں نے اس کی مسلمان شناخت پر اصرار کیا تب اُن کی آنکھیں کھلیں اور وہ ''باجو کی گلی سے پاکستان چلے آئے۔'' اُنھوں نے منٹو کے بمبئی چھوڑنے کی اصل وجہ اُس واقعے کو قرار دیا ہے جب منٹو اور شیام نے پاکستان سے آئے ایک سکھ خاندان کی درد بھری داستان سنی۔ اس کے بعد دونوں میں ہونے والا مکالمہ ہی منٹو کے بمبئی چھوڑ کر پاکستان آنے کی وجہ بنا۔

''سعادت حسن منٹو اور جنگ آزادی کشمیر'' میں کشمیر بارے منٹو کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ منٹو کشمیر کا الحاق پاکستان کے ساتھ چاہتے تھے۔ اُنھوں نے منٹو کے افسانوں ''جاؤ حنیف جاؤ''، ''آخری سیلوٹ''، ''ٹیٹوال کا کتا''، ''ابا میاں'' اور ''دو بلیاں'' کے علاوہ ''چچا سام کے نام ایک بھتیجے کا خط'' کا حوالہ دیتے ہوئے کشمیر کے معاملہ پر منٹو کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے پنڈت نہرو کو کشمیر پر غاصبانہ قبضے کا ذمہ دار ٹھہرایا۔

''انقلاب پسند منٹو اور نام نہاد ترقی پسند'' میں پروفیسر فتح محمد ملک نے منٹو کی ابتدائی زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے ثابت کیا کہ منٹو شروع سے ہی ترقی پسندانہ مزاج رکھتا تھا اور ترقی پسند تحریک کے قیام سے قبل ہی باری علیگ کی صحبت میں وہ روسی اور فرانسیسی ادیبوں کی انقلابی کتب اور افسانوں کے تراجم کر چکا تھا۔ اس کی اوّلین کتاب ''آتش پارے'' میں شامل افسانے اور بعد کی تحریریں منٹو کی ترقی پسندی کی غماز ہیں۔ ان کے مطابق منٹو اول تا آخر ترقی پسند تھا۔ وہ ترقی پسندی کے خلاف نہیں تھا بلکہ نام نہاد ترقی پسندوں کے خلاف تھا۔ اُنھوں نے منٹو اور ترقی پسندوں کے درمیان اختلاف کی واحد وجہ منٹو اور محمد حسن عسکری کے اشتراک کو قرار دیا جس کی وجہ سے ترقی پسند منٹو کے خلاف ہو گئے تھے۔

چوں کہ ترقی پسند تحریک کے عمائدین قیامِ پاکستان کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور محمد حسن عسکری نے پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کا پرچار کرتے ہوئے ادیبوں کے پاکستانی تشخص کا نعرہ لگایا تھا اس لیے نظریاتی اعتبار سے حسن عسکری کے ساتھ ان کا رویہ معاندانہ تھا۔ چناں چہ ہر وہ شخص جو حسن عسکری کے ساتھ نظر آتا ترقی پسند اس کے مخالف ہو جاتے۔ حسن عسکری کے ساتھ ''اُردو ادب'' کی اشاعت میں اشتراک اور ''سیاہ حاشیے'' کا دیباچہ ہی دراصل ایسی وجوہات تھیں جو ترقی پسندوں کے نزدیک منٹو کا ناقابلِ معافی جرم تھیں۔ لہٰذا اُنھوں نے رجعت پسند قرار دیتے ہوئے منٹو کا بائیکاٹ کر دیا۔ فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

''منٹو اور عسکری ہر دو کی غلطی اگر کوئی تھی تو ان کی سچی اور کھری پاکستانیت تھی۔''[۷٦]

''منٹو کی فکری صلابت اور نظریاتی استقامت'' میں منٹو کی قائد شناسی اور علامہ اقبال کے ساتھ فکری وابستگی کو موضوع بنایا گیا۔ اُنھوں نے منٹو کے لکھے ہوئے خاکے ''میرا صاحب'' کو قائدِ اعظم کی شخصیت کے باطن تک رسائی اور ان کی عظمت کی انسانی بنیادوں پر دریافت کا منبع قرار دیا۔ اسی مضمون میں وہ کہتے ہیں کہ منٹو کے افسانوں پر فحاشی کے مقدمات محض ایک بہانہ تھا۔ دراصل برطانوی استعمار منٹو کے انقلابی نظریات سے خائف تھا۔ اُنھوں نے چودھری محمد حسین کو جو منٹو کے خلاف مقدمات دائر کرنے میں پیش پیش تھے، برطانوی استعمار کا ایجنٹ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''پریس برانچ کے انچارج چودھری محمد حسین کی سرکاری اور دفتری تربیت برطانوی استعمار کے مفادات کی نگہبانی کی خاطر کی گئی تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی وہ برطانوی دور میں قائم کیے گئے نظام ہی کی چاکری میں مصروف تھے۔ وہ جے جمائے استحصالی نظام کے رکھوالے تھے۔ چناں چہ اُنھوں نے اپنی بات رسالہ ''جاوید'' میں شائع کی گئی اُن تحریروں کی ضبطی سے شروع کی جن میں مروّجہ استحصالی نظام کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ جب ان تحریروں کے باب میں ان کی ایک نہ چلی تو بالآخر اُنھوں نے رسالے پر پابندی عائد کرنے کے لیے منٹو کے افسانہ ''ٹھنڈا گوشت'' پر فحاشی کا الزام تراش کر رسالہ ''جاوید'' پر پابندی عائد کرا دی۔''[۷۷]

اس مضمون میں اُنھوں نے منٹو کی قائد شناسی، اقبال کے ساتھ فکری ہم آہنگی اور منٹو پر قائم مقدمات کی اصل وجوہات کو بحث کا حصہ بنایا اور منٹو کے اُن مضامین کو سراہا جو اُنھوں نے اپنے مقدمات کے دفاع میں لکھے۔ ادب میں فحاشی کی اس بحث کو وہ پختہ، معنی خیز قرار دیتے ہوئے اسے منٹو کی فکری صلابت اور نظریاتی استقامت سے تعبیر کرتے ہیں۔

''ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ ایک نئی تعبیر'' میں مصنف نے منٹو کے اس افسانے پر کی گئی اب تک کی تنقید کو رد کرتے ہوئے ایک نئی رائے قائم کی۔ اُنھوں نے معروف مارکسی دانشور طارق علی کی اس رائے کو غلط قرار دیا جس میں طارق علی نے اس افسانے کو قیامِ پاکستان کے جرم کے خلاف صدائے احتجاج سے تعبیر کیا تھا۔ فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ نہ تو ٹوبہ ٹیک سنگھ کا موضوع برطانوی ہند کی تقسیم ہے اور نہ ہی یہ افسانہ فسادات کے پس منظر میں لکھا گیا تھا۔''[۷۸]

اُنھوں نے طارق علی کے ساتھ ساتھ وارث علوی سے بھی اختلاف کیا جنھوں نے لاہور کے اس پاگل خانے کو جس میں بشن سنگھ موجود تھا باہر کی دنیا کے پاگل خانے کی علامت تسلیم کرنے کی بجائے اس کا اصلی روپ قرار دیا تھا۔ مصنف کے مطابق اس افسانے کا

موضوع حافظے کی گمشدگی اور تخیل کی موت ہے۔ دراصل اس کہانی کا موضوع یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کا مقصد پاگلوں کی فہم سے بالاتر ہے۔ لکھتے ہیں:

""منٹو کی زیر نظر کہانی کی فقط ایک ہی تعبیر ممکن ہے اور وہ یہ کہ پاکستان کا تصور، پاکستان کی تحریک اور پاکستان کا قیام بشن سنگھ جیسے پاگلوں کی سمجھ میں ہر گز نہیں آسکتا۔ کیوں کہ یہ ایک فوق التہذیب تصور ہے اور یہ لوگ تو منجملۂ نباتات و جمادات ہیں۔"" [۷۹]

کتاب میں شامل پہلا مضمون ""منٹو کی پاکستانیت"" اس سے قبل ""ادبیات"" کے شمارہ نمبر ۵۵۔ ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا تھا۔ گویا دورِ جدید میں منٹو کی پاکستانیت کے حوالے سے سب سے پہلے بحث فتح محمد ملک نے چھیڑی۔ [۸۰] لیکن اس مسئلہ نے دو طرفہ بحث کی صورت اُس وقت اختیار کی جب انتظار حسین اور آصف فرخی نے ""پاکستانی ادب"" کے لیے افسانوں کا انتخاب کرتے ہوئے منٹو کے افسانہ ""کھول دو"" کو اس انتخاب میں شامل کیا۔ منٹو کو انتخاب میں شامل کرنے کا صاف مقصد یہی ہے کہ منٹو پاکستانی ادیب ہے۔ چناں چہ ہندوستان میں منٹو کی پاکستانیت کو تسلیم کرنے سے جزوی طور پر انکار کیا گیا۔ مشرف عالم ذوقی اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

""وہی منٹو جس نے ہندوستان میں جنم لیا، ہندوستان میں دھکے کھائے، ممبئی اور تب کے بامبے، کے فلم اسٹوڈیوز میں نوکری کی اور جس کا آئرن مین ""ٹوبہ ٹیک سنگھ"" بھی ""نو مینس لینڈ"" کے اس طرف جانے میں یقین نہیں رکھتا تھا، کیا آن کی آن میں پاکستانی بن گیا؟"" [۸۱]

مشرف عالم ذوقی کے مطابق محض سات سال پاکستان میں گزارنے کی وجہ سے منٹو پر پاکستانی ہونے کی مہر نہیں لگائی جاسکتی۔ منٹو کا آخری وقت میں پاکستان چلے جانا بد قسمتی ہو سکتا ہے لیکن یہی منٹو تھا جو ساری زندگی بٹوارے کے خلاف لکھتا رہا۔

ہندوستانی مصنف کھیم چند، مشرف عالم ذوقی کے جذباتی انداز سے لکھے گئے مضمون کی نسبت ڈھکے چھپے انداز میں منٹو کے غیر پاکستانی ہونے پر زور دیتے ہیں۔ اپنے مضمون ""منٹو پاکستانی نہیں تو کیا ہندوستانی تھے؟"" میں کھیم چند لکھتے ہیں کہ منٹو جیسے بہت سے لوگ دہشت کے تحت پاکستان گئے تھے ورنہ تقسیم ملک سے اُنھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ منٹو کی پاکستانیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

""ہم کون ہوتے ہیں منٹو جیسے اُن افسانہ نویسوں کی قومی اور تہذیبی جڑیں تلاش کرنے والے جنھیں ان کے ہی ملک میں سچ کہنے کی ہمیشہ ممانعت ہے۔"" [۸۲]

آصف فرخی نے بطور مرتّب ""پاکستانی ادب"" مشرف عالم ذوقی اور کھیم چند کے اعتراضات پر اپنے مضمون ""منٹو اور تنقید کی اوپڑ دی گڑ گڑ"" میں کہا کہ منٹو نے ""زحمت مہر درخشاں"" میں پاکستانی ادب اور ادیب کے مسائل کے حوالے سے جو گفتگو کی ہے وہ اس کے پاکستانی ہونے کا بین ثبوت ہے اور اگر معترضین کا اعتراض درست تسلیم کر لیا جائے تو پاکستان میں افسانے کی بنیاد اُٹھتی نظر نہیں آتی۔

حیرت کی بات ہے کہ منٹو کی پاکستانیت پر ڈاکٹر انوار احمد اور فتح محمد ملک کے مضامین جو کہ ""پاکستانی ادب"" میں منٹو کے افسانے ""کھول دو"" کی شمولیت اور اس کے نتیجہ میں ظاہر ہونے والے ردِ عمل سے پہلے شائع ہوئے تھے، کی اشاعت کے وقت اس قسم کے مباحث نے کیوں سر نہ اُٹھایا۔ ""پاکستانی ادب"" میں تو محض منٹو کا ایک افسانہ شامل کیا گیا تھا۔ جب کہ مذکورہ بالا دونوں مضامین کا مقصد کسی حد تک

منٹو کو پاکستانی ثابت کرنا تھا۔ سعادت حسن منٹو کی پاکستانیت کو ثابت کرنے کے لیے پروفیسر فتح محمد ملک کے پیش کردہ استدلال سے تو اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اُن کے حاصل کردہ نتائج سے انکار ممکن نہیں جب کہ۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ ایک نئی تعبیر'' میں اُن کے اخذ کیے گئے نتیجہ کو محض ''نتیجہ معترضہ'' ہی قرار دیا جا سکتا ہے کیوں کہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' جیسے شاہکار افسانے کا مقصد کم از کم یہ نہیں ہو سکتا کہ ''پاکستان کا قیام پاگلوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔'' ایم خالد فیاض، پروفیسر فتح محمد ملک کی نئی تعبیر اور منٹو کے پاکستانی تشخص سے اختلاف کرتے ہوئے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ:

> ''ادب اور ادیب کے معاملے میں اس طرح کی پاکستانیت کی بحث ہی فضول ہے۔ یہ ادیب کو تنگ دائرے میں محدود کرنے کی کاوش کے سوا کچھ بھی نہیں۔''[۸۳]

ان چھے مضامین کے بعد کتاب کا اگلا حصہ جس میں دس مضامین بطور ضمیمہ جات شامل کیے گئے ہیں شروع ہوتا ہے، مصنف کے زمانۂ طالب علمی میں لکھے گئے مضمون گنجا فرشتہ کے علاوہ دیگر تمام مضامین میں ترقی پسند نقطۂ نظر سے اختلاف کا کوئی نہ کوئی پہلو نکلتا ہے۔ ''گنجا فرشتہ'' اس سے قبل ادبی رسالہ ''مشرب'' کراچی کے جون ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔ مصنف نے یہ مضمون گورنمنٹ کالج اٹک میں سال سوم کے طالب علم کی حیثیت سے منٹو کی وفات کے سلسلہ میں ہونے والے تعزیتی اجلاس میں پڑھا تھا جب کہ کتاب میں شامل ایک اور مضمون ''انقلاب پسند منٹو اور نام نہاد ترقی پسند'' اس سے پہلے دنیا زاد کتابی سلسلہ نمبر ۱۳ میں شائع ہو چکا ہے۔[۸۴]

''سعادت حسن منٹو کی کہانی''، انیس ناگی:

زیر نظر کتاب انیس ناگی کی دو کتابوں ''سعادت حسن منٹو'' (مصنفہ) اور ''سعادت حسن منٹو کے مقدمات'' (مرتّبہ) کو یکجا صورت میں ''سعادت حسن منٹو کی کہانی'' کے نام سے جمالیات پبلی شرز نے ۲۰۰۵ء میں لاہور سے شائع کی۔ ''سعادت حسن منٹو'' فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور نے ۱۹۸۹ء میں شائع کی۔ فیروز سنز کی شائع کردہ کتاب میں بارہ مضامین شامل ہیں۔ اس کتاب میں شامل آخری مضمون ''منٹو کی انسان دوستی''، ''سعادت حسن منٹو کی کہانی'' میں شامل نہیں۔ اسی طرح فیروز سنز کی شائع کردہ کتاب میں ''بابو گوپی ناتھ سے ملاقات'' بطور مضمون شامل تھا۔ زیر نظر کتاب میں اسے ضمیمے کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔

''سعادت حسن منٹو کے مقدمات'' اس سے قبل ۱۹۹۹ء میں جمالیات، لاہور نے شائع کی تھی۔ جو اب زیر نظر کتاب کے حصہ دوم کے طور پر شامل کی گئی ہے۔ اس کتاب میں سعادت حسن منٹو کے افسانوں پر چلنے والے مقدمات کی روداد اور عدالتی کارروائی کے علاوہ ان افسانوں کی توضیح بھی پیش کی گئی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ انیس ناگی جو اس کتاب کے مرتّب ہیں نے اس کی پہلی اشاعت کا ذکر تک نہیں کیا۔ کتاب کی پہلی اشاعت کے پیش لفظ میں اُنھوں نے اعتراف کیا تھا کہ یہ تمام معلومات منٹو کی تحریروں سے اخذ کردہ ہیں جنھیں تلخیص کے بعد پیش کیا جا رہا ہے۔

> ''منٹو نے اپنے مضامین میں اپنے مقدمات کا حال بھی رقم کیا ہے۔ اس لیے منٹو کے بیان اور اس کے خلاف کارروائیوں کو کاٹ چھانٹ کر یہ dossier تیار کی گئی ہے۔''[۸۵]

لیکن ''سعادت حسن منٹو کی کہانی'' میں اُنھوں نے پیش لفظ شامل نہیں کیے، چناں چہ ایسے قارئین جن کی ''سعادت حسن منٹو کے مقدمات'' تک رسائی نہیں ان کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ مذکورہ کتاب تصنیف ہے یا تدوین؟

''سعادت حسن منٹو کی بازیافت'' جسے اس کتاب کا پیش لفظ/دیباچہ بھی کہا جا سکتا ہے؛ میں انیس ناگی لکھتے ہیں:

''۲۰۰۵ء میں اس کی تیسری اشاعت کا جواز وہ حالات ہیں جنھوں نے منٹو کو ایک قابل قبول اور بڑا مصنف قرار دیا ہے۔ اسی مناسبت سے اس متن میں چند ایک نئے مضامین شائع کیے گئے ہیں۔''[۸۶]

مصنف کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ ''سعادت حسن منٹو کی کہانی'' میں شامل تمام مضامین اس سے قبل ان کی مذکورہ بالا دونوں کتب میں شامل تھے بلکہ گزشتہ مضامین بھی مکمل شائع نہیں کیے گئے۔ ''منٹو کی انسان دوستی'' جو اس سے قبل ''سعادت حسن منٹو'' صفحہ ۱۰۳ پر موجود ہے۔ ''سعادت حسن منٹو کی کہانی'' میں شامل نہیں۔ کتاب میں شامل مضامین کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ اس سے قبل لیا جا چکا ہے۔[۸۷]

''سعادت حسن منٹو (تحقیق)''، ڈاکٹر علی ثناء بخاری:

ڈاکٹر علی ثناء بخاری کی یہ کاوش منٹو شناسی کے باب میں تحقیقی نقطۂ نظر سے کافی اہمیت کی حامل ہے۔ خصوصاً منٹو کی سوانح کے باب میں موجود یا پیدا کی گئی بہت سی غلط فہمیوں کو مصنف نے تاریخی حقائق اور دستاویزات کی مدد سے رد کیا ہے۔

ڈاکٹر علی ثنا بخاری کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ پاکستان میں سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے والے پہلے خوش نصیب ہیں۔ اُنھوں نے ڈاکٹر وحید قریشی کی نگرانی میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ۱۹۸۴ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ زیر تبصرہ کتاب سعادت حسن منٹو (تحقیق) ان کے تحقیقی مقالہ کی کتابی صورت ہے۔ جسے منٹو اکادمی لاہور نے ۲۰۰۶ء میں شائع کیا۔ مقالے کی طرح کتاب بھی ۱۶ ابواب پر مشتمل ہے اور ان ابواب کی پیش کش اور ترتیب میں معمولی رد بدل کیا گیا ہے۔ مثلاً مصنف کے تحریر کردہ مقالہ، سعادت حسن منٹو (سوانح اور ادبی کارنامے) میں شامل پہلے باب کا عنوان ''حالات زندگی'' تجویز کیا گیا تھا، کتاب میں اسے تبدیل کر کے ''احوال'' کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے۔ اسی طرح مقالہ میں موجود چھٹا باب بعنوان ''مجموعی جائزہ'' کو عنوان کی حد تک تبدیل کر کے ''حرف آخر'' کا نام دے دیا گیا ہے۔ کتاب میں شامل ابواب کی تفصیل و ترتیب کچھ یوں ہے:

پہلا باب، احوال، دوسرا باب: افسانہ، تیسرا باب: ریڈیو ڈراما، چوتھا باب: مضمون، پانچواں باب: خاکہ، چھٹا باب: حرف آخر ابواب کے عنوانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں منٹو کی سوانح حیات کے علاوہ افسانہ، مضمون، خاکہ اور ڈراما نگاری کو موضوع بنایا گیا ہے۔

منٹو شناسی کے باب میں یہ ایک سنجیدہ تحقیقی و تنقیدی کتاب ہے جس سے منٹو کے متعلق پائی جانے والی بہت سی تاریخی گمراہیوں اور غلط فہمیوں کو دور کیا گیا ہے۔ ۳۳۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب کے آخر میں ضمیمہ جات اپنی انفرادیت کی وجہ سے خاصے اہم ہیں۔[۸۸]

''فسانے منٹو کے اور پھر بیان اپنا''، خالد اشرف:

سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن پر یوں تو بیسیوں کتابیں مرتّب اور تصنیف کی گئی ہیں لیکن ان میں زیادہ تر کتابیں ایسی ہیں جن میں منٹو کے ساتھ وہ سنجیدہ برتاؤ نہیں کیا گیا جس کے وہ حقدار تھے۔ بہت سی کتابیں موضوعات اور ان کی تفصیلات کی یکسانیت کی وجہ سے بعض اوقات ایک دوسرے کا چربہ اور منٹو کے ساتھ اظہار محبت کا ذریعہ محض بنکر اسے دنیائے اُردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار

قرار دینے پر مصر ہیں۔ ''فسانے منٹو کے اور پھر بیاں اپنا'' منٹو شناسی کے اس قبیلے سے تعلق رکھتی ہے جو سعادت حسن کو منٹو میں تبدیل کرنے والی تخلیقات کا دروں بینی سے مطالعہ کرنے کے بعد پیدا ہونے والے تاثرات کی روشنی میں اپنی رائے کا سنجیدہ اظہار کرتا ہے۔۔ نہ تو وہ منٹو سے محبت کا دم بھرتے ہیں اور نہ ہی اُسے کوسنے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصے میں پروفیسر محمد حسن کے دیباچے بعنوان ''منٹو پر اطلاقی تنقید کا آغاز'' کے بعد مصنف کے تین پر مغز مضامین ''زندگی: ایک ٹیڑھی لکیر''، ''تصانیف کا اجمالی جائزہ'' اور ''فن کے مختلف پہلو اور نظریہ'' شامل ہیں۔ پروفیسر محمد حسن نے اگرچہ کتاب کو منٹو شناسی کے باب میں ایک نئے دور کا آغاز قرار دیا ہے لیکن اشارۃً اُنھوں نے بعض مقامات پر منٹو سے مغلوب ہونے کا الزام بھی لگایا۔ لکھتے ہیں:

> ''خالد اشرف نے منٹو پرستی اور منٹو شکنی دونوں سے تقریباً انحراف کرتے ہوئے منٹو کو ان کی ذاتی زندگی اور افسانوں کے آئینے میں جہاں تک ہو سکا ہے معروضی انداز میں دیکھنے دکھانے کی کوشش کی ہے۔'' [۸۹]

اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

> ''تقریباً اس لیے کہ وہ بھی کہیں کہیں جذباتیت سے مغلوب ہو گئے ہیں اور منٹو سے اُس بے رحمی اور اصول پرستی سے پیش نہیں آ سکے ہیں جو منٹو کا حق بھی تھا اور منٹو کی تنقید کا فرض بھی۔'' [۹۰]

پروفیسر محمد حسن ایک اور اعتراض بھی کرتے ہیں کہ مصنف کے کیے گئے بعض تجزیوں میں منٹو کے افسانوی جادو کی کامیابی یا عدم کامیابی پر ان کا فیصلہ یا تو سرے سے پردہ اخفا میں چلا جاتا ہے یا پھر کسی قدر نامکمل رہتا ہے۔ کتاب کے فلیپ پر ڈاکٹر وارث علوی نے مصنف کی کاوش کو خواب سراہا اور کتاب کو اس بات کا ثبوت قرار دیا کہ جب ایک بڑے فنکار کا جادو ایک باشعور نقاد کے سر چڑھ کو بولنے لگتا ہے تو کیسے صریر خامہ نوائے سروش بنتا ہے۔

پہلے حصے کا اولین مضمون ''زندگی: ایک ٹیڑھی لکیر'' کا موضوع منٹو کی سوانح حیات کا مفصل جائزہ ہے۔ منٹو کے آباء و اجداد کے ذکر سے شروع ہونے والا مضمون اُس کی وفات تک کے کم و بیش سبھی اہم واقعات کا دلچسپ انداز بیاں پر مبنی مجموعہ ہے۔ بچپن، شرارتیں، صحافت، تراجم، ادب کی طرف رجحان، شادی، اولاد، بیوی، دوست احباب، ملازمتیں، ڈرامانویسی، فلمی کہانیاں، افسانوں پر چلنے والے مقدمات، ترقی پسندوں سے اختلاف، حسن عسکری کی قربت، فسادات، منٹو کی ہجرت، پاکستان میں اس کی حالت زار اور دیگر بہت کچھ اس طویل مضمون میں مصنف نے پیش کیا ہے۔ اور صرف یونہی سنی سنائی یا پڑھی پڑھائی باتوں کو ہی اپنے انداز میں نہیں لکھ چھوڑا بلکہ ہر ہر واقعے، قصے اور کہانی کو اُنھوں نے باقاعدہ حوالے دے کر اور ماخذات کی مکمل نشاندہی کر کے انتہائی مربوط انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ منٹو کی زندگی کی فلم چلنا شروع ہو جاتی ہے۔

منٹو کی شخصیت پر یوں تو لاتعداد مضامین لکھے گئے ہیں جن میں اپنے اپنے ''آلات'' سے منٹو کی شخصیت کا بار بار پوسٹ مارٹم کیا گیا۔ یہ مضامین بار بار مختلف کتب اور رسائل کی زینت بنتے رہے۔ شاید ہی منٹو کی زندگی کا کوئی پہلو اب پردہ اخفا میں ہو۔ مصنف نے بھی انھی تحریروں یا پھر منٹو کی ذاتی تحریروں کی روشنی میں حاصل شدہ مواد کو ہی از سر نو مرتّب کیا ہے لیکن معلومات کو جس

خوبصورت ترتیب اور بر موقع اقتباسات اور پھر ماخذات کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ حواشی و تحریر سے متعلق ضروری اور معلوماتی تفصیلات فراہم کی ہیں وہ اس کتاب کا منفرد خاصا ہیں۔ وگرنہ منٹو کے اکثر مصنف اور مرتّب اس تکلف سے بے نیاز ہی رہے۔

دوسرے مضمون بعنوان ''تصانیف کا اجمالی جائزہ'' میں منٹو کے تخلیقی ادب یعنی، افسانوں، ڈراموں، مضامین اور خاکوں کی اشاعت کی تفصیل زمانی ترتیب کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ مصنف کے مطابق مختلف افسانوی مجموعوں اور رسائل میں چھپنے والے افسانوں کو ملا کر سعادت حسن منٹو کے لکھے گئے افسانوں کی تعداد ۲۳۳ بنتی ہے۔ بقول مصنف، منٹو ۴۲۔۱۹۴۰ء کے درمیان سو سے زائد ڈرامے لکھنے کا دعویٰ اپنی تحریروں میں کر چکے ہیں۔ لیکن ان کے مجموعوں میں صرف پچپن ڈرامے اب تک شائع ہوئے ہیں۔ باقی کیوں نہیں شائع ہو سکے اور ان کے مسودات کہاں گئے اور کیا یہ مسودات اب بھی کہیں محفوظ ہوں گے؟ اسی طرح منٹو کے خودنوشت خاکے سمیت لکھے گئے خاکوں کی تعداد پچیس بتائی ہے۔

حصہ اول کے تیسرے اور آخری مضمون ''فن کے مختلف پہلو اور نظریہ'' میں خالد اشرف کے مطابق منٹو کا سیاسی اور ادبی نظریہ ایک روشن خیال، انسان دوست اور روایت شکن ادیب کا تھا۔ نہ تو ترقی پسند ادبی تحریک کے علمبردار اُس پر اپنی مرضی و منشا مسلط کر سکتے تھے۔ اور نہ ہی محمد حسن عسکری کے بس میں تھا کہ وہ منٹو کو اپنے راستے پر لگا سکیں۔ وہ ایک آزاد منش ادیب تھے جو مذہب، سماج، سیاست، ریاست یہاں تک کہ ادب کے رائج کردہ اصول و ضوابط سے انحراف کر کے اپنے لیے نئے اصول اور ضابطے بناتے گئے۔

مضمون کے آخری حصے میں منٹو کی مختلف موضوعات پر لکھی گئی کہانیوں کا جائزہ لے کر منٹو کے تخلیقی موضوعات کا تعین کیا گیا ہے۔ اس حصے میں فسادات، جنس / طوائف اور تقسیم پر لکھے گئے افسانوں پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں سعادت حسن منٹو کی لکھی گئی تیس کہانیوں کا تجزیاتی مطالعہ بھی خاصے کی چیز ہے۔ ان کہانیوں کے نام درج ذیل ہیں:۔

بابو گوپی ناتھ، ٹوبہ ٹیک سنگھ، نیا قانون، خوشیا، ہتک، ۱۹۱۹ء کی ایک بات' سوراج کے لیے، بلاؤز، دھواں، بو، کالی شلوار، جانکی، شاردا، ممی، موذیل، ٹھنڈا گوشت، ننگی آوازیں، کھول دو، سہائے، رام کھلاون، آخری سیلیوٹ، ٹیٹوال کا کتا، دو قومیں، شاہ دولے کا چوہا، نعرہ، سیاہ حاشیے، کبوتروں والا سائیں، ممد بھائی، دودا پہلوان، پھوجا حرام دا۔

کیا ہی اچھا ہوتا کہ مصنف کہانیوں کا جائزہ لیتے وقت ان کی زمانی ترتیب کا خیال رکھ لیتے۔ اس سے منٹو کے فن کی ارتقائی صورتیں سامنے لائی جا سکتی تھیں۔ ان تجزیوں میں کہانیوں کی تفصیل کے ساتھ ساتھ ان میں موجود فنی خوبیوں کو انتہائی مختصر انداز میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ جس سے قاری کو پروفیسر محمد حسن کی اس بات سے متفق ہونا پڑتا ہے کہ:

> ''منٹو کے افسانوں کے اس افسانوی جادو کی کامیابی یا عدم کامیابی پر ان کا فیصلہ یا تو سرے سے پردہ اخفا میں رہتا ہے یا پھر کسی قدر نامکمل۔''[۹۱]

اس کمی کے باوجود منٹو کی شخصیت اور فن کا یہ ایک بہترین جائزہ ہے۔ صاحبِ تصنیف اپنے موضوع تصنیف سے مکمل واقفیت بلکہ دسترس رکھتے ہیں۔ شخصی، فکری اور فنی لحاظ سے یہ منٹوانہ تنقید کی عمدہ مثالوں میں سے ایک ہے۔ جس میں تمام کا تمام منٹو اپنی تمام ترکارفرمائیوں کے ساتھ موجود ہے۔ مصنف عمدہ اسلوب بیان کے ساتھ قاری کی انگلی پکڑ کر اسے منٹو کی شخصیت اور فن کے مختلف

پہلوؤں سے آشنا کرتے چلے جاتے ہیں۔ ۵۲۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی نے ۲۰۰۶ء میں شائع کی۔

''گنجافرشتہ (سعادت حسن منٹو)''، قمر یورش:

قمر یورش کا لکھا ہوا شخصی نوعیت کا یہ تاثراتی مضمون منٹو کی وفات کے بعد لکھا گیا۔ جو مضمون نگار اور منٹو کی ان ملاقاتوں کے احوال پر مبنی ہے جو منٹو کے زندگی کے آخری دور سے تعلق رکھتی ہیں اسی عنوان کے تحت عابد علی عابد اور انور عنایت اللہ نے بھی اپنے اپنے تاثرات کا اظہار کیا جو نقش کراچی، نقوش، لاہور اور پگڈنڈی، امرت سر کے منٹو نمبر کے علاوہ غلام زہرہ کی تالیف ''منٹو کیا تھا'' میں بھی اشاعت پذیر ہوئے۔ قمر یورش کا یہ مضمون اس سے پہلے ''مزدور جدوجہد'' کے منٹو نمبر مطبوعہ ۱۹۹۹ء کے صفحہ ۷ تا ۲۰ پر گنجے فرشتے کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ الفاظ پبلی کیشنز، لاہور نے طاہر اصغر کے تعارفی مضمون کے ساتھ اسے ۲۰۰۷ء میں ایک کتابچے کی صورت میں شائع کیا۔ یہ تعارفی مضمون منٹو کی بجائے قمر یورش کے اوصاف حمیدہ کا اظہار یہ بن کر رہ گیا ہے۔

مضمون کے پہلے ہی جملے سے مضمون نگار اور منٹو کے تعلقات کے زمانہ کا تعین کیا جا سکتا ہے کہ یہ بہت مختصر المدتی تھا۔ یعنی دسمبر ۱۹۵۴ء کی ایک ابر آلود صبح کو مضمون نگار اپنی ایک کہانی ''وڈاانسان'' لے کر منٹو کو سنانے چل دیے تاکہ ان سے تاثرات لکھوا کر شائع کریں۔ پہلے تو منٹو صاحب وہ کہانی سن کر خوب روئے، پھر اس پر اپنے تاثرات پنجابی زبان میں رقم کر دیے جو بقول مضمون نگار اُنھوں نے منٹو کے دیباچے کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کر دیے۔ چوں کہ دیباچہ منٹو کا لکھا ہوا تھا اور کہانی مزدوروں کو بغاوت کے لیے اکساتی تھی اس لیے اخبارات کے اصرار پر مصنف کے وارنٹ بھی جاری ہو گئے۔ منٹو کی شراب نوشی جو عمر کے آخری حصے میں طلب سے بھی زیادہ ہو گئی تھی 'صفیہ منٹو کے حفاظتی اقدامات' پاگل خانے کے کچھ واقعات اور منٹو کی موت کا منظر افسانوی انداز میں کھینچا گیا ہے۔ مضمون نگار منٹو کی بے وقت موت سے بہت رنجیدہ اور ملول دکھائی دیتے ہیں۔ ۲۴ صفحات پر مشتمل یہ مضمون دراصل خراج عقیدت کے طور پر لکھا گیا ہے۔ وہ خراج عقیدت جس کے اظہار کے لیے ہم فنکار کے مرنے کا انتظار کرتے ہیں۔

''سیاہ حاشیے: تجزیاتی مطالعہ''، سجاد شیخ:

سجاد شیخ کا منٹو کی منفرد کہانیوں کا منفرد انداز میں تجزیہ الحمد پبلی کیشنز لاہور نے ۲۰۰۷ء میں شائع کر کے منٹوانہ تنقید کے خزانے میں گوہر نایاب کا اضافہ کر دیا۔ سیاہ حاشیے فسادات کے موضوع پر منٹو کی وہ سسکیاں ہیں جنھیں چٹکلے قرار دے کر اُس پر پھبتیاں کسی گئیں۔ اتنے مختصر الفاظ میں مذہب، سیاست اور انسانیت کا پردہ اس سے پہلے اردو ادب میں کم از کم کسی نے چاک نہیں کیا۔ جب یہ کہانیاں منظر عام پر آئیں تو ان کی حمایت میں کم اور مخالفت میں زیادہ آوازیں بلند ہوئیں۔ ترقی پسند ادب کی مقبولیت کے زمانے میں بے چارے حسن عسکری کی آواز کون سنتا۔ اُس وقت کی ادبی فضا کے مقابلے میں آج کا ادیب نہ تو ان کہانیوں کو چٹکلے سمجھتا ہے اور نہ ہی لاشوں کی جیبوں سے کہانیاں نکالنے کا ناٹک۔ فی زمانہ ''سیاہ حاشیے'' میں موجود ان چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی تفہیم زیادہ بہتر طریقے سے کی جا رہی ہے۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی پروفیسر سجاد شیخ کی زیر تبصرہ کتاب ''سیاہ حاشیے'' کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔ جو اس بات کا غماز ہے کہ منٹو کی چھوٹی چھوٹی کہانیوں پر بھی بڑی بڑی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ یہ کتاب مجموعی طور پر پانچ حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلے چار حصوں میں سیاہ حاشیے میں شامل کہانیوں کا متن اور فاضل مصنف کا تجزیہ ہے۔ جب کہ حصہ پنجم چار ضمیمہ جات پر مشتمل ہے۔ حصہ

اول میں سیاہ حاشیے کی گیارہ کہانیاں مزدوری، حیوانیت، رعایت، گھاٹے کا سودا، استقلال، کھاد، اصلاح، سوری، صفائی پسند، جوتا اور کرامات شامل ہیں۔ حصہ دوم میں درج ذیل سات کہانیاں۔ تعاون، خبردار، تقسیم، قسمت، اشتراکیت، الہنا اور دعوت عمل' حصہ سوم بھی سات ہی کہانیوں پر مشتمل ہے ان میں مناسب کارروائی 'آرام کی ضرورت، حلال اور جھٹکا، ہمیشہ کی چھٹی، بے خبری کا فائدہ، کسر نفسی اور جیلی شامل ہیں۔ جب کہ حصہ چہارم میں درج ذیل کہانیاں شامل ہیں، ساعت شیریں، آنکھوں پر چربی، پٹھانستان، پیش بندی، نگرانی میں، صدقے اس کے اور جائز استعمال۔

قارئین کی سہولت اور آسان فہمی کے لیے مصنف نے ہر کہانی کے تجزیے سے پہلے اُس کا متن بھی شامل کر دیا ہے۔ یوں متن اور تجزیے کا ملاپ سیاہ حاشیے کی خصوصیات کے بہت سے اچھوتے پہلو ہمارے سامنے لے آتا ہے۔ حصہ اول میں شامل افسانے ''مزدوری'' کا تجزیہ کرتے ہوئے مصنف کہتے ہیں کہ دیگر افسانوں کی طرح اس افسانے میں بھی کیمرے کا خصوصی فوکس بلوائی ہیں۔ لیکن بالعموم یہ لوگ اس وحشیانہ پن سے قطعاً نابلد ہیں جس کی توقع بلوائیوں سے کی جاتی ہے۔ ''مزدوری'' ہی کے تجزیے میں لکھتے ہیں :

> ''حقائق کی ایسی پر تاثیر معروضی Vivid اور Graphic پیشکش جس کفایت لفظی سے ''مزدوری'' میں کی گئی ہے وہ سیاہ حاشیے میں شامل افسانوں کی عمومی خصوصیت کی نشاندہی کرتی ہے۔'' [۹۲]

انسانوں میں حیوانیت اور حیوانوں میں انسانیت کی موجودگی کا خوبصورت طنزیہ کتاب کے حصہ اول میں موجود افسانہ ''حیوانیت'' ہے۔ بچھڑے کی آواز سن کر گائے کی بے کلی ایک جبلی فعل تھا جس کی بنیاد پر بیوی نے اسے حیوان کہا۔ بقول مصنف :

> ''یہ چونکا دینے والا جملہ سن کر قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ کیسے انسان ہیں جو جان بچانے کے جبلی جذبے کے غلام ہو کر گائے کی ماتا کو محض ایک حیوانی جذبہ قرار دے رہے ہیں۔'' [۹۳]

''رعایت'' جیسے بے حد مختصر اور انتہائی المناک ڈرامے میں منٹو نے اپنی مثالی معروضیت اور غیر جانبداری برقرار رکھتے ہوئے فسادات کے زمانے میں عورتوں کے ساتھ ہونے والے انسانیت سوز مظالم کی حد درجہ کفایت لفظی اور ایمائیت کے ساتھ نہایت اثر انگیز عکاسی کی ہے۔ مصنف کا یہ خیال درست ہے کہ منٹو نے فسادات کے ان المیوں پر مذہب کی بجائے انسانیت کے نقطۂ نظر سے لکھا۔ حالات حاضرہ پر اُس کے یہ نوحے ''کسی مسلمان خاتون ناہید کی پکار نہیں بنتے'' بلکہ اس کے اکثر افسانوں کے کرداروں سے تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ مرنے اور مارنے والے کس مذہب یا دھرم سے تعلق رکھتے ہیں۔ انسانوں پر انسانوں کے ہاتھوں ڈھائے جانے والے مظالم پر وہ کوئی تبصرہ یا تنقید نہیں کرتا بلکہ واقعات کی پیش کش کے انداز سے وہ قاری کو خود ہی کسی نتیجے پر پہنچنے کے لے اکساتا ہے۔ منٹو کے غیر جانبدارانہ رویے کا حامل یہ اقتباس ملاحظہ کریں :

> ''منٹو خود بھی ایک مسلمان ادیب ہے لیکن گاڑی میں سوار دوسرے مسلمانوں کو اس نے جس بے باک اور بے لاگ سچائی کے حوالے سے عریاں کیا ہے یہ اسی کا خاصا ہے۔ اپنے ہم مذہبوں کے بارے میں اتنی سچائی کا ایسا برملا اظہار منٹو ہی کر سکتا تھا۔'' [۹۴]

ان تجزیوں میں مصنف نے صرف فکری یا موضوعاتی سطح پر ہی نہیں بلکہ اسلوبیاتی اور فنی سطح پر بھی ان خصوصیات کی طرف اشارے کیے ہیں جو اُنھیں بڑے ادب کے درجے پر فائز کرتے ہیں۔ مثلاً سیاہ حاشیے میں شامل ایک کہانی ''آرام کی ضرورت ہے'' کا فنی اعتبار سے جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ افسانہ کفایت لفظی، ایجاز و اختصار، شدت تاثر اور ایمائیت کی بنا پر منٹو کے بے مثال افسانوں میں جگہ پانے کا حقدار ہے۔ کم از کم الفاظ کے ذریعے ایسا گہرا تاثر پیدا کرنے کی صلاحیت منٹو کو صف اول کے افسانہ نگاروں میں لا کھڑا کرتی ہے۔''[۹۵]

اسی طرح ''اشتراکیت'' نامی کہانی میں موجود فنی خوبیوں کا احاطہ یوں کرتے ہیں:

> ''بغیر کسی تنقید یا تبصرے یا تشریح کے۔ بیان میں سادگی اور ڈرامائی رمزیہ، پیش کش کے علاوہ طنزیہ، استہزائیہ انداز اس افسانے کی نمایاں خصوصیات ہیں۔''[۹۶]

المختصر ''سیاہ حاشیے: تجرباتی مطالعہ'' میں موجود ۳۲ کہانیوں کے یہ تجزیے اپنی مثال آپ ہیں۔ ان تجزیات میں فاضل مصنف نے فکری، موضوعاتی اور فنی سطح پر کہانیوں میں موجود پوشیدہ اسرار و رموز سب پر وا کر دیے ہیں۔ فسادات سے متعلق لکھے گئے ان افسانوں میں منٹو ایک غیر جانبدار ادیب کے طور پر انسان کے وحشی ہونے کے مناظر کو جوں کا توں دکھاتا چلا گیا۔ جس طرح غزل کے ہر شعر میں ایک الگ اور مکمل کہانی پیش کر دی جاتی ہے' اسی طرح منٹو نے ایک یا دو جملوں میں وہ کہانیاں بیان کر دی ہیں کہ کوئی شاعر بھی نہ کر سکے۔

کتاب کا پانچواں حصہ ''ضمیمہ'' چار ضمیمہ جات پر مشتمل ہے۔ پہلا ضمیمہ محمد حسن عسکری کا ''حاشیہ آرائی'' کے عنوان سے وہ مضمون ہے جو اُنھوں نے سیاہ حاشیے کے دیباچے کے طور پر لکھا تھا۔ دوسرے ضمیمہ میں ممتاز مفتی، یوسف ظفر، حسنین، جاوید صدیقی اور شعیب حسن کے سیاہ حاشیے پر لکھے گئے مختصر تبصرے ہیں۔ تیسرے ضمیمہ میں منٹو کا سوانحی خاکہ جب کہ آخری ضمیمہ میں منٹو کی دسمبر ۱۹۴۷ء تک کی تحریر کردہ تخلیقات کی فہرست دی گئی ہے۔

''سعادت حسن منٹو: شخصیت اور فن''، مبین مرزا:

اکادمی ادبیات پاکستان کے زیر اہتمام پاکستانی ادب کے معمار کے سلسلہ میں مبین مرزا کی یہ تصنیف ۲۰۰۸ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ افتخار عارف کے ''پیش نامہ'' اور مصنف کے پیش لفظ کے علاوہ مجموعی طور پر سات مضامین کتاب میں شامل ہیں۔ یہ مضامین منٹو کی شخصیت اور ادبی جہتوں کے مختلف زاویوں پر تصنیف کیے گئے ہیں۔ ان مضامین کے عنوانات سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ مصنف نے منٹو کی شخصیت سمیت اس کے فن کے تمام پہلوؤں کو ایک ہی کتاب میں جمع کرنے کی سعی کی ہے۔ اگرچہ یہ کام پہلی بار نہیں ہوا بلکہ اس سے پہلے بھی اس نوعیت کی بہت سی کتابیں تصنیف ہو چکی ہیں۔ لیکن جس طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سی غلط فہمیوں اور خوش فہمیوں میں بعض حقائق کے منظر عام پر آنے کے بعد ہمیں اپنے سابقہ فیصلوں میں ترمیم کرنا پڑتی ہے اسی طرح منٹو کے باب میں بھی وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے ادبی، سیاسی، سماجی اور حکومتی حلقوں کو چار و ناچار ترمیم کرنا پڑی۔ منٹو کی شخصیت اور فن کے مرکزی حوالے اگرچہ کسی بڑی تبدیلی سے دوچار نہ ہوئے لیکن منٹو کی فنی عظمت کا سکہ اور شخصیت کی دھاک وقت کے ساتھ ساتھ

مزید مستحکم اور پختہ تر ہوتی جا رہی ہے۔ چناں چہ منٹو کی شخصیت اور فن پر مختلف زمانوں میں دی جانے والی آرا میں ہلکی پھلکی تبدیلی منٹو فہمی کے ضمن میں ایک خوشگوار تاثر چھوڑ جاتی ہے۔ مبین مرزا کا شمار منٹو شناسوں کی فہرست میں ہوتا ہے، اس کتاب کے علاوہ بھی اُنھوں نے منٹو پر بہت سا تحقیقی کام کر رکھا ہے۔ ایک ضخیم کتاب بھی اس حوالہ سے مرتّب کی ہے۔ زیر نظر کتاب میں شامل مضامین کی فہرست کچھ اس طرح ہے۔ منٹو سوانحی خاکہ، منٹو کے افسانے، منٹو کے ڈرامے، منٹو کے خاکے، منٹو کے مضامین، منٹو کے تراجم اور منٹو کی وطنیت کا مسئلہ۔ ان مضامین کے عنوانات ہی سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کتاب میں منٹو کی شخصیت اور فن کے کم و بیش تمام پہلوؤں کو اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ خاص طور پر ایسے قارئین جو منٹو فہمی کے باب میں نووارد ہیں اُنھیں منٹو کی شخصیت اور فن پر ایک سیر حاصل کتاب پڑھنے کا موقع ضرور میسر آ جاتا ہے۔ مبین مرزا نے اچھا کیا کہ اپنے مضامین لکھ کر منٹو کی شخصیت و فن کا جائزہ لیا، اگر وہ روایتی انداز اختیار کرتے اور ادھر ادھر سے مضامین پکڑ کر کتاب شائع کر دیتے جیسا کہ فی زمانہ چلن عام ہے تو شاید وہ فکری تسلسل مفقود وہ جاتا جو اس کتاب کا خاصا ہے۔ کتاب میں شامل آخری مضمون ''منٹو کی وطنیت کا مسئلہ'' گزشتہ دہائی میں چھڑنے والی اس بحث پر مشتمل ہے جو ہندوستان اور پاکستان کے ادیبوں کے درمیان جاری رہی۔ ہر دو طرف کے ادیب منٹو کو اپنے اپنے ملک کا باشندہ قرار دیتے رہے۔ فاضل مصنف، امجد طفیل، فتح محمد ملک، جگدیش چندر ودھاون، حمید شاہد، کھیم چند اور مشرف عالم ذوقی کی منٹو کی پاکستانیت اور ہندوستانیت کے ضمن میں کی جانے والی بحث کا تقابلی جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:

> ''ادبی حلقوں میں یہ سوال کہ وہ پاکستانی نہیں بلکہ ہندوستانی تھا، اس لیے اسے پاکستان میں اردو افسانے کے نمائندوں میں شامل کرنا درست نہیں، محض جذباتی، غیر عقلی اور غیر ادبی بات ہے۔''[۹۷]

کتاب کے آخر میں منٹو کی تصنیفات اور ان میں شامل تخلیقات کے مفصل اشاریے کے علاوہ منٹو کی شخصیت اور فن پر لکھی گئی کتب، رسائل کے خصوصی نمبر، مقالہ جات اور انگریزی زبان میں منٹو کے کیے گئے تراجم کی ایک نامکمل فہرست بھی شامل کی گئی ہے۔ صفحات کی مجموعی تعداد ۲۲۸ ہے۔

''منٹو کی عورتیں''، ڈاکٹر روش ندیم:

''منٹو کی عورتیں'' ڈاکٹر روش ندیم کے پی۔ ایچ ڈی کے مقالہ بعنوان ''بیسویں صدی کے سیاسی اور سماجی حوالے سے منٹو کے افسانوں میں عورت کا کردار'' کی کتابی شکل ہے۔ اُنھوں نے یہ مقالہ مکمل کر کے نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لنگویجز، اسلام آباد سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ کتاب کے دیباچے میں وہ بجا طور پر شکوہ کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ ابتدائی دور میں گنتی کے چند ناقدین کی دو چار کتابوں اور فارمولا قسم کے مضامین، جن میں کم و بیش ایک سی باتیں کی گئی ہیں اور یوں یہ تنقید یکسانیت کا شکار ہو گئی ہے کے علاوہ سنجیدہ نوعیت کا کوئی کام نہیں کیا گیا:

> ''بیسویں صدی کے سیاسی اور سماجی حوالے سے منٹو کے افسانوں میں عورت کا کردار'' پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے تنقید و تحقیق کا موضوع بنا تو اس بات پر شدید حیرت ہوئی کہ اُردو ادب میں اہم ترین گنے جانے والے منٹو کے نسوانی کرداروں پر وزیر آغا، انیس ناگی اور ممتاز شیریں کے سوا کسی نے خصوصی طور پر قلم ہی نہیں اٹھایا۔''[۹۸]

چناں چہ امدادی مواد کی عدم موجودگی کے سبب مصنف کو وہ تمام گرد اڑانی پڑی جو منٹو کے ادب کے ہر ہر صفحے پر اٹی پڑی تھی۔ اُنھوں نے ایک ایک پرت کو آہستہ آہستہ کھولا اور پھر اپنی علمی بصیرت اور منٹو سے رغبت کی وجہ سے ان نسوانی کرداروں کو ان کی اصلی حالت میں ہمارے سامنے لا کھڑا کیا۔ یقیناً یہ ان کا کمال خاص ہے۔ زیر تبصرہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب بعنوان ''تاریخی پس منظر'' دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ ''پانچ ہزار سالہ ہندوستانی ناری'' دراصل برصغیر پاک و ہند کی نسوانی زندگی کی پانچ ہزار سالہ قدیم تاریخ ہے۔ اسی تاریخی تناظر اور مختلف تہذیبوں میں عورت کے مختلف مقامات کے مفصل مطالعہ کے بعد باب کے دوسرے حصے ''بیسویں صدی اور عورت کا نیا جنم'' میں گزشتہ صدی میں عورت کے تصور اور کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کے دوسرے باب بعنوان ''منٹو کا شعور اور اس کی عورتیں'' میں منٹو کے نسوانی کرداروں اور تصور عورت سے بحث کی گئی ہے۔ منٹو کی یہ عورتیں عموماً نچلے یا متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں ہر قماش کی عورت موجود ہے۔ خوب صورت اور وفادار بیوی، محبت کے لیے ہر وقت تیار محبوبہ یا پھر پیشہ ور طوائفیں۔ عورت چاہے کسی روپ میں ہو ہمارا معاشرہ کسی نہ کسی طریقے سے اس کا استحصال کر رہا ہے۔ منٹو عورتوں کے اس استحصال کے خلاف تھے اور اُنھیں مردوں کے برابر حقوق دلوانا چاہتے تھے کم از کم اپنی ذاتی زندگی میں تو اُنھوں نے اس نظریے کا عملی ثبوت بھی فراہم کیے رکھا۔ بقول مصنف:

> ''منٹو کے نسوانی کردار استحصال کا شکار ہیں اور ایک استحصالی نظام کے تحت مخصوص کردار نبھانے پر مجبور کیے جاتے رہے ہیں۔''[۹۹]

مصنف کے مطابق منٹو کی عورت شہری سماج کے ٹھکرائے ہوئے نچلے طبقات سے تعلق رکھنے والے ان کرداروں کا خاص حصہ ہے جو اپنے طبقے میں سماجی حوالے سے بھی ٹھکرائی ہوئی ہے اور جنسی و صنفی حوالے سے بھی۔ عورت کی اس کمزور حیثیت نے اسے مردانہ معاشرے میں ایک کٹھ پتلی بنا کر رکھ چھوڑا ہے۔ مصنف منٹو کو اس حوالے سے بہت اہم تخلیق کار گردانتے ہیں جنھوں نے پہلی مرتبہ ہندوستان کی عورت کو سیاسی و سماجی حوالے سے ایک وسیع تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

''منٹو کی عورتوں کا ارتقاء'' میں مصنف نے منٹو کے پہلے افسانوی مجموعہ سے لے کر اس کے تمام فن کا نسوانی کرداروں کے حوالے سے جائزہ لیا ہے۔ مصنف کے بقول منٹو کے پہلے افسانوی مجموعے آتش پارے کے آٹھ میں سے صرف تین افسانوں تماشا، جی آیا صاحب اور ماہی گیر میں نسوانی کردار ملتے ہیں اور یہ تینوں کردار فنی حوالوں سے کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑتے۔ پھر منٹو امرت سر سے بمبئ آ گئے۔ یہاں ''منٹو کے افسانے'' ''اور دھواں'' شائع ہوئے تو منٹو کی افسانوی دنیا میں بھی وہ فرق پیدا ہو چلا تھا جو امرت سر اور بمبئ کی فضاؤں میں موجود ہے۔ یہاں منٹو کا تصور محبت اور تصور جنس بھی پہلی مرتبہ کھل کر سب کے سامنے آ گیا۔ بمبئ میں منٹو کی افسانوی زندگی کا دوسرا دور ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۷ء تک کا ہے منٹو کے چوتھے افسانوی مجموعہ ''افسانے اور ڈرامے'' میں شیرہ، مس فریا اور مسز ڈی سلوا کے نسوانی کرداروں کو مرکزیت حاصل ہے۔ بو، دھواں اور کالی شلوار کی عورتیں اب استعارے بن چکی ہیں۔ مصنف کے مطابق ''آتش پارے'' سے لے کر ''انار کلی'' تک سماجی، سیاسی، اور عصری رجحانات کے زیر اثر منٹو کے افسانوں میں نسوانی کرداروں کی بتدریج ترقی اس کے شعور کی غمازی کرتی ہے اور یہ کردار منٹو کے فنی و فکری ارتقاء کے ساتھ ساتھ داخلی و خارجی سطح پر زیادہ واضح، مستحکم اور تفصیلی صورتوں میں سامنے آتے گئے۔

چوتھے باب کا عنوان ''منٹو کا تصور عورت'' ہے۔ اس باب میں مصنف نے کہانیوں کے کرداروں کی روشنی میں منٹو کے تصور عورت کو پیش کیا ہے۔ منٹو کے عہد کے ہندوستان کی عورت کو تہذیبی زوال کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ عورت مکمل طور پر محکوم اور استحصال زدہ ہو چکی تھی' چاہے اس کا تعلق سماج کے اعلیٰ طبقے سے ہو یا متوسط و پست طبقے سے، چاہے وہ طوائف ہو یا پھر بیوی، مرد معاشرہ اس کا استحصال کرنے کی کوئی ترکیب ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ لیکن اس سب کے باوجود منٹو کی یہ عورت تمام تر ظلم و زیادتی کے باوجود ایک خاص جذبے سے معمور ہے اور وہ ہے جذبہ انسانیت۔ بقول مصنف:

> ''منٹو ان نسوانی کرداروں میں انسانیت کے حامل ایسے اخلاقی و قدرتی عناصر سامنے لاتا ہے جو معاشرے میں ان کے حقیقی و انسانی مقام کی بازیابی کی ایک کاوش ہونے کے ساتھ ساتھ خود معاشرے کے اخلاقی تضاد و بحران کو بھی واضح کرتے ہیں۔'' [۱۰۰]

مصنف نے بجا لکھا ہے کہ منٹو کا تصور عورت اس کے تصور انسان سے جڑا ہوا ہے گویا منٹو کے تصور انسان پر بات کرنا دراصل اس کے تصور عورت ہی پر بات کرنے کے مصداق ہے۔ منٹو متشدد اور باغیانہ رویوں کی بجائے عورت کے شخصی اوصاف کو ابھارتا ہے اور اس کے عمل سے ثابت کرتا ہے کہ تمام تر استحصال کے باوجود عورت کے اندر ممتا کا جذبہ موجود رہتا ہے اُنھوں نے عورت کی جس سب سے بڑی خاصیت کو اپنے کرداروں کا حصہ بنایا وہ ممتا ہی تو ہے۔ جدید تقاضوں کے عین مطابق منٹو عورت کو فعال دیکھنا چاہتا ہے 'گھر میں بیٹھ کر چکی پیسنے والی عورتوں کی بجائے شوہر سے لڑ کر سینما دیکھنے والی عورت اسے زیادہ اچھی لگتی ہے۔ باب کے آخر میں مصنف نے منٹو کے تصور عورت کو تین طرح کی خصوصیات کا حامل قرار دیا۔ اول یہ کہ عورت کا تصور اس کے تصور انسان سے منسلک ہے۔ دوم، منٹو عورت کی آفاقی خوبیوں کا قائل ہے اور سوم وہ تصور جو عورت کے گرہستن، وفادار اور ممتا کے جذبہ سے سرشار ہے۔

''منٹو کی عورتیں اور فحاشی و عریانی کا مسئلہ'' اس کتاب کا آخری باب ہے۔ اس باب میں مصنف نے جامع انداز میں منٹو کی ایسی کہانیاں جن پر فحش ہونے کا الزام لگا کر مقدمات قائم کیے گئے کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ملکی و غیر ملکی قوانین کی رو سے فحاشی کا دائرہ کار، نیز ان مقدمات میں منٹو کی طرف سے پیش کیے گئے گواہان کا فحاشی اور منٹو کے افسانوں سے متعلق نقطۂ نظر اور فاضل جج صاحبان کے تحریری فیصلے بذات خود ادبی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ منٹو ادب کے جدید اور دیرینہ اظہار کا نمائندہ تھا مگر جامد معاشرے نے اس کے فن کی تفہیم نہ کی۔ بقول مصنف:

> ''سچائیوں کے ننگے اظہار پر جنس نگاری اور فحش نگاری کے الزامات اور مقدمات کی بوچھاڑ' ایسے جامد و مقلد سماجی سیاسی نظام کی طرف سے ردعمل کی ایک صورت تھی۔'' [۱۰۱]

مصنف کی یہ رائے درست ہے کہ فحاشی و عریانی کا مسئلہ محض اخلاقی نہیں ہوتا بلکہ اس کی اٹھان سماجی بنیادوں پر ہوتی ہے، جس میں سیاسی، سماجی، معاشی، روایتی، ریاستی، طبقاتی، قانونی، علمی و فنی اور پدر شاہی اسباب شامل ہوتے ہیں۔ منٹو ان تمام طبقات سے بغاوت کر کے اس استحصال کے خلاف آواز اٹھاتے رہے۔

’’منٹو از عالم بالا‘‘، فاروق سلہریا:

فاروق سلہریا کے منٹوانہ انداز میں لکھے گئے یہ خطوط ’’ہفت روزہ‘‘ مزدور، جدوجہد، لاہور کے مختلف شماروں میں سال ۲۰۰۵ء سے لے کر سال ۲۰۰۸ کے درمیانی عرصہ میں اشاعت پذیر ہوئے۔ فہرست کے مطابق عالم بالا سے منٹو نے اب تک ۸ خطوط لکھے ہیں ان میں سات خط تو چچا سام کے نام ہیں۔ جن میں سے ایک خط (تیسرا) فرشتے نے غلطی سے چچا جان کی بجائے شیطان کے سپرد کر دیا۔ یوں چچا سام کو صرف چھے ہی خطوط مل سکے، جب کہ ایک خط ’’جی ایچ کیو‘‘ کے نام بھی شامل کتاب ہے۔ چچا سام کے نام یہ خطوط اب کی بار لکشمی مینشن کی بجائے، میانی صاحب، کے قبرستان سے لکھے گئے ہیں۔ فاروق سلہریا کو یہ خطوط لکھنے کا خیال اس وقت آیا جب مزدور جدوجہد نے ۲۰۰۵ء میں منٹو کی پچاسویں برسی کے موقع پر دوسری مرتّبہ خصوصی شمارہ شائع کیا۔ چناں چہ چچا سام کے نام عالم بالا سے لکھے گئے اپنے پہلے خط میں وہ اس بات کا اعتراف بزبان منٹو از عالم بالا اس طرح کرتے ہیں:

> ’’خط لکھنے کی کوئی فوری وجہ تو نہیں۔ بس یونہی جب گزشتہ دنوں ’’جدوجہد‘‘ والوں نے منٹو نمبر نکال کر یاد دلایا کہ ۱۷ جنوری کو میری پچاسویں برسی تھی۔‘‘[۱۰۲]

افسوس کہ مزدور جدوجہد والوں نے فاروق سلہریا کو یہ کیوں نہ یاد کرایا کہ منٹو کی پچاسویں برسی ۱۷ کی بجائے ۱۸ جنوری ۲۰۰۵ء کو تھی۔ چلیں مان لیا کہ اس وقت مصنف کو بھی جلدی میں خط لکھنا پڑ گیا کیوں کہ ’’جدوجہد‘‘ والوں نے جلد از جلد رسالہ شائع کرنا تھا، اس مدیر اور پبلی شرز نے بھی مصنف کی اصلاح نہ کی جس نے ۳۸ صفحات کے کتابچے کی قیمت ۱۰ امریکی ڈالر یعنی کم و بیش ایک ہزار سے بھی زائد پاکستانی روپے مقرر کر دی۔

مصنف نے ان خطوط میں منٹو کی طرز میں اپنے زمانے کے سیاسی و سماجی مسائل پر جو دراصل امریکہ کے ہی پیدا کردہ ہیں، گفتگو کی ہے، منٹو ہی کی طرح امریکہ پر طنز و تعریض کے نشتر چلائے ہیں اور پاکستان کے تمام حکمرانوں اور سیاستدانوں کو چچا سام ہی کا نمائندہ قرار دیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کے تمام اداروں کی چابیاں اور تالے امریکہ ہی کے پاس ہیں اور ہم پاکستانی اس کے اشاروں ہی کے محتاج ہوتے ہیں۔ فاروق سلہریا نے ان خطوط میں ان مسائل کی نشاندہی کی ہے۔ لیکن مسئلہ مسائل کی نشاندہی کا نہیں ٗاسی موضوع پر سیکڑوں کتابیں نہ صرف اردو میں بلکہ دیگر زبانوں میں بھی لکھی جا چکی ہیں۔ آئے دن اخبارات اور ٹیلی ویژن کے ٹاک شوز میں اس موضوع کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ اصل چیز تو یہ ہے کہ مصنف نے منٹو کے جس انداز کو اپنانے کی کوشش کی ہے وہ ہئیت کے لحاظ سے تو درست ہے مگر تحریر کے اندر وہ معنویت جو ایک بڑا ادیب پیدا کرتا ہے، سرے سے مفقود ہے۔ کسی بھی ادیب، شاعر ٗفنکار یا مصور کے انداز کی نقالی ویسے بھی آرٹ کی دنیا میں مستحسن قرار نہیں دی جاتی۔ پھر منٹو کو تو آج تک کوئی بھی نقل نہیں کر سکا۔ مصنف کے یہ خطوط پڑھ کر سوائے افسوس کے اور کوئی جذبہ بیدار نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ان کے لکھے گئے اور منٹو کے لکھے گئے خطوط میں ادبیت اور غیر ادبیت کی وسیع خلیج حائل ہے۔ یہ تمام خطوط مصنف اور مزدور جدوجہد کے نظریات کی عکاسی کرتے ہیں نہ کہ منٹو کی۔ ’’مزدور جدوجہد‘‘ کوئی ادبی رسالہ نہیں، بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے نظریات کا پرچارک ہے۔ منٹو کے ساتھ ان کا شغف بھی محض نظریات کے اسی اشتراک کی وجہ سے ہے۔ خاص طور پر منٹو کی ابتدائی ادبی زندگی میں اس کے آثار واضح دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن نظریاتی مماثلت کے اظہار کا یہ طریقہ کچھ جچا نہیں۔ یہ خطوط سنجیدگی، متانت، حسِ مزاح، لطافت اور تاثیر سے یکسر خالی ہیں اور اُنھیں

محض کمیونسٹ نظریات کے پرچار کے علاوہ تحریروں کے کسی ادبی زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ خاص طور پر جی ایچ کیو کے نام لکھے گئے خط میں تو واضح طور پر ملکی افواج کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ادب میں طنزیہ پیرایہ کوئی نئی یا بری بات نہیں لیکن اس کے لیے ادبی پیرایہ اختیار کرنا لازمی ہے وگرنہ تحریر طعنہ، گالی یا چیخ و پکار تو ہو سکتی ہے ادب ہر گز نہیں۔ ۳۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں شامل آٹھ/سات خطوط، گڈ بکس، لاہور نے ۲۰۱۰ء میں شائع کیے۔

''منٹو کا اُسلوب''، طاہرہ اقبال:

طاہرہ اقبال کا یہ تحقیقی و تنقیدی مقالہ ۲۰۱۲ء میں منٹو صدی کی مناسبت سے فکشن ہاؤس نے لاہور سے کتابی شکل میں شائع کیا۔ چار ابواب پر مشتمل اس کتاب کا پہلا باب اسلوب، اردو نثر اور افسانے کے نمایاں اسالیب کی بحث پر مبنی ہے۔ دوسرے باب 'منٹو بحیثیت افسانہ نگار' میں منٹو کے حالات زندگی اور افسانوی مجموعوں کا زمانی ترتیب سے جائزہ لیا گیا ہے 'اسی باب میں منٹو کے اسلوب پر مختلف شخصیات، رجحانات اور تحریکات کے اثرات سمیت منٹو کی افسانہ نگاری کے اسلوب کا عہد بہ عہد ارتقائی جائزہ شامل ہے۔ اس باب میں شامل پہلا جزو بعنوان ''منٹو کے حالات زندگی اور افسانوں کے مجموعوں کا زمانی ترتیب سے جائزہ'' محض سعادت حسن منٹو کے حالات زندگی اور افسانہ نویسی کے اشاریے پر مشتمل ہے۔ منٹو کے حالات زندگی تعلیم، مقدمات، فلمیں، رہائش گاہیں، اولین تحریریں، اخبارات رسائل سے وابستگی وغیرہ کا گوشوارہ، اسی طرح منٹو کے افسانوں کی زمانی ترتیب بھی دراصل اشاریہ ہی ہے۔ منٹو کے پندرہ افسانوی مجموعوں اور ان میں شامل کہانیوں کی زمانی ترتیب سے فہرست بغیر کسی تجزیے و تبصرے کے باب دوم کے اس مضمون میں درج کر دی گئی ہیں۔ اسی باب کے دوسرے مضمون ''منٹو کے اسلوب پر مختلف شخصیات، رجحانات و تحریکات کے اثرات'' میں سب سے پہلے ان شخصیات کا تذکرہ کیا گیا ہے جن سے منٹو بہت متاثر تھے اور جن کی شخصیت اور تحاریر کا اثر منٹو پر بھی پڑا۔ غالب، باری علیگ اور موپساں کے انداز فکر ہی نہیں بلکہ ان کے اسلوب بیان نے بھی منٹو کے اسلوب خاص کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔ بقول ڈاکٹر صلاح الدین درویش:

> ''طاہرہ اقبال نے منٹو کی اسلوبیاتی جہتوں کو غالب کی جدت طرازی، باری علیگ کی انقلابیت اور موپساں کی حقیقت نگاری میں دریافت کر کے منٹو کے اسلوب کو سمجھنے میں مزید سہولت پیدا کر دی ہے۔''[۱۰۳]

مصنفہ کے مطابق خود پسندی، انانیت، نرگسیت اور جدت و انفرادیت پسندی منٹو اور غالب دونوں کی شخصیت کا خاصا تھے۔ دونوں معترضین میں گھرے رہے، دونوں اجتہاد پسند اور جدت طراز تھے اور اپنے اسلوب کے خود معمار تھے لفظوں کے انتخاب میں باریکی سے کام لیتے اور گنجینۂ معنی آباد کر دیتے۔ اسی طرح ایسے تمام عناصر جو ان دونوں ادیبوں کی شخصیت اور فن میں قدر مشترک کا درجہ رکھتے ہیں کا حوالہ دے کر مصنفہ نے منٹو اور غالب کو ایک ہی مکتبہ فکر سے منسلک قرار دیا۔ مصنفہ کے نزدیک باری علیگ کی مختصر صحبت نے بھی منٹو پر مستقل اثر چھوڑا۔ ان کی شخصیت میں انقلاب کی تحریک باری علیگ نے ہی پیدا کی۔ منٹو کے ادبی سفر کا آغاز مغربی تراجم سے ہوا۔ وہ روسی افسانہ نگار میکسم گورکی سے متاثر تھے لیکن ان کے اسلوب پر موپساں کا اثر زیادہ واضح ہے۔ بقول طاہرہ اقبال:

> ''منٹو کا اسلوب موپساں کے زیادہ قریب ہے۔ موپساں کا براہ راست، دوٹوک اور تند و تیز لہجہ منٹو کے ہاں موجود ہے۔''[۱۰۴]

تحلیل نفسی، نفسیات، دور محکومیت، سامراجیت، تحریک اور قیام پاکستان، آزاد تلازمہ خیال، شعور کی رو اور علامتی انداز تحریر ' یہ وہ رجحانات و رویے ہیں جنھوں نے منٹو کے اسلوب کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کیا۔ اسی باب کے تیسرے اور آخری مضمون میں منٹو کی افسانہ نگاری کے اسلوب کا عہد بہ عہد ارتقائی جائزہ لیا گیا ہے اور ہر محقق اور نقاد کی طرح اُنھوں نے بھی اسے تین ادوار میں تقسیم کیا۔ پہلا دور ابتدا سے ۱۹۳۶ء تک، دوسرا دور قیام پاکستان اور تیسرے دور میں منٹو کی وفات تک کے تخلیقی ادب کو مختلف کہانیوں کے تناظر میں زیر بحث لایا گیا ہے۔

باب سوم ''منٹو کے جداگانہ اسلوب کے تشکیلی عناصر'' میں منٹو کے افسانوں میں آغاز، وسط اور انجام ذخیرہ الفاظ، تراکیب کا استعمال، دیگر زبانوں کے الفاظ کا استعمال، لب و لہجہ، تشبیہات و استعارات، فقرہ سازی اور پیرابندی کے علاوہ منٹو کے خطابیہ اور علامتی انداز تحریر کے حامل بعض افسانوں کا اسلوبیاتی جائزہ لیا گیا ہے۔ جب کہ کتاب کے آخری باب میں منٹو کے اسلوب پر ان کی شخصیت اور موضوعات کے اثرات کے ساتھ ساتھ معاصر افسانہ نگاروں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور اوپندر ناتھ اشک کے ساتھ تقابل کر کے منٹو کی انفرادیت اور اس کے مقام و مرتبے کا تعین کیا گیا ہے۔

''منٹو کا سیاسی شعور''، روبینہ یاسمین:

ایم۔ فل کی ڈگری کے حصول کے لیے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے لیے لکھے گئے مقالے کی یہ کتابی شکل ہے۔ جسے مثال پبلی کیشنز، فیصل آباد نے ۲۰۱۲ء میں شائع کیا۔ کتاب مجموعی طور پر پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں ''بیسویں صدی کا سیاسی منظر نامہ'' پیش کیا گیا ہے۔ ہندوستان سمیت دنیا بھر میں چلنے والی سیاسی اور سماجی، فکری اور جنگی تحریکوں کے اثرات نے منٹو کی سیاسی بصیرت کو کس طرح بیدار کیا اور اُنھوں نے ان اثرات کو اپنی تحریروں میں کس طرح سمویا، یہی اس کتاب کی تصنیف کا مقصد ہے۔

باب دوم ''منٹو کے افسانے'' میں منٹو کے سیاسی موضوعات پر لکھے گئے مختلف افسانوں کا پس منظر، پیش منظر اور عہد حاضر میں ان کے اطلاق کا خوبصورتی سے جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنفہ کے بقول منٹو نے حقیقی کہانیوں کو حقیقی کرداروں کی صورت میں پیش کیا ہے۔ چاہے وہ ہندوستان میں چلنے والی آزادی کی تحریکیں ہوں یا آزاد مملکت پاکستان کی تشکیل، منٹو کا سیاسی ذہن ان تحریکوں کے پیچھے چلنے والے خفیہ ہاتھوں سے بھی واقف تھا اور ان کے پس پردہ مقاصد سے بھی۔ جلیانوالہ باغ، تقسیم بنگال، تحریک خلافت اور امریکی پالیسیاں یا پھر برصغیر کی تقسیم کے ضمن میں قیام پاکستان اور اس کے مسائل سب پر منٹو کی سیاسی نگاہ تھی۔ ایک اقتباس دیکھئے:

> ''منٹو کی نگاہ بین الاقوامی سیاست پر بھی تھی اور ان کی دور بین نگاہ نے سامراجیت اور اس کے مفاد کو نہ صرف دیکھ لیا تھا بلکہ اس کے اثرات کو بھی محسوس کر لیا تھا۔''[۱۰۵]

مصنفہ کے مطابق اپنے معاصر افسانہ نگاروں کے مقابلے میں منٹو کے ہاں سیاسی بصیرت کہیں زیادہ تھی۔ باب کے آخر میں اُنھوں نے پریم چند، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی اور کرشن چندر کے سیاسی بصیرت کے حامل افسانوں کا منٹو کے اس موضوع پر لکھے گئے افسانوں اور دیگر تحریروں سے تقابل کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ:

> ''منٹو کا سیاسی شعور اور عقابی نگاہ، پھر اس کا تخیل آمیز افسانوی حقیقتوں کا بیان واقعہ کو کس قدر مؤثر بنا دیتا ہے کہ اس کا کوئی ہم عصر اس کی قوت بیان کی گرد تک بھی نہیں پہنچتا۔''[۱۰۶]

تیسرے باب ''خاکے اور ڈرامے'' میں سعادت حسن منٹو کے لکھے ہوئے شخصی خاکوں اور ریڈیو کے لیے لکھے گئے فیچر اور ڈراموں میں موجود سیاسی بصیرت کا محاکمہ کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے معروضی حالات کے تناظر میں منٹو کی لکھی گئی ان تحریروں میں اُس وقت کی دھڑکن محسوس کی جا سکتی ہے۔ انقلاب اور آزادی کی خواہش، غیروں کی حکمرانی، سوشلزم کے اثرات، فرقہ واریت، دو قومی نظریہ، تقسیم کے بعد فسادات، عالمی جنگیں اور رسہ کشی، غرض ان خاکوں اور ڈراموں میں براہ راست نہ سہی بالواسطہ ایسے واضح اور تلخ اشارے ملتے ہیں جو منٹو کو اس کے عہد سے جڑا ہوا تخلیق کار ثابت کرتے ہیں۔ چاہے مرلی کی دھن ہو یا اشوک پر لکھا ہوا مضمون، یا پھر قائدِ اعظم کا خاکہ، یہاں تک کہ نور جہاں سرور جہاں میں بھی تقسیم کے بعد کی تلخی کے اثرات نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ ریڈیائی ڈراموں کا حوالہ دیتے ہوئے مصنفہ رقم طراز ہیں کہ:

> ''ان ریڈیائی ڈراموں میں منٹو نے ہندوستانی ماحول، معاشرت اور سیاست کے ساتھ ساتھ ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز میں عالمی سیاست پر بھی نظر ڈالی ہے۔''[۱۰۷]

منٹو کے یہ ڈرامے ۱۹۴۰ء میں طبع ہو کر منظرِ عام پر آئے۔ واقعات کی ترتیب اور حالات کے متعلق منٹو کی پیش گوئیاں حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئیں۔ منٹو کی سیاسی بصیرت کے متعلق لکھتی ہیں:

> ''منٹو کی عالمی سیاست اور بین الاقوامی واقعات پر گہری نظر تھی۔ وہ عالمی حالات سے باخبر تھے اور سامراجی سیاست کے اسرار و رموز سے خوب واقف تھے کہ سامراج اپنے مفاد کے لیے ہر اصول توڑ سکتا ہے۔''[۱۰۸]

بقول مصنفہ منٹو کی سیاسی بصیرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی کہی ہوئی باتیں آج بھی اس کے شعور کی سچائی کا مظہر ہیں۔ ڈراما ہو یا، فیچر، افسانہ ہو یا خاکہ، منٹو کی عالمی سیاست پر نظر اور تاریخی واقعات کو ان تحریروں میں سمونے کا سلیقہ سب سے جدا ہے۔

چوتھے باب ''مضامین اور دیگر تحریریں'' میں بھی وہی انداز مطالعہ ہے جو گزشتہ ابواب میں تھا۔ یعنی منٹو کے مضامین، چچا سام کے نام لکھے گئے خطوط نما مضامین کی روشنی میں وہ یہ نتیجہ نکالتی ہیں کہ منٹو نے عالمی سیاست میں امریکی کردار، چالبازی اور مفادات کو اس طرح کھول کر بیان کیا ہے کہ عام آدمی پر بھی امریکی استحصال کا طریقہ کار واضح ہو سکے۔ آخر سطر بہت جاندار ہے کہ:

> ''منٹو نے امریکہ کی دریافت اور اس کے کارناموں کا خلاصہ ایک ہی جملے میں بیان کر دیا ہے کہ امریکہ کا ہر روپ استحصالی ہے۔''[۱۰۹]

باب پنجم ''مجموعی جائزہ'' میں گزشتہ ابواب میں کی جانے والی بحث کو سمیٹا گیا ہے۔ اور اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ ہمیں منٹو کے سیاسی افکار کو موجودہ دور کے سیاسی و سماجی حالات و واقعات کی روشنی میں جانچنے اور مستقبل کی راہیں متعین کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

''غالب اور منٹو''، شمس الحق عثمانی:

سال ۲۰۱۲ء کو منٹو کی ۱۰۰ ویں سالگرہ کی نسبت سے کافی شہرت ملی، اس سال منٹو کی شخصیت اور فن کی مختلف جہتوں پر بیسیوں کتابیں شائع ہوئیں۔ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ صدر غالب اکیڈمی پروفیسر شمیم حنفی کے تعارفی مضمون کے علاوہ ''غالب اور منٹو'' کے عنوان سے شمس الحق عثمانی کے خصوصی لیکچر کے بعد منٹو کی غالب کے متعلق مختلف اوقات میں لکھی گئی درج ذیل چھے تحریریں، آگرہ میں مرزا نوشہ کی زندگی، غالب اور سرکاری ملازمت، غالب اور چودھویں، مرزا غالب کی حشمت خان کے گھر دعوت کے علاوہ غالب، چودھویں اور حشمت خان شامل ہیں۔ جب کہ کتاب کا آخری حصہ ''من کہ سعادت حسن منٹو'' جو سعادت حسن منٹو کی خود نوشت تحاریر کو ترتیب دے کر تشکیل دیا گیا، اس کتاب کا سب سے طویل مضمون ہے۔

۲۰۱۳ء میں غالب اکیڈمی سے شائع ہونے والی اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے اکیڈمی کے صدر پروفیسر شمیم حنفی نے مختصراً غالب اور منٹو کی شخصیات کے مشترک پہلو اور ہر دو کے معاصرانہ اشتراکات کا جائزہ لینے کے بعد زیر تبصرہ کتاب کو منٹو شناسی کے باب میں روایت سے ہٹ کر ایک منفرد اضافہ قرار دیا۔

''غالب اور منٹو''، شمس الحق عثمانی کا وہ کلیدی خطبہ ہے جو اُنھوں نے غالب اکیڈمی کی درخواست پر ۲ دسمبر ۲۰۱۲ء کو منعقدہ سیمینار میں دیا تھا۔ اس مضمون میں اُنھوں نے غالب اور منٹو کو ادبی ''استعارے'' قرار دیتے ہوئے منٹو کی غالب میں دلچسپی کو صرف شخصی یا جذباتی کے ساتھ ساتھ دو نابغہ روزگار لکھنے والوں کی مماثلت اور یگانگت سے بھی تعبیر کیا ہے۔ زیر تبصرہ مضمون میں مرتّب نے منٹو کی تخلیقی زندگی میں غالب کے اثرات اور دلچسپی کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ ان کے مطابق منٹو نے غالب کی شخصیت پر آدھے درجن سے زائد مضامین لکھ کر ان کی وضع کردہ تراکیب سے اپنی کتابوں اور دیگر کئی تحریروں کے عنوانات اخذ کیے، غالب کی زندگی پر ایک فلم لکھی، نیز غالب کے اشعار کا بر محل استعمال اور اپنے مضامین کے عنوانات بھی لیے۔ شمس الحق عثمانی کے بقول غالب سے منٹو کی ارادت کے آثار ۱۹۴۰ء میں ملتے ہیں جب منٹو نے غالب کی زندگی پر ایک فلمی کہانی لکھنے اور اس کی تکمیل کا اعلان احمد ندیم قاسمی کو لکھے گئے خطوط میں کیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۸ء میں روزنامہ، امروز کے لیے لکھے گئے ہلکے پھلکے مضامین میں غالب کے متعلق درج ذیل تین مضامین ''غالب اور سرکاری ملازمت'' آگرہ میں مرزا نوشہ کی زندگی کے علاوہ غالب اور چودھویں، بھی شامل تھے۔ بعد میں یہ مضامین تلخ، ترش اور شیریں، مطبوعہ ۱۹۵۴ء میں شامل ہوئے جب کہ ۱۹۵۵ء کی ''شکاری عورتیں'' میں غالب پر ان کا مضمون، مرزا غالب کی حشمت خان کے گھر دعوت، شامل ہے۔

شمس الحق عثمانی نے اپنے اس مضمون میں، جو دراصل ان کے دیے گئے لیکچر کی تحریری صورت ہے، منٹو کے ان مضامین کا اشاعتی ترتیب کی بجائے غالب کے سوانحی کوائف کی روشنی میں جائزہ لیتے ہوئے ان مضامین کی فنی و فکری اور تکنیکی و ہئیتی خوبیوں پر سیر حاصل بحث کی۔ ان مضامین کے علاوہ منٹو کی مختلف النوع تحریروں میں بھی غالب سے دلچسپی کے آثار مسلسل ملتے ہیں۔ مصنف کے بقول، ''منٹو کے مضامین'' مطبوعہ ۱۹۴۲ء کی دو ابتدائی تحریروں کے عنوانات، چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد'' اور ''کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی'' غالب ہی کے دو مصرعے ہیں۔ مضمون، چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد؛ کا آغاز بھی اسی غزل کے شعر کے ایک مصرع، گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی، سے ہوتا ہے جب کہ منٹو کے مضمون، کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی، کا آغاز، قطع کیجئے نہ

تعلق ہم سے، کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی طرح چچا سام کے نام لکھے گئے خطوط میں بھی غالب کی شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کے اشعار کا حوالہ موجود ہے۔ نیز نمرود کی خدائی، جیب کفن، لذت سنگ، زحمت مہر درخشاں اور اپنی قبر کے کتبے کے لیے لکھی گئی تحریر میں ''لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں تھا کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ منٹو آغاز سے انجام تک غالب کو اپنے ساتھ ساتھ لے کر چلتے رہے۔ یہاں تک کہ حفیظ ہوشیار پوری نے منٹو کی وفات پر لکھے گئے قطع تاریخ کو بھی غالب کے فارسی مصرع ''مژدہ باد اہل ریا کہ زمیداں رفتم'' سے ڈھونڈ نکالا۔

کتاب کے آخری مضمون ''من کہ سعادت حسن منٹو'' کے آغاز میں اُنھوں نے اس نظریے کو رد کر دیا جس کے مطابق سعادت حسن اور منٹو کو دو الگ الگ خانوں میں رکھ کر دیکھنے کی روش عام ہو چکی ہے۔ مصنف کے بقول:

> ''مگر آج جس حد تک بھی اس کی معاشرتی زندگی اور تصانیف کی معنویت کو سمجھا گیا، صرف اس کے پیش نظر بھی یہ تصور محل نظر ہے کہ سعادت حسن معاش و معاشرت سے دوچار شخص تھا اور منٹو، فکر و فن کا شناور' منکشف منٹو معنویت ہی یہ باور کرانے کو کافی ہے کہ سعادت حسن منٹو کے حرف حرف میں اس کی شخصیت بھی کھپی ہے اور فنکاری بھی۔'' [۱۱۰]

اگرچہ ''منٹو'' نامی مضمون میں منٹو نے یہ ضرور کہا ہے کہ:

> ''ہم اکٹھے ہی پیدا ہوئے اور اکٹھے ہی مریں گے۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سعادت حسن مر جائے اور منٹو نہ مرے، اور ہمیشہ مجھے یہ اندیشہ بہت دکھ دیتا ہے۔'' [۱۱۱]

چناں چہ محض ایک قیاس کو بنیاد بنا لینا جب کہ منٹو اس تقسیم کو باعث تکلیف گردانتے ہوں۔ اور ہمیشہ اپنا پورا نام یعنی سعادت حسن منٹو ہی دستخط کے طور پر استعمال کرتے ہوں، اس تقسیم کو رد کرنے کے ٹھوس اشارے ہیں۔

ان تمہیدی جملوں کے بعد منٹو کی مختلف تحریروں کے اقتباسات کو جوڑ کر اس کی شخصی زندگی کے علاوہ نظریہ ادب اور فن پر کیے گئے منٹوانہ مباحث کو ایک عمدہ تسلسل کے ساتھ پیش کر کے خوب صورت سوانحی خاکہ مرتّب کر دیا گیا ہے۔ کتاب ۱۵۹ صفحات پر مشتمل ہے اور یہ منٹو کو ایک نئے انداز سے سمجھنے کی کوشش ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی برج پریمی اور جگدیش چندر ودھاون منٹو کی غالب پرستی کے حوالے سے اپنے مضامین میں اشارے دے چکے تھے خاص طور پر پرویز انجم نے تو پوری ایک کتاب ''منٹو غالب کا پرستار'' اور چند مضامین کے علاوہ منٹو کی غالب پر فلم کا مکمل جائزہ پیش کر کے کافی شہرت بھی حاصل کر لی ہے۔ تاہم ہر مصنف کا چیزوں کو پرکھنے اور لکھنے کا اپنا اپنا زاویہ نظر ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے شمس الحق عثمانی کی یہ کتاب روش عام سے ہٹ کر منٹو شناسی کا سنجیدہ روپ قرار دی جا سکتی ہے۔

''منٹو: حقیقت سے افسانے تک''، شمیم حنفی:

چار حصوں میں منقسم شمیم حنفی کی یہ کتاب نئے اور پرانے مضامین کے اجتماع کے ساتھ منٹو صدی کی مناسبت سے شہر زاد کراچی نے ۲۰۱۲ء میں شائع کی۔ پہلا حصہ ''دستاویز'' پانچ مضامین، منٹو اور فحاشی، منٹو ہتک کے حوالے سے، ہم زاد کی تلاش، منٹو تھیمز اور رام چندرن: ڈرائنگز پر مشتمل ہے۔ یہ پانچوں مضامین مصنف کی ۱۹۸۳ء میں شائع ہونے والی کتاب ''کہانی کے پانچ رنگ''

کے علاوہ بلراج مینرا کی ادارات میں نکلنے والے رسالے ''شعور'' کی مختلف اشاعتوں کا بھی حصہ رہے۔ اس حصے میں شامل پہلے مضمون میں مصنف نے فحاشی کے متعلق بین الاقوامی قوانین اور نظریات کے تناظر میں منٹو پر لگائے گئے فحش نگاری کے الزام کا خوب صورت دفاع کیا ہے۔ اُنھوں نے منٹو کے قارئین پر یہ شرط عائد کی ہے کہ منٹو کے بارے میں کسی با معنی گفتگو کا ارادہ کرنے سے پہلے ان تقاضوں کو سمجھیں جنھیں افسانوں سے الگ کسی بھی فکری، اخلاقی یا جذباتی سطح پر سمجھنا ممکن نہیں۔ یہی وہ غلطی ہے جس کی بنا پر منٹو کو ملعون و مطعون قرار دینے والوں میں مولوی اور منصف، صحت مند خیالات کی اشاعت کو ادب کا نصب العین سمجھنے والے مدیران رسائل اور مملکت خداداد کے سماجی مصلح اور معمار علامہ تاجور نجیب آبادی اور وارث علامہ محمد اقبال جناب چوہدری محمد حسین کے علاوہ ترقی پسند نقاد تک سب کے سب ایک ساتھ صف آرا دکھائی دیتے ہیں۔ چناں چہ ایک طرف منٹو سے ایسے ادب کی تخلیق کا مطالبہ کیا جاتا ہے جو قرآن کی تعلیمات کے عین مطابق ہو اور جسے مسجد یا مدرسے میں باجماعت اصلاح اخلاق کے لیے پڑھا جا سکے تو دوسری طرف حسن عسکری کی قربت کو منٹو کا مسلمانہ رنگ قرار دے کر معتوب کیا گیا۔ اس ضمن میں مصنف لکھتے ہیں:

''یہ بات تو منٹو کے حاشیہ خیال میں بھی نہ آئی ہو گی کہ اس کا کوئی افسانہ جمعہ کی نماز کا خطبہ بن سکتا ہے۔''[۱۱۲]

منٹو کے موضوعات، اسلوب اور کردار نگاری کو سراہتے ہوئے اُنھوں نے لکھا کہ منٹو نے اپنے اسلوب پر کسی خارجی آرائش کا غلاف چڑھانے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ وہ اپنے کرداروں کے باطن تک اپنے تمام تر حواس کی مدد سے پہنچتا تھا اور ان کرداروں کی پہچان کے لیے بھی اُنھوں نے خارجی یا ذہنی عمل کی بجائے ان کے مجموعی نظام احساس کی سطح کا انتخاب کیا۔ یہی وجہ ہے کہ:

''تن تنہا منٹو نے اُردو افسانے کو جتنے زندہ اور متحرک کرداروں سے متعارف کرایا ہے شاید اُردو کے تمام افسانہ نگار مل بھی یہ بار نہ اٹھا سکتے۔''[۱۱۳]

منٹو کے خاص طور پر ایسے معترضین جو اسے فحش نگار کہتے رہے، کی آرا کو وہ ان کی ادب ناشناسی تعبیر کرتے ہیں، جو اپنے ذاتی نظریات کی ترویج کا مطالبہ منٹو سے پورا کرانے کے خواہشمند تھے، لیکن منٹو ان کے دام میں بھی نہ آیا۔

دوسرے مضمون میں مصنف نے منٹو کے شہرہ آفاق افسانے ''ہتک'' اور اس کے مرکزی کردار سوگندھی کو آفاقی افسانہ اور کردار قرار دیا۔ ''ہم زاد کی تلاش'' دراصل لیزلی فلیمنگ کی کتاب "Another lonely Voice" پر تبصرہ ہے۔ جس میں اُنھوں نے لیزلی فلیمنگ کی بہت سی آرا سے اختلاف کرتے ہوئے کتاب میں موجود غلط فہمیوں کو رفع کیا۔ ایک اقتباس دیکھیے:

''منٹو کے مختلف ادوار کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ مصنفہ نے منٹو کی کہانیوں کے اقسام کا تعین جس شکل میں کیا ہے اور ان کی درجہ بندی کی جو دلیل قائم کی ہے وہ مضحک بھی ہے اور مہمل بھی۔''[۱۱۴]

شمیم حنفی نے لیزلی فلیمنگ کی اس کتاب کو مصنفہ کے غلط اور ناقص تجزیوں، غیر معتبر ماخذات اور منٹو کے ذہنی اور تخلیقی ماحول اور روایت پر گرفت کی کمزوری کے طفیل، غلط اور دور از کار نتائج کا حامل قرار دیا۔

کتاب میں شامل چوتھا مضمون اپنے زمانے کے معروف مصور رام چندرن کی مصورانہ صلاحیتوں کا خوب صورت قصیدہ ہے۔ رام چندرن کے فن مصوری کی مجموعی تحسین کے بعد مصنف نے اُن ڈرائنگز کو جو منٹو کے معتوب افسانوں پر بنائی گئیں، اسطور کی از سر

نو تخلیق کہا جن کا ظہور منٹو کی کہانیوں میں ہوا ہے۔ مصنف کے بقول رام چندرن نے اپنے جذباتی اندوہ واضطراب اور تہذیبی ادراک کا اظہار کھول دو، ٹھنڈا گوشت اور بو کے خاکوں میں بہت کامیابی سے کیا ہے۔ اگرچہ اے رام چندرن کی بنائی گئی نصف درجن کے قریب ڈرائنگز کے شامل کتاب ہونے کا دعویٰ کتاب میں شامل پیش لفظ میں کیا گیا ہے۔ اور جس کے آخر میں مصنف کی بجائے سعادت حسن منٹو کے دستخط موجود ہیں۔ لیکن منٹو کی ایک تصویر کے علاوہ صرف تین افسانوں، ٹھنڈا گوشت، دھواں اور اوپر نیچے اور درمیان کے عکس ہی شامل ہیں۔

کتاب کا دوسرا حصہ بعنوان ''منٹو: اپنے دفاع میں '' پانچ تحریروں پر مشتمل ہے۔ ان میں سفید جھوٹ، افسانہ نگار اور جنسی مسائل، کسوٹی اور عصمت فروشی، ایسے مضامین ہیں جن میں منٹو اپنے اوپر لگنے والے فحاشی کے الزامات کے ساتھ ساتھ، جنسی مسائل، ادب میں فحاشی کا تصور اور اپنا نظریہ ادب کھل کر بیان کر رہے ہیں۔ جب کہ پانچواں مضمون ''ہائی کورٹ جج منٹ'' منٹو کے افسانے ٹھنڈا گوشت پر چلنے والے مقدمہ کا تفصیلی فیصلہ ہے جو چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ محمد منیر نے تحریر کیا تھا۔ جس کے مطابق تمام ملزمان کو تین سو روپے جرمانہ کی سزا سنائی گئی تھی۔ یہ فیصلہ انگریزی زبان میں تحریر کیا گیا تھا جسے فاضل مصنف نے اُردو کے قالب میں ڈھال کر پہلی مرتبہ شائع کرنے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔

تیرے حصے بعنوان ''مباحث'' میں دو مضامین تقسیم کا ادب اور تشدد کی شعریات، ادب میں انسان دوستی کا تصور: ایک سیاہ حاشیے کے ساتھ، شامل ہیں۔ پہلے مضمون میں تقسیم ہندوستان اور قیام پاکستان کے نتیجے میں برپا ہونے والے فسادات کے نتیجے میں اردو ادب خصوصاً شاعری اور فکشن پر پڑنے والے اثرات کا تفصیلی جائزہ بہت عمدہ ہے۔ اس سے ملحق دوسرا مضمون ''ادب میں انسان دوستی کا تصور: ایک سیاہ حاشیے کے ساتھ'' میں اپنے عہد کے سیاق میں انسان دوستی کے مضمرات کے ساتھ ساتھ ادب میں انسان دوستی کے تصور کا جائزہ لیا گیا ہے۔ خاص طور پر تقسیم کے ادب میں موجود اس تصور کو اُنھوں نے اپنے مطالعہ کی بنیاد بنایا ہے۔ بقول مصنف تقسیم کے المیے کا اثر ہر عام اور خاص پر پڑ رہا تھا۔ خود منٹو بھی اس کی زد میں آئے تھے۔ اس المیے کا بنیادی تقاضا یہ تھا کہ سیدھی سادی عام انسانی سطح پر اس کے بخشے ہوئے درد کا ادراک کیا جاتا لیکن زیادہ تر افسانے عجلت میں لکھے گئے اور ان میں تخلیقی سطح پر کسی گہرے ردعمل سے زیادہ اظہار ایسے جذبوں کا ہوا جو ہنگامی اور صحافیانہ نوعیت کے حامل تھے۔ منٹو کو اس جم غفیر سے الگ ایک منفرد نقطہ نظر کا حامل افسانہ نگار قرار دیتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

> ''منٹو اور اس کے ہم عصروں کی کہانیاں ایک ساتھ سامنے رکھی جائیں تو ان کا فرق اور منٹو کا امتیاز سمجھ میں آتا ہے۔ اپنے معاصرین کے برعکس منٹو نے فارمولا کہانی لکھنے سے گریز کیا۔'' [۱۱۵]

''اختتامیہ'' کتاب کا چوتھا اور آخری حصہ ہے جس میں تین مضامین ''منٹو کے زمان و مکان'' ''منٹو: حقیقت سے افسانے تک'' کے علاوہ ''منٹو اور نیا افسانہ'' شامل ہیں۔

منٹو کے زمان و مکان میں، مصنف نے منٹو کو ایسا ادیب قرار دیا ہے جو فکری اور فنی لحاظ سے زمان و مکان کی قید سے ماورا ہے۔ اس کی کہانیاں آج بھی ہمارے سماج اور اس سے جڑے مسائل کی ترجمان ہیں۔ ان کے افسانوں میں تاریخ کے بیر ئر کو توڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ افسانے کسی خاص ملک، قوم، مسلک و مذہب، سیاسی اور معاشرتی صورتحال سے زیادہ انسانی ذہن اور ضمیر کو دیمک کی

طرح چاٹتی ہوئی تنگ نظری اور تعصب، تشدد اور بہیمیت، سنگ دلی اور جنسی، اقتصادی، معاشرتی استحصال اور حرص و طلب کے افسانے بھی ہیں۔اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

"بہر حال، تقسیم کے پس منظر میں ہمارے یہاں جو فکشن سامنے آیا،اس کا سب سے قیمتی اور لازوال حصہ منٹو کے افسانے ہیں۔"[۱۱۶]

"منٹو حقیقت سے افسانے تک" جواس کتاب کا عنوان بھی ہے،میں مصنف نے سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن کو ایک دوسرے کا لازمی عنصر قرار دیا جب کہ کتاب کے آخری مضمون منٹو اور نیا افسانہ" میں جدید افسانوی رویوں کے تناظر میں سعادت حسن منٹو کی اہمیت اور انفرادیت کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ شمیم حنفی کی یہ کتاب مجموعی طور پر ۲۹۴ صفحات پر محیط ہے۔

"سعادت حسن منٹو،ذاتی یادداشتوں پر مبنی اوراق"،ابوالحسن نغمی:

ابوالحسن نغمی کا شمار منٹو کے ایسے دوستوں میں ہوتا ہے جو عمر میں تو منٹو سے اچھے خاصے چھوٹے تھے مگر منٹو کی قربت میں اُنھوں نے اچھا خاصا وقت گزارا اور منٹو کے اندرون و بیرون سے اچھی طرح واقف تھے۔ زیر مطالعہ کتاب منٹو سے مصنف کی ان ملاقاتوں کا تذکرہ ہے جو زندگی کے آخری تین برسوں میں مصنف اور منٹو کے درمیان ہوئیں۔ اگرچہ کہ مصنف نے منٹو کی شخصیت کے متعلق چبائے ہوئے لقموں سے گریز کا دعویٰ کیا ہے لیکن اس کے باوجود منٹو کی شخصیت کا کوئی نادر پہلو ہمارے سامنے نہیں آیا۔ منٹو کی شخصیت سے آگاہی رکھنے والے لوگوں کے ذہن میں منٹو کا جو تصور موجود ہے زیر مطالعہ کتاب بھی عمومی طور پر وہی پرانا تاثر ہی چھوڑتی ہے۔ یہ بات اپنی جگہ الگ اہمیت کی حامل ہے کہ ابوالحسن نغمی نے ۵۷ برس کے طویل دورانیے میں منٹو کو جب جب یاد کیا اسے اپنی ڈائری میں محفوظ کر لیا۔ لیکن یہ سعادت صرف منٹو ہی کے حصے میں نہیں آئی بلکہ روزانہ کی بنیاد پر ڈائری لکھنا مصنف کی جبلتوں میں سے ایک جبلت تھی۔ لیکن کتاب کا مطالعہ کرتے وقت مصنف کے پر خلوص طرز تحریر کو دیکھ کر اس بات کا معترف ہونا پڑتا ہے کہ اُنھوں نے ۵۷ برس منٹو کو سینت سینت کر رکھا۔ چھوٹی چھوٹی یادوں کی ایک بکھری ہوئی دنیا ہے جس میں منٹو کی زندگی کے مختلف روپ جمع ہیں۔ منٹو کی شیخیاں، بے ساختگی، بذلہ سنجی، شراب نوشی، بیماری، معاشی تنگ دستی، منٹو کی نجی زندگی، خودکشی کی کوشش وغیرہ وغیرہ۔ اگرچہ کہ اس سب کی مصنف نے تفصیل نہیں بتائی بلکہ صرف جھلکیاں ہی دکھائی ہیں۔ چوں کہ منٹو کی شخصیت پر خاطر خواہ لکھا جا چکا ہے اس لیے مصنف کی یہ چھوٹی چھوٹی یادیں قاری کے حافظے سے ان تفصیلات کو باہر نکال لاتی ہیں جو اندر کہیں لاشعور میں محفوظ تھیں۔ تشنگی کا احساس اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مصنف ایسے واقعات کا ذکر کرتے ہیں جو شاذونادر ہی اس سے پہلے بیان ہوئے۔ کاش وہ ان واقعات کی تفصیل بھی بیان کر دیتے۔ مثلاً یہ واقعہ جب مولانا ظفر علی خان کی ۸۱ ویں سالگرہ کی تقریب منا کر اردو کے اس وقت کے معروف ادیبوں اور شاعروں کا اجتماع، جن میں بہت سے منٹو کے قریبی دوست بھی شامل تھے، کرم آباد سے واپس لاہور آ رہا تھا تو گوجراں والا کے مقام پر ریڈیو سے منٹو کے انتقال کی خبر نشر ہوئی۔ المیہ یہ نہیں کہ منٹو مر گیا، المیہ یہ تھا کہ بس میں سوار لاہور کے تمام ادیبوں و شاعروں کو اس خبر نے ایک لمحے کے لیے بھی افسردہ نہ کیا اور جیسے ہی بس روانہ ہوئی ایک فحش طرحی مشاعرہ شروع ہو گیا جس میں سوائے منیر نیازی کے سب نے شرکت کی۔ منٹو کے عزیز ترین دوست شاد امرت سری مشاعرے میں سب سے پیش پیش تھے۔
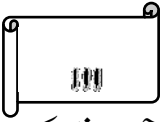
پانچ دن بعد حلقہ ارباب ذوق کے تعزیتی اجلاس میں انھی شاد امرت سری صاحب نے اپنے دوست سعادت حسن منٹو کے بارے میں تعزیتی نظم سنائی۔ اس انسانی المیہ سے بھی بُرا انکشاف مصنف نے یہ کیا کہ :

''یہ وہی شاد صاحب ہیں جنھوں نے متعدد مرتبہ لاہور کے ریگل چوک پر کالج کے طلبہ اور دیگر راہ گیروں کو جمع کر کے منٹو صاحب سے بھیک منگوائی۔''[۱۱۷]

اپنے اس دعویٰ کے استفسار کے لیے وہ بطور ثبوت یوں رقم طراز ہیں :

''میرے مرحوم استاد، ڈاکٹر وحید قریشی (اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی) نے مجھے وصیت کی ہے اور مجھ سے کہا ہے ''آپ میرا نام ظاہر کر دیں اور صاف صاف لکھیں کہ شاد امرت سری، منٹو سے لاہور کے ریگل چوک میں شام کے وقت بھیک منگواتے تھے۔''[۱۱۸]

اسی طرح جی ایم اثر کی دوستی کو بھی وہ مفاد پرستی پر محمول کرتے ہوئے کم و بیش یہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اگر منٹو شراب نہ پیتے تو جی ایم اثر شاید اُن سے ملنا بھی گوارا نہ کرتے۔ مصنف ایک جملے میں ان کی ساری شخصیت ہمارے سامنے عیاں کر دیتے ہیں کہ :

''کاش وہ منٹو کے پڑوسی نہ ہوتے۔''[۱۱۹]

یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ منٹو غالب کے پرستار تھے۔ ان کی تحریریں، کتابوں اور مضامین کے عنوانات منٹو کی غالب پر تحریر کردہ فلم، گویا منٹو کی غالب سے محبت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ لیکن اس پسندیدگی کی معراج اگر کسی نے دکھائی ہے تو وہ مصنف ہیں، لکھتے ہیں :

''منٹو صاحب کو غالب سے شدید جذباتی وابستگی تھی۔ اُنھیں غالب پر کبھی کبھی اس قدر پیار آتا تھا کہ وہ فرطِ محبت سے اسے گالیاں دیا کرتے تھے۔ یوں سمجھئے کہ بس یہ شدید ترین تعلق خاطر کی انتہا تھی۔''[۱۲۰]

منٹو کے سوانح نگار اور محققین اگرچہ بہت سے پوشیدہ گوشے تلاش کر چکے ہیں لیکن مصنف نے ان تمام محققین اور سوانح نگاروں کے آگے ایک سوالیہ نشان کھڑا کر دیا ہے کہ منٹو کچھ دن نواب مظفر علی قزلباش کے اخبار ''منشور'' میں باقاعدہ ملازم رہے اور باقاعدگی کے ساتھ کالم لکھتے رہے۔ منٹو کے ایک گمشدہ افسانے ''گھس کھدا'' کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف کا یہ دعویٰ ہے کہ اُنھوں نے خود ترقی پسند تحریک کے اجلاس میں اسے منٹو صاحب کی زبانی پڑھتے سنا :

''میں نے گھس کھدا'' کے عنوان سے منٹو صاحب کے اس افسانے کو مطبوعہ صورت میں نہ تو کسی رسالے میں دیکھا اور نہ ان کے افسانوں کے کسی مجموعے میں نظر سے گزرا۔''[۱۲۱]

تمام احباب و ادارے جو منٹو کے مدون ہونے کا شرف رکھتے ہیں اُنھیں افسانے گھس کھدا اور منشور میں لکھے گئے کالم ضرور تلاش کرنے چاہیں۔ ۷۵ برس پر مشتمل یادیں کسی مربوط قصے، کہانی یا مضمون کی صورت میں لکھنا ممکن ہی نہ تھا۔ لہٰذا اس کتاب میں بھی بہت سے مقامات پر بے ربطی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ پھر مصنف نے ڈائری سے اُن لکھی ہوئی یادوں کو دریافت تو کر لیا لیکن ان یادوں کا پیچھا نہیں کیا۔ اگر ایسا کیا جاتا تو آج منٹو کے بہت سے دوست نما دشمن اپنے اپنے ناموں کے ساتھ ہمارے سامنے ہوتے۔ منٹو
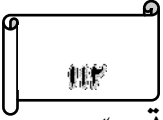
صدی کے موقع یعنی ۲۰۱۲ء میں سنگ میل پبلی کیشنز کی شائع کردہ یہ کتاب منٹو کی سوانح نگاری کے باب میں ایک اشاراتی ہی سہی عمدہ نمونہ ہے۔ جس میں منٹو کی ہستی کے بہت سے پہلو سامنے لائے گئے ہیں۔

''ہمارے لیے منٹو صاحب''، شمس الرحمٰن فاروقی:

شہرزاد، کراچی سے ۲۰۱۳ء، میں شائع ہونے والی شمس الرحمٰن فاروقی کی اس تصنیف کا محرک اشعر نجمی کے آٹھ سوالات ہیں جو اُنھوں نے منٹو پر ایک نئی بحث کے آغاز کے لیے ناقدین کے آگے رکھے۔ ان سوالات کے نتیجے میں منٹو کے فکر و فن پر موجودہ عہد کے تنقید نگاروں نے گفتگو کا آغاز کر دیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کے علاوہ محمد حمید شاہد نے بھی ان سوالات اور شمس الرحمٰن فاروقی کے اعتراضات و اعترافات پر ''سعادت حسن منٹو۔ جادوئی حقیقت نگاری اور آج کا اردو افسانہ'' کے عنوان سے کتاب لکھی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اشعر نجمی کو مراسلہ نما مضمون میں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ منٹو کو محض جنسی مضامین اور فحاشی پر مبنی تحریروں تک محدود سمجھنا منٹو کے ساتھ بددیانتی اور ناانصافی ہے۔ بددیانتی اس لیے کہ اُنھیں جنس اور فحاشی تک محدود کر کے ہم منٹو کے ان ہزاروں صفحات کے وجود سے انکار کرتے ہیں جن میں جنس وغیرہ کچھ بھی نہیں۔ منٹو کو چند مخصوص یا معتوب موضوعات تک محدود کرنے کی روش کو مسترد کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

> ''یہ منٹو کی بدقسمتی اور ہماری تنقید کا شرمناک عجز ہے کہ ہم منٹو کو صرف جنس نگار سمجھیں۔ یہ ہماری تنقید کی بدنصیبی اور ہمارے پڑھنے والوں کے ساتھ ظلم عظیم ہے کہ ''رنڈیوں کا افسانہ نگار'' اور فحشیات کا ماہر'' یا بہت سے بہت ''فسادات کے موضوع پر چند شاق انگیز افسانوں کا مصنف'' کہہ کر ٹال دیا جائے۔'' [۱۲۲]

مصنف کے خیال میں اس طرح کے مطالعہ سے منٹو کا تو کچھ نہیں بگڑا کہ منٹو آج پہلے کی نسبت زیادہ پسند کیا جا رہا ہے۔ منٹو کی خود پسندی، انانیت اور مشہور ہونے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے اختیار کرنے کے سوال کو شمس الرحمٰن فاروقی نے رد کرتے ہوئے کہا کہ ادبی تنقید میں ایسا کوئی اصول نہیں جس کی رو سے ہم کہہ سکیں کہ اگر کسی فنکار کی شخصیت میں سقم ہیں تو وہ بہت خراب فنکار بھی ہے۔ اگر ہم منٹو کو شخصی طور پر خرابیوں میں لتھڑا ہوا شخص تسلیم کر لیں تو بھی اُس کے فن کے متعلق کسی تشویش میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔

اشعر نجمی کے ایک سوال کے جواب میں جس میں اُنھوں نے منٹو کے بعض مضامین کو خیال و فکر کی گہرائی سے عاری قرار دیا، شمس الرحمٰن فاروقی نے موقف اختیار کیا کہ منٹو کے دیگر مضامین کی طرح ''تحدید اسلحہ'' بظاہر ہلکا پھلکا طنزیہ مضمون لگتا ہے۔ مگر اس میں بعض باتیں بہت عقل مندی کی ہیں۔ یہ مضمون دراصل جنگ کے خلاف ہے۔ اور ان حکومتوں کا مذاق اڑاتا ہے جو اپنے لیے تو اسلحہ کے انبار لگانا ضروری سمجھتے ہیں لیکن دوسروں کو نہتا چھوڑنا چاہتے ہیں۔ منٹو کے ''مضمون گناہ کی بیٹیاں'' اور ''گناہ کے باپ'' کو بھی مصنف کئی طرح کی ادبی، لسانی پھلجھڑیوں اور سماجی بصیرتوں سے منور مضامین قرار دیتے ہیں۔

چچا سام کے نام لکھے گئے منٹو کے خطوط کو اشعر نجمی نے لچر اور جذبہ خود نمائی کا اظہار قرار دیتے ہوئے منٹو کو مصلح قوم اور لیڈر کے رنگ میں پیش کرنے کی اوچھی حرکت کا مرتکب شخص قرار دیا۔ جس کے جواب میں شمس الرحمٰن فاروقی رقم طراز ہیں:

''میرا خیال ہے کہ منٹو کی اکثر تحریروں کی طرح ان خطوط کو بھی توجہ سے پڑھا نہیں گیا۔ ورنہ یہ ہمارے زمانے کے سیاسی وسماجی موضوعات پرانتہائی بیدار مغزاور زندہ تحریریں ہیں۔''[۱۲۳]

اشعر نجمی کو منٹو کی تحریروں میں تحسین و ستائش کی تمنا، خود پسندی کا جذبہ، خود نمائی کا رجحان اور فکر کی گہرائی کا جو فقدان دکھائی دیا، مصنف نے اُنھیں عیوب ماننے سے انکار کرتے ہوئے سوال کنندہ کو یوں مخاطب کیا:

''کیا تم دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہو کہ غالب کو ستائش کی تمنا یا صلے کی پروا نہیں تھی؟ خود پسندی، انانیت، تحسین کی تمنا، خود نمائی، اپنی بات لوگوں تک پہنچانے کا شوق، کہ لوگوں کو پتہ لگے کہ ہم بھی کچھ سوچتے اور کہتے ہیں، اس میں کیا برائی ہے؟''[۱۲۴]

شمس الرحمٰن فاروقی نے میر تقی میر کے بعد منٹو کو واحد ادیب قرار دیا جس کے یہاں زندگی کی رنگارنگی، دکھ درد، وجد و شوق، غم اور مسرت، انسانی وجود کا احترام اور اس کی کمزوریوں کا احساس تخلیقی سطح پر ملتا ہے۔ ساتھ ہی وہ منٹو کے افسانوں میں موجود سنسنی خیزی کے رجحان کو ذاتی طور پر ناپسند کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ممتاز شیریں کی منٹو کے سنسنی خیز افسانوں کے متعلق دی گئی آرا پر اعتراض کرتے ہوئے مصنف کا خیال ہے کہ موصوفہ منٹو کی محبت میں اس قدر غیر متوازن ہوئیں کہ نقاد کی بجائے ایک جوشیلی وکیل بن گئیں:

''ممتاز شیریں مرحومہ میں ایک عادت تھی کہ وہ جگہ بے جگہ بڑے بڑے نام لے کر اپنی علمیت کا سکہ بٹھا دیتی تھیں۔ لیکن وہ ان لوگوں کے بارے میں ہمیں کچھ بتاتی نہیں تھیں۔ ہم صرف مرعوب ہو کر رہ جاتے ہیں۔''[۱۲۵]

ممتاز شیریں کے علاوہ محمد حسن عسکری اور وارث علوی پر بھی مصنف نے یہی الزام دہرایا۔ سرکنڈوں کے پیچھے اور پڑھیے کلمہ کا موضوع اگرچہ سنسنی خیزی سے خالی نہیں۔ مگر مصنف ''پڑھیے کلمہ'' کو فسادات کے موضوع پر منٹو کا سب سے کامیاب افسانہ گردانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ 'ٹھنڈا گوشت' اور ''کھول دو'' کے زور میں ہم منٹو کے اس افسانے کے ساتھ انصاف نہ کر سکے۔ یہی صورت ''بادشاہت کا خاتمہ'' کے معاملے میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ منٹو کے شہرہ آفاق افسانوں، 'ٹھنڈا گوشت' کھول دو، اور بو کو مصنف نے فکری اور فنی لحاظ سے یکسر رد کرتے ہوئے بحث سے پہلے ہی نتیجہ سنا دیا کہ:

''میں یہ بات فوراً ہی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ''بو'' میرے خیال میں کوئی عظیم افسانہ نہیں۔''[۱۲۶]

مصنف نے ممتاز شیریں، وارث علوی اور شمس الحق عثمانی کو منٹو کے مداحین قرار دیتے ہوئے ان فسانوں پر کی گئی اُن تینوں کی تنقید کو لایعنی قرار دیتے ہوئے اسے منٹو کی خوش نصیبی سے تعبیر کیا کہ ان کے اتنے اوسط درجے کے افسانے کو اس قدر اہمیت اور شہرت ملی۔ منٹو کے افسانے 'بو' کی طرح مصنف ''ٹھنڈا گوشت'' کو بھی جلد بازی میں لکھا گیا بالکل ناکام افسانہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر ''بو'' اوسط درجے کا افسانہ ہے تو ''ٹھنڈا گوشت'' اوسط سے فروتر ہے۔''[۱۲۷]

منٹو کے افسانے ''کھول دو'' کو ناکام ثابت کرنے کے لیے مصنف نے جس طرح کے پست اور سطحی دلائل کا سہارا لیا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔
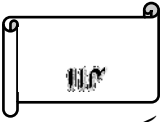
گفتار یازدہم میں ''سیاہ حاشیے'' کو اپنا موضوع بناتے ہوئے منٹو کے فن اور حسن عسکری کے دیباچے پر بحث کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

> ''عسکری صاحب اور منٹو صاحب انسان سے مایوس نہیں تھے اور ''سیاہ حاشیے' بہت بڑی کتاب ہے۔ لیکن ایسی دو چار کتابیں میں اور پڑھ لوں تو مجھے زندگی سے نفرت ہو جائے۔''[۱۲۸]

منٹو کے افسانوں، فرشتے، پھندنے اور باردہ شمالی کو وہ ایسے افسانے قرار دیتے ہیں جن پر منٹو کے بیشتر ناقدین نے توجہ نہیں کی۔ فرشتہ کو ایک تجریدی افسانہ قرار دیتے ہوئے اسے منٹو کی جادوئی حقیقت نگاری کا حامل قرار دیتے ہیں۔ مصنف نے دانشور کی مدیر عفت انیس کے اس مضمون کو سراہا جس میں اُنھوں نے منٹو کے ان افسانوں کو ایک دوسرے کی توسیعی شکل قرار دیتے ہوئے ان کے درمیان موجود معنوی ربط کی طرف اشارے کیے۔ اس طرح لیزلی فلیمنگ بھی منٹو کی ایسی نقاد ہیں جو ان تین افسانوں خصوصاً ''باردہ شمالی'' کے متعلق سنجیدہ گفتگو کرتی دکھائی دیں۔ ان کے علاوہ منٹو کے نقاد بشمول جگدیش چندر ودھاون، ممتاز شیریں، وارث علوی، اور انیس ناگی کے ساتھ ساتھ خود محمد حسن عسکری بھی منٹو کی ان تینوں کہانیوں کے ساتھ انصاف نہ کر سکے۔ کتاب کے آخر میں مصنف منٹو کی تخلیقی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہم عسکری کے ممنون ہیں کہ اُنھوں نے ہمیں منٹو کے بارے میں بہت سی بصیرتیں سجھائیں۔ لیکن ہمارے ادب میں منٹو پہلا آدمی ہے جسے کسی نقاد کی ضرورت نہیں، خواہ وہ نقاد شمس الرحمٰن فاروقی ہی کیوں نہ ہو۔''[۱۲۹]

اثبات کے اشعر نجمی کے سوالات کے جواب میں لکھا گیا یہ خط ۱۱۳ صفحات کی کتابی صورت میں ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔

''سعادت حسن منٹو: جادوئی حقیقت نگاری اور آج کا افسانہ''، محمد حمید شاہد:

محمد حمید شاہد کی یہ تصنیف اشعر نجمی کے ناقدین کو لکھے گئے اُن سوالات کے جواب میں شروع ہونے والے مکالمے کی دوسری کڑی ہے۔ جو اُنھوں نے سعادت حسن منٹو کے فن کے متعلق پوچھے تھے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس سے قبل اشعر نجمی کے ان سوالات کا طویل مکتوب کی صورت میں جواب لکھا تھا۔ جسے شہرزاد کراچی سے آصف فرخی نے ۲۰۱۳ء میں کتابی شکل دے کر اس مکالمے کو عام کرنے کی طرف پہلا عملی قدم اٹھایا۔ زیر تبصرہ کتاب دراصل شمس الرحمٰن فاروقی کی سعادت حسن منٹو کے فن پر کی گئی تنقید پر تنقید ہے۔ اس کتاب میں اُنھوں نے شمس الرحمٰن فاروقی کے منٹو کی تحریروں پر کیے گئے اعتراضات کا بالکل انھی کے انداز نگارش میں جواب دیا ہے۔ کہیں کہیں مصنف، شمس الرحمٰن فاروقی کی آرا سے متفق بھی دکھائی دیے مگر زیادہ تر اختلاف کی صورتیں ہی سامنے آئی ہیں۔ گویا حمید شاہد کی یہ کتاب شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب پر لکھا گیا اختلافی نوٹ کہی جا سکتی ہے۔ اُن کی یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں مصنف کے دیباچے ''پہلی بات'' کے علاوہ چوبیس مختصر اور قدرے غیر مختصر عنوانات کے تحت کیے گئے تبصروں میں دراصل شمس الرحمٰن فاروقی کے اعتراضات کی روشنی میں مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مکتوب کی صورت میں کیے گئے اس مکالمے کا پہلا خط ''ہمارے منٹو صاحب'' کے عنوان سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے۔ کہ مصنف کا منشا کیا ہے۔ منٹو کے افسانہ کھول دو، پر فاروقی صاحب کے باریک اعتراضات اور ''لوسا/لیوسا'' کی بحث کے بعد اُنھوں نے ''ٹھنڈا گوشت'' کو منٹو کے سیاسی شعور اور انسانی نفسیات اور توفیقات کا سلیقہ مند اظہار قرار دیا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی کتاب میں ''ٹھنڈا گوشت'' سمیت منٹو کے بیشتر

کامیاب افسانوں کو ناکام افسانے قرار دیتے ہوئے۔ نسبتاً ناکام اور غیر معروف افسانوں کی تعریفوں کے پل باندھے تھے۔ مصنف نے شمس الرحمٰن فاروقی کی اس رائے سے اختلاف کیا جس میں اُنھوں نے میر تقی میر کے بعد سعادت حسن منٹو کو زندگی کی رنگارنگی، دکھ درد، وجد و شوق، غم و مسرت اور انسانی وجود کا احترام اور اس کی کمزوریوں کا احساس رکھنے والا ادیب قرار دیا تھا۔ مصنف نے فاروقی صاحب کی تحریر کے اقتباسات کے ذریعے اُن کے مراسلے میں موجود تضادات کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا کہ :

''مان لیجئے کہ دونوں کی کائنات الگ الگ ہے اور آپس میں مقابلہ یا موازنہ بنتا ہی نہیں ہے۔'' [۱۳۰]

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی کتاب ''ہمارے لیے منٹو صاحب'' میں منٹو کے افسانوں ''بو''، ''ٹھنڈا گوشت''، ''دھواں''، ''سرکنڈوں کے پیچھے'' اور ''کھول دو'' وغیرہ کو یک جنبش قلم مسترد کرتے ہوئے ''موذیل'' بابو گوپی ناتھ، ہتک، جانکی، بادشاہت کا خاتمہ، میرا نام رادھا ہے، پھندنے، خوشیا، نیا قانون، شاردا، کالی شلوار، اور لیتکا رانی کو منٹو کے شاہکار افسانے قرار دیا تھا۔ مصنف سرکنڈوں کے پیچھے، قیمے کی بجائے بوٹیاں اور ننگی آوازیں کی حد تک شمس الرحمٰن فاروقی کی رائے سے متفق ہیں کہ منٹو کے یہ افسانے پڑھ کر ''لاحول والا قوۃ'' پڑھنے کو دل کرتا ہے۔ لیکن اُنھیں اعتراض یہ ہے کہ آخر مصنف نے اپنی گفتگو کا موضوع منٹو کی ناکام کہانیوں ہی کو کیوں بنایا اور کیا وجہ ہے کہ ان ناکام اور پھسپھسے افسانوں میں سے کسی ایک کو وہ اپنے موضوع کے لحاظ سے شاہکار بھی قرار دے دیتے ہیں۔ مثلاً پڑھیے کلمہ، کو فاروقی صاحب نے فسادات کے متعلق منٹو کا سب سے بہترین افسانہ قرار دیا۔ حمید شاہد کے بقول:

''فسادات کے زمانہ میں فسادات سے کٹی ہوئی کہانی کا موازنہ کھول دو، اور ٹھنڈا گوشت سے بنتا ہی نہیں ہے۔'' [۱۳۱]

منٹو کے افسانے ''بو'' کو شمس الرحمٰن فاروقی اوسط درجے کا افسانہ قرار دے چکے ہیں۔ اور رشک کر چکے ہیں کہ منٹو کے اس اوسط درجے کے افسانے کو اتنی مقبولیت ملنا اُن کی خوش نصیبی ہے۔ حمید شاہد اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ فاروقی صاحب نے اس اوسط درجے کے افسانے پر اپنی کتاب کے نو صفحات صرف کر دیے۔ اتنی طوالت تو اُن تیرہ شاہکار کہانیوں کا مقدر بھی نہیں بنی جس کی فہرست خود فاروقی صاحب نے درج کی تھی۔ بلکہ ان میں سے بعض افسانوں ٹوبہ ٹیک سنگھ، موذیل اور بابو گوپی ناتھ پر گفتگو ہی نہیں کی۔ حال آں کہ ان افسانوں کے بغیر سعادت حسن منٹو کے فن کی قدر و قیمت کا تعین کیسے ممکن ہے۔

کتاب کے اس پہلے حصے میں مصنف نے شمس الرحمٰن فاروقی کے اعتراضات پر اعتراضات کرتے ہوئے سوال اٹھایا کہ آخر فاروقی صاحب منٹو کے اہم افسانوں کو مسترد کر کے غیر اہم افسانوں کو گہرائی، بصیرت اور معنویت کا حامل قرار دینے پر ہی کیوں مصر ہیں؟ کتاب کے دوسرے حصے ''منٹو کچھ اور'' میں درج ذیل مضامین شامل ہیں۔ مہاجر منٹو! ایک شرمناک پھبتی، منٹو کا دن، منٹو کے دن، ٹوبہ ٹیک سنگھ، نئی پرانی تعبیریں، منٹو کی ننگی زبان، جادوئی حقیقت نگاری اور آج کا اُردو افسانہ، مہاجر منٹو، ریوتی سرن شرما کا مضمون ہے جو آصف فرخی کی مرتّبہ کتاب ''منٹو کا آدمی نامہ'' میں شائع ہوا۔ حمید شاہد ریوتی شرما کی مہاجر منٹو، کی اصطلاح سے شدید اختلاف کرتے ہوئے اسے تعصب پر مبنی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

''تنقید کے نام پر شدید تعصب اور نفرت کے اظہار اور لفظ مہاجر کو منٹو کے نام کے ساتھ یوں تکرار کے ساتھ لکھنا کہ ظلم سہنے اور بہت کچھ چھن جانے کی علامت ایک معصوم سا لفظ گالی کا تاثر دینے لگے، تنقید میں کیسے روا ہو جاتا ہے، میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔'' [۱۳۲]

پروفیسر صغیر افراہیم کی طرح حمید شاہد نے بھی ریوتی شرما کو منٹو کی تحریروں کے فنی نظام سے لاعلم شخص قرار دیتے ہوئے ان کے مضمون کو منٹو کی نیک نیتی پر شرمناک حملوں سے تعبیر کیا۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کے ضمن میں پروفیسر فتح محمد ملک کے نقطۂ نظر پر سنجیدہ بحث کی گئی ہے۔ آخری مضمون جو مصنف کی کتاب کا عنوان بھی بنا ''جادوئی حقیقت'' نگاری اور آج کا اُردو افسانہ'' آصف فرخی کے ۲۱ افسانوں کے اُس انتخاب کے ذکر سے شروع ہوتا ہے جو اُنھوں نے آکسفورڈ کے سلسلہ مطبوعات ''اردو افسانہ'' کی پہلی کتاب کی صورت میں سعادت حسن منٹو کی کہانیوں کی صورت میں کیا۔ مصنف کو ان افسانوں کی فہرست میں منٹو کا علامتی افسانہ ''فرشتہ'' دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس کڑے انتخاب میں ''فرشتہ'' کیوں کر شامل ہوا۔ جب کہ اس سے قبل کسی بھی مرتّب نے اس افسانے کو خاطر میں لانے کی ضرورت یا زحمت محسوس نہیں کی۔ مصنف نے منٹو کے اس افسانہ کو جدید افسانے کا نقطہ آغاز قرار دیا۔ ۱۶۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب شہرزاد کراچی سے ۲۰۱۳ء میں شائع ہوئی۔

''سعادت حسن مر گیا: منٹو نہیں مرا''، پرویز انجم:

مکتبہ جدید، لاہور سے ۲۰۱۵ء میں شائع ہونے والی پرویز انجم کی یہ کتاب بارہ مضامین کے ساتھ ۱۹۲ صفحات پر محیط ہے۔ ان بارہ مضامین میں منٹو کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کا پہلا مضمون ''سعادت حسن منٹو، خاندانی پس منظر'' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون میں منٹو اور اس کے خاندان کے سوانحی حالات کو پیش کیا گیا ہے۔ ۲۰۱۵ء میں شائع ہونے والی کتاب میں منٹو کا سوانحی خاکہ شامل کرنے کی ضرورت مصنف کو کیوں پڑی' جب کہ اس نوعیت کے بیسیوں مضامین اور تحقیقی مقالہ جات میں منٹو کی شخصیت اور سوانح کو کئی کئی بار درج کیا جا چکا ہے۔ دوسرا مضمون بعنوان ''منٹو اور جلیانوالہ باغ'' میں ۱۹۱۹ء میں رونما ہونے والے اس انسانی المیے اور منٹو کی شخصیت اور فن پر اس کے اثرات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مغربی ادب سے آگاہی و دلچسپی کا سبب باری علیگ کو اپنے مضمون ''مغربی تراجم اور طالب علم منٹو'' میں قرار دیتے ہیں جن کی صحبت میں اُنھوں نے عالمی ادبیات کا وسیع مطالعہ کیا۔ وہ روسی و فرانسیسی ادب سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ بعض رسائل کے روسی اور فرانسیسی ادب نمبر بھی شائع کیے۔ ''ویرا''، ''سرگزشت اسیر'' اور روسی افسانے کی کتابی شکل میں اشاعت منٹو کی روسی و فرانسیسی ادب سے دلچسپی اور ذہنی افتاد کا ابتدا ہی میں ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ایک اقتباس سے اس بات کی مزید وضاحت ہو جائے گی:

> ''سعادت حسن منٹو کے تراجم پر مشتمل رسائل کے خاص نمبر اہم دستاویزات ہیں۔ یہ رسائل اپنے عہد کے معتبر و معروف جریدے تھے۔ جن میں اُنھوں نے روسی اور فرانسیسی اور دوسری مغربی زبانوں کے ادب کا خاصہ حصہ اُردو میں جمع کیا اور یہ بات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ وہ روسی افسانوں کو اُردو میں منتقل کرنے والے اولین مترجمین میں سے تھے۔'' [۱۳۳]

منٹو کی بطور مترجم صلاحیتوں کا مصنف کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ منٹو نے ترجمہ نگاری کے بنیادی اصولوں کی مکمل پاسداری کرتے ہوئے ایک منجھے ہوئے مترجم کی طرح محنت اور لگن سے ترجمہ نگاری کی۔ ''منٹو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں'' اس مضمون میں منٹو کے زمانہ طالب علمی کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی جو روشن خیالی کا مظہر بن گئی تھی اور بہت سے مستقبل کے ادیب یہاں تعلیم و تدریس میں مشغول تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے منٹو کا اخراج اس مضمون کا مرکزی خیال

ہے۔ جب کہ اگلے مضمون ''منٹو کی بیگو'' میں منٹو کی دس عشقیہ کہانیوں سے پلاٹ کشید کر کے ایک خوبصورت رومانی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اگلے مضمون بعنوان ''انجمن ترقی پسند مصنفین کا آغاز اور منٹو'' میں سعادت حسن منٹو کی ترقی پسندی اور نام نہاد ترقی پسندوں کے درمیان پائے جانے والے تضادات پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ اگرچہ کہ دیگر مضامین کی طرح اس مضمون میں بھی کوئی نئی بحث یا نقطہ نہیں اٹھایا گیا لیکن پھر بھی مضمون دلچسپی سے خالی نہیں۔

ہفت روزہ، مصور'' کے ادبی اور فلمی میگزین سے شروع ہونے والے سفر کا آغاز اور فلم انڈسٹری پر منٹو کے راج کی کہانی ''ایک ایکٹرس اور منٹو کی آنکھ'' نامی مضمون میں بہت عمدگی سے بیان کی گئی ہے۔

دلی ریڈیو اسٹیشن سے منٹو کی بطور ڈراما رائٹر وابستگی کو اپنے مضمون ''دلی ریڈیو اسٹیشن اور ڈراما نگار منٹو'' میں مصنف نے پیش کیا ہے۔ منٹو ۱۵۰ روپے ماہوار پر ڈراما نویس مقرر ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دلی ریڈیو پر اُس وقت کے نامور ادیبوں کا جمگھٹا تھا۔ راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، ن۔ م راشد، اوپندر ناتھ اشک، میراجی، غلام عباس وغیرہ وغیرہ۔ آل انڈیا ریڈیو میں گزارے گئے منٹو کے اوقات کا بہترین اندازہ اوپندر ناتھ اشک کے مضمون ''منٹو میرا دشمن'' سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام تخلیقی کامیابیوں اور چپقلشوں اور طنز و مزاح سے بھرپور واقعات کا ذکر مصنف نے اپنے اس مضمون میں کیا ہے۔ منٹو کی بمبئی چھوڑ کر لاہور آمد وہ خطرناک موڑ ہے جس نے منٹو کو اس خطرناک حد تک پہنچا دیا جو اس کی قبل از وقت موت سے ملتی تھی۔ بمبئی اور لاہور کی زندگی کا فرق مصنف نے اپنے مضمون ''منٹو۔ بمبئی سے مراجعت'' میں بہت خوب صورتی سے کیا ہے۔ بمبئی میں اُنھوں نے بہت آسودہ زندگی گزاری، ریڈیو، اخبارات، فلم اور ادب کے میدان میں ان کا طوطی بولتا تھا مگر یہاں لاہور میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ بقول مصنف:

> ''شہرت، مقبولیت، گہما گہمی کی تیز دھوپ میں زندگی گزارنے والے اس عظیم لیکھک کا آخری دور انتہائی کسمپرسی میں گزرا۔ پاکستان میں جیسے وہ زندگی بسر کرنے نہیں، زندگی جھیلنے آیا تھا۔'' [۱۳۴]

ٹوبہ ٹیک سنگھ کو وہ نہ صرف منٹو کا بلکہ ''سرزمین پنجاب کا قد آور افسانہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ'' قرار دیتے ہوئے اس افسانے کی فنی اور صوتی خوبیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ کتاب میں شامل آخری دو مضامین بعنوان ''منٹو اور غالب۔ ایک صلیب دو عہد'' اور منٹو کی تحریر کردہ فلم ''مرزا غالب'' اس سے پہلے مصنف کی شائع کردہ کتاب ''منٹو'' غالب کا پرستار'' میں شامل ہیں۔ منٹو کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں کے جائزے پر محیط اس کتاب میں منٹو کی شخصیت و فن کا کوئی نیا در اگرچہ وا نہیں کیا گیا لیکن پرانی معلومات کو جس طرح تحقیق صداقت سے پیش کیا گیا ہے وہ اسے اہم بنا دیتا ہے۔

''منٹو کے باغی کردار: سماجی و نفسیاتی مطالعہ''، حمیرا خان:

چار ابواب پر مشتمل حمیرا خان کی یہ کتاب شمع بکس نے جنوری ۲۰۱۶ء میں فیصل آباد سے شائع کی۔ منٹو کی شخصیت اور فن کے متعلق لکھی جانے والی یہ تازہ ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کتاب میں مصنفہ نے شخصیت، تخلیقی کردار اور ممنوعہ موضوعات پر واشگاف انداز میں قلم اٹھانے والے سعادت حسن منٹو کو باغی افسانہ نگار قرار دیا ہے۔ ان کے بقول منٹو نے مروجہ معاشرتی اقتدار کے تناظر میں اپنے افسانوی کرداروں کی انفرادی اور اجتماعی نفسیات کا تجزیہ کر کے فرد اور معاشرے کی ایک دوسرے پر اثر پذیری، فرد کے نفسیاتی عوارض، ان عوارض کے اسباب اور پھر ان کے باعث معاشرے میں پیدا ہونے والے بگاڑ کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

ہندوستانی و پاکستانی معاشرے میں موجود مثبت اور منفی دونوں حوالوں سے معاشرتی اقدار سے منحرف کرداروں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ اس کتاب کا موضوع خاص ہے۔ چار ابواب میں منقسم اس کتاب کا پہلا باب چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے مضمون میں منٹو کی سوانح حیات جب کہ دوسرے مضمون میں ان کی تخلیقات کا تعارف کرایا گیا ہے۔ تیسرے مضمون میں اردو افسانے کی روایت پر اُچٹتی نظر ڈالنے کے بعد منٹو کی افسانہ نگاری کا بھی مختصر جائزہ پڑھنے کو ملتا ہے۔ عمومی طور پر اس باب میں منٹو کی شخصیت اور فن کا سرسری تعارف ہی کرایا گیا ہے۔ دوسرا باب ''تین حصوں میں منقسم ہے۔ سب سے پہلا مضمون ''بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں کا ہندوستانی معاشرہ'' محض تین صفحات پر مشتمل ہے۔ ان تین صفحوں میں ہندوستانی معاشرے کی ایک ادھوری تصویر پیش کرنے کے بعد اگلے دو مضامین میں مصنفہ اپنے اصل موضوع پر آتی ہیں۔ جہاں ابتدائی تخلیقی زندگی سے لے کر ۱۹۴۷ء تک سعادت حسن منٹو کے تخلیق کردہ ایسے مرد اور نسوانی کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے۔ جنھیں عرف عام میں منٹو کے باغی کردار کہا جاتا ہے۔ وہ سیاسی انحراف کی پہلی مثال منٹو کے افسانہ تماشا اور کردار منگو کوچوان کو قرار دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''مغربی استعمار سے نجات حاصل کرنے کے سلسلے میں اس کی جو نفسیات بنی اس کا صحیح عکاس منٹو کے افسانے ''نیا قانون'' کا مرکزی کردار ہے۔'' [۱۳۵]

افسانہ ٹیڑھی لکیر، پہچان، خوشیا، بانجھ، نعرہ، اُس کا پتی، ہتک، انقلاب پسند، بو، کالی شلوار، گرم سوٹ، اور ترقی پسند کے مرکزی اور ضمنی مرد کرداروں کی نفسیاتی گرہوں کو کھولتے ہوئے ان معاشرتی عناصر کی نشاندہی کی گئی ہے جو اُنھیں مروجہ روش سے انحراف پر مجبور کرتے ہیں۔ گویا منٹو کے یہ منحرف یا باغی کردار معاشرے میں موجود کج روی کا شکار ہوتے ہوئے بھی اپنے فطری تقاضوں کو نہیں بھولتے۔ اسی باب کے آخری حصے میں ایسے نسوانی کرداروں کو بھی موضوع گفتگو بنایا گیا ہے جو فطری، نفسیاتی، سیاسی اور سماجی بندشوں کے خلاف سراپا احتجاج نظر آتے ہیں۔ مثلاً ہتک کی سوگندھی کو مصنفہ نے نسوانی کرداروں کی پیش کش کا سب سے بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔ سوگندھی کی طرح دس روپے'' کی سریتا، کالی شلوار کی سلطانہ، خوشیا، کی کانتا، شوشو اور دھواں کے تناظر میں مصنفہ نے، منٹو کے کم و بیش سبھی کرداروں کو نفسیاتی شعور اور ادراک کا حامل قرار دیا۔

باب سوم دراصل پچھلے باب کا توسیعی مطالعہ ہے۔ پچھلے باب کی طرح یہ بھی تین اجزاء میں منقسم ہے۔ اس باب میں ۱۹۴۷ء کے بعد تشکیل پانے والے پاکستانی معاشرے میں منٹو کے نسوانی اور مرد کرداروں کا نفسیاتی جائزہ لیا گیا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستانی معاشرہ کی تشکیل پر ڈیڑھ صفحے کا تبصرہ تکلف محض کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مرد کرداروں میں بابو گوپی ناتھ، میرا نام رادھا ہے کا مرد کردار راج کشور، پانچ دن کا پروفیسر، ٹھنڈا گوشت کا ایشر سیاں، گولی کا شفقت، باسط، شاردا، کا نذیر، ننگی آوازیں کا بھولو، شانتی کا کردار مقبول، سوراج کے لیے، کا مرکزی کردار غلام علی، شریفین کا قاسم، تقی کاتب، حنیف، اللہ دِتہ، ممد بھائی، ٹوبہ ٹیک سنگھ، کا بشن سنگھ، دودا پہلوان، موج دین، قیمے کی بجائے بوٹیاں کا کردار ڈاکٹر سعید اور کوٹ پتلون کا کردار ناظم اپنی تمام تر جنسی، سیاسی، سماجی معاشی، معاشرتی، فطری، ناہمواریوں کے خلاف بغاوت کی بہترین مثالیں ہیں۔ اسی باب کے آخری صفحے میں منٹو کی مختلف کہانیوں میں موجود نسوانی کرداروں مثلاً (رکما) نیلم، جانکی، کلونت کور، خورشید، زینت، شانتی، نیتی، سکینہ، شوبھا بائی، برمی لڑکی، ممی موزیل، ہلاکت، محمودہ، نسیم اختر، بیگو، شاردا اور عیدن کے ذریعے منٹو نے ایک حساس اور باشعور ادیب کی حیثیت سے اپنے افسانوی وژن کے ذریعے

معاشرتی مجبوریوں اور بے راہ رویوں سے بھرپور سماج کو یوں پر کھا ہے کہ انسان شناسی کے نئے اور مشاہداتی تصورات ابھر کر سامنے آ گئے۔ کتاب کے آخری باب بعنوان ''حاصل تحقیق'' میں منٹو کے تمام مرد اور نسوانی کرداروں کا تذکرہ کر کے بغیر کوئی نتیجہ نکالے کتاب کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ ۱۵۸ صفحات پر مشتمل یہ ایک روایتی قسم کی کتاب ہے جس میں منٹو کی کہانیوں یا کرداروں پر تعارفی نوٹ ہی پیش کیے گئے ہیں۔ اور کردار بھی وہ جو معروف زمانہ اور زبان زد عام ہیں۔

''منٹو اور موپاساں: ایک تقابلی مطالعہ''، ڈاکٹر ریاض قدیر:

ڈاکٹر ریاض قدیر کی یہ تصنیف اُن کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالہ بعنوان ''منٹو کے افسانوی ادب پر موپاساں کے اثرات'' کی کتابی شکل ہے۔ مثال پبلی شرز، فیصل آباد نے اسے ۲۰۱۶ء میں شائع کیا۔ پانچ ابواب پر مشتمل یہ کتاب عنوانات کے معمولی ردوبدل کے ساتھ ان کے مقالہ کا ہو بہو عکس ہے۔ یہاں تک کہ مصنف نے وہ دیباچہ بھی جوں کا توں شائع کر دیا جو اس قسم کے مقالہ جات کا رسمی، غیر ضروری لیکن ناگزیر حصہ ہوتا ہے۔ ابواب بندی کچھ اس طرح کی گئی ہے۔ پہلا باب بعنوان ''فرانسیسی اور اُردو افسانہ'' مقالے میں اس کا عنوان ''فرانسیسی اور اُردو افسانے کی روایت'' ٹھہرا کے اسے دو ضمنی حصوں ''اُردو کا افسانہ منٹو کے عہد تک'' اور ''فرانسیسی افسانہ موپاساں کے عہد تک'' میں تقسیم کیا گیا ہے۔ دوسرے باب، کا عنوان منٹو اور موپاساں کے افسانوی ادب کے موضوعات، تیسرا باب، منٹو پر موپاساں کے اثرات، اشتراک اور اختلاف، کے عنوان کے تحت زیر بحث لایا گیا ہے۔ چوتھا باب بعنوان ''منٹو اور موپاساں کے تقابلی مباحث'' جب کہ پانچویں باب کا عنوان ہے ''منٹو اور موپاساں کے افسانوی ادب کے اثرات کا تقابلی مطالعہ۔۔ نتائج''۔ پہلے باب کے عنوان میں معمولی ترمیم کے علاوہ تمام کتاب اُن کے مقالہ ہی کا عکس ہے۔ اُن کے مقالے پر تفصیلی گفتگو آئندہ صفحات میں تفصیل سے کی گئی ہے۔ [۱۳۶] کتاب ۲۲۰ صفحات پر محیط ہے۔

''میرے مطابق منٹو، ''لیزلی فلیمنگ''، مترجم: سلیم شہاب:

مکتبہ جدید، لاہور سے پہلی بار شائع ہونے والی اس کتاب پر سال اشاعت درج نہیں ہے۔ نامعلوم، پبلی شرز یا مصنفین و مرتّبین کسی بھی کتاب کے سال اشاعت کی تحقیقی اہمیت کو خاطر میں کیوں نہیں لاتے۔ کتاب مجموعی طور پر چھے مضامین کا مجموعہ ہے۔ جنھیں ابواب کا نام دیا گیا ہے۔ فہرست مضامین میں ترتیب کے اعتبار سے باب نمبر پانچ کا اندراج نہیں کیا گیا اور نہ ہی تفصیل میں مضمون یا باب کا عنوان دیا گیا ہے۔ ''رحمدل دہشت گرد'' پہلا مضمون ہے جس میں منٹو کی سوانح حیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جب کہ دوسرے باب، ادبی پس منظر میں ۱۹ ویں اور ۲۰ ویں صدی کے تناظر میں منٹو کے ابتدائی دور کے ادب نیز باری علیگ کے اثر سے سوشلزم اور ترقی پسندانہ رجحانات سے رغبت کے علاوہ ترقی پسند نقادوں کی منٹو مخالف آرا کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنفہ نے اس ضمن میں سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، احمد علی، انتظار حسین، احتشام حسین اور خلیل الرحمٰن اعظمی کے رویوں پر حیرت اور تشویش کا اظہار کیا جنھوں نے محض اپنے ذاتی اختلاف کو ادبی اختلافات کا جبہ پہنایا۔ مصنفہ نے بھی فنی اعتبار سے منٹو کے ادبی سفر کو تین روایتی ادوار میں تقسیم کرتے ہوئے منٹو کے شائع ہونے والے مجموعوں کا زمانی اعتبار سے جائزہ لیا ہے۔ باب دوم، سوم اور چہارم میں دور اول یعنی ابتدا سے ۱۹۳۶ء تک باب سوم ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۷ء جب کہ باب چہارم میں ۱۹۴۸ء تا وفات ۱۹۵۵ء تک کے ادبی سفر کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا گیا۔ اس ادبی سفر کے دوران منٹو کے ادبی تجربات کس کس طرح تبدیل ہوتے رہے اور وقت کے بدلتے دھاروں کو کس طرح اُس نے اپنی تخلیقات

میں سمویا۔ گویا منٹو کے افسانوں کے کردار، پلاٹ اور اثرات سبھی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ چاہے ان کا تعلق ابتدائی دور یعنی تراجم اور آتش پارے سے ہو یا پھر سیاسی و سماجی یا رومانوی و جنسی حقیقت نگاری سے ہو۔ چاہے اس نے فسادات کو اپنا موضوع بنایا ہو یا پھر انکل سام کو للکار رہے ہوں۔ مصنفہ نے اتنی بڑی شخصیت کے حامل ادیب کو اور اس کے فن کو ایک مختصر کتاب میں سمونے کی جو کوشش کی ہے۔ اگر ہم اُن کے تئیں اسے کامیاب قرار دے بھی دیں پھر بھی قاری کی تشفی نہیں ہوتی۔ اختصار یقیناً نثری خوبی سہی لیکن ایسا بھی کیا کہ بات مکمل طور پر سمجھ میں ہی نہ آئے، خصوصاً ایسے قارئین جو منٹو کے بارے کچھ زیادہ معلومات نہیں رکھتے اُنھیں کتاب کے بعض مقامات پر مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

آخری باب ''افسانوں کا از سر نو جائزہ'' میں منٹو کے افسانوں کو ہی دراصل اس کا اصل تخلیقی سرمایہ گردانتے ہوئے اُن کے افسانوں میں موجود فنی و فکری خوبیوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ جب کہ آخر میں منٹو کی کہانیوں، بلاوز، بو، ٹوبہ ٹیک سنگھ، ٹھنڈا گوشت، کالی شلوار، موذیل، نیا قانون، ہتک کا انتخاب شامل کیا گیا ہے۔ فی زمانہ ان کہانیوں کا انتخاب ایک تحقیقی و تنقیدی کتاب میں شامل کرنے کا مقصد کتاب کی ضخامت میں اضافے کے سوا کچھ معنی نہیں دیتا۔

''دو ادیب: سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی''، وارث علوی:

اردو کے دونوں نامور ادیبوں سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی کی شخصیت اور فن پر لکھی گئی وارث علوی کی یہ کتاب شاہد پبلی کیشنز، لاہور نے سال اشاعت درج کیے بغیر شائع کی۔ ۱۸۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ سعادت حسن منٹو کی شخصیت و فن کا احاطہ کرتا ہے جو ۹۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ جب کہ دیگر صفحات میں راجندر سنگھ بیدی کی شخصیت و فن کا جائزہ لیا گیا ہے۔ منٹو سے متعلق حصے میں شامل تین مضامین کے عنوانات درج ذیل ہیں:

۱۔ زندگی اور شخصیت ۲۔ ڈرامے، مضامین، خاکے ۳۔ افسانے

کتاب میں شامل ان تین مضامین کی مدد سے گویا منٹو کی شخصیت اور فن کے جائزے کو سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ وارث علوی کا شمار اُردو کے اہم نقادوں میں کیا جاتا ہے۔ منٹو پر ان کی کتاب ''منٹو۔ ایک مطالعہ'' منٹو پر کی جانے والی سنجیدہ تنقید کے زمرے میں آتی ہے۔ ''دو ادیب'' میں شامل پہلا مضمون ''زندگی اور شخصیت'' منٹو کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے عہد کو جو تقریباً ۴۳ سال پر محیط ہے ۲۶ صفحات میں بیان کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ تفصیل کی بجائے گریز کے راستے کو اختیار کرنے کی سعی وارث علوی نے کی۔ بچپن کے حالات، والد کی سختی، دوستیاں، مشغلے، باری علیگ اور دیگر دوستوں کے واقعات، دلی ریڈیو اور بمبئی کی نوکری، فلم انڈسٹری سمیت پاکستان آمد اور پھر غربت، افلاس اور مقدمات کے بعد وفات تک کا یہ سفر محض اشارتاً ہی طے کیا گیا ہے۔

منٹو کے ہندوستان چھوڑنے کی تین وجوہات بیان کی گئی ہیں۔ جن کا ذکر کسی نہ کسی صورت میں منٹو کی ذاتی تحریروں کے علاوہ اُن کے معاصرین کی تحریروں سے بھی ملتا ہے۔ وارث علوی نے عصمت کے اس دعویٰ کو منٹو کے ہندوستان چھوڑنے کی ایک وجہ تسلیم کیا ہے کہ پاکستان میں اسے بڑے بڑے مکانات الاٹ ہو جائیں گے۔ عصمت چغتائی کا یہ خیال اپنی جگہ لیکن منٹو نے پاکستان میں آ کر نہ تو الاٹمنٹ کے لیے کوئی دوڑ دھوپ کی اور نہ ہی اُسے اس طرح کی کوئی سہولت دی گئی۔ لے دے کے ایک برف کا کارخانہ وہ بھی تین لوگوں کی شراکت کے ساتھ قدرت اللہ شہاب کی وسعت نظری و قلبی کے طفیل منٹو کو الاٹ ضرور ہوا تھا لیکن منٹو نے اسے بھاری

پتھر جان کر اٹھانے سے انکار کر دیا۔ دوسری وجہ اشوک کمار جیسے دوست کے رویے سے جب منٹو کو یہ احساس ہوا کہ اس کو نظر انداز کر کے عصمت کی کہانی کو ترجیح دی جا رہی ہے تو اس کا دل کھٹا ہو گیا اور تیسرے ہندو مسلم فسادات اور تعصب کے نتیجہ میں منٹو مخالف لابی اشوک کمار کے لیے مسائل پیدا کر رہی تھی کہ اس کے بمبئی ٹاکیز میں کلیدی عہدوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہے۔ چناں چہ بمبئی ٹاکیز کو نقصان سے بچانے کے لیے منٹو باجو کی گلی سے پاکستان چلا گیا۔ بقول مصنف۔ سات سال کا وہ عرصہ جو منٹو نے پاکستان میں گزارا اس کی زندگی کا سب سے زیادہ دکھی اور پریشان حال زمانہ تھا۔ لکھتے ہیں:

"بمبئی کی زندگی کی خوشحالی، لاہور کی زندگی کی فلاکت کا عجب تضاد پیش کرتی ہے۔۔۔۔ پاکستان میں منٹو کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اسٹوڈیو چل نہیں رہے تھے اس لیے فلموں کے ذریعے روزی کمانے کے جو خواب منٹو نے دیکھے تھے شرمندہ تعبیر نہ ہوئے۔" [۱۳۷]

پاکستان میں قیام کے ان سات سالوں کو وارث علوی منٹو کی زندگی کا تخلیقی اعتبار سے بہترین زمانہ گردانتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان سات برسوں میں منٹو نے ۱۲۷ کہانیاں لکھیں۔۔ افسانوں کے بارہ مجموعوں کے علاوہ مضامین کے دو، خاکوں اور اپنے افسانوں پر مقدمات کی پیش کی گئی روداد کا ایک مجموعہ اور ایک ناولٹ "بغیر عنوان کے" شائع ہوا۔ "سیاہ حاشیے" ایک اور مختصر کتاب ہے جس میں فسادات پر لطیفے جمع کیے گئے ہیں۔" [۱۳۸]

مصنف نے مرتے وقت منٹو کے شراب طلب کرنے کے واقعہ کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اگرچہ کہ اب منٹو کے گھر والے اس واقعہ کی تردید کرتے ہیں کہ آخر میں منٹو کو ایک چمچ کے ذریعے، اس کے اصرار پر شراب پلانے کی کوشش کی گئی جو جان لیوا ثابت ہوئی۔ "ڈرامے، مضامین، خاکے" تین حصوں پر مشتمل اس مختصر مضمون میں فنی اعتبار سے افسانوں کے علاوہ ان تحریروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جن میں ادب کی یہ تینوں اصناف یعنی ڈراما، مضمون اور خاکہ نگاری شامل ہیں۔ پہلا حصہ منٹو کے فن ڈرامانویسی کے جائزہ پر مشتمل ہے۔ مصنف کے مطابق منٹو کے ابتدائی ڈرامے جو ان کے مجموعوں "تین عورتیں" اور آو" میں شامل ہیں مکالموں کے زور پر تحریر کیے گئے ہیں۔ ان کی ظرافت، مزاحیہ صورتحال کرداروں کے باہمی عمل کا نتیجہ کم جب کہ چمکدار اور بے تکلف مکالموں کی رہین منت زیادہ ہے۔ "تین عورتیں" میں وہ ڈرامائی صورتحال کے فقدان کا رونا روتے دکھائی دیتے ہیں۔ "آو" میں شامل گیارہ ڈراموں کے علاوہ "کروٹ" اور "منٹو کے ڈرامے" میں شامل چھبیس ڈراموں کے مختصر تجزیے کے بعد وہ اُنھیں سپنس، تھرل اور فلمی کہانیوں کے انداز کے ڈرامے قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

"وہ ڈرامے عام تفریح کی سطح سے بلند نہیں ہو پاتے۔ ان کے کرداروں میں کوئی نفسیاتی گہرائی یا فکر انگیز اخلاقی کشمکش نہیں۔۔۔۔ ان ڈراموں کی تفہیم میں کوئی بصیرت افروز بات نہیں۔" [۱۳۹]

البتہ "ہتک" اور "جرنلسٹ" کو وہ منٹو کے کامیاب ترین اور بلند مقام کے حامل ڈرامے گردانتے ہیں۔ وارث علوی کے اس مضمون کا دوسرا حصہ منٹو کی مضمون نگاری سے متعلق ہے۔ ان کے بقول سو کے قریب ریڈیائی ڈرامے لکھنے والے منٹو کے فلمی خاکوں اور مضامین کی تعداد بھی سو سے کم نہیں۔ جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ منٹو کتنے بسیار نویس تھے۔ منٹو کے مضامین، تلخ ترش اور شیریں، اور اوپر نیچے اور درمیان، میں شامل مضامین کے علاوہ ایسے مضامین جن میں ادب اور عریانی، ادب اور احتساب اور دور جدید کے

ادبی تقاضوں پر بحث کی گئی ہے فکر انگیز نکات کے حامل ہیں۔ مضمون کے تیسرے حصے کا تعلق منٹو کی خاکہ نگاری سے ہے۔ خاکوں کے دو مجموعوں لاوڈا سپیکر اور گنجے فرشتے، میں شامل خاکوں کو جن کا تعلق، فلم، ادب اور صحافتی شخصیات سے ہے وارث علوی منٹو کی بہترین تحریروں میں شمار کرتے ہیں۔ ان کے بقول قاری ان خاکوں کے صفحات میں پورے ایک دور کی نبض کو دھڑکتا ہوا محسوس کرتا ہے۔
کتاب کا تیسرا اور آخری مضمون بعنوان ''افسانے'' میں منٹو کے فن افسانہ نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ اس کتاب کا سب سے طویل مضمون ہے۔ جس میں منٹو کے افسانوں کے مختلف پہلوؤں کا سیاسی افسانے، رومانی افسانے، جنسی افسانے، حقیقت نگاری اور فسادات کے موضوع پر لکھے جانے والے افسانوں کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ مختلف موضوعات پر لکھے گئے ان افسانوں کے اقتباسات کی مدد سے وہ یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ منٹو واقعی بہت بڑے افسانہ نگار تھے جن کے سینہ میں واقعی فن افسانہ نگاری کے تمام راز پنہاں تھے۔ اور ان کی معمولی سے معمولی کہانی بھی فنکارانہ چابک دستی اور ہنر مندی کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کا دوسرا حصہ اُردو کے معروف ادیب راجندر سنگھ بیدی کی شخصیت اور فن سے متعلق ہے۔ اور اس جائزہ کا بھی ہو بہو وہی انداز ہے جو سعادت حسن منٹو کے مطالعہ کے ضمن میں روا رکھا گیا۔ دونوں ادیبوں کی شخصیت و فن کا تقابلی جائزہ لے لیا جاتا تو کتاب کی یکجا اشاعت کا جواز پیدا کیا جاسکتا تھا۔

(ب) مرتّب کتب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

''منٹو کے خطوط، ندیم کے نام''، احمد ندیم قاسمی:

سعادت حسن منٹو اور پیر زادہ احمد ندیم قاسمی کے باہمی تعلقات اور دونوں کی شخصیت و فن کی ترجمان یہ کتاب ۱۹۶۲ء میں کتاب نما، لاہور نے شائع کی۔ ادبی حلقوں میں پذیرائی کی وجہ سے جلد ہی اس کا دوسرا ایڈیشن، دیباچہ طبع دوم کے اضافہ سے کتاب نما، راولپنڈی نے ۱۹۶۶ء شائع کیا۔ جب کہ دیباچہ طبع سوم اور ڈاکٹر سلیم اختر کے مضمون ''منٹو خطوط کے آئینے میں'' کے ساتھ ۱۹۹۱ء میں اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز نے لوئر مال لاہور سے شائع کیا۔

سعادت حسن منٹو کے متعلق مرتّب کی جانے والی یہ سب سے پہلی کتاب ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے سعادت حسن منٹو کے اُن تمام خطوط کو جو اُنھوں نے مرتّب کے نام جنوری ۱۹۳۷ء سے فروری ۱۹۴۸ء کے درمیانی دس سالوں میں لکھے تھے، یکجا کر کے زمانی ترتیب کے ساتھ شائع کیا۔ منٹو شناسی کے باب میں یہ بہت اہم کتاب ہے، جس سے منٹو کی شخصیت اور فن کے کئی نادر پہلو حقیقی طور پر سامنے آئے۔ نجی نوعیت کے یہ خطوط چوں کہ اشاعت کے خوف سے بے نیاز ہو کر لکھے گئے تھے اس لیے ادبی موشگافیوں یا مبالغہ آرائی کی بجائے مکتوب نگار اور مکتوب الیہ دونوں کی شخصیت کی خوب سے خوب تر عکاسی کا باعث بنے۔ دونوں کے مزاج اور ادبی مقام و مرتّبے میں پائے جانے والے فرق کو ان خطوط کی وجہ سے بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی اور سعادت حسن کے تعلقات کی اس دس سالہ تاریخ کے مطالعہ کے بعد دونوں اصحاب کا جو تصور ابھرتا ہے۔ اُس کے مطابق منٹو (اپنی شخصی خامیوں کے باوجود) احمد ندیم قاسمی کی انگلی پکڑ کر کسی بچے کی طرح اپنے قدموں پر کھڑا کر کے اُنھیں چلنا سکھا رہا ہو۔ اُس کی توتلی زبان کو رواں کرنے کے لیے ڈھیروں باتیں کر رہا ہو اور اس کے معاشی مسائل کو حل کرنے کے لیے مختلف جتن کر رہا ہو۔ گویا منٹو کسی شفیق بزرگ کی طرح احمد

ندیم قاسمی کے سر پر دست شفقت پھیرتے اور ان کے معاشی مسائل کے حل کے لیے فکر مند دکھائی دیتے ہیں۔ جب کہ احمد ندیم قاسمی کا تصور ایک طفل مکتب کا سا ابھرتا ہے۔ جو اپنے اُستاد کی بتائی ہوئی ہر بات کو گرہ میں باندھنے کی کوششوں میں مصروف عمل ہو۔ مرتّب کی اس بات سے یقیناً سب کو اتفاق ہو گا کہ ان خطوط کی اشاعت کا مقصد خود نمائی ہرگز نہیں:

> ''اس لیے کہ منٹو نے جگہ جگہ میری ناکام تحریروں کی طرف اشارے کیے ہیں، مجھے جذبات زدہ قرار دیا ہے اور کم سے کم فلمی ادب کی حد تک ان خطوط میں اس کی حیثیت ایک رہنما کی سی ہے۔'' [۱۴۰]

دونوں کے درمیان جاری خط و کتابت کا یہ سلسلہ اُس وقت رک گیا جب احمد ندیم قاسمی ادبی زندگی کے ابتدائی مسائل سے نکل کر شہرت یافتہ ادیب اور ترقی پسندوں کے سرخیل (جنرل سیکریٹری) بن بیٹھے۔ اس نفسیاتی نقطے کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ قاسمی صاحب جب تک ''طاقتور ادیب'' نہیں بنے تھے تب تک اخلاقی اور نظریاتی اختلاف کے باوجود وہ منٹو کے سامنے دوزانو بیٹھتے رہے۔ معاً یہ نجی خط و کتابت ''کھلے خطوط'' میں تبدیل ہو گئی۔ کیا یہ مقام افسوس نہیں کہ احمد ندیم قاسمی اُس قرارداد کو پاس کرائیں جس میں منٹو کے بائیکاٹ کا اعلان کیا گیا ہو۔ کیا قاسمی صاحب کو منٹو کی بجائے نظریات کو قربان نہیں کر دینا چاہیے تھا؟

ڈاکٹر سلیم اختر کا مضمون ''منٹو خطوط کے آئینے میں'' سب سے پہلے اوراق، لاہور کے سالنامہ ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ مرتّب نے کتاب کے تیسرے ایڈیشن میں اس کی شمولیت کتاب کی تفہیم کے لیے ضروری سمجھی۔ فاضل نقاد نے بہت تفصیل سے ان خطوط کی اہمیت اور قدر و قیمت جتائی۔ لیکن ان سمیت منٹو کے کسی بھی نقاد نے ان خطوط کے انتخاب اور اشاعت کے معاملے میں اس سنجیدہ نقطے پر غور نہیں کیا کہ منٹو جیسے زود نویس شخص نے دس سال کے طویل عرصے میں کیا واقعی اتنے ہی خط لکھے ہوں گے۔ جتنے کہ قاسمی صاحب نے شائع کر دیے؟ یا کڑے انتخاب کے بعد محض گوارا خطوط ہی شائع کیے؟ قیاس اغلب ہے کہ قاسمی صاحب جیسے وضع دار اور مصلحت پسند آدمی نے بہت احتیاط اور کرید کے بعد ایک مخصوص مجموعہ خطوط کی اشاعت کو ہی اپنے اور (کسی حد تک) منٹو کے حق میں بہتر سمجھا ہو گا۔ دو چار لوگوں نے دبے دبے انداز میں اس خدشے کا اظہار بھی شروع کر دیا ہے کہ قاسمی صاحب اُن خطوط کو دبا گئے جو اُنھوں نے سعادت حسن منٹو کے نام لکھے تھے۔ اگرچہ مرتّب بار بار یہ اعلان کر چکے کہ منٹو نے اُن کے رویے سے نالاں ہو کر اور غصے میں آ کر یہ تمام خطوط ایک ایک کر کے جلا دیے تھے مگر یہ بات اتنی آسانی سے ہضم ہوتی دکھائی نہیں پڑتی۔ منٹو کی صاحبزادی نصرت منٹو نے حال ہی میں یہ انکشاف کر کے سب کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ:

> ''قاسمی صاحب جب منٹو کے اپنے نام خطوط چھاپنا چاہتے تھے تو وہ امی سے (منٹو کے نام) اپنے خط یہ کہہ کر لے گئے تھے کہ وہ اپنے اور منٹو کے خطوط کو اکٹھے چھاپنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ خط چھپے نہیں۔ منٹو کے قاسمی صاحب کے نام خطوط ۶۲ء یا ۶۳ میں چھپ گئے تھے۔ قاسمی صاحب کا ۲۰۰۶ء میں انتقال ہوا تو سارے عرصے میں وہ یہ خطوط چھاپنے سے محترز رہے۔'' [۱۴۱]

قاسمی صاحب منٹو کو خط لکھتے وقت پتہ نہیں کیسا اسلوب اختیار کرتے تھے، کہ جس کی اشاعت اُن کے لیے خطرے کا باعث تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ سعادت حسن منٹو کو ''اردو ادب'' میں اپنے خط کی اشاعت سے منّتیں کر کے منع نہ کرتے۔ ان تمام تر خدشات

اور تحفظات کے باوجود کتاب موجودہ اشاعتی صورت میں بھی منٹو شناسی کی بہت سی پرتیں کھولتی دکھائی دیتی ہے۔ سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن کے متعلق یہ ایک براہ راست دستاویز ہے جس کی اہمیت ہر دور میں مسلم ہے۔

''منٹو شخصیت اور فن''، پریم گوپال متل:

سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن کے متعلق مرتّب ہونے والی یہ پہلی کتاب ہے۔ اس سے قبل اگرچہ احمد ندیم قاسمی اپنے نام لکھے گئے سعادت حسن منٹو کے خطوط کو مرتّب کر کے شائع کر چکے تھے۔ مگر اپنے موضوع کے لحاظ سے وہ ایک بالکل الگ کتاب ہے۔ پریم گوپال متل کی ''عرض مرتّب'' کے بعد کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ ''منٹو۔ اپنی نظر میں'' منٹو کا خود نوشت خاکہ ہے جو اُنھوں نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل لکھا تھا۔ دوسرا حصہ ''منٹو دوسروں کی نظر میں'' ابواللّیث صدیقی، عصمت چغتائی اور ممتاز شیریں کے منٹو پر لکھے گئے تین مضامین پر مشتمل ہے۔ تیسرے حصے بعنوان ''منٹو۔ اپنے افسانوں میں'' منٹو کی ۲۱ کہانیوں کا انتخاب شامل ہے۔ اور یہ کتاب کا سب سے طویل حصہ ہے جب کہ چوتھے حصے ''دوسرے منٹو کی نظر میں'' منٹو کے لکھے گئے پانچ شخصی خاکے منتخب کر کے شامل کیے گئے ہیں۔ اس طرح دوسرے حصے کے علاوہ باقی تمام کتاب میں سعادت حسن منٹو کی تحریروں سے کام چلایا گیا ہے۔ عصمت چغتائی کا مضمون ''میرا دوست میرا دشمن'' ابواللّیث صدیقی کا مضمون، ''منٹو کا فن'' جب کہ ممتاز شیریں کا مضمون ''فن کی تکمیل'' سب سے پہلے نقوش'' لاہور کے منٹو نمبر مطبوعہ ۱۹۵۵ء میں اشاعت پذیر ہوئے۔ [۱۴۲]

ممتاز شیریں کا مضمون نقوش میں ''منٹو کی فنی تکمیل'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ بعد میں یہ مضامین بیشتر مرتّبہ کتب اور رسائل میں متعدد مرتّبہ اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ ''منٹو۔ شخصیت و فن'' کے تیسرے حصے میں درج ذیل کہانیوں کا انتخاب شامل ہے۔ بابو گوپی ناتھ، ہتک، سو کینڈل پاور کا بلب، موذیل، ٹوبہ ٹیک سنگھ، ننگی آوازیں، کھول دو، ٹھنڈا گوشت، دھواں، ترقی پسند، ڈرپوک، دودا پہلوان، خوشیا، بو، کالی شلوار، سہائے۔ ٹوٹو، خالی بوتلیں، خالی ڈبے، سڑک کے کنارے اور پھندنے۔

جب کہ چوتھے حصے میں عصمت چغتائی، آغا حشر، میراجی، اشوک کمار، اور نرگس کے خاکے شامل ہیں جو منٹو نے لکھے تھے۔ اس طرح کتاب میں شامل مرتّب کے مضمون کے علاوہ ۳۲ میں سے ۲۹ خود منٹو کے قلم سے لکھی ہوئی تحریریں ہیں۔ ۳۳۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب کو موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی نے ۱۹۸۰ء میں شائع کیا۔

''سعادت حسن منٹو''، ضیاء ساجد:

ضیاء ساجد کی مرتّب کردہ کتاب ''سعادت حسن منٹو'' قابل تحسین، شمس قاری، گاف روڈ، لاہور سے سن اشاعت کے بغیر شائع ہوئی۔ محمد نوید اپنے غیر مطبوعہ مقالے میں اس کے سن اشاعت کے متعلق اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> ''ضیاء ساجد کی کتاب ''سعادت حسن منٹو'' پہلی بار دہلی سے ۱۹۸۹ء سے پہلے شائع ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن پاکستان سے مکتبہ سوشل بکس سروس، لاہور سے ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔'' [۱۴۳]

محمد نوید کی دی گئی معلومات سے اس کے پہلے ایڈیشن کے پبلشر اور سن اشاعت کا پتہ نہیں چلتا البتہ اُنھوں نے اس کی اولین اشاعت دہلی سے ۱۹۸۹ء سے قبل کی قرار دی ہے۔ زیر نظر ایڈیشن قابل تحسین شمس قاری، گاف روڈ، لاہور کا شائع کردہ ہے اور اس پر سن اشاعت درج نہیں۔

ضیاء ساجد کی مرتّبہ کتاب میں منٹو کے معاصر ادبا کے نو(۹)تاثراتی مضامین، تین خطوط اور منٹو کے چوبیس(۲۴)افسانوں اور مضامین کے انتخاب کے علاوہ معاصرین کی تحریروں کے چھبیس(۲۶)اقتباسات شامل ہیں۔ جہاں تک مضامین کا تعلق ہے، نو(۹) میں سے سات(۷) مضامین، ''چند یادیں'' از شورش کاشمیری، ''تاثرات'' از یوسف ظفر، ''منٹو زندہ ہے'' از حمید اختر، ''منٹو اور اس کا فن'' از ممتاز مفتی، ''منٹو ایک نفاست پسند پا انداز'' از سید امجد الطاف، ''منٹو ایک انسان'' از احمد شجاع پاشا اور بلقیس عابد علی کا مضمون ''منٹو مر گیا'' اس سے قبل ''گل خنداں'' کے منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) میں شائع ہوئے۔[۱۴۴]

کرشن چندر کا مضمون بعنوان ''سعادت حسن منٹو'' نئے ادب کے معمار کے سلسلے میں ۱۹۴۸ء میں کتب پبلی شرز، بمبئی سے شائع ہوا تھا۔

باری علیگ کے مضمون ''چند مہینے امرت سر میں'' کی پہلی اشاعت سعادت حسن منٹو اور محمد حسن عسکری کی ادارت میں شائع ہونے والے ''اُردو ادب'' کے دوسرے شمارے فروری ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔[۱۴۵] باری علیگ امرت سر میں حکیم نور الدین کی سفارش پر ''مساوات'' اخبار میں ملازم ہوئے تھے۔ زیرِ نظر مضمون باری علیگ کے امرت سر میں گزارے گئے چند مہینوں کی یادوں کا تذکرہ ہے۔ منٹو کی پہلی قلمی تحریر جو فلمی تبصرے کی صورت میں ''مساوات'' میں شائع ہوئی کا پس منظر بتاتے ہوئے باری علیگ لکھتے ہیں کہ اُنھوں نے منٹو کو اس شرط پر پریس پاس دے کر فلم دیکھنے پر آمادہ کر لیا کہ واپسی پر وہ اس پر تبصرہ لکھ کر دیں گے۔ چناں چہ منٹو کا یہ تبصرہ جب مساوات میں شائع ہوا تو منٹو اس دن بہت خوش تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اگلے دن مساوات میں ہمارے فلمی نامہ نگار کے قلم سے جو چند سطریں شائع ہوئیں ان سے میرا دوست بہت خوشی دکھائی دیتا تھا۔ اس واقعہ کو سولہ سال گزر چکے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ان سطروں کی اشاعت ہی نے سعادت کے اندر چھپے ہوئے ''افسانہ نگار منٹو'' کو بیدار کیا تھا۔''[۱۴۶]

''فری تھنکرز'' کے نام سے بنائے جانے والی تنظیم، اس کا نصب العین، دوسروں کو بے وقوف بنانے کے واقعات اور اس کے شیرازہ بکھرنے کے ذکر کے بعد اُنھوں نے وکٹر ہیوگو کی کتاب The last days of Condemned کے علاوہ روسی افسانوں کے تراجم کو بھی معیاری قرار دیا۔ ''منٹو کے نام'' احمد ندیم قاسمی کا مضمون ہے جو ''کھلا خط'' کے عنوان سے سب سے پہلے دوماہی ''سنگ میل'' پشاور میں شائع ہوا۔ اس خط میں احمد ندیم قاسمی نے ترقی پسند مصنّفین کے ترجمان کی حیثیت سے سعادت حسن منٹو اور محمد حسن عسکری کے ''گٹھ جوڑ'' پر کڑی تنقید کرتے ہوئے منٹو کو حسن عسکری کے جال سے نکل کر انجمن ترقی پسند مصنّفین کی باگ ڈور سنبھالنے کی دعوت دی۔ منٹو سے زیادہ اس میں محمد حسن عسکری کا تذکرہ ذکر کیا گیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے خیال میں حسن عسکری ترقی پسندوں کی صف میں دراڑیں ڈالنے کے لیے منٹو کے قریب ہوا ہے کیوں کہ قیامِ پاکستان کے بعد بچ جانے والے ادیبوں میں منٹو کی اہمیت مسلم ہے۔ اس حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''تنقید کی چٹان سے اچانک جو منٹو کے فنی کمالات کا فوارہ بلند ہوا ہے تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ محمد حسن عسکری کو آپ سے ایک ضروری کام ہے اور وہ ہے ترقی پسندوں کی صفوں میں انتشار۔''[۱۴۷]

احمد ندیم قاسمی نے اس کھلے خط میں انھی خیالات کی ترجمانی کی ہے جو کم و بیش تمام ترقی پسندوں کے اس سلسلہ میں تھے۔ حسن عسکری کی ترقی پسندوں کے ساتھ نظریاتی جنگ اعلانیہ طور پر جاری تھی۔ چناں چہ سعادت حسن منٹو کی صورت میں حسن عسکری کو ایک بہت ہی مضبوط سہارا مل گیا تھا۔ یہ حسن عسکری کی حکمت عملی ہو یا محض اتفاق، ترقی پسند تحریک کے لیے یہ اشتراک ناقابل برداشت تھا۔ چناں چہ محمد حسن عسکری کے ساتھ ساتھ منٹو بھی موردِ الزام ٹھہرائے گئے۔ منٹو کا ادبی بائیکاٹ کیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ اسے ترقی پسند تحریک میں شامل کرنے کی کوششیں بھی جاری کر دی گئیں۔ یہ کھلا خط بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے اس کھلے خط پر منٹو بہت برہم ہوا اور اس کا پہلا ردِ عمل یہ تھا کہ ''تم نے میرے نام کھلی چٹھی لکھی ہے میں تمہارے نام بند لفافہ بھیجوں گا۔''

خط میں محمد حسن عسکری کا تذکرہ اتنے تواتر سے کیا گیا ہے کہ یہ محسوس ہوتا ہے جیسے منٹو کو محض مخاطب ہی کیا گیا ہے و گرنہ اصل میں تو حسن عسکری کو ہی اس خط میں رگیدا گیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ فتح محمد ملک نے اس خط کو حسن عسکری کی نثری ہجو قرار دیا تھا؟ سعادت حسن منٹو اس کھلے خط کو نہ بھول سکے۔ چناں چہ احمد ندیم قاسمی کے ساتھ اس کے تعلقات واجبی سے رہ گئے۔ محمد سعید نے اپنے مضمون ''سعادت حسن منٹو اور محمد حسن عسکری کا اُردو ادب'' میں احمد ندیم قاسمی کے اس بیان سے اختلاف کیا کہ منٹو نے یہ خط پڑھنے کے بعد مجھ سے اتفاق کیا تھا اور ناراضی ختم کر دی تھی۔ محمد سعید نے دو تحریروں کے اقتباس پیش کر کے یہ خیال ظاہر کیا کہ احمد ندیم قاسمی کی یہ رائے درست نہیں کیوں کہ اس کھلے خط کے بعد ان کے تعلقات کی نوعیت کچھ اس قسم کی تھی۔ احمد ندیم قاسمی جولائی /اگست ۱۹۴۹ء کے اپنے ایک خط میں منٹو کو لکھتے ہیں:

> ''یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں ۲۴ اپریل سے علیل ہوں۔۔۔۔۔اس امر کا مجھے افسوس رہا کہ آپ مجھے پوچھنے تک نہ آئے۔''[۱۴۸]

اسی ضمن میں ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو جو منٹو کے مضمون جیب کفن سے لیا گیا ہے:

> ''مجھے غصہ تھا اس کا نہیں کہ الف نے مجھے کیوں غلط سمجھا۔ مجھے غصہ تھا، اس بات کا کہ الف نے محض فیشن کے طور پر ایک سقیم و عقیم تحریک کی انگلی پکڑ کر بیرونی سیاست کے مصنوعی ابرو کے اشارے پر میری نیت پر شک کیا اور مجھے اس کسوٹی پر پرکھا جس پر صرف ''سرخی'' ہی سونا تھی۔''[۱۴۹]

محمد سعید نے اپنے مضمون میں یہ دونوں اقتباسات پیش کرنے کے بعد احمد ندیم قاسمی کی اس رائے سے اختلاف کیا جس میں اُنھوں نے منٹو کی ناراضی کے دُور ہونے کا عندیہ سنایا تھا۔ ان کے مطابق:

> ''منٹو کے اس اقتباس میں ''الف'' سے مراد احمد ندیم قاسمی ہی ہیں۔ ان کا نام لینے یا لکھنے کی بجائے اس کی جگہ صرف ''الف'' لکھنا بے وجہ اور سرسری بات نہیں ہے گویا منٹو کی ان سے ناراضی کا عالم یہ ہے کہ وہ ان کا پورا نام لکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔''[۱۵۰]

احمد ندیم قاسمی کے اس کھلے خط کے بعد ''منٹو کے نام دو خطوط'' میں جاوید اقبال اور عبدالسلام خورشید کے خطوط شائع کیے گئے ہیں۔ جاوید اقبال نے اپنے خط میں حسن عسکری اور منٹو کے تعلق کو پاکستان کے لیے مفید قرار دیا۔ یہ خط ۱۲ اگست ۱۹۴۹ء کو لکھا گیا

تھا جب کہ عبدالسلام کو خورشید ترقی پسند ہونے کے باوجود ترقی پسندوں کی پالیسیوں سے نالاں دکھائی دیتے ہیں۔ اُنھوں نے اس خط میں ترقی پسند تحریک کی طرف سے ادیبوں کے بائیکاٹ کی کہانی بھی درج کی ہے۔ اُنھوں نے ''اُردو ادب'' میں مضمون نہ لکھنے کی وجہ ترقی پسند تحریک کو قرار دیا جس نے اپنے ممبران پر منٹو اور عسکری کے رسالہ میں مضمون شائع نہ کرانے کی پابندی لگا رکھی تھی۔ عبدالسلام خورشید نے یہ خط ۲۰ اگست ۱۹۴۹ء کو لکھا تھا۔ یہ دونوں خطوط دو ماہی اُردو ادب کے دوسرے شمارے میں خطوط کے حصہ ''خطوط وحدانی''، صفحہ ۳۱۱، ۳۲۰ پر ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئے۔

''سعادت حسن منٹو: ایک مطالعہ''، انیس ناگی:

''سعادت حسن منٹو۔ ایک مطالعہ'' ڈاکٹر انیس ناگی نے مرتّب کی۔ جسے مقبول اکیڈمی نے ۱۹۹۱ء میں لاہور سے شائع کیا۔ مرتّب نے مختلف ادبی رسائل میں شائع ہونے والے تنقیدی مضامین میں سے تئیس (۲۳) کا انتخاب کر کے زیر نظر کتاب کی صورت میں پیش کیا۔ ان مضامین کے علاوہ ''منٹو کی کتابیں'' کے عنوان سے منٹو کے افسانوی مجموعوں کا کیٹلاگ/اشاریہ بھی اس کتاب میں شامل ہے۔

عصمت چغتائی کا مضمون ''مرا دوست میرا دشمن''، ابو سعید قریشی ''رحم دل دہشت پسند''، سید عابد علی عابد ''گنجا فرشتہ''، احمد ندیم قاسمی ''منٹو کی چند یادیں اور خطوط''، محمد حسن عسکری ''منٹو کا مقام'' اور ممتاز شیریں کا مضمون ''منٹو کی فنی تکمیل'' اس سے قبل ادبی رسالہ ''نقوش'' کے منٹو نمبر ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئے تھے جب کہ ''سعادت حسن منٹو'' از حنیف رامے، ''موذیل ایک پرسنل کہانی'' از افتخار جالب، ''منٹو کے تین افسانے'' از انیس ناگی''، ''منٹو اور انسان دوستی'' از انیس ناگی''، ''نیا قانون۔ ایک تجزیہ'' از ڈاکٹر آغا سہیل، ''منٹو اور اس کا عہد'' از اصغر ندیم سیّد، ''منٹو کی خاکہ نگاری'' از احمد عقیل روبی اور ڈاکٹر سعادت سعید کا مضمون ''منٹو پر ایک تحقیقی مقالہ'' اس سے قبل مصنف کے نجی رسالے ''دانشور'' کے منٹو نمبر میں شائع ہوئے۔ اس طرح نقوش اور دانشور کے منٹو پر شائع کردہ خصوصی شماروں سے لیے گئے مضامین کی مجموعی تعداد پندرہ ہے۔[۱۵۱]

ان پندرہ مضامین کے علاوہ دیگر آٹھ مضامین میں ''منٹو ایک انسان'' از احمد شجاع پاشا، ''سعادت حسن منٹو'' از کرشن چندر، ''منٹو کے نام'' از احمد ندیم قاسمی، ''افسانہ ساز منٹو'' از مظفر علی سید ''منٹو کے مضامین، انشایئے اور خاکے'' از ڈاکٹر برج پریمی، ''منٹو پر مقدمات'' از جگدیش چندر رودھاون، ''منٹو اور ممتاز شیریں'' از قاضی جاوید شامل ہیں۔ کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، باری علیگ اور احمد شجاع پاشا کے مضامین اس سے پہلے ضیا ساجد کی مرتّب کردہ کتاب ''سعادت حسن منٹو'' میں شائع ہوئے۔[۱۵۲]

مظفر علی سیّد کا مضمون ''افسانہ ساز منٹو'' حلقہ اربابِ ذوق کی گولڈن جوبلی کے موقع پر پہلی بار لاہور میں پڑھا گیا تھا۔ بعد میں یہی مضمون ماہنامہ ''سپوتنک''، منٹو نمبر، فروری ۱۹۹۴ء میں بھی اشاعت پذیر ہوا۔ مضمون چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں اُنھوں نے منٹو پر کیے جانے والے تحقیقی و تنقیدی سرمائے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ معاصر افسانہ نگاروں میں جتنا تنقیدی کام منٹو پر ہوا وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آیا لیکن اس کے باوجود سعادت حسن منٹو کی مخالفت کسی نہ کسی سطح پر پہلے بھی کی جاتی تھی اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ لکھتے ہیں:

"ہماری یونیورسٹیوں میں اور سرکاری سطح پر منٹو ابھی تک شجر ممنوعہ ہے اور سیاسی سطح پر لفٹ ہو یا رائٹ، علی سردار جعفری ہوں یا نعیم صدیقی اب تک اسے غلاظت نگار کہتے جا رہے ہیں۔" [۱۵۳]

اُنھوں نے موقف اختیار کیا کہ محض چودھری محمد حسین پر مخالفت کی تمام تر ذمہ داری نہیں ڈالی جا سکتی کیوں کہ منٹو کی مخالفت محض حکومتی ایما کا نتیجہ نہیں تھی۔ اس حوالے سے ان کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑے گا کہ:

"پنجاب کے اخبار تو چودھری صاحب کی مٹھی میں تھے لیکن دہلی اور بمبئی کے اخبارات نے کس کے زیر اثر یہی پراسی کیوشن اختیار کی اور پھر انجمن ترقی پسند مصنّفین کے عہدے داروں نے یہی رویہ کیوں اختیار کیا۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور مولانا ماہر القادری کی مخالفت کو کس کھاتے میں ڈالا جائے جو منٹو کی موت کے بعد مزید شدت اختیار کر گئی۔" [۱۵۴]

مصنف کے نزدیک منٹو کسی بھی ادبی یا سیاسی تنظیم کے قواعد و ضوابط کا پابند نہیں رہا۔ اُنھوں نے حلقہ ارباب ذوق میں بھی مضامین پڑھے اور اجلاسوں میں شرکت کرتے رہے۔ حسن عسکری اور ممتاز شیریں کی پاکستانیت اور اسلامیت سے بھی ان کا رشتہ رہا۔ حتیٰ کہ ترقی پسند تحریک کے قیام سے قبل ہی وہ اپنا ترقی پسند نقطۂ نظر اپنی تخلیقات اور تراجم کی صورت میں سامنے لا چکے تھے۔ اُنھوں نے منٹو کو انجمن ترقی پسند مصنّفین اور حلقہ اربابِ ذوق کی ہراول شخصیت قرار دیا۔ مضمون کے دوسرے حصے میں مضمون نگار نے سجاد ظہیر اور پریس برانچ کے اعتراضات کو ایک ہی نوعیت کا قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ خیال درست نہیں کہ منٹو نے جنس سے متعلق افسانے ضد میں آ کر لکھے اور اگر اُن کے سیاسی افسانوں پر مقدمات چلائے جاتے تو وہ سیاسی نوعیت کے افسانے لکھتے۔

مضمون نگار نے وزیر آغا کے اس بیان کو بھی غلط قرار دیا جس میں اُنھوں نے منٹو کو طوائف کے مسائل کے بیان میں محدود وژن کا حامل قرار دیا تھا۔ مضمون کے تیسرے اور چوتھے حصے میں منٹو کے فن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

"منٹو کے مضامین، انشائیے اور خاکے" ڈاکٹر برج پریمی کا مضمون ہے۔ یہ مضمون ان کے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے "سعادت حسن منٹو، حیات اور کارنامے" میں چوتھے باب کی صورت میں شامل ہے۔ زیر نظر کتاب میں اسے تلخیص شدہ صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر برج پریمی نے منٹو کے مضامین کو تین حصوں، ادبی مضامین، سیاسی و سماجی مضامین اور فلمی مضامین میں تقسیم کرتے ہوئے منٹو کے مختلف رسائل اور کتابی صورتوں میں شائع ہونے والے مضامین کا گوشوارہ سنین کے اعتبار سے پیش کیا ہے۔

جگدیش چندر ودھاون کا مضمون "منٹو پر مقدمات" مضمون نگار کی کتاب "منٹو نامہ" میں شامل ہے۔ اس مضمون میں اُنھوں نے منٹو کے پانچ افسانوں "کالی شلوار"، "بُو"، "کھول دو"، "ٹھنڈا گوشت" اور "اوپر نیچے اور درمیان" پر چلنے والے مقدمات کی روداد بیان کی ہے۔

قاضی جاوید کا مضمون "منٹو اور ممتاز شیریں" دراصل ایک تبصرہ ہے جو اُنھوں نے ممتاز شیریں کی کتاب "نوری نہ ناری" کی اشاعت اوّل کے بعد لکھا۔ اس مضمون میں ترقی پسندوں کی حسن عسکری کے نظریات سے روایتی اختلافات کی بحث اور ممتاز شیریں کو حسن عسکری کا پیروکار ثابت کرنے کے بعد ممتاز شیریں کے بنائے گئے تعقلاتی نظام کو جو اُنھوں نے منٹو کے مطالعہ کے لیے قائم کیا، رَد کرتے ہوئے کہا کہ یہ تعقلاتی نظام جو ڈی ایچ لارنس سے مستعار ہے بے حد کمزور اور بودہ ہے۔ مزید یہ کہ یہ سارا نظام سامی مذاہب سے

مستعار ہے اور محض یہی حقیقت اسے کسی جنوبی ایشیائی تخلیقی ادیب کو سمجھنے کے لیے غیر متعلق بنا دیتی ہے۔ منٹو کو سمجھنے یا سمجھانے کے لیے ڈی ایچ لارنس کے نظام کی بجائے ہندوستان کے نوآبادیاتی نظام کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

قاضی جاوید کے اعتراضات درست سہی لیکن منٹو کے معاملہ میں ممتاز شیریں کے مضامین کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ممتاز شیریں وہ پہلی نقاد ہیں جنھوں نے منٹو کا باضابطہ مطالعہ ایک وسیع تناظر میں کیا اور ان کے کرداروں کا تقابل مغربی افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کے ساتھ کیا۔ منٹو کو ہندوستانی پس منظر میں سمجھنے کی روایت بہت مضبوط ہے اور درجنوں ناقدین نے اس پس منظر میں ان کے افسانوں کا جائزہ لیا ہے۔ ممتاز شیریں کے فریم آف ورک سے لاکھ اختلافات کے باوجود اس کی انفرادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہ ان کی کتاب کی اہمیت ہے۔

ان مضامین کے بعد آخر میں منٹو کی کتابیں کے عنوان سے مرتّب کی پیش کردہ فہرست شامل کی گئی ہے جس میں منٹو کے افسانوی مجموعوں کا کیٹلاگ اس سے پہلے ان کی کتاب ''سعادت حسن منٹو'' میں بھی شائع ہو چکا ہے۔[۱۵۵] مجموعی طور پر کتاب میں شامل چوبیس مضامین میں سے بیس مضامین مختلف کتب اور رسائل میں اس کتاب کی اشاعت سے قبل شائع ہو چکے ہیں۔ بہتر ہوتا اگر مرتّب ان ماخذات کی نشان دہی بھی کر دیتے۔ لیکن منٹو پر مرتّب کی جانے والی بیشتر کتابوں میں یہی صورت حال سامنے آتی ہے اور کم و بیش سبھی مرتّبین نے اپنے ماخذات کی نشان دہی سے گریز کیا ہے۔

''منٹو ایک کتاب''، صہبا لکھنوی:

ماہنامہ ''افکار'' کراچی کے مدیر صہبا لکھنوی نے منٹو کی شخصیت اور فکر و فن پر کتاب مرتّب کرتے ہوئے اس کا نام ''منٹو ایک کتاب'' تجویز کیا۔ مکتبہ افکار نے ۱۰۵/سی، نیشنل آٹو پلازہ، مارسٹن روڈ کراچی سے ۱۹۹۴ء میں اسے شائع کیا۔ کتاب میں شامل مواد کا بیشتر حصہ ''افکار'' کے منٹو نمبر سے لیا گیا ہے۔ پیش کش کی ترتیب میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس میں چند نئے مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں۔ کتاب کو چھے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ مرتّب کے معروضات اور ڈاکٹر حنیف فوق کے مضمون کے علاوہ تاثرات، اخبارات میں شائع ہونے والے اداریوں اور فلمی حلقے کے منٹو کی موت سے متعلق کیے گئے اظہارِ خیالات کا مجموعہ ہے۔ کتاب کا دوسرا حصہ ''ماتم یک شہر آرزو'' برصغیر پاک و ہند کے شعرا کی منٹو کی موت پر لکھی جانے والی نظموں اور اشعار پر مشتمل ہے۔ تیسرے حصہ ''منٹو کا ایک نایاب مضمون'' میں منٹو کی تحریر ''منٹو اپنے ہم زاد کی نظر میں'' کے علاوہ صہبا لکھنوی کا مضمون شامل ہے۔ چوتھے حصہ ''فرشتہ'' میں منٹو کی شخصیت پر لکھے گئے چھے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ ''رتی ماشہ تولہ'' میں منٹو کے فن پر لکھے گئے نو(۹) مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے جب کہ آخری حصہ ''موم بتی کے آنسو'' میں منٹو کی وفات کے فوراً بعد لکھے گئے معاصرین کے تاثراتی مضامین شامل ہیں جن کی تعداد پندرہ ہے۔ کتاب ۴۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر حنیف فوق کا مضمون ''منٹو اور سخن ہائے گفتنی'' دیباچے کے طور پر شامل ہے۔ اُنھوں نے اس میں منٹو کی شخصیت اور فکر و فن کا مختلف پہلوؤں سے تفصیلی جائزہ اور کتاب میں شامل مضامین کا سرسری تعارف پیش کرنے کے بعد زیر نظر کتاب کو منٹو شناسی کے ذیل میں ایک سنگ میل قرار دیا۔ ''ناخن کا قرض''، ''اخبارات کا اظہار غم'' اور ''سوگ میں ہے فسانہ گوئی آج'' کے تحت منٹو کی وفات کے بعد اس کے معاصرین کے تاثرات، اخبارات میں شائع ہونے والے تبصروں اور مضامین کے علاوہ فلمی دنیا کے مختلف شعبوں

سے وابستہ افراد کی آرا شامل کی گئی ہیں۔ یہ تاثرات، تراشے، تبصرے اور مضامین ''افکار'' کے منٹو نمبر ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئے تھے۔[۱۵۶]

''ماتمِ یک شہر آرزو'' برصغیر پاک و ہند کے شعرا کا منٹو کو منظوم خراجِ عقیدت ہے اس میں دس (۱۰) شعرا کا کلام شامل ہے۔ یہ حصہ بھی ''افکار'' ہی سے مستعار لیا گیا ہے۔[۱۵۷] تیسرا حصہ بعنوان ''منٹو کا ایک نایاب مضمون'' بھی افکار ہی کے منٹو نمبر کی دین ہے۔[۱۵۸] البتہ کتاب کے چوتھے حصہ ''فرشتہ'' میں شامل تمام مضامین ''افکار'' کی بجائے دیگر رسائل و کتب سے منتخب کیے گئے ہیں۔ اس حصہ میں شامل چھے مضامین منٹو کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ''میرا دوست میرا دشمن'' از عصمت چغتائی، ''رحمت دل دہشت پسند'' از ابو سعید قریشی، ''منٹو کی چند یادیں اور چند خطوط'' از احمد ندیم قاسمی اور اوپندر ناتھ اشک کا مضمون ''منٹو میرا دشمن'' سب سے پہلے ''نقوش'' کے منٹو نمبر ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئے۔''[۱۵۹]

نصر اللہ خان نے اپنے خاکہ نما مضمون ''سعادت حسن منٹو'' میں منٹو کے ساتھ گزارے گئے زمانہ طالب علمی کی بہت سی یادوں کو یک جا کیا ہے اور یہی اس مضمون کی انفرادیت ہے۔

منٹو کی وضع قطع بیان کرنے کے بعد مضمون نگار نے منٹو کی اسکول میں گزاری گئی زندگی کے بہت سے واقعات اور ذہنی رجحانات پر بہت عمدہ گفتگو کی ہے۔ سکول میں منٹو کی شرارتیں، نصاب کی بجائے ناول پڑھنا، اُردو میں فیل ہونا جب کہ ہر وقت عامیانہ انداز میں انگریزی بولنا، گھر سے بھاگنا غرض منٹو کے زمانۂ طالب علمی کی ایک عمدہ تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے اور یہی اس مضمون کی خاص بات ہے۔ یہ مضمون ان کے خاکوں کی کتاب ''کیا قافلہ جاتا ہے'' مکتبہ تہذیب و فن کراچی، ۱۹۸۴ء میں بھی شامل ہے۔ دو مقامات پر مضمون نگار کی آرا سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ منٹو کے کیے گئے تراجم پر تبصرہ کرتے ہوئے نصر اللہ خان لکھتے ہیں:

۱۔ ''انھی دنوں منٹو نے وکٹر ہیوگو کے مشہور ناول ''لامزرے با'' کا ترجمہ ''سرگزشت اسیر'' کے نام سے کیا۔''[۱۶۰]

۲۔ ''ادھر شاہد صاحب سے ملاقات کی اور ساقی کا فرانسیسی نمبر چھاپ مارا۔''[۱۶۱]

ان دونوں مقامات پر مضمون نگار سے سہو ہوا ہے۔ منٹو نے وکٹر ہیوگو کے ناول"The Last Days of Condemned" کا اُردو ترجمہ ''سرگزشت اسیر'' کے نام سے کیا تھا جسے اُردو بک سٹال، لاہور نے ۱۹۳۳ء میں شائع کیا تھا۔ اسی طرح ساقی کا فرانسیسی ادب نمبر بھی منٹو نے ایڈٹ نہیں کیا تھا۔ اسی کتاب میں شامل شاہد احمد دہلوی (مدیر ساقی) کے مضمون ''منٹو'' کے آغاز میں ہی شاہد احمد دہلوی نے لکھا ہے کہ منٹو نے ''ساقی'' کا فرانسیسی نمبر مرتّب کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا جسے وہ ٹال گئے تھے۔[۱۶۲]

''رتی، تولہ، ماشہ'' ایسے مضامین کا انتخاب ہے جن میں منٹو کی تخلیقات کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے۔ نو تنقیدی مضامین پر مشتمل اس حصے میں شامل مندرجہ ذیل چار مضامین اس سے قبل ''نقوش'' کے منٹو نمبر میں شائع ہو چکے ہیں۔ ''منٹو کا مقام'' از محمد حسن عسکری ''منٹو کا فن'' از پروفیسر وقار عظیم ''سعادت حسن منٹو کی یاد میں'' از پروفیسر ممتاز حسین اور منٹو کی حقیقت نگاری'' از عبادت بریلوی[۱۶۳] پروفیسر وقار عظیم کے دوسرے مضمون ''بدنام منٹو'' کے علاوہ ممتاز شیریں کا مضمون ''منٹو ایک فنکار'' اس سے قبل ماہنامہ ''افکار'' کے منٹو نمبر میں شائع ہوئے تھے۔[۱۶۴] دیگر تین مضامین میں الطاف گوہر کا مضمون ''ایک اور صنم'' اس سے پہلے ان کی کتاب ''تحریریں چند'' مطبوعات حرمت، اسلام آباد سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا تھا۔ یہی مضمون سہ ماہی ''ادبیات''

اسلام آباد، شمارہ ۱۶، جلد ۴۶، ۲۰۰۴ء کے علاوہ ''ماہِ نو'' کراچی، ۱۹۵۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون میں مضمون نگار نہ صرف منٹو پر کڑی تنقید کرتے دکھائی دیتے ہیں بلکہ شروع سے آخر تک اُن کا لہجہ /اُسلوب مکمل طنزیہ ہے۔ الطاف گوہر نے منٹو کو تحسین وستائش کا خواہاں، لیڈر شپ کا شوقین، مصلح قوم اور باغیانہ مزاج کا حامل قرار دیتے ہوئے کہا کہ منٹو کو ان تمام چیزوں کے حصول کی خواہش تھی۔ اپنی تحسین وستائش کے لیے اس نے طرح طرح کے ڈھونگ رچائے اور زبردستی اپنی عزت کروانے کی کوشش کی۔ اُنھوں نے مزید لکھا کہ منٹو کے اندر چوں کہ لیڈرانہ صلاحیتیں نہیں تھیں چناں چہ وہ کوئی ادبی یا سیاسی تنظیم نہ بنا سکا۔ اس لیے اس کی شخصیت کے اہم مطالبے کی تسکین نہ ہو سکی۔ لکھتے ہیں:

> ''وہ (منٹو) نہ کوئی ادبی جماعت بنا سکا اور نہ کسی سیاسی تحریک کی رہنمائی کر سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ منٹو کے پاس کوئی ایسا نظامِ فکر نہ تھا جو کسی سیاسی یا ادبی تحریک کا باعث بن سکتا۔'' [۱۶۵]

منٹو کے مضامین اور خاکوں کو وہ جذباتیت کا حامل اور فکری گہرائی سے یکسر عاری قرار دیتے ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے وہ منٹو کے افسانوں کو چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:

۱۔ علمی یا فکری موضوع سے متعلق افسانے	۲۔ فسادات سے متعلق افسانے
۳۔ جنس سے وابستہ افسانے	۴۔ مخصوص ماحول اور کردار کے افسانے

منٹو نے جنسی افسانے لکھ کر اپنی انفرادیت قائم کرنے کی کوشش کی ہے اور جنسی موضوعات پر ان کے افسانے قاری کو لذت بہم پہنچاتے ہیں۔ اس موضوع کے ذریعے منٹو نے شہرت تو حاصل کر لی لیکن اس کی مصلح قوم بننے کی خواہش کو کچوکے لگتے رہے۔ مضمون نگار ''سوگندھی'' کو منٹو کا واحد اچھا کردار قرار دیتے ہیں۔

الطاف گوہر کے الزامات روایتی نوعیت کے ہیں۔ اس قسم کے اعتراضات کا جواب خود منٹو نے بھی کئی مقامات پر دیا ہے اور ان کے ناقدین نے بھی۔ اگر یہ الزامات درست ہوتے تو منٹو اب قصہ پارینہ ہو چکا ہوتا جیسے کہ اس کے ساتھ کے کئی افسانہ نگار۔ موت کے تریسٹھ برس بعد اب جس طرح منٹو کی از سرِ نو دریافت کا عمل شروع ہو چکا ہے اس سے ثابت ہے کہ وقت ہی سب سے بڑا منصف ہوتا ہے۔

جگدیش چندر ودھاون کے مضامین ''فن کے تین ادوار'' اور ''تخلیقی اُسلوب اور طریقہ کار'' ان کی کتاب ''منٹو نامہ'' سے لیے گئے ہیں۔ [۱۶۶] کتاب کا آخری حصہ ''موم بتی کے آنسو'' پندرہ (۱۵) تاثراتی مضامین پر مشتمل ہے جو منٹو کی وفات کے بعد اُن کے معاصرین نے لکھے۔ ''خالی بوتل بھرا ہوا دل'' از کرشن چندر، ''دیکھ کبیرا رویا'' از قرۃ العین حیدر، ''بدزبان'' از سردار جعفری، ''سیاہ حاشیے'' از ظ انصاری'' اٹھاؤ بوتل اور چلو منٹو کے پاس'' از ابراہیم جلیس، ''بے غیرتی'' از ضیا الحسن مولوی، ''منٹو کے آخری ایام'' از سید اکمل علیمی اور صہبا لکھنوی کا مضمون ''اُردو کا نڈر اور بے باک افسانہ نگار'' سب سے پہلے افکار منٹو نمبر میں شائع ہوئے۔ [۱۶۷] جب کہ غلام عباس کا مضمون ''منٹو کی موت'' اور ہاجرہ مسرور کا مضمون ''جو بِک نہ سکا'' اس سے قبل نقوش کے منٹو نمبر میں شائع ہوئے تھے۔ [۱۶۸]

قدرت اللہ شہاب نے ''ادب اور میلہ مویشیاں'' بزم افکار کے زیر اہتمام ''یوم منٹو'' کی تقریب منعقدہ کراچی میں پڑھا۔ بقول مرتّب زیرِ نظر کتاب میں اسے پہلی بار شائع کیا جارہا ہے۔ قدرت اللہ شہاب کے مطابق اپنی زندگی میں منٹو ایک ادیب تھا، لیکن مرنے کے بعد وہ ایک ادارہ بن گیا ہے۔ اُنھوں نے اظہار افسوس کیا کہ جیتے جی فنکاروں کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا لیکن مرنے کے بعد ہماری آنکھیں کھلتی ہیں۔ کیا شہرت اور پذیرائی کے لیے فنکاروں کو اپنی موت کا خواہش مند ہونا پڑے گا۔

حامد جلال نے ''کالا دودھ'' کے آغاز میں منٹو کی کہانیوں کے انتخاب کا انگریزی زبان میں ترجمہ کی اشاعت کے اعلان کے ساتھ بتایا کہ منٹو سے خونی رشتے کے ساتھ ساتھ دونوں کے درمیان ادبی رشتہ بھی تھا۔ حامد جلال نے منٹو کی زندگی میں ہی ان کی کہانیوں کے تراجم کرنا شروع کر دیے تھے۔ ان کے مطابق اس مجموعے کا نام منٹو ہی کی تجویز پر ''کالا دودھ'' (Black Milk) رکھا گیا ہے۔ اس مضمون میں اُنھوں نے منٹو کی شخصیت اور فن دونوں پر گفتگو کی۔

اخباری تبصروں، مضامین، منظوم کلام اور شخصیت و فن پر صہبا لکھنوی کی مرتّب کردہ کتاب میں شامل مضامین و تاثرات صرف ادبی دنیا سے وابستہ لوگوں تک ہی محدود نہیں بلکہ صحافتی اور فلمی حلقوں میں منٹو کی موت پر پائے جانے والے اضطراب کو بھی تبصروں اور تراشوں کی صورت میں شامل کیا گیا ہے۔ مرتّب نے ماخذات کے متعلق محض اتنی ہی تفصیل دی ہے کہ اُنھوں نے ''افکار'' کے منٹو نمبر میں شامل مواد کو شروع میں ہی دے دیا ہے لیکن دیگر مضامین کے ماخذات کی اُنھوں نے نشان دہی نہیں کی۔ خصوصاً وہ مضامین جو ''نقوش'' کے منٹو نمبر میں شائع ہوئے تھے اور کتاب میں ان کی تعداد دس (۱۰) ہے۔ کرشن چندر کے نام سے شائع ہونے والے مضمون ''خالی بوتل بھرا ہوا دل'' کے ساتھ ابراہیم جلیس کے مضمون ''اٹھاؤ بوتل اور چلو منٹو کے پاس'' کا متن درج ہو گیا ہے۔ اسی طرح ابراہیم جلیس کے نام سے کرشن چندر کے مضمون کا متن شائع کر دیا گیا ہے۔

''دائیں بائیں اوپر نیچے (منٹو فن و شخصیت)''، فرید احمد:

''دائیں بائیں اوپر نیچے'' منٹو کی شخصیت اور فن پر فرید احمد کی مرتّب کردہ کتاب ہے۔ اسے المسلم پبلی شرز' اُردو بازار کراچی نے ۱۹۹۵ء میں شائع کیا۔ بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ مرتّب نے منٹو کے افسانے ''اوپر نیچے اور درمیان'' کی مناسبت سے عنوان تجویز کیا ہوگا مگر ''پیش گفتار'' میں مرتّب نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ کتاب کا نام خلیجی جنگ میں اتحادی فوجوں کے کمانڈر جنرل نارمن شوارزکوف کی بریفنگ کے الفاظ سے اخذ کیا گیا ہے جس میں اُنھوں نے کہا تھا کہ ''ہم اوپر نیچے دائیں بائیں ہر طرف سے عراقی فوجیوں پر حملہ کریں گے۔'' [۱۶۹]

ابو سعید قریشی کے ''تعارف'' اور مرتّب کے پیش گفتار کے علاوہ کتاب چار حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلے حصہ ''مضامین'' میں مرتّب کے چار مضامین شامل ہیں۔ دوسرا حصہ ''انٹرویوز'' میں منٹو کے سات معاصرین کے انٹرویو شامل کیے گئے ہیں۔ ''ریفریشمنٹ'' کتاب کا اگلا حصہ ہے اور اس میں تین مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے جب کہ آخری حصہ ''انتظاریہ'' میں چار انٹرویوز کے علاوہ فرید احمد کا ایک وضاحتی مضمون شامل ہے۔

کتاب کا پہلا حصہ ''مضامین'' مرتّب کے چار مضامین ''چچا سام کے نام ایک خط''، ''مصورِ حیات کا ادبی سفر''، ''پانچ مقدمے، ایک آدمی'' اور ''ٹھنڈا گوشت عدالتی نظائر کی روشنی میں'' پر مشتمل ہے۔ پہلے مضمون ''چچا سام کے نام ایک خط'' میں

مرتّب نے منٹو کے اُسلوب میں ایک بھانجے کی طرف سے امریکی پالیسیوں کا خاکہ اُڑایا ہے۔ منٹو کے چچاسام کے نام لکھے گئے خطوط کو بار بار پڑھنے کے دعویٰ اور انھی کے اُسلوب میں اپنے خیالات کو ڈھالنے کے باوجود مرتّب ان خطوط کی تعداد سات (۷) بتاتے ہوئے۔ لکھتے ہیں:

''یہ خطوط ۱۶ دسمبر ۵۱ء سے ۲۶ اپریل ۵۴ء کی تاریخوں میں شائع ہوئے جن کی تعداد سات ہے۔'' [۱۷۰]

منٹو نے چچاسام کے نام جو خطوط لکھے تھے ان کی تعداد نو (۹) ہے اور یہ ان کے مجموعہ ''اوپر نیچے اور درمیان'' میں شامل ہیں۔ منٹو کے اُسلوب کو اختیار کرنا تو شاید ممکن ہے اور مرتّب نے اس خط کے ذریعے اسے پایۂ تکمیل تک بھی پہنچایا لیکن خیال اور جملوں کی وہ بندش جس میں طنز کے نشتر چھپے ہوتے ہیں اور جو منٹو کی تحریروں کا خاصا ہے، مرتّب کے ہاں ناپید ہے۔

''مصورِ حیات کا ادبی سفر'' منٹو کی شخصیت اور فن پر عمومی تبصرہ ہے۔ اس میں فرید احمد نے منٹو کی انانیت، شراب نوشی، معاشی پس ماندگی اور قلم کے ذریعے روزگار کے حصول پر گفتگو کی۔ ''پانچ مقدمے ایک آدمی'' میں منٹو کے افسانوں ''کالی شلوار''، ''دھواں''، ''بُو''، ''ٹھنڈا گوشت'' اور ''اوپر نیچے اور درمیان'' پر چلنے والے مقدمات کی روداد پیش کرتے ہوئے سعادت حسن منٹو کو پیش آنے والی مشکلات اور فحاشی کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ملتی ہے۔

''ٹھنڈا گوشت عدالتی نظائر کی روشنی میں'' بھی اسی سلسلہ کی توسیعی صورت ہے۔ ان دونوں مضامین میں مرتّب نے ان افسانوں کے متعلق محض پہلے سے شائع شدہ معلومات پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ عدالت کے ججوں سمیت وکلا اور گواہان صفائی واستغاثہ کے فیصلہ جات اور آرا کا بھی تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ عالمی سطح پر فحاشی کے مقدمات کے تحت کے گئے فیصلہ جات کا منٹو کے افسانہ ''ٹھنڈا گوشت'' کے فیصلے سے تقابل بھی کیا گیا ہے۔ دونوں مضامین مقدمات کے سلسلہ میں اہمیت کے حامل ہیں اور اُنھیں منٹو کے مقدمات کا تجزیاتی مطالعہ کہا جائے تو چنداں غلط نہ ہوگا۔

کتاب کا دوسرا حصہ انٹرویوز پر مشتمل ہے۔ ابو سعید قریشی، حسن بانو جمیل، نصراللہ خان، احمد شریف، جی ایم اثر، حمید کاشمیری اور مہدی علی صدیقی نے اپنے اپنے تعلقات کی روشنی میں منٹو کی شخصیت پر گفتگو کی۔ حمید کاشمیری اور مہدی علی صدیقی کے علاوہ دیگر شخصیات سے لیے گئے انٹرویو مرتّب کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے ماہنامہ ''پہچان'' کے مختلف شماروں میں اشاعت پذیر ہوئے جنھیں بعد میں زیر نظر کتاب کا حصہ بنا دیا گیا۔

منٹو کے افسانہ ''اوپر نیچے اور درمیان'' پر کراچی میں مہدی علی صدیقی کی عدالت میں فحاشی کا مقدمہ چلایا گیا تھا۔ مہدی علی صدیقی نے اپنے انٹرویو میں اس مقدمے کی روداد کے علاوہ منٹو کے افسانہ ''ٹھنڈا گوشت'' پر جسٹس منیر کی آرا سے اختلاف کرتے ہوئے اس فیصلہ میں موجود کمزوریوں کا قانونی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا۔ مہدی علی صدیقی کے مطابق یہ بات درست نہیں کہ میں نے منٹو کو روک کر کہا تھا کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ بلکہ ملاقات کا اصرار خود منٹو نے ہی کیا تھا۔ البتہ جگہ کا تعین میری فرمائش پر کیا گیا تھا۔ اُنھوں نے بتایا کہ میں نے جرمانہ اس دن کی تاریخ کی مناسبت سے کیا تھا۔ اس کی وجہ منٹو کی ''جان چھوڑنا'' تھا جس کا کہ اس نے کمرۂ عدالت میں آتے ہی اظہار کیا تھا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جرمانہ پانچ سو تھا لیکن اسے کاٹ کر پچیس روپے کیا گیا، ان کی رائے غلط ہے۔ مہدی علی صدیقی کا انٹرویو ''ایک ادبی نوادر سے ملاقات'' کے زیر عنوان شامل کتاب ہے۔

''ریفریشمنٹ'' کے عنوان سے تیسرے حصے میں تین مضامین شامل ہیں۔ ''سعادت حسن منٹو کے عہد کا معاشرہ'' اور ''باقیات منٹو'' ابو سعید قریشی کے مضامین ہیں جب کہ ''منٹو کا جگر چاہیے منٹو کا تجسس'' پروفیسر جی ایم اثر سے کی گئی ایک گفتگو کی تحریری شکل ہے۔

ابو سعید قریشی نے اپنے مضمون ''منٹو کے عہد کا معاشرہ'' میں ہندوستان میں موجود ہندو مسلم ثقافت کا جائزہ لیتے ہوئے ان اسباب کی طرف توجہ دلائی جو ایک غلام قوم کا مقدر بنتے ہیں۔ مضمون نگار نے منٹو کے عہد کو عہد غلامی قرار دیا اور چوں کہ یہ غلامی صرف سیاسی نوعیت کی نہ تھی بلکہ اس سے زندگی کے تمام شعبے متاثر ہو رہے تھے لہٰذا معاشرہ ہی منٹو کے افسانوں کا موضوع بنا۔

اپنے دوسرے مضمون ''باقیات منٹو'' میں جو مجلس افسانہ پاکستان کراچی کے زیر اہتمام سعادت حسن منٹو کی چھتیسویں برسی کے موقع پر ۱۹۹۱ء میں پڑھا گیا تھا، ابو سعید قریشی نے منٹو کی ان تحریروں کو ''باقیات'' کا نام دیا جو عمر کے آخری حصے میں وہ محض پبلی شرز کے اصرار پر لکھتے رہے۔ اگر منٹو تادیر زندہ رہتے تو وہ ان میں سے بیشتر افسانوں کو خود ہی تلف کر دیتے۔

پروفیسر غلام محی الدین اثر جو ادبی حلقوں میں جی ایم اثر کے نام سے متعارف ہیں، سے حمید علوی کے گھر واقع اسلام آباد ۱۴ جنوری ۱۹۸۳ء کو ہونے والی گفتگو، رشیدہ سید نے مرتّب کی۔ حمید علوی، بیگم قیصرہ علوی، مظفر علی سیّد، منیر احمد شیخ اور بیگم نصرت منیر شرکائے انٹرویو تھے۔ یہ انٹرویو ادبی رسالہ ''نیرنگ خیال'' راولپنڈی کے سال نامہ جون ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا تھا۔

قیامِ پاکستان کے بعد جی ایم اثر اور منٹو لکشمی مینشن میں ایک دوسرے کی ہمسائیگی میں رہے۔ زندگی میں دونوں کے تعلقات کی نوعیت خواہ کچھ بھی رہی ہو لیکن منٹو کی وفات کے بعد اُنھوں نے جو سنسنی خیز انکشافات کیے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف منٹو سے کسی پرانی رنجش کا بدلہ لے رہے ہیں۔ منفی نوعیت کی اس گفتگو میں جی ایم اثر نے آخری ایام میں منٹو کو ایک ایک سے پیسے مانگنے والا ایسا شرابی قرار دیا جس کی زندگی کا واحد مقصد شراب پینا ہو اور جس کے نزدیک کسی رشتے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اُنھوں نے منٹو کی نجی زندگی کو ناکام قرار دیتے ہوئے صفیہ اور اس کے تعلقات کو برائے نام قرار دیا۔ منٹو کے ساتھ صفیہ کا سلوک بھی غیر اخلاقی بتاتے ہیں۔ اُنھوں نے انکشاف کیا کہ منٹو کی بڑی بہن ناصرہ اقبال منٹو کو روزانہ بی کمپلیکس کا ٹیکہ لگاتی تھیں۔

جی ایم اثر سے قبل یا بعد میں منٹو کی حمایت اور مخالفت میں لکھے گئے سیکڑوں مضامین میں جو کہ اس کے دوستوں اور دشمنوں نے لکھے ہیں، کہیں بھی اس قسم کی رائے یا شک کا اظہار نہیں کیا گیا۔ ایک اور مقام پر جی ایم اثر نے منٹو کی موت کے تین دن بعد کے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے منٹو کی بیگم کی ذہنی تسکین کو ثابت کرتے دکھائی دیتے ہیں جو اُنھیں منٹو کی موت کے بعد حاصل ہوئی تھی۔ فرماتے ہیں:

> ''منٹو کی وفات کے تیسرے روز میں گیا اور میں نے اُن کی اہلیہ سے کہا۔ میں نے کہا بھابھی، آپ سے ایک چیز مانگنے آیا ہوں۔ کہنے لگیں کیا؟ میں نے کہا، ایک پیتل کا گلاس ہوا کرتا تھا جسے استعمال کرتے تھے مرحوم، وہ گلاس آپ مجھے دے دیجئے، اس کا جواب یہ ملا، وہ تین چار گلاس تھے۔ سب کی میں نے قلعی کرا دی ہے۔ اب پتہ نہیں وہ کون سا گلاس تھا۔ یہ صرف تین دن کی بات ہے۔۔۔ بہر حال یہ صورت حال تھی۔ ان کی نجی زندگی جو تھی وہ بہت تلخ تھی۔''[۱۷۱]

اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ قدرت اللہ شہاب کی مدد سے منٹو کو برف خانہ الاٹ ہوا تھا جس کی آمدنی براہِ راست صفیہ منٹو کو ملتی تھی اور اسی سے ہی گھر کا برا بھلا خرچ چلتا رہا۔ جی ایم اثر نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ منٹو کی موت کے وقت اقبال بیگم (منٹو کی بڑی بہن) نے اُنھیں گھر سے بلا بھیجا تھا۔ جس کے بعد وہ منٹو کو ایمبولینس میں ہسپتال لے گئے لیکن منٹو راستے ہی میں دم توڑ گیا تھا۔ جی ایم اثر کی تمام آرا سے دشمنی کی بُو آتی ہے کیوں کہ منٹو کے کسی بھی ہم عصر یا دوست نے منٹو پر لکھتے ہوئے اس موقع پر جب کہ منٹو قریب المرگ تھا، جی ایم اثر کی موجودگی کا ذکر نہیں کیا۔

بہر حال جی ایم اثر کے ان خیالات کی تائید اس کے دیگر معاصرین کی تحریروں سے نہیں ہوتی۔ جی ایم اثر کا یہ انٹرویو جب ''نیرنگ خیال'' (۱۹۸۴ء) میں شائع ہوا تو منٹو کی بڑی بہن ناصرہ اقبال نے اس کو پڑھ کر شدید غصے کا اظہار کیا۔ اُنھوں نے ایک خط منٹو کی بیٹی نصرت منٹو کے توسط سے جی ایم اثر کے نام لکھا اور اس میں جی ایم اثر کے دیے گئے بیانات کو بہتان قرار دیا۔ یہ خط نیرنگ خیال کے سال نامہ ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ ناصرہ اقبال نے اس خط میں جی ایم اثر کی باتوں کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے کہا کہ نہ ہی وہ منٹو کو بی کمپلیکس کے انجکشن لگاتی تھیں اور نہ ہی اپنوں نے جی ایم اثر کو منٹو کی موت کے وقت گھر سے بلوا بھیجا تھا۔ سعادت اور صفیہ کی لڑائیاں اس انداز کی نہیں ہوتی تھیں جیسا کہ اُنھوں نے بیان کی ہیں۔ ناصرہ اقبال نے گلاسوں کے قلعی کرانے اور برف خانے کی الاٹمنٹ سے حاصل شدہ آمدنی کو بھی بہتان محض قرار دیا۔ [۱۷۲]

چوتھے اور آخری حصے بعنوان ''انتظاریہ'' میں مرتّب کے ایک مضمون ''دیر آید درست آید'' کے علاوہ آزر زوبی، اے ایم سعید اور جسٹس مشتاق علی قاضی کے انٹرویوز اور مرتّب کی شخصیت پر لکھا گیا۔ توصیف چغتائی کا توصیفی مضمون شامل ہے۔ ''دیر آید درست آید'' میں مرتّب نے ''ٹھنڈا گوشت'' پر منٹو کو جرمانہ کرنے والے جج اے ایم سعید کے آزر زوبی کی گیسٹ بک میں درج ریمارکس کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ان کے ریمارکس پڑھ کر اُنھوں نے اس میں درج پتے پر اے ایم سعید کو خط لکھا، جس کا جواب ملنے پر مرتّب نے اُنھیں ایک سوال نامہ بھیجا۔ اس مضمون میں اُنھوں نے منٹو کے ان دلچسپ ریمارکس کا عکس بھی شائع کیا جو منٹو نے اے ایم سعید کے ریمارکس کے نیچے درج کیے تھے۔ آذر زوبی کے متعلق اے ایم سعید کے ریمارکس اس طرح تھے "Not the country for such a person" :منٹو نے یہ ریمارکس پڑھ کر گیسٹ بک میں جو تحریر لکھی وہ ملاحظہ ہو:

> ''زوبی ایسے آدمی کے لیے یہ ملک ٹھیک نہیں ہے تو مجھ ایسے آدمی کے لیے جسے ''ٹھنڈا گوشت'' کے سلسلے میں سعید صاحب نے تین سو روپے جرمانہ اور تین ماہ قید بامشقت کی سزا کا حکم سنایا تھا، ساری دنیا ہی غالباً ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے زوبی کو مشورہ دیتا ہوں کہ اکادمی چھوڑے اور ہوٹل کھول لے۔ میں بیرا بن جاؤں گا۔ شاید یہ ملک ہمارے لیے یا ہم اس ملک کے لیے موزوں و مناسب بن جائیں۔'' [۱۷۳]

''منٹو کا نعم البدل نہیں ملتا'' آذر زوبی کا انٹرویو ہے۔ جس میں اے ایم سعید اور سعادت حسن منٹو کے آذر زوبی کی گیسٹ بک میں درج ریمارکس کا عکس بھی شائع کیا گیا ہے۔

''منٹو کمال تک پہنچا'' اے ایم سعید کا وہ جواب ہے جو اُنھوں نے مرتّب کے اصرار پر اُنھیں تحریری طور پر روانہ کیا۔ اُنھوں نے ''ٹھنڈا گوشت'' پر چلنے والے مقدمہ کی روداد جتنی اُن کی یادداشت میں محفوظ رہ گئی تھی، بیان کرنے کے بعد منٹو کو بطور فنکار

سراہا۔ مرتّب کو جسٹس مشتاق علی قاضی کا انٹرویو شائع کرنے کی ضرورت ان کی کتاب "journey Through Judiciary" میں شامل اس پیرا گراف کی وجہ سے محسوس ہوئی جس میں جسٹس مشتاق علی قاضی نے منٹو کے مقدمہ کے سلسلہ میں اُن کو کیے گئے جرمانہ کا ذکر کیا تھا۔

''سعادت حسن منٹو کے مقدمات''، انیس ناگی:

''سعادت حسن منٹو کے مقدمات'' جسے جمالیات، لاہور نے ۱۹۹۹ء میں شائع کیا، دراصل منٹو کے افسانوں پر چلنے والے مقدمات کی مختصر روداد ہے جسے انیس ناگی نے منٹو کی مختلف تحریروں سے اخذ کیا ہے۔ کتاب کی تدوین کا مقصد منٹو پر چلنے والے فحاشی کے مقدمات کے ریکارڈ کو یک جا کرنا ہے تاکہ اُردو ادب کے ایسے قارئین جو ان مقدمات کے حوالے سے معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں اُنھیں ایک ہی کتاب سے یہ تمام معلومات میسر آسکیں۔

اس کتاب میں منٹو کے پانچ افسانوں ''کالی شلوار''، ''دھواں''، ''بُو''، ''ٹھنڈا گوشت'' اور ''اوپر نیچے اور درمیان'' پر قائم مقدمات کو زمانی ترتیب کے ساتھ زیر بحث لایا گیا ہے۔ ان افسانوں کے خلاف ہونے والی عدالتی کارروائی کو منٹو کی تحریروں سے اخذ کر کے مصنف کمنٹری کی صورت میں اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتے گئے ہیں۔ مصنف نے منٹو کے افسانے ''ٹھنڈا گوشت'' پر چلنے والے مقدمہ کے سلسلہ میں ہائی کورٹ کے فیصلہ کا متن پہلی بار شائع کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ ان پانچ افسانوں پر چلنے والے مقدمات کی تفصیل، ججوں کے فیصلے اور ذاتی کمنٹری (توضیح) کے علاوہ ضمیمہ میں مہدی علی صدیقی کا مضمون ''منٹو اور میں'' علاوہ منٹو کے افسانہ ''بُو'' پر چلنے والے مقدمہ کی روداد بھی شامل کی گئی ہے جو احمد ندیم قاسمی سے خاص طور پر لکھوائی گئی۔

اُردو افسانے کی تاریخ میں منٹو واحد ایسا افسانہ نگار ہے جس پر سب سے زیادہ فحاشی کے مقدمات چلائے گئے۔ اس تناظر میں ان مقدمات کی روئیداد کو یکجا کرنا واقعی ایک اہم ادبی فریضہ ہے۔ چناں چہ مصنف نے اس اہم ادبی فریضہ کو سرانجام دیتے ہوئے منٹو کے مقدمات کی روداد پہلی مرتّبہ شائع کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔

اس نادر ریکارڈ کو سب سے پہلے شائع کرنے کے مصنف کے دعویٰ کی تائید نہیں کی جاسکتی۔ منٹو کے ایسے تمام مضامین جن میں ان مقدمات کے حوالے سے کسی قسم کی بھی تفصیل دی گئی ہے کے علاوہ تمام دستیاب عدالتی ریکارڈ (جو زیر نظر کتاب میں شامل ہے) سب سے پہلے بلراج مینرا نے ہندوستان سے ''دستاویز'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ جسے نواز چودھری نے پاکستان سے مکتبہ شعر و ادب لاہور کے زیر اہتمام شائع کیا۔ گو کہ اس پر سن اشاعت درج نہیں لیکن نواز چودھری کی کتاب ''دستاویز'' انیس ناگی سے پہلے اشاعت کے مراحل طے کر چکی تھی۔

انیس ناگی ''ٹھنڈا گوشت'' پر چلنے والے مقدمہ کے سلسلے میں دعویٰ کرتے ہیں کہ ''جہاں تک ہائی کورٹ کے فیصلے کا تعلق ہے اسے پہلی مرتّبہ شائع کیا جارہا ہے۔ [۱۷۴] مصنف کے اس دعویٰ میں بھی کوئی سچائی نہیں کیوں کہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس محمد منیر کے ''ٹھنڈا گوشت'' پر دیے جانے والے فیصلے کا اُردو ترجمہ ''دستاویز'' میں پہلے سے موجود ہے۔ [۱۷۵] چناں چہ انیس ناگی کا دعویٰ اولیت درست نہیں۔ منٹو کے مقدمات کے حوالے سے تمام دستیاب معلومات خاصی تفصیل کے ساتھ ''دستاویز'' میں دی گئی

ہیں۔ اس کے علاوہ فرید احمد کی کتاب ''دائیں بائیں اوپر نیچے'' میں بھی منٹو پر چلنے والے مقدمات پر سیر حاصل معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔

''سعادت حسن منٹو''، پریم گوپا متّل:

پریم گوپال متّل کی منٹو کی شخصیت اور فن کے متعلق یہ دوسری مرتّب کردہ کتاب ہے۔ مرتّب کے دیباچے ''منٹو، منٹو ہے'' کے علاوہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں سات مضامین شامل ہیں جن میں منٹو کی شخصیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں سات ایسے مضامین منتخب کیے گئے ہیں جن کا تعلق منٹو کے فکر و فن سے ہے جب کہ تیسرے اور آخری حصے میں منٹو کے لکھے گئے پانچ خاکے شامل ہیں۔

پہلے اور دوسرے حصے میں شامل تمام چودہ مضامین نقوش لاہور اور ''مرد آزاد'' دہلی مطبوعہ ۱۹۵۵ء میں سب سے پہلے ایک ساتھ شائع ہوئے۔ کتاب کی اشاعت کے وقت اگر طفیل صاحب زندہ ہوتے تو بڑے فائدے میں رہتے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ شخصیت کے حصے میں شامل مضامین کی فہرست ملاحظہ کریں:۔

منٹو، از سعادت حسن منٹو، میرا دوست میرا دشمن، از اوپندر ناتھ اشک، منٹو ماموں کی موت، از حامد جلال، جو بک نہ سکا، از حاجرہ مسرور، منٹو میرا دشمن، اوپندر ناتھ اشک، منٹو کی موت، از غلام عباس اور رحمدل دہشت پسند، از ابو سعید قریشی، اسی طرح منٹو کے فن کے بارے میں شامل مضامین کی فہرست کچھ اس طرح ہے۔ منٹو کا فن از وقار عظیم، منٹو کی حقیقت نگاری، از عبادت بریلوی، منٹو کی فنی تکمیل، از ممتاز شیریں، منٹو کا مقام از محمد حسن عسکری، منٹو از ابواللّیث صدیقی اور سعادت حسن منٹو، از ممتاز حسین۔[۱۷۶]

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ یہ تمام مضامین نقوش اور مرد آزاد کے اُن شماروں میں بیک وقت شائع ہوئے جو اُنھوں نے منٹو کی وفات کے بعد خصوصی طور پر نکالے تھے۔ پتہ نہیں فاضل مرتّب کو ایسی کون سی مجبوری لاحق تھی کہ اُنھوں نے مضامین کے انتخاب کے لیے کسی دوسرے ذریعے کو غیر ضروری سمجھا۔ بات صرف یہیں پر ہی ختم نہیں ہوتی۔ بلکہ کتاب کے دوسرے حصے میں موجود منٹو کے لکھے ہوئے پانچوں خاکے عصمت چغتائی، آغا حشر کاشمیری، تین گولے (میرا جی) اشوک کمار اور نرگس، اس سے پہلے مرتّب ہی کی ۱۹۸۰ء میں ترتیب دی گئی کتاب ''منٹو، شخصیت اور فن'' میں بھی شامل تھے (۱۷۷) مذکورہ بالا کتاب میں شامل ابواللّیث صدیقی، عصمت چغتائی اور ممتاز شیریں کے مضامین بھی دوبارہ زیر تبصرہ کتاب کا حصہ بنا دیے گئے ہیں۔ اسے مرتّب کی سہل انگاری کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے۔ کہ مواد کی تلاش میں کی جانے والی مخلصانہ کوششوں کا تفاخر سے تذکرہ کرنے والے فاضل مرتّب نے کسی ایک ماخذ کی بھی نشاندہی نہیں کی۔ یہ قیاس بھی ممکن نہیں کہ منٹو کی شخصیت اور فن پر دو کتابیں مرتّب کرنے والے منٹو کے ایک زبردست مداح کی نظروں سے ''مرد آزاد'' اور خاص طور پر نقوش کے منٹو نمبر نہ گزرے ہوں۔ کتاب کی ترتیب کے ضمن میں مرتّب کے خیالات عالیہ ملاحظہ فرمائیں:

> ''میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں نے بہترین انتخاب پیش کر دیا ہے لیکن اپنی رسائی کے مطابق مخلصانہ کوشش ضرور کی ہے کہ ایسے تمام مضامین جمع ہو جائیں جن سے منٹو کی بھرپور شخصیت بھی سامنے آجائے اور اس کے فن کے نقوش بھی واضح ہو جائیں۔''[۱۷۸]

چناں چہ بہت عرق ریزی، جاں فشانی اور لائبریریوں کی خاک چھاننے اور ہزاروں کتب و رسائل کی گرد جھاڑنے کے بعد بالآخر وہ گوہر نایاب تلاش کر آئے جس سے منٹو کی شخصیت اور فن پر حقیقی معنی میں روشنی پڑنا شروع ہو گئی ہے۔ منٹو شناسی کے باب میں سرقہ کی یہ اولین مثال ۳۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی نے اسے ۱۹۹۹ء میں شائع کیا۔

''منٹو کیا تھا؟''، غلام زہرہ:

غلام زہرہ کی تالیف ''منٹو کیا تھا؟'' برائٹ بکس نے اقرا سنٹر، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور سے اکتوبر ۲۰۰۳ء میں شائع کی۔ کتاب میں مجموعی طور پر سینتیس (۳۷) مضامین ہیں۔ ان میں شامل دس مضامین ''میرا دوست میرا دشمن'' از عصمت چغتائی، ''منٹو میرا دشمن'' از اوپندر ناتھ اشک، ''جو بک نہ سکا'' از ہاجرہ مسرور، ''منٹو'' از ابواللیث صدیقی، ''منٹو کی فنی تکمیل'' از ممتاز شیریں، ''منٹو کا مقام'' از محمد حسن عسکری، ''گنجا فرشتہ'' از سید عابد علی عابد، ''رحم دل دہشت پسند'' از ابو سعید قریشی، ''منٹو کی چند یادیں اور خطوط'' از احمد ندیم قاسمی، ''چند یادیں'' از شورش کاشمیری اور ''منٹو کی حقیقت نگاری'' از عبادت بریلوی سب سے پہلے ادبی رسالہ ''نقوش'' منٹو نمبر ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئے۔[۱۷۹] شورش کاشمیری کا مضمون ''چند یادیں''، ''نقوش'' کے علاوہ اسی سال شائع ہونے والے رسائل ''افکار'' اور ''گل خنداں'' کے منٹو نمبر میں بھی شامل ہیں۔ ''نقوش'' میں شامل ان دس مضامین کے علاوہ ''دیکھ کبیرا رویا'' از قرۃ العین حیدر، اُٹھاؤ بوتل اور چلو منٹو کے پاس'' از ابراہیم جلیس، ''بدنام منٹو از وقار عظیم، ''سیاہ حاشیے'' از ظ انصاری، ''بدزبان'' از سردار جعفری، ''خالی بوتل بھرا ہوا دل'' از کرشن چندر، ''منٹو اور میں'' از مہدی علی صدیقی، ''بے غیرتی'' از ضیاالحسن موسوی، ''اُردو کا نڈر اور بے باک افسانہ نگار'' از صہبا لکھنوی، ''منٹو کے آخری ایام'' سید اکمل علیمی، ''کچھ منٹو کے بارے میں'' از ثریا قمر اور ''منٹو ایک فنکار'' از ممتاز شیریں، ماہنامہ ''افکار'' کراچی کے منٹو نمبر ۱۹۵۵ء میں سب سے پہلے اشاعت پذیر ہوئے[۱۸۰] یوں نقوش اور ''افکار'' سے مجموعی طور پر تئیس (۲۳) مضامین مؤلفہ نے اپنی کتاب میں شامل کیے ہیں۔ امرتا پریتم کا مضمون ''جاں دادۂ ہوائے سرِ راہ گزار تھا'' صفیہ ناصر کا ترجمہ کردہ ہے۔ تاثراتی نوعیت کے اس مضمون میں امرتا پریتم نے منٹو کے اُس تعریفی خط کا ذکر کیا جس میں منٹو نے ان کی نظم کو سراہا تھا۔ مضمون نگار کے مطابق منٹو نے اپنے افسانوں میں ایسے لوگوں کی طرف توجہ دلائی ہے جن کے اندر کی روح بہت پہلے مر چکی ہے اور لاشوں جیسے انسان کہیں سے گزرتے ہیں تو اپنے پیچھے موت کی بُو چھوڑ جاتے ہیں۔ منٹو کی موت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے اُنھوں نے کہا کہ اب نہ ہی ٹوبہ ٹیک سنگھ جیسی کہانی کوئی لکھے گا اور نہ ''ہتک'' کی سوگندھی کبھی دوبارہ جلوہ گر ہو گی۔ انکل سام کی پریشانی بھی اب ختم ہو جانی چاہیے کہ اب اس کا گستاخ بھتیجا اسے دوبارہ کبھی تنگ نہیں کرے گا۔

ڈاکٹر انوار احمد کا مضمون ''مختصر سوانحی خاکہ'' اس سے قبل ان کی کتاب ''اُردو افسانہ تحقیق و تنقید'' میں شائع ہوا تھا۔[۱۸۱] اُنھوں نے اس مضمون میں منٹو کی سوانح سے متعلق چیدہ چیدہ معلومات درج کی ہیں۔ اُنھوں نے منٹو کے علی گڑھ یونیورسٹی سے اخراج کے متعلق سجاد شیخ کی اس رائے کو معنی خیز قرار دیا جس کے مطابق منٹو کو اس کے انقلاب اور نظام دشمن رویے کی وجہ سے نکالا گیا تھا۔

ممتاز شیریں کا مضمون ''منٹو کا تغیر اور ارتقا'' سب سے پہلے ان کے تنقیدی مجموعے ''معیار'' میں شائع ہوا۔[۱۸۲] بعد میں آصف فرخی نے ممتاز شیریں کی کتاب ''نوری نہ ناری'' مرتّب کرتے ہوئے اسے مذکورہ کتاب میں شامل کیا۔[۱۸۳]

مسز راحیلہ تنویر کا مضمون ''منٹو اور ادب جدید'' سرقہ کی بدترین مثال ہے مضمون نگار نے مختلف کتابوں میں شامل منٹو پر لکھی گئی تحریروں سے پیرا گراف چرا کر وہاب اشرفی، محمد اسد اللہ، اوپندر ناتھ اشک کے تجربات اور احساسات کو اپنا نام دے دیا۔ ان کے لکھے ہوئے اس مضمون کے پیرا گراف ''ترقی پسند ادب'' میں شامل پروفیسر وہاب اشرفی کے مضمون ''ترقی پسند اُردو افسانہ'' کے صفحات ۳۳۵، ۳۴۱، ۳۴۶، ۳۵۸اور ۳۵۹ پر جوں کے توں موجود ہیں[۱۸۴] اسی طرح اوپندر ناتھ اشک کی کتاب ''منٹو میرا دشمن'' کے صفحات ۷۸، ۷۹، ۸۴، ۸۵، ۸۶ پر موجود پیرا گراف بھی جوں کے توں اُٹھا لیے گئے ہیں۔[۱۸۵]

ڈاکٹر سلیم اختر کا مضمون ''بغاوت کا استعارہ۔ منٹو'' اس سے پہلے ان کی کتاب ''افسانہ اور افسانہ نگار'' میں شائع ہوا۔[۱۸۶] مضمون نگار نے منٹو کو اپنے عہد کا ہی نہیں بلکہ موجودہ دور کا بھی نمائندہ افسانہ نگار قرار دیتے ہوئے کہا کہ منٹو کے موضوعات آئندہ آنے والے زمانے میں بھی اتنے ہی مؤثر اور معنی خیز ثابت ہوں گے جتنا کہ آج ہیں یا پھر خود منٹو کے عہد میں تھے۔ ان کے مطابق منٹو ہی نے اُردو افسانے میں جنسی حقیقت نگاری کی داغ بیل ڈالی۔

منٹو نے جنسی موضوعات کا انتخاب لذت کوشی یا کراہت آمیزی کے لیے نہیں کیا بلکہ اس نے جنس کو محض جنس کے طور پر پیش کرتے ہوئے اس کے حوالے سے زندگی کو سمجھا۔ اگر منٹو کے افسانوں سے جنس کا لیبل اُتار دیا جائے یا ان کے جنسی موضوعات پر لکھے گئے افسانوں سے صرف نظر کرتے ہوئے اس کے سیاسی اور انقلابی نوعیت کے افسانوں کا جائزہ لیا جائے تو اس کا سب سے پہلا افسانہ اور اس کی زندگی کی ابتدائی ادبی مصروفیات، انقلاب پسندی اور سیاسی بصیرت کی غماز ہیں۔

''منٹو عظیم افسانہ نگار یا فحش۔۔۔؟'' نصرت نثار رانا کے اس سطحی نوعیت کے مضمون میں دیگر ناقدین کی آرا کو مضمون نگار نے اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہے۔

''منفی سے اثبات کی طرف مراجعت'' اس کتاب میں شامل ڈاکٹر سلیم اختر کا دوسرا مضمون ہے۔ مضمون کے آغاز میں درج تحریر کے مطابق یہ مضمون ۱۲ جولائی ۱۹۸۱ء کو لکھا گیا جو مضمون نگار کی کتاب ''افسانہ اور افسانہ نگار'' میں ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا۔[۱۸۷] ڈاکٹر سلیم اختر منٹو کی تحریروں کو گھٹن اور حبس کے دور میں تازہ ہوا کا جھونکا قرار دیتے ہیں۔

اُنھوں نے عہد حاضر میں ادیبوں پر چھائی پژمردگی، مایوسی اور خوف کی وجہ سے پیدا ہونے والے ادبی جمود کا علامتی اور تاثراتی انداز میں جائزہ لینے کے بعد کہا کہ منٹو کے کردار اپنے منفی طرزِ عمل کے باوجود مثبت دکھائی دیتے ہیں۔

ڈاکٹر انوار احمد کا مضمون ''فکر و فن'' ان کی کتاب ''اُردو افسانہ تحقیق و تنقید'' میں ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ مضمون نگار کے مطابق اُردو افسانے میں جب بھی حق و انصاف کی خاطر مزاحمت، ریاکاری کے خلاف للکار، انسانیت سے لگاؤ کے بلند آہنگ اقرار اور آزادیٔ اظہار کا ذکر ہوتا ہے، سعادت حسن منٹو کا ذکر ناگزیر ہو جاتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اُردو افسانے کو یہ لب و لہجہ منٹو ہی نے دیا تھا تو غلط نہ ہو گا۔ ڈاکٹر انوار احمد نے منٹو کے فکر و فن کا ارتقائی جائزہ لیتے ہوئے ان کے افسانوں کا سیاسی و سماجی پس منظر میں جائزہ لیا ہے۔ منٹو کے ابتدائی دور کے افسانوں، جن میں منٹو ایک انقلابی روپ میں سامنے آتا ہے، انقلاب اور بغاوت' اور اس سے ملحقہ سیاسی موضوعات پر مشتمل ان کے افسانوں میں موجود فکر کا اقتباسات کی مدد سے جائزہ لیا ہے۔ منٹو کے جنسی افسانوں کے ساتھ ساتھ طوائف اور عورت کے موضوع کے علاوہ فسادات پر لکھے گئے افسانوں کا بھی عمدہ جائزہ لیا۔

''منٹو اور تحریک آزادی'' جیلانی کامران کا مضمون ہے۔ منٹو جس عہد کا مکیں تھا وہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے کے باوجود آزادی کی امید لیے ہوئے تھا چناں چہ منٹو اپنے ادبی موضوعات کے ذریعے ایک معتبر انسانی معاشرے کی تشکیل کا خواہاں تھا۔ منٹو کی کہانیاں ''ٹھنڈا گوشت'' اور ''کھول دو'' بہتر انسانی معاشرے کی تشکیل کے اسی خواب کے ٹوٹنے کا نوحہ ہیں۔ منٹو کی کہانیوں کو بامقصد تمثیلیں قرار دیتے ہوئے اُنھوں نے ''کھول دو'' کی دوہری معنویت پر اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا ہے:

> ''ادب عالیہ میں قوموں کو لڑکی کہہ کر پکارا گیا ہے اور کیا ''کھول دو'' کی تمثیل میں کوئی اور کہانی تو نہیں ہے؟'' [۱۸۸]

''سعادت حسن منٹو اور فرانسیسی ادب'' ڈاکٹر برج پریمی کا مضمون ہے۔ یہ مضمون اس سے پہلے ادبی رسالہ ''فنون'' جنوری، اپریل ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔ مضمون میں منٹو کے مرتّب کردہ ہمایوں کے فرانسیسی ادب نمبر میں شامل منٹو کے کیے گئے تراجم کی خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

محمد طفیل کا خاکہ نما مضمون ''منٹو صاحب'' دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ منٹو کی زندگی میں جب کہ دوسرا حصہ اس کی موت کے بعد لکھا گیا۔ اس سے قبل یہ مضمون ''نقوش'' کے محمد طفیل نمبر میں شائع ہوا۔ محمد طفیل کی خاکوں کی کتاب ''صاحب'' مطبوعہ ادارۂ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۶۲ء میں بھی یہ مضمون شامل ہے۔ اس مضمون میں محمد طفیل نے اپنے تعلقات کے حوالے سے منٹو کی شخصیت کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

غلام زہرہ کی ۴۸۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں سینتیس (۳۷) مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے۔ تحقیقی نقطۂ نظر سے یہ ایک ناقص کتاب ہے۔ مضامین کا انتخاب کرتے وقت ماخذات کی نشان دہی نہیں کی گئی۔ کتابت کی سیکڑوں اغلاط قاری پر بہت بُرا تاثر چھوڑتی ہیں۔ بعض اوقات یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہے یا تحقیق کی۔ منٹو کی شخصیت اور فن پر مرتّب ہونے والی یہ غیر معیاری کتاب ہے جسے مؤلفہ کی ناتجربہ کاری کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ محمد نوید کی اس کتاب کے بارے میں یہ رائے سو فیصد درست ہے:

> ''اس کتاب میں اُنھوں نے کسی تحقیقی بصیرت سے کام نہیں لیا۔ نہ تو ان مضامین کی اشاعت کی تفصیل درج کی ہے اور نہ ان مضامین میں شخصیت، حالات زندگی یا فن وغیرہ کی کوئی ترتیب یا نظم کا خیال رکھا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر انوار احمد کا مضمون ''مختصر سوانحی خاکہ'' اُنھوں نے درمیان میں درج کیا ہے اس کو ابتدا میں لکھنا بہتر تھا۔۔۔۔ ان مضامین کو زمانی ترتیب سے بھی پیش نہیں کیا گیا۔ ان کی اس کوشش سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو محبت منٹو سے نہیں بلکہ اپنی خود نمائی سے ہے۔'' [۱۸۹]

''سعادت حسن مر گیا، منٹو زندہ ہے''، احمد سلیم:

احمد سلیم کی مرتّب کردہ کتاب ''سعادت حسن مر گیا، منٹو زندہ ہے'' سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور نے ۲۰۰۵ء میں شائع کی۔ کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:۔

پہلا حصہ جو اخباری تراشے، کالم اور اداریوں پر مشتمل ہے میں منٹو کی وفات کے موقع پر مختلف اخبارات میں کالم اور اداریوں کی صورت میں شائع ہونے والی ۳۲ تحریروں کا انتخاب شامل کیا گیا ہے۔

دوسرا حصہ بعنوان ''اہل قلم معاصرین'' منٹو کی موت پر شائع کیے گئے تاثراتی مضامین پر مشتمل ہے۔ اس حصہ میں غلام عباس، حامد جلال، محمد طفیل، شورش کاشمیری، یوسف ظفر، بلقیس عابد علی، حاجرہ مسرور، اسرار الحق مجاز، ملک راج آنند، ممتاز حسین، ڈاکٹر محمد حسن، شاہد احمد دہلوی، سید احتشام حسین، نصیر انور، حفیظ ہوشیار پوری، محمد حسن عسکری، حیات اللہ انصاری، مختار صدیقی، علی عباس حسینی، سید ابوالخیر کشفی، ممتاز مفتی، خواجہ اطہر حسین، رشید اختر ندوی، سبط فاروق، عادل رشید، ظفر زبیری اور راجندر سنگھ بیدی کے، مختلف رسائل میں شائع ہونے والے ستائیں (۲۷) تاثراتی مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔

تیسرے حصے میں فلم انڈسٹری کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی بیس (۲۰) شخصیات کے تاثرات کو یک جا کیا گیا ہے۔ ان میں محمد نذیر، راما نند ساگر، ایم اے مغنی، شکیل بدایونی، جیمنی دیوان، کیدار شرما، نوشاد علی، ایم صادق، ایس یوسنی، ہیرالال، ولی محمد خان، ملک راج بھاکڑی، ایف حسن، پی این اروڑہ، رشید پرویز، مدن موہن مہرہ، اے شاہ عاجز، ایس کے اوجھا، واحد قریشی اور ہر بنس شامل ہیں۔

جب کہ چوتھا اور آخری حصہ بعنوان ''پچاس سال بعد جنوری ۲۰۰۵ء'' منٹو کی پچاسویں برسی کے موقع پر پاکستان کے مختلف اخبارات میں شائع ہونے والے تبصروں اور مضامین پر مشتمل ہے۔ کتاب کی اشاعت کا مقصد بتاتے ہوئے احمد سلیم رقم طراز ہیں:

> ''زیرِ نظر کتاب ۱۹۵۵ء میں منٹو کے انتقال پر شائع ہونے والی ان صحافتی تحریروں کا مجموعہ ہے، جو مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوئیں اور جنھیں مستند ادبی تحریریں قرار نہیں دیا جا سکتا۔ (البتہ کتاب کے دوسرے حصے میں ادبی جرائد سے اخذ، منٹو کے قلمی معاصرین کے فوری ردِ عمل شامل کر لیے گئے ہیں جو منٹو کی وفات پر سامنے آئے تھے) اخبارات و رسائل میں چھپنے والی خبروں، اداریوں اور کالموں کا یہ مجموعہ منٹو کا ایک ایسا چہرہ سامنے لا رہا ہے جس سے ہماری دنیا زیادہ آگاہ نہیں ہے اور یہی اس کتاب کی اشاعت کی وجہ جواز ہے۔'' [۱۹۰]

کتاب کی اشاعت کا جواز پیش کرنے کے بعد مرتّب نے اپنے ماخذات کی نشان دہی کی۔ لکھتے ہیں:

> ''میں نے جن بھی اخبارات و رسائل (بشمولہ ادبی جرائد و رسائل) سے یہ مواد اخذ کیا ہے، ان کا حوالہ ہر تحریر کے ساتھ درج کر دیا ہے تا کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔'' [۱۹۱]

مرتّب نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ مواد ''ساؤتھ ایشین ریسرچ اینڈ ریسورس سنٹر'' (SARRC) کے لٹریری آرکائیوز میں موجود ہے۔ کتاب کی اشاعت کا مقصد، ماخذات کی نشان دہی اور کتاب کو پڑھنے کے بعد مرتّب کی محنت پر داد دینے کو دل چاہتا ہے جنھوں نے منٹو کے متعلق بکھرے ہوئے اس ''غیر ادبی'' سرمائے کو یکجا کر کے محفوظ صورت میں ڈھال دیا۔ لیکن منٹو کے سنجیدہ قاری کی حیثیت سے اس بات سے چشم پوشی کرنا ممکن نہیں کہ کتاب کے اولین تین حصے: اخباری تراشے، کالم، اداریے، اہل قلم معاصرین اور فلمی معاصرین کے تاثرات اس سے قبل ماہنامہ ''افکار'' کراچی کے منٹو نمبر میں جوں کے توں شائع ہو چکے ہیں۔

کتاب کا پہلا حصہ ''اخباری تراشے، کالم، اداریے'' ماہنامہ 'افکار' کراچی (منٹو نمبر) کے صفحہ نمبر ۱۴۹ تا ۱۷۱ پر ''سوگ میں ہے فسانہ گوئی آج'' (صحافتی حلقوں میں منٹو کا ماتم) کے عنوان سے موجود ہے۔ واضح رہے کہ دونوں مقامات پر ان تحریروں کی ترتیب اور تعداد بھی یکساں ہیں۔

دوسرے حصے کو مرتّب نے ''اہل قلم معاصرین'' کا عنوان دیا ہے اور اس میں شامل منٹو کے ہم عصر ادیبوں کے تاثراتی مضامین کو شامل کیا ہے۔ اگرچہ مرتّب نے پیش لفظ میں دعویٰ کیا ہے کہ اُنھوں نے تمام ماخذات کی نشان دہی کر دی ہے لیکن یہ حصہ اس قسم کے کسی بھی حوالے سے عاری ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہ مضامین تاثرات مختلف ادوار میں مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہے لیکن مجموعی طور پر یہ تمام مضامین جن کی تعداد ستائیس ہے (دو مضامین نکال کے) افکار ہی کے منٹو نمبر میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ کتاب میں مجموعی طور پر ستائیس مضامین تاثرات شامل ہیں۔ ان میں سے چوبیس (۲۴) مضامین ''ناخن کا قرض'' کے عنوان کے تحت ماہنامہ ''افکار'' کے صفحات ۱۳۰تا۱۴۸ پر کم و بیش اسی ترتیب سے موجود ہیں جو کہ کتاب کی ترتیب ہے۔ البتہ شورش کاشمیری کا مضمون ''چند یادیں'' مذکورہ رسالہ کے صفحہ نمبر ۵۶تا۵۸ پر دیکھا جا سکتا ہے۔ غلام عباس کا مضمون ''منٹو کی موت'' اور محمد طفیل کا مضمون منٹو کا ایک خط ''نقوش'' کے منٹو نمبر سے لیے گئے ہیں۔[۱۹۲]

کتاب کے تیسرے حصے میں شامل فلم انڈسٹری سے وابستہ لوگوں کے تاثرات جن کی تعداد بیس (۲۰) ہے، ماہنامہ افکار کے اسی شمارے میں ''ٹوٹ گئے بینا کے تار'' (منٹو کا فلمی دنیا میں ماتم) کے عنوان سے مذکورہ رسالہ کے صفحات ۲۷اتا۱۶۷ پر ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ مرتّب نے ان مضامین/تاثرات کے ماخذات کی نشان دہی بھی نہیں کی حال آں کہ چوتھے حصہ میں جو کہ جنوری ۲۰۰۵ء کے اخبارات و رسائل میں شامل مضامین پر مشتمل ہے کے ماخذات کی مکمل نشان دہی کی گئی ہے۔

اس طرح چار حصوں پر مشتمل اس کتاب کے پہلے تین حصے ماہنامہ ''افکار'' کراچی، شائع شدہ مارچ اپریل ۱۹۵۵ء سے مستعار لیے گئے ہیں جب کہ اس کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔ اس امر کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ جن جن مقامات پر ''افکار'' کے مدیر نے حوالے دیے ہیں مرتّب نے بھی وہی حوالے جوں کے توں درج کیے ہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اخبارات میں شامل مضامین کی تاریخ افکار کے منٹو نمبر میں نہیں دی گئی، مرتّب نے بھی ان کے آگے تاریخ اشاعت درج نہیں کی۔

۱۔ دوسرا بڑا آدمی، سعادت حسن منٹو، مجید لاہوری، روزنامہ ''جنگ''، کراچی۔
۲۔ موج و تلاطم، کشفی آریانی، روزنامہ ''مغربی پاکستان''، لاہور۔
۳۔ افکار و حوادث، کاررواں باشی، روزنامہ ''ہلال پاکستان''، لاہور۔
۴۔ باغ و بہار، نغمی، روزنامہ ''زمیندار''، لاہور۔
۵۔ آہ! سعادت حسن منتو، حاجی لق لق، روزنامہ ''نوائے پاکستان''، لاہور۔

ماہنامہ 'افکار' میں ان مضامین کی اشاعت اسی طرح ہوئی ہے اور ان کے ساتھ ان کی تواریخ اشاعت درج نہیں کی گئیں۔ مرتّب نے بھی مذکورہ تحریروں کے آگے ان کی تواریخ اشاعت درج نہیں کیں۔ ممکن ہے کہ یہ تمام مواد ساؤتھ ایشین ریسرچ اینڈ ریسورس سنٹر کے لٹریری آرکائیوز میں موجود ہو لیکن اس یکسانیت کو محض اتفاق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مرتّب کی اگر براہِ راست ان ماخذات تک رسائی تھی تو دونوں کے مواد کی ترتیب اور تعداد میں فرق کیوں نہ آیا۔ کیا منٹو کی موت پر شائع ہونے والے محض یہی مضامین تھے جو اخبارات میں شائع ہوئے؟

ماہنامہ ''افکار'' کی اشاعت ۱۹۵۵ء سے لے کر اب تک اس ذخیرے میں یقیناً قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ پھر مرتّب نے محض انھی تحریروں پر اکتفا کیوں کیا؟ پھر ان مضامین کی تواریخ اشاعت تک بھی درج نہیں کیں جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ چوں کہ ''افکار'' میں ان مضامین کے آگے کسی نہ کسی وجہ سے تاریخ شائع نہ کی جا سکی اور مرتّب کے سامنے محض یہی رسالہ تھا اس لیے اُنھوں نے اسے جوں کا توں شائع کرا دیا۔ مواد کے تقابل، ترتیب اور تعداد سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ مرتّب نے ''افکار'' کے منٹو نمبر سے یہ تمام مواد حاصل کر کے اسے اپنے نام سے شائع کر وا دیا۔ صہبا لکھنوی جو ماہنامہ ''افکار'' کراچی کے مدیر تھے، نے ۱۹۹۴ء میں منٹو کی شخصیت اور ''فن پر منٹو ایک کتاب'' کے نام سے مکتبہ افکار کے زیر اہتمام ایک کتاب مرتّب کی۔ جس کے صفحات نمبر ۳۶ تا ۱۲۳ پر یہ مواد جوں کا توں شائع ہو چکا ہے۔[۱۹۳]

''سعادت حسن منٹو (پچاس برس بعد)''، نوید الحسن / شمشیر حیدر شجر:

شعبۂ اُردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور نے سعادت حسن منٹو کی پچاسویں برسی کی مناسبت سے سعادت حسن منٹو (پچاس برس بعد) ۲۰۰۵ء میں شائع کی۔ شعبہ کے سال دوم کے دو طالب علموں شمشیر حیدر شجر اور نوید الحسن نے اسے مرتّب کیا۔ کتاب کی اشاعت کا مقصد منٹو کے فکر و فن پر گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے اساتذہ، طلبہ اور فارغ التحصیل طلبہ کی تحریروں کو یک جا کر کے منٹو کی عظمت کا اعتراف کرنا ہے۔ دو سو اڑتالیس (۲۴۸) صفحات پر مشتمل یہ کتاب چار حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصے کا عنوان ''تقویم'' تجویز کیا گیا۔ اس حصے میں مرتّبین کے دو مضامین ''منٹو ماہ و سال کے آئینے میں'' از شمشیر حیدر شجر اور ''منٹو کے بارے میں کتب کا اشاریہ'' از نوید الحسن شامل ہیں۔ دوسرا حصہ ''مضامین و مقالہ جات'' میں منٹو کے فکر و فن پر تیرہ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ ''باتیں ملاقاتیں'' کتاب کا تیسرا حصہ ہے، میں احمد راہی، احمد ندیم قاسمی، عارف عبدالمتین، انتظار حسین، ڈاکٹر سلیم اختر اور سرمد صہبائی کی گفتگو، جب کہ چوتھے حصے ''روداد'' میں گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور میں منٹو کی پچاسویں برسی کے موقع پر منائے گئے ''یوم منٹو'' ۲۰۰۴-۰۵ء کی روداد پیش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان کے پیش لفظ سے پہلے ''منٹو کا ٹائپ رائٹر'' کے عنوان سے ایک اعلان نما عبارت درج ہے جس میں منٹو کے ٹائپ رائٹر کی فروخت اور خریداری کے بعد ن م راشد کی وصیت کے مطابق اسے ساقی فاروقی نے اصل حق داروں کے سپرد کرنے کا اعلان اس طرح کیا ہے:۔

''منٹو کا ٹائپ رائٹر''

> ''اُردو کا یہ مشہور ٹائپ رائٹر ن م راشد نے سعادت حسن منٹو سے خریدا تھا۔ شیلا راشد نے اپنے مرحوم شوہر کی خواہشات کے مطابق، کئی اُردو کتابوں کے علاوہ، یہ تاریخی ٹائپ رائٹر بھی میرے حوالے کیا۔ آج یہ امانت، افتخار عارف کے ذریعے، جی سی یونیورسٹی، لاہور کے سپرد کر رہا ہوں۔ حق بحق دار رسید۔''

اس عبارت کی پہلی لائن ''اُردو کا یہ مشہور ٹائپ رائٹر ن م راشد نے سعادت حسن منٹو سے خریدا تھا'' کے علاوہ بقیہ تمام عبارت سے ہمیں کوئی اختلاف نہیں۔ جہاں تک منٹو کے ٹائپ رائٹر بیچنے کا تعلق ہے اور وہ بھی ن م راشد کے پاس، تو یہ ایک بحث طلب موضوع ہے۔ منٹو کے باب میں لکھی گئی تحریروں میں کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک اور ابو سعید قریشی کے ٹائپ رائٹر سے متعلق لکھے گئے بیانات کے علاوہ کم از کم تحریری طور پر اس بات کا کوئی سراغ نہیں ملتا کہ منٹو نے اپنا اُردو کا ٹائپ رائٹر ن م راشد یا کسی

کے پاس بھی فروخت کیا ہو۔ اس غلط فہمی کو سب سے پہلے کرشن چندر نے نئے ادب کے معمار کے سلسلہ میں منٹو پر مضمون لکھتے ہوئے جنم دیا۔ کرشن چندر کے مطابق:

''کیوں کہ منٹو کے پاس صرف دو ٹائپ رائٹر تھے، آخر منٹو نے غصے میں آکر اپنا انگریزی کا ٹائپ رائٹر بھی بیچ دیا اور پھر اُردو ٹائپ رائٹر کو بھی وہ نہیں رکھنا چاہتا تھا مگر اس سے کام میں تھوڑا آسانی ہو جاتی تھی۔ اس لیے اس نے اسے نہیں بیچا پہلے پہل۔ مگر تین ٹائپ رائٹروں کی مار وہ کب تک کھاتا آخر اس نے اُردو کا ٹائپ رائٹر بھی بیچ دیا۔'' [۱۹۴]

کرشن چندر کے بیان کو رد کرتے ہوئے اوپندر ناتھ اشک لکھتے ہیں:

''ہم دونوں (مصنف اور منٹو) دفتر سے ایک ساتھ نکلے، منٹو کے دائیں ہاتھ میں ٹائپ رائٹر اور بائیں ہاتھ میں نفیس چمڑے کا بیگ تھا۔ میرے دونوں ہاتھوں میں ٹائپ رائٹر تھے۔ (ہم دونوں ایکسچینج بلڈنگ تک پیدل آتے تھے اور وہاں سے تانگہ لیتے تھے) اُس شام کو دوستوں نے منٹو کو اتنا چڑایا کہ وہ جھلا کر بولا ''میں یہ ٹائپ رائٹر سالا بیچ دوں گا اور پن سے لکھا کروں گا''، لیکن منٹو نے ڈراما کبھی پن سے نہیں لکھا اور نہ اپنا اُردو کا ٹائپ رائٹر فروخت کیا حالاں کہ ''نئے ادب کے معمار'' کے سلسلے میں کرشن چندر نے ایسا لکھا ہے۔'' [۱۹۵]

سعادت حسن منٹو اور ن م راشد کے باہمی تعلقات کا جائزہ اس ضمن میں بے معنی نہ ہو گا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ن م راشد، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر اور اوپندر ناتھ اشک مختلف حیثیتوں سے ملازمت کرتے تھے۔ منٹو کی انانیت ڈھکی چھپی بات نہیں۔ وہ حفظ مراتب کا خیال رکھے بغیر جملہ بازی کیا کرتے تھے۔ بے عزتی کے خوف سے لوگ اُن سے ڈر کر چھپ جایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ منٹو کے افسانوں پر ان کی موجودگی میں تنقید سے بھی گریز کرتے تھے۔ منٹو اکثر ن م راشد کی آزاد شاعری کا مذاق اُڑایا کرتے۔ راشد چوں کہ افسر تھے اور منٹو محض ڈراما نویس، لیکن اس کے باوجود منٹو کے آگے اُن کی ایک نہیں چلتی تھی۔ دہلی ریڈیو اسٹیشن پر منٹو کی معاصرانہ چشمکیں بیک وقت سب کے ساتھ جاری رہتیں۔ منٹو کے دہلی ریڈیو اسٹیشن چھوڑنے میں، جس واقعے نے سب سے اہم کردار ادا کیا، راشد اس میں برابر کے شریک تھے۔ اوپندر ناتھ اشک اور لکھنؤ سے آنے والے پروگرام اسسٹنٹ کی ملی بھگت سے جب منٹو کے ڈرامے میں تصحیح کی گئی تو وہ جھگڑا کھڑا ہوا جس نے منٹو کو دہلی چھوڑنے پر مجبور کیا۔ جب منٹو کے ڈرامے کو تصحیح کے بعد نشر کرنے کا اعلان کیا گیا تو منٹو نے راشد سمیت سب کو سخت برا بھلا کہا اور ڈرامے کو جوں کا توں چلائے بغیر نشر کرنے کی اجازت نہ دی۔ چناں چہ اگلی صبح میٹنگ میں اس موضوع پر بطور خاص بات کی گئی۔ اس حوالے سے اوپندر ناتھ اشک رقم طراز ہیں:

''دوسرے دن میٹنگ میں ڈرامے کا قصہ پیش ہوا۔ لکھنوی پی اے نے راشد کے کہنے پر ڈرامے کی تحریری تنقید پیش کی۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا، کہ کسی ہونے والے ڈرامے کی تنقید میٹنگ میں ہو لیکن چوں کہ ڈیوی ایشن کا سوال تھا' اگر وہ ڈراما نہ ہو تو اس کی جگہ دوسرا ڈراما چننے کی بات تھی، اس لیے راشد نے میٹنگ میں وہ بات اُٹھائی۔ لکھنوی پی اے نے پہلے ہی وہ تنقید تیار کر رکھی تھی سو اس نے پڑھ دی۔ بہر حال منٹو کی تنقید ہوا اور وہ بھی بھری میٹنگ میں یہ کبھی نہ ہوا تھا۔ منٹو اس طرح اپنی تنقید سننے کا عادی نہیں تھا۔'' [۱۹۶]

اسی سلسلہ میں وہ مزید لکھتے ہیں:

''منٹو میٹنگ کے بعد دفتر میں نہیں رکا اس نے ٹائپ رائٹر اُٹھایا اور چلا گیا۔ دوسرے دن بھی وہ دفتر نہیں آیا۔۔۔۔ تیسرے دن بھی منٹو دفتر نہیں آیا۔ ڈراما اس نے منگوا لیا۔ چوتھے یا پانچویں یا غالباً ساتویں دن سنا کہ وہ بمبئی چلا گیا۔''[۱۹۷]

اوپندر ناتھ اشک کے ان اقتباسات سے پتہ چلتا ہے کہ منٹو کے ڈرامے میں تصحیح اور تنقید جو کہ ملی بھگت کا نتیجہ تھی، ن م راشد اس میں برابر کے حصہ دار تھے۔ اس میٹنگ میں منٹو کے ڈرامے پر اتنے بودے اعتراضات کیے گئے کہ اس کے بعد منٹو نے دہلی ریڈیو اسٹیشن کا دوبارہ رُخ نہ کیا اور ڈراما کسی دوسرے ذریعے سے واپس منگوا لیا۔ اوپندر ناتھ اشک نے یہ بات واضح طور پر لکھی ہے کہ منٹو نے ٹائپ رائٹر اُٹھایا اور چلا گیا۔ یعنی منٹو جب دہلی سے گئے تو مذکورہ ٹائپ رائٹر ان کے ساتھ تھا۔ گویا دہلی میں اُنھوں نے کسی کے ہاتھ اپنا یہ ٹائپ رائٹر فروخت نہیں کیا تھا۔ اب ذرا آگے چلتے ہیں۔ دہلی چھوڑنے کے بعد منٹو بمبئی چلے آئے جہاں اُنھوں نے فلم کمپنی میں ملازمت اختیار کر لی۔ کچھ عرصہ بعد بوجوہ اُنھوں نے اوپندر ناتھ اشک کو بھی ملازمت کی خاطر بمبئی بلوا لیا۔ اوپندر ناتھ اشک کا یہ بیان اس بات کی تائید کرتا ہے کہ منٹو کا یہ ٹائپ رائٹر بمبئی میں بھی ان کے پاس موجود تھا۔ لکھتے ہیں:

''منٹو جب دہلی کے ریڈیو اسٹیشن پر رہا ڈراما ہمیشہ ٹائپ کرتا رہا۔ جب میں اس کی دعوت پر بمبئی گیا اور اس کے گھر ٹھہرا اس وقت بھی ٹائپ رائٹر اس کے پاس تھا حالاں کہ منٹو نے اسے برس بھر سے استعمال نہ کیا تھا۔''[۱۹۸]

یہاں منٹو کے لنگوٹیے ابو سعید قریشی کا بیان بھی بے محل نہ ہو گا۔ ابو سعید قریشی کے مطابق:

''ڈیسک کے پاس بائیں ہاتھ کی الماری میں اس کے ٹائپ رائٹر پڑے رہتے تھے۔ انگریزی کی مشین تو خیر کبھی کبھار رہی استعمال ہوتی تھی، ہاں اُردو کی مشین پر اس نے ہزاروں صفحے لکھے ہوں گے۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی کے پرانے دفتر جو نمبر ۱۸--انڈر ہل روڈ پر واقع تھا، یہ مشین ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتی تھی۔''[۱۹۹]

اوپندر ناتھ اشک، کرشن چندر اور ابو سعید قریشی کے اقتباسات سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ منٹو نے اپنا یہ ٹائپ رائٹر فروخت نہیں کیا تھا بلکہ بمبئی میں بھی یہ ان کے پاس موجود/محفوظ تھا۔ کرشن چندر نے اگرچہ یہ لکھا ہے کہ منٹو نے اپنا اُردو کا ٹائپ رائٹر بیچ ڈالا تھا لیکن اُنھوں نے بھی محض اتنا کہہ دینا ہی کافی سمجھا، کس کو بیچا، کتنے میں بیچا اور کس کی موجودگی میں بیچا، جناب ساقی فاروقی اور افتخار عارف کی طرح اُنھوں نے بھی اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔

منٹو کے باب میں لکھے گئے سیکڑوں تنقیدی مضامین، درجنوں کتابوں، تحقیقی مقالہ جات اور رسائل کے خصوصی اور عمومی شماروں میں کہیں بھی ٹائپ رائٹر کی فروخت بارے کوئی تحریر نہیں ملتی۔ (کم از کم میرے مطالعے میں نہیں آئی) پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ منٹو اپنا یہ ٹائپ رائٹر ن م راشد کو فروخت کریں گے، وہی راشد جن سے جھگڑ کر اُنھوں نے ملازمت تک چھوڑ دی تھی اور پھر راشد کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ نہ صرف منٹو سے یہ ٹائپ رائٹر خریدے بلکہ تمام زندگی اسے محفوظ رکھے اور بعد میں وصیت بھی کر جائے۔ وہ خود بہت بڑا ادبی بت تھا۔ اپنی موت کے پچاس برس بعد سعادت حسن منٹو ایک لیجنڈ کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ ان کی تخلیقات اب پبلک پراپرٹی بن چکی ہیں اور ان سے وابستہ تمام حوالے خواہ ان کا تعلق استعمال کی چیزوں سے ہی کیوں نہ ہو نوادرات کی صورت

اختیار کر چکی ہیں۔ پھر منٹو کا ٹائپ رائٹر تو اس لحاظ سے بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ منٹو نے اس کے ذریعے سو سے بھی زیادہ ڈرامے، فیچر اور مضامین تحریر کیے۔ چوں کہ اس ٹائپ رائٹر کی بقول جناب ساقی فاروقی، واقعی، تاریخی اہمیت ہے اس لیے محققین کا تجسس تقاضا کرتا ہے کہ اس ٹائپ رائٹر کی فروخت سے لے کر گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور کو سپرد کیے جانے تک کی تمام شہادتیں منظر عام پر لائی جائیں۔

مضامین کے سلسلہ میں پہلا حصہ جو کہ ''تقویم'' کے عنوان سے ہے، میں مرتّبین کے دو تحقیقی نوعیت کے مضامین شامل ہیں۔ ''منٹو ماہ و سال کے آئینے میں'' شمشیر حیدر شجر کا مضمون ہے۔ اُنھوں نے اپنے اس مضمون میں منٹو کے سوانحی، خاندانی اور نجی کوائف کے علاوہ، منٹو کے افسانوں پر قائم کیے گئے مقدمات، تحریر کردہ فلموں رہائش گاہوں، اوّلین تحریروں، ادبی و ثقافتی اداروں اور اخبارات سے وابستگی کے علاوہ منٹو کے انتقال اور اس کی قبر پر کندہ کتبے کو درج کرتے ہوئے زمانی اعتبار سے ایک مکمل خاکہ پیش کیا ہے۔ یہ مضمون دو حصوں پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے میں اُنھوں نے ''منٹو کی تصانیف'' کا اشاریہ بناتے ہوئے منٹو کی اڑتیس (۳۸) تصنیفات میں شامل مضامین، افسانے اور ڈرامے وغیرہ کا چارٹ بناتے ہوئے سب کے سن اشاعت اور پبلی شرز کے نام دیے ہیں۔ یہ تحقیقی نوعیت کا مضمون ہے اور مصنف نے اس کو ترتیب دیتے ہوئے ڈاکٹر علی ثنا بخاری کے غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی ''سعادت حسن منٹو: سوانح اور ادبی کارنامے'' پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۸۴ء کے علاوہ انیس ناگی کی کتاب ''سعادت حسن منٹو'' مطبوعہ فیروز سنز، لاہور، ۱۹۸۹ء سے مکمل استفادہ کیا ہے مگر دونوں کا حوالہ نہیں دیا۔[۲۰۰]

''منٹو کے بارے میں کتب کا اشاریہ'' نوید الحسن کا مضمون ہے۔ اس مضمون میں اُنھوں نے منٹو کی شخصیت اور فن پر شائع ہونے والی اکیس (۲۱) کتابوں کے علاوہ منٹو پر خصوصی طور پر شائع ہونے والے نو (۹) رسائل کے مندرجات پیش کیے ہیں جب کہ پاکستان اور ہندوستان کی مختلف جامعات میں منٹو پر کیے جانے والے تیرہ (۱۳) تحقیقی مقالہ جات کی فہرست اور ان میں سے بعض کی ابواب بندی بھی درج کی ہے۔ اس اشاریہ میں بہت سی کتابوں، رسائل اور مقالہ جات میں شامل مضامین اور ابواب کی تفصیل نہیں دی گئی اور صرف سن اشاعت و پبلی شرز کا نام دینے پر اکتفا کیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کا یہ کام سراہے جانے کے قابل ہے۔ ان سے قبل ڈاکٹر علی ثنا بخاری نے ''سعادت حسن منٹو: کتابیات'' میں کتاب کی اشاعت تک کے مواد کو مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد کے زیر اہتمام ۱۹۸۶ء میں شائع کیا تھا۔ مضمون کے آخری حصے میں منٹو کی تخلیقات کے انگریزی تراجم کا اشاریہ "Translations & Critical Work" کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے۔

''گورنمنٹ کالج لاہور میں منٹو کا آخری دن'' میں ڈاکٹر انیس ناگی نے سعادت حسن منٹو کی موت سے ایک دن قبل ہونے والی اپنی ملاقات کا حال درج کیا ہے۔ اس سے قبل اُن کی کتاب ''سعادت حسن منٹو'' میں یہ مضمون تاریخ کی تبدیلی کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔ مضمون نگار نے اپنی گزشتہ تحریر میں اس ملاقات کی تاریخ اٹھارہ جنوری درج کی تھی۔

ڈاکٹر علی ثنا بخاری نے اپنے مضمون ''خاکہ نگاری اور گنجے فرشتے'' میں خاکہ نگاری کی روایت کا جائزہ لینے کے بعد منٹو کے فن خاکہ نگاری پر روشنی ڈالی۔ اُنھوں نے عصمت چغتائی کے خاکے کو منٹو کا پہلا خاکہ قرار دیا۔ پاکستان میں پہلا خاکہ ''پری چہرہ نسیم بانو'' لکھا

جب کہ ''تپش کاشمیری'' منٹو کا آخری خاکہ تھا۔ ڈاکٹر علی ثنا بخاری نے اُسلوب بیان، واقعات کا تناسب اور ربط، تمہید و اختتام، رمزیت، اشاریت، تجسس اور کردار نگاری کے باوصف منٹو کو کامیاب خاکہ نگار قرار دیا۔

ڈاکٹر انوار احمد نے اپنے مضمون ''سعادت حسن منٹو۔ پاکستان کا ایک غیر معمولی تخلیق کار'' میں سعادت حسن منٹو کی پاکستانیت کے حوالے سے چلنے والی بحث کا حوالہ دیتے ہوئے منٹو کے پاکستانی تشخص پر اپنی رائے کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے:

> ''اگر تو پاکستانی سے مراد ایک ایسا شخص ہے جو بھارت کو عالمِ اسلام کی مدد سے تہس نہس کرنا چاہتا ہے تو منٹو پاکستانی نہیں تھا اور اگر پاکستانی تخلیق کار سے وہ شخص مراد ہے جو طاقت وروں کی تاریخ، تہذیب اور قومی شناخت کی من چاہی تشریح کے مقابل اپنے تخلیقی ضمیر کی روشنی میں حقِ انحراف استعمال کرتا ہے تو پھر بلاشبہ منٹو سے بڑا کوئی پاکستانی تخلیق کار نہیں تھا۔''[۲۰۱]

اُنھوں نے منٹو کی تحریروں کے درجنوں اقتباسات کے ذریعے منٹو کی تخلیقی صلاحیتوں کا جائزہ لیا۔[۲۰۲]

''منٹو صاحب اور ان کی کہانی'' میں اصغر ندیم سیّد کا موقف ہے کہ منٹو کا مسئلہ نہ تو کردار تھا اور نہ ہی کوئی معاشرتی موضوع یا کوئی سماجی مسئلہ بلکہ منٹو کا مسئلہ صرف اور صرف کہانی تھا۔ چناں چہ اسے جہاں سے بھی کہانی ملنے کی امید ہوتی وہ وہیں پہنچ جاتا۔ اُنھوں نے منٹو کی افسانہ نگاری پر گرفت کے حوالے سے اس واقعہ کا بھی ذکر کیا جب ''سویرا'' کراچی نے اپنے شائع شدہ اعلان کی لاج رکھتے ہوئے مجبوراً منٹو سے کرشن چندر کے اُسلوب میں افسانہ لکھوایا۔ کرشن چندر کے سامنے جب منٹو کا افسانہ رکھا گیا تو اُنھوں نے اسے پڑھنے کے بعد کہا کہ بہتر تھا کہ میرے نام سے منٹو کے افسانے کو چھاپ دیا جاتا۔ گویا منٹو کے لیے کسی بھی قسم کی کہانی لکھنا مشکل نہیں تھا۔ ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی نے اپنے مضمون ''منٹو کے افسانوں میں گھرانوں کے انہدام کے جنسی محرکات'' میں منٹو کے افسانوں ''ترقی کاتب''، ''کتاب کا خلاصہ''، ''اللہ دتہ'' اور ''پانچ دن'' کی مثالیں دیتے ہوئے کہا کہ برصغیر پاک وہند کے معاشرے میں موجود ادھیڑ عمر افراد کے جنسی مسائل کو اُجاگر کر کے منٹو نے مروّجہ معاشرتی ڈھانچے کے خلاف بھرپور آواز اُٹھائی ہے۔

''سعادت حسن منٹو اور محمد حسن عسکری کا اُردو ادب'' محمد سعید کا مضمون ہے۔ مضمون نگار نے محمد حسن عسکری اور سعادت حسن منٹو کے اشتراک سے شائع ہونے والے رسالے دوماہی ''اُردو ادب'' کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ محمد حسن عسکری اور انجمن ترقی پسند مصنّفین کے اختلافات، منٹو کی کتاب ''سیاہ حاشیے'' پر حسن عسکری کے مقدمہ لکھتے ہی ترقی پسند ادیبوں کا ردِ عمل اور منٹو عسکری ''گٹھ جوڑ'' کی وجوہات پر عمدہ گفتگو کی گئی ہے۔ محمد سعید کا یہ مضمون نہ صرف ''اُردو ادب'' کی اہمیت کو اُجاگر کرتا ہے بلکہ اس مضمون سے قیامِ پاکستان کے بعد کی ادبی صورت حال بھی پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔

صائمہ ارم کے مضمون ''منٹو کے افسانوں میں ہجوم کی نفسیات'' میں فرد اور گروہ کے تعلق کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد مضمون نگار نے منٹو کے ایسے افسانوں کا تجزیہ کیا ہے جن میں کسی ایک فرد کی بجائے پورا گروہ شامل ہے۔ ان کے مطابق ''آخری سیلیوٹ''، ''رام کھلاون''، ''ٹیٹوال کا کتا''، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اور ''سہائے'' کا پس منظر ذاتی کی بجائے اجتماعی یا گروہی ہے اور جس طرح ہر بڑے گروہ میں مزید کئی چھوٹے چھوٹے گروہ ہوتے ہیں جن کے اپنے مفادات ہوتے ہیں اس طرح منٹو نے بھی اپنے افسانوں میں ہمہ قسمی گروپ اور ان کی ترجیحات سے پردہ اُٹھایا ہے۔

سیدہ مصباح رضوی ''منٹو کی ایک غیر مدوّن تحریر'' کی ذیل میں منٹو کی ستر سال پرانی ترجمہ کردہ تحریر کو سامنے لائی ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ منٹو کی یہ تحریر اب تک شائع ہونے والے کسی مجموعے میں بھی شامل نہیں۔ جس کا عنوان ''سوویٹ کا سند باد جہازی'' ہے۔ ماہنامہ ''شاہکار'' لاہور کی جلد۱، شمارہ ۱۵ اگست ۱۹۳۵ء کے شمارے میں شامل ہے۔ یہ روسی ادیب الیا الف اور ایگنی کی تحریر کا اُردو ترجمہ ہے جو شاید انگریزی سے کیا گیا ہے۔

شمشیر حیدر شجر نے ''سعادت حسن منٹو کے علامتی افسانے'' میں ''فرشتہ''، ''بار دہ شمالی'' اور ''پھندنے'' کو جدید علامتی افسانے کا سنگ بنیاد قرار دیا۔ ان سے قبل عفت انیس انھی تینوں افسانوں کو جدید اردو افسانے کا نقطۂ آغاز قرار دے چکی ہیں۔ [۲۰۳]

مضامین کے سلسلہ کے بعد احمد راہی، احمد ندیم قاسمی اور عارف عبدالمتین کی گفتگو کا ترجمہ شامل کیا گیا ہے یہ ترجمہ انیس ناگی کی منٹو پر بنائی گئی پہلی دستاویزی فلم "Manto a Profile" سے ماخوذ ہے۔ یہ ترجمے بھی مرتّبین نے کیے ہیں جب کہ آخر میں انتظار حسین، ڈاکٹر سلیم اختر اور سرمد صہبائی سے لیے گئے انٹرویو شامل ہیں۔

کتاب کا آخری حصہ ''روداد'' گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور میں منائے جانے والے ''یوم منٹو'' کی روداد پر مبنی ہے۔ اس میں ۲۰۰۴ء اور ۲۰۰۵ء میں منائے گئے ایام منٹو کی روداد شمشیر حیدر شجر اور نوید الحسن نے مفصل انداز میں بیان کی ہے۔ یوم منٹو ۲۰۰۴ء کے ضمن میں اس پروگرام کے خصوصی شرکا اصغر ندیم سید، ڈاکٹر انوار احمد، عابد حسن منٹو اور ڈاکٹر خالد آفتاب نے منٹو کی شخصیت اور فن پر جو گفتگو کی اس کا خلاصہ شامل کیا گیا ہے۔

''منٹو اور مزاح''، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک:

بیت الحکمت لاہور سے ۲۰۰۷ء میں شائع ہونے والی کتاب ''منٹو اور مزاح'' ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کی تحقیق و تدوین کا نتیجہ ہے۔ مرتّب، مدون اور محقق کو کتاب کی ترتیب، تدوین اور تحقیق کی نہ جانے کتنی گھاٹیوں کو عبور کر کے یہ شاہکار مجموعہ منظر عام پر لانے کی سعادت نصیب ہوئی۔ جس میں تحقیق، تدوین اور ترتیب کے کسی ایک اصول کو بھی ضابطہ ترتیب میں نہیں لایا گیا۔ ۴۸۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ۳۳ مضامین، ۶ خاکے، ۱۳ خطوط، ۱۱ ڈرامے، ۱۴ افسانے اور ۱۳۱ افسانچے شامل ہیں۔ یاد رہے کہ یہ تمام کی تمام تحریریں سعادت حسن منٹو کی ہیں جو ان کے مجموعوں اور کلیات سے بآسانی دستیاب ہو جاتی ہیں۔ کتاب میں موجود منٹو کی تخلیقات کی کل تعداد ۹۶ بنتی ہے۔

اس ضخیم کتاب کی تدوین و تحقیق کا دعویٰ اپنی جگہ مگر کتاب کو پڑھنے/دیکھنے کے بعد بہت مایوسی ہوتی ہے کہ مرتّب کے دیباچہ نما چار صفحاتی عامیانہ مضمون بعنوان ''مزاح نگار منٹو'' کے علاوہ ایک حاشیہ یا حوالہ پوری کتاب میں نہیں ملتا۔ نہ ہی دیباچے میں طریق تحقیق و تدوین بتائے یا جتائے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ دیباچے میں اُن مجموعوں تک کی نشاندہی نہیں کی گئی جن سے یہ مضامین لیے گئے ہیں۔ ''مزاح نگار منٹو'' جو مرتّب کے دیباچے کا عنوان ہے، میں ڈاکٹر اشفاق احمد ورک نے ایک حیران کن انکشاف کچھ یوں کیا کہ:

> ''اس حقیقت سے بہت کم لوگ آشنا ہیں کہ اردو ادب میں سعادت حسن منٹو کا ورود بطور ایک مزاح نگار کے ہوا لیکن اس زمانے میں افسانے کا جادو ایسا سر چڑھ کر بول رہا تھا کہ منٹو بھی اس کے اثر میں آئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو کے افسانوں میں اکثر مقامات پر طنز و مزاح کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔'' [۲۰۴]

اب تک منٹو کی سوانح اور فن پر جتنا بھی تنقیدی سرمایہ میسر ہے، منٹو کے کسی بھی شارح یا نقاد نے اس قسم کا دعویٰ نہیں کیا۔ بلکہ یہ بات تو اب زبان زد عام ہے کہ منٹو نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز تراجم نگاری سے کیا تھا۔ جہاں تک مرتّب کی دوسری بات کا تعلق ہے کہ چوں کہ افسانے کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا اس لیے منٹو بھی اس کا اسیر ہو گیا، قطعاً بے بنیاد ہے۔ اپنی تمام تخلیقات میں جو نثر کی مختلف انصاف سے تعلق رکھتی ہیں، منٹو اگر کسی صنف کو خالص سمجھتا تھا یا پھر اپنا فن شمار کرتا تھا تو وہ ''افسانہ'' ہی تھی۔ منٹو بظاہر عجلت میں افسانہ لکھتے ضرور دکھائی دیتے ہیں لیکن در حقیقت وہ افسانوی ضروریات کی پابندی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اور سوائے اپنے افسانوں کے اُنھوں نے دیگر تحریروں پر کبھی فخر نہیں کیا۔

منٹو کی مضمون نگاری کا سلسلہ اگرچہ کہ اُس کی ابتدائی ادبی زندگی کے تھوڑے عرصے بعد شروع ضرور ہو گیا تھا لیکن مزاحیہ و طنزیہ مضامین کی افراط ۱۹۴۷ء کے فسادات کے بعد اور منٹو کے قیام پاکستان کے عہد سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن صرف مضامین میں ہی نہیں، بلکہ افسانوں اور افسانچوں تک میں منٹو کا طنزیہ و مزاحیہ اسلوب کہیں نہ کہیں چھلک پڑتا ہے۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کے مطابق:

> ''اس دور کے حالات نے مزاح نگار منٹو کے چہرے سے ظرافت و شگفتگی کا نقاب اتار کر اس کے ہاتھ میں طنز کا تند و تیز نشتر تھما دیا، جس سے وہ ہماری معاشرتی ناہمواریوں، سماجی بوالعجبیوں، بندھے ٹکے جاہلانہ رویوں، عقل و شعور سے عاری حکمرانوں اور گھمبیر منافقتوں کی نہایت دبنگ اور بے رحم انداز میں سرجری کرتا چلا جاتا ہے۔'' [۲۰۵]

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کی یہ کتاب اُن کے عامیانہ قسم کے دیباچہ نما مضمون کے ساتھ مرتّبین و مدونین کے اس گروہ سے تعلق رکھتی ہے جس میں کمپوزر اور پبلشر کا کردار مرتّب یا مدون سے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

''سعادت حسن منٹو: ایک لیجنڈ''، ڈاکٹر ہمایوں اشرف:

سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن کے متعلق (۱۰۸۴) صفحات پر مشتمل یہ سب سے ضخیم کتاب ہے۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی کے دیباچے ''ایک ادبی دستاویز' مرتّب کے مقدمے اور منٹو نامہ' سمیت مجموعی طور پر ۸۴ مضامین کو پورٹریٹ، سلف پورٹریٹ، یادیں، باتیں، معجزۂ فن کی نمود، خدمات! متفرق اور اس فسوں میں، کے عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے ۲۰۰۷ء میں اس کتاب کے ذریعے منٹو شناسی کے باب میں لکھے گئے تنقیدی سرمائے کا ایک بہت بڑا اور اہم حصہ یکجا کر کے منٹو کی شخصیت اور فن کی تفہیم میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ پہلا حصہ پورٹریٹ' پانچ شخصی نوعیت کے مضامین پر مشتمل ہے۔ سیلف پورٹریٹ ''منٹو اپنے ہم زاد کی نظر میں'' واحد مضمون ہے۔ یہ مضمون خود سعادت حسن منٹو کی تحریر ہے۔ کتاب کے تیسرے حصے، یادیں، میں دس، چوتھے حصے' باتیں، میں چودہ، پانچویں حصے، معجزۂ فن کی نمود، میں پینتیس، چھٹے حصے، خدمات: متفرق، میں آٹھ جب کہ آخری حصہ بعنوان، اس فسوں میں، آٹھ مضامین پر مشتمل ہے [۲۰۶] یہ تمام مضامین مختلف اوقات میں شائع ہونے والے رسائل و جرائد' خاص طور پر منٹو کی وفات کے بعد شائع ہونے والے خصوصی شماروں کے علاوہ عمومی رسائل میں اس سے قبل اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ منٹو کے کسی مرتّب نے پہلی بار منٹو کے متعلق کی گئی تنقید کے منتشر سرمائے کا ایک بہت بڑا حصہ اکٹھا کر کے قارئین اور ناقدین کے آگے لا کے رکھ دیا۔ کتاب میں شامل مضامین کا بڑا حصہ نقوش، افکار، گل خنداں اور پگڈنڈی وغیرہ کے منٹو نمبروں میں چوں کہ شائع ہو چکا ہے اس لیے ان مضامین میں اُٹھائے گئے مباحث کو زیرِ بحث لانا

تکرار محض کے سوا کچھ نہیں[۲۰۷] ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے اس کتاب کی اہمیت کو باور کراتے ہوئے بڑے پتے کی باتیں کی ہیں۔ ان کے مطابق منٹو کے محققین کے لیے تو شاید یہ مضامین نئے یا اجنبی نہ ہوں، لیکن منٹو کے قارئین اور ناقدین عموماً اس بات سے نابلد ہوتے ہیں کہ منٹو کی شخصیت اور فن کے متعلق اب تک کیا کیا چھپ چکا ہے اور کہاں کہاں چھپ چکا ہے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں کہ :

> ''محقق تو ایسے مضامین کو شاید تلاش بھی کر لیتا ہے لیکن عمومی تنقید لکھنے والوں کی نگاہ میں پہلے لکھی ہوئی ساری تحریریں نہیں ہوتیں۔ لکھنے والا یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کون سی بات جو بہت پہلے قلم زد ہو چکی ہے، اس کی تکرار کر رہا ہے اور کون سا نیا پہلو تلاش کر رہا ہے۔''[۲۰۸]

ڈاکٹر ہمایوں اشرف سے پہلے کے تمام مرتّبین نے اپنی ترتیب دی گئی کتابوں میں ان ماخذات کی نشاندہی کی طرف بالکل توجہ نہ کی جو ان کی کتاب کی اشاعت کا سبب بنے۔ فاضل مرتّب نے بہت سے مضامین کے ماخذات کی نشاندہی ہر مضمون کے آخر میں کر کے ترتیب و تدوین کے اس بنیادی اصول کا پاس رکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن بہت سے مضامین ماخذات کی نشاندہی کیے بغیر بھی کتاب کا حصہ بن گئے ہیں۔ ماخذات کے ضمن میں اُن سے ایک غلطی بار بار ہوئی جسے ہم کتابت کی غلطی بھی قرار نہیں دے سکتے۔ اُنھوں نے ایسے تمام مضامین جو نقوش، لاہور کے منٹو نمبر مطبوعہ ۱۹۵۵ء سے منتخب کیے ہیں بلکہ نقوش میں شامل تمام مضامین ہی اٹھا لیے ہیں، کا حوالہ تو ضرور دیا ہے مگر نقوش کے منٹو نمبر کی اشاعت کا سال وہ جگہ جگہ ۱۹۵۴ء ہی درج کرتے چلے آئے ہیں۔ حال آں کہ نقوش سمیت کسی بھی رسالے نے ۱۹۵۵ء سے پہلے منٹو کے متعلق کوئی خصوصی شمارہ شائع نہیں کیا۔

اس بات میں کسی شک اور شبے کی گنجائش نہیں کہ متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے منٹو کی شخصیت اور فن پر لکھے گئے ان مضامین کی ایک خاص اہمیت ہے جس کے ذریعے مختلف ادوار سے تعلق رکھنے والے ارباب تنقید کی منٹو کے متعلق پائی جانے والی آرا کی روشنی میں منٹو شناسی کے کئی در وا ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

''نوادرات منٹو''، محمد سعید:

محمد سعید کی مرتّب کردہ یہ کتاب ''ہمایوں'' اور عالمگیر کے دو روسی اور ایک فرانسیسی ادب نمبر جو سعادت حسن منٹو کی معاونت سے اشاعت پذیر ہوئے تھے، میں شامل سعادت حسن منٹو کی اُن تحریروں سے مزین ہے جو بقول مرتّب، غیر مدون کی ذیل میں آتی ہیں۔ دو حصوں میں منقسم اس کتاب کے پہلا حصے کا تعلق ایسی تحریروں سے ہے جو طبع زاد ہیں۔ اُنھیں تین ذیلی حصوں میں اصناف کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ حصہ الف، بعنوان ''خود نوشت'' میں چار، حصہ ب بعنوان ''افسانے'' میں آٹھ جب کہ حصہ ج، بعنوان، ''مضامین'' میں منٹو کی پندرہ تحریروں کو پاکستانی، روسی اور فرانسیسی ادب کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے۔ کتاب کا دوسرا حصہ سعادت حسن منٹو کے کیے گئے تراجم سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ بھی پچھلے حصے کی طرح تین ضمنی اجزاء میں منقسم ہے۔ جز و الف میں روسی اور فرانسیسی افسانہ نگاروں کی آٹھ ایسی کہانیوں کو شامل کیا گیا ہے جن کا ترجمہ منٹو کے قلم سے ہوا۔ حصہ ب میں تین ڈرامے جب کہ حصہ ج میں روسی اور فرانسیسی شاعروں، ویلری بر سوف، میکوف، ٹالسٹائی، لیفلیف، طوماسکی، سر منطوف، لیٹر منلوف، پشکن، کریمیلیف اور خاص طور پر وکٹر ہیوگو کی نظموں کے تراجم کا انتخاب شامل ہے۔[۲۰۹] کتاب میں شامل باسٹھ تحریروں کو شائع کرتے وقت مرتّب نے زمانی ترتیب کو خاص طور پر ملحوظ خاطر رکھا۔ زیادہ تر تحریروں کا تعلق منٹو کی ابتدائی اور آخری زندگی کے زمانہ سے

تعلق رکھتا ہے۔ گویا منٹو کے ذہنی، فکری اور فنی ارتقاء کو سمجھنے میں یہ تحریریں خاصی مدد فراہم کرتی ہیں۔ کتاب کے مرتّب محمد سعید نے ''مقدمہ'' میں ہمایوں اور عالمگیر کے روسی و فرانسیسی ادب نمبروں کی نایابی اور اس کی تلاش میں معاونت اور فراہمی کرنے والے احباب کی تفصیلات بتا کر تحقیقی دیانت داری کا ثبوت فراہم کیا۔ و گرنہ ہمارے ہاں کے مرتّبین دوسروں کی کتابوں کو اپنے نام سے چھپوا کر دیدہ دلیری سے سینہ تانے پھرتے ہیں۔ مرتّب نے کتاب میں شامل تمام تحریروں کے مکمل حوالے درج کرنے پر بھی خاص توجہ دی ہے۔

کتاب میں شامل مقدمے کی ابتدا میں مرتّب نے منٹو کی تحریروں کے معروف مدونین و مرتّبین، ہمایوں اشرف، شمس الحق عثمانی اور سنگ میل، کے شائع کردہ کلیات منٹو، میں موجود خامیوں پر اعتراضات کے بعد کلیات منٹو کی از سر نو تدوین کی ضرورت پر زور دیا۔ اپنی کتاب ''نوادرات منٹو'' کو وہ اس سلسلہ کی کڑی قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کڑی کو شائع ہوئے نو سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔ مرتّب نے ابھی تک اگلی منزل کی طرف قدم نہیں بڑھایا جب کہ ان کے ایک اور معاصر امجد طفیل نے کلیات منٹو کی از سر نو تشکیل کر کے اسے شائع بھی کر دیا۔

نوادرات منٹو کے ضمن میں ڈاکٹر اسد فیض کے اُس ملال کا تذکرہ بھی ضروری ہے جو اُنھوں نے اپنی مرتّب کردہ کتاب ''منٹو کی گمشدہ تحریریں'' میں کیا تھا۔ اسد فیض کے مطابق شہزاد منظر کے ساتھ مل کر ہمایوں اور عالمگیر کے خصوصی شماروں میں موجود منٹو کی تحریروں کی تدوین کا عمل وہ مکمل کر چکے تھے لیکن پبلی شرز کے ساتھ رائلٹی کے تنازعوں نے محمد سعید کو موقع فراہم کر دیا اور وہ ''نوادرات منٹو'' کی صورت میں ان رسائل میں شامل تحریروں کو شائع کر کے مقدم ہو گئے۔[۲۱۰] ۳۹۰صفحات پر مشتمل یہ کتاب مئی ۲۰۰۹ء میں ادارہ فروغ اردو، لاہور سے اشاعت پذیر ہوئی۔

''سعادت حسن منٹو (منٹو صدی: منتخب مضامین)''، مبین مرزا، ڈاکٹر روف پاریکھ:

منٹو صدی کی مناسبت سے یہ پاکستان میں چھپنے والی سب سے پہلی کتاب ہے۔ جو منٹو کی ۱۰۰ اویں سالگرہ سے ایک سال قبل یعنی ۲۰۱۱ء میں مقتدرہ ''قومی زبان پاکستان نے اسلام آباد سے شائع کی۔ سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن کے متعلق مطبوعہ مضامین کے بہترین انتخاب کی تحقیق و تدوین کر کے مبین مرزا اور ڈاکٹر روف پاریکھ جیسے نامور محقق اور نقاد جناب افتخار عارف کو تو احسان کے بوجھ تلے دبا گئے مگر حقیقت میں نہ تو ان دونوں نے کوئی تحقیقی کارنامہ سرانجام دیا اور نہ ہی تدوین متن کی گتھیاں سلجھائیں۔ مبین مرزا اور ڈاکٹر رؤف پاریکھ جیسی علمی و ادبی شخصیات اور غلام زہرہ یا طاہر اصغر کی مرتّبہ کتب کا موازنہ کریں تو تمام احباب ایک ہی دائرے میں گھومتے دکھائی دیتے ہیں، اس فہرست میں جناب احمد سلیم کا اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ کتاب میں شامل پینتیس مضامین کا بڑا حصہ وہی ہے جو اس کتاب کی زینت بننے سے پہلے متعدد مرتّبہ اشاعت پذیر ہو کر بار بار پڑھا جا چکا ہے۔ نقوش، افکار، دانشور کے منٹو نمبرز کے علاوہ غلام زہرہ کی مرتّب کردہ کتاب ''منٹو کیا تھا'' انیس ناگی کی کتاب، سعادت حسن منٹو ایک مطالعہ، احمد سلیم کی مرتّبہ کتاب، منٹو میرا دوست میرا دشمن، اور طاہر اصغر کی کتاب، یہ ہے منٹو شخصیت اور یہ ہے منٹو فن، کے علاوہ منٹو کا انکار، سب سے بڑا افسانہ نگار، منٹو کی پہچان وغیرہ میں بھی یہ تمام مضامین تواتر سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ مخصوص مضامین کی بار بار اشاعت ان تمام مرتّبین کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔ غلام زہرہ جیسی مبتدی اور سلیم احمد، مبین مرزا اور رؤف پاریکھ کی تحقیق و تدوین

صلاحیتوں میں ذرا برابر بھی فرق دکھائی نہیں دیتا۔ زیرِ تبصرہ کتاب کو دو بڑے حصوں، شخص و عکس اور فکر و فن کے زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں چھے مضامین گنجا فرشتہ، از سید عابد علی عابد، میرا دوست میرا دشمن، عصمت چغتائی، منٹو میرا دشمن، اوپندر ناتھ اشک، رحم دل دہشت پسند، ابو سعید قریشی، جو بک نہ سکا، ہاجرہ مسرور اور منٹو ماموں کی موت، از حامد جلال شامل ہیں۔ یہ تمام کے تمام مضامین سب سے پہلے یکجا صورت میں نقوش، کے منٹو نمبر ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئے تھے۔ مختلف صورتوں میں ان کی اشاعت کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ کتاب کا دوسرا حصہ جس میں ایسے مضامین شامل کیے گئے ہیں جو منٹو کے فن کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان مضامین کی صورت حال بھی وہی ہے جو شخصی نوعیت کے مضامین کی تھی، یعنی ہر مضمون، منٹو کے متعلق مرتّب ہونے والی ہر کتاب اور ہر منٹو نمبر میں موجود ہے۔ مثلاً منٹو کا مقام، از حسن عسکری، منٹو کی حقیقت نگاری، از عبادت بریلوی، موذیل ایک پرسنل کہانی، از افتخار جالب، نیا قانون، ایک تجزیہ، از ڈاکٹر آغا سہیل، منٹو اور انسان دوستی، از انیس ناگی، منٹو کے تراجم، از ڈاکٹر محمد علی صدیقی، سعادت حسن منٹو، برِ صغیر کا تخلیقی ضمیر، از ڈاکٹر انوار احمد، سعادت حسن منٹو، از حنیف رامے، منٹو کی خاکہ نگاری، از احمد عقیل روبی، منٹو کے عہد کا افسانہ، از اصغر ندیم سید، کہاں کہاں نہیں چھپے۔ [۲۱۱] اسی طرح وارث علوی، ممتاز شیریں، شمیم حنفی، جگدیش چندر ودھاون کے مضامین، رسائل و مرتّبہ کتب کے علاوہ منٹو ایک مطالعہ، منٹو۔ نوری نہ ناری، منٹو حقیقت سے افسانے تک اور منٹو نامہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ [۲۱۲] مبین مرزا نے دیباچہ میں اس انتخاب کی غرض و غایت یہ بیان کی ہے کہ منٹو کے عہد سے لے کر آج تک ہماری تنقید نے منٹو کا مطالعہ کس نہج اور کس زاویے سے کیا ہے اور یہ کہ آج کا نقاد منٹو کو کس نقطہ نظر سے دیکھ رہا ہے۔ چناں چہ اُنھوں نے مختلف نقطہ ہائے نظر رکھنے والے ناقدین کے مقالات کو شاملِ کتاب کیا ہے۔

مضامین کا وہ مختلف حصہ جس کی نمائندگی عہدِ حاضر کے منٹو شناسوں نے کی ہے اس کتاب کا خاصا بھی ہے اور پڑھنے والوں کو تازگی بھرا احساس بھی دیتا ہے۔ محمد حمید شاہد کا مضمون، سعادت حسن منٹو، ہمارا ہم عصر، عنبرین حسیب عنبر کا مضمون، بڑے شہر کا افسانہ نگار، منٹو اور ڈاکٹر روش ندیم کا مضمون ''منٹو کی عورتیں' آج کی تنقیدی نسل کے ترجمان مضامین ہیں۔ اگرچہ کہ یہ مضامین بھی اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں لیکن پھر بھی اُنھیں منٹو کے باب میں نیا ذائقہ ضرور کہا جا سکتا ہے۔

''منٹو ایک نیا مطالعہ''، ڈاکٹر صالحہ زریں:

منٹو صدی کے موقع پر ہندوستان سے شائع ہونے والی اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں شامل زیادہ تر مضامین کے مصنفین کا تعلق آج کی نسل سے ہے۔ عہدِ جدید کا نقاد منٹو کی تفہیم کس تناظر اور کن معنی میں کرتا ہے یہ اس کتاب کی ترتیب کا مقصد خاص ہے۔ مرتّبہ ڈاکٹر صالحہ زریں کے ''مقدمہ'' سمیت کتاب میں شامل مضامین کی تعداد اٹھارہ ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے تمام لکھاری ہندوستان کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ کتاب میں شامل مضامین پاکستان میں موجود قارئین کی ایک بڑی تعداد کے مطالعے میں پہلی دفعہ آئے ہوں تو کوئی بڑی بات نہیں۔ کتاب کی مرتّب ڈاکٹر صالحہ زریں نے ''مقدمہ'' میں منٹو کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں کا روایتی انداز میں جائزہ لیا۔ منٹو کی شخصیت اور فن کے چیدہ چیدہ اور قدرے معروف پہلوؤں میں اب شاید قاری خاص دلچسپی نہیں رکھتا۔ کیوں کہ کم و بیش ہر کتاب میں یہ التزام خصوصی طور پر برتا گیا ہے۔ ویسے بھی منٹو کو بطور شخص اور بطور افسانہ نگار الگ الگ رکھ کے پرکھنا ممکن نہیں۔ اس لیے شخصیت کے ذکر میں فن اور فن کے تذکرے میں شخصیت غیر ارادی طور پر شامل ہو جاتی ہے۔ بہر

حال یہ ایک روایتی قسم کا مضمون ہے جس میں منٹو کی زندگی اور فن کے ارتقاء کا واجبی سا جائزہ لیا گیا ہے۔ منٹو کے سنجیدہ قاری پر یہ مقدمہ کوئی خاص اثر نہیں ڈالتا۔ وارث علوی عموماً منٹو پر بڑے بڑے اور سنجیدہ قسم کے مضامین لکھتے ہیں مگر اس کتاب میں ان کا نسبتاً مختصر مضمون بعنوان: ''منٹو کا فن -ایک تاثر'' شامل ہے، جس میں وہ منٹو سے اپنی عقیدت اور عشق کا اظہار کرتے ہوئے اسے عظیم افسانہ نگار قرار دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ منٹو کے متعلق ان کا آج بھی یہ خیال ہے کہ ہم اسے پوری طرح سے سمجھ نہیں پائے۔ گویا منٹو کے افسانوں کی از سر نو تعبیر کی ضرورت فی زمانہ موجود ہے۔

سید محمد عقیل رضوی نے ''منٹو کی تین مظلوم لیکن جرات مند عورتیں'' میں ہتک کی سوگندھی، سراج اور سو کینڈل پاور کا بلب، کی عورت کے کرداروں کا جائزہ لیا۔ جو بغیر کسی نتیجے کے ختم ہو جاتا ہے۔ دیوندر اسر اپنے مضمون ''منٹو ایک سماجی جراح'' میں کہتے ہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ منٹو کے افسانوں کا تجزیہ اُنھوں نے مختلف انداز سے کیا ہے۔ شروع شروع میں اُنھوں نے یہ مطالعہ بطور سامراجی جراح کیا تھا۔ پھر فطری اور اصلی انسان ہونے کی بحث سے گزرتے ہوئے روح کی یگانگت تلاش کرنے لگے اور اب وجودی نقطۂ نظر سے منٹو کا مطالعہ کرنے کو جی چاہتا ہے کیوں کہ منٹو کی مختلف کہانیوں کے مختلف کردار مختلف نقطہ ہائے نظر سے ہی دیکھے اور سمجھے جا سکتے ہیں۔ شاہد ماہلی اپنے مضمون ''منٹو کی افسانہ نگاری میں تجربے'' میں منٹو کی لسانی اور اسلوبیاتی خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''ان کی نثر بے پناہ قوت اور بے اندازہ حسن و جمال کی حامل ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے سادہ مانوس الفاظ اپنے اندر معنی کی ایک پوری کائنات سموئے رہتے ہیں۔'' [۲۱۳]

منٹو کی زبان کو وہ براہ راست ترسیل اور ابلاغ کی زبان قرار دیتے ہوئے پھندنے کو منٹو کا ایک بے مثال افسانہ گردانتے ہیں، جس میں الفاظ کو یکسر منفرد انداز میں برتنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

''منٹو کی حقیقت نگاری پر تازہ نوٹ'' میں علی احمد فاطمی منٹو کی حقیقت نگاری کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج پریم چند کے بعد منٹو سے زیادہ بڑا حقیقت نگار کوئی نہیں سمجھا جاتا۔ ان کے مطابق منٹو نے دیگر افسانہ نگاروں کے برخلاف حقیقت کے نئے نئے پہلوؤں سے اُردو افسانے کو متعارف کرایا۔ اگرچہ، وقار عظیم، ممتاز شیریں، وارث علوی اور حسن عسکری نے بڑی ژرف نگاہی سے منٹو کی حقیقت نگاری کو سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ سوال جوں کا توں اپنی جگہ پر موجود ہے کہ کیا ہم سعادت حسن منٹو اور اس کی حقیقت نگاری کو مکمل طور پر سمجھ پائے ہیں؟

طارق چھتاری نے اپنے مضمون ''منٹو! ایک عظیم فنکار'' میں منٹو کے فن افسانہ نگاری کو فنی اور فکری لحاظ سے احسن قرار دیا۔ وہ منٹو کی کہانی ''پھندنے'' کو جدید علامتی افسانے کا نقطہ آغاز گردانتے ہیں۔ صغیر افراہیم منٹو کے جنس یا طوائف کے موضوع پر لکھے گئے افسانوں اور ان کے کرداروں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عشق و محبت کی عمومی واردات سے لے کر جنس کی پیچیدہ نفسیات تک مرد اور عورت کے درمیان رشتوں کے کئی نیم روشن اور تاریک گوشے اس کے فن پاروں میں بڑی ہنر مندی سے پیش کیے گئے ہیں۔'' [۲۱۴]

منٹو کی افسانہ نگاری کو سراہتے ہوئے وہ مزید کہتے ہیں کہ موذیل ''ہتک'' کالی شلوار، جانکی، ممی، شاردا، خوشیا اور بو وغیرہ ایسے افسانے ہیں جو ہمارے روایتی نظام اخلاق کو درہم برہم کر دیتے ہیں۔

''منٹو نظریے اور سماج''، ترنم ریاض کا مضمون ہے جس میں وہ منٹو کی لکھی گئی کہانیوں اور ان کے موضوعات کو آج بھی اتنا ہی اہم سمجھتی ہیں جتنا منٹو کے زمانے میں اہم تھے۔ منٹو نے جن موضوعات کو سامنے رکھ کر اپنی کہانیاں تخلیق کیں وہ آج بھی ہمارے سامنے سوالیہ نشان کی طرح ہم سے جواب طلب کر رہی ہیں۔ بالکل اُسی طرح جیسے اپنی تخلیق کے زمانے میں کر رہی تھیں۔ مضمون نگار کے مطابق منٹو بھلے سیاسی و سماجی بندشوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے لیکن وہ افسانہ نگاری کی فنی اور تکنیکی بندشوں کا حد درجہ احترام کرتے تھے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ، کی ایک نئی تعبیر اُنھوں نے یہ کی کہ اس زمانے کا مرکزی کردار بشن سنگھ دراصل خود سعادت حسن منٹو ہی ہے ،جس نے ہجرت کے باوجود تقسیم کے عمل کو سخت ناپسند کیا۔ نگار عظیم نے اپنے مضمون، ''منٹو ایک منفرد قلمکار'' میں منٹو کے فن افسانہ نگاری میں موجود خصوصیات کا ذکر کیا' جس میں منٹو کے موضوعات، کردار، واقعہ نگاری، جزئیات نگاری، منظر نگاری، الفاظ کا انتخاب، افسانے کا آغاز اور انجام، تشبیہات کا بر محل استعمال' غرض اپنے ایک ہی مضمون میں اُنھوں نے منٹو کی بیشتر فنی و فکری خوبیوں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ علی احمد فاطمی نے ''بیگو'' کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بیگو قسم کے افسانے لکھ کر منٹو نے ثابت کر دیا کہ صرف جنس یا طوائف ہی نہیں بلکہ اس طرح کے رومانی افسانے بھی وہ لکھ سکتا ہے۔ ڈاکٹر خالد اشرف اپنے پر مغز مضمون، منٹو کا نظریہ ادب، میں منٹو کو ایک آزاد فکر اور روشن خیال ادیب قرار دیتے ہیں جو کسی بھی ادبی نظریے کا پیروکار ہونے کی بجائے نظریاتی ادب کی تخلیق کا سرے سے مخالف ہے۔ اگرچہ وہ ترقی پسندانہ سوچ رکھتا تھا لیکن کسی تحریک کے دائرے میں رہ کر اپنے خیالات کی ترجمانی اس کے بس کی بات نہ تھی۔ چناں چہ ترقی پسندانہ سوچ اور حلقہ احباب کے باوجود منٹو کی ترقی پسندوں سے اَن بن ہی رہی۔ اپنے اس طویل مضمون میں فاضل مضمون نگار منٹو، حسن عسکری اور ترقی پسند تحریک کے درمیان اختلافات پر خوب صورت اور جامع بحث کرتے ہوئے اس الزام کو رد کرتے ہیں کہ حسن عسکری نے منٹو کو ترقی پسندی سے دور کر کے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ منٹو اور حسن عسکری کے ادبی نظریات کا تقابل کیا جائے تو دونوں کے ہاں کوئی قدر مشترک نہیں ملے گی۔

ش۔ ق نظام نے 'افسانہ، حقیقت اور منٹو، میں منٹو کے افسانہ ہتک، کا تجزیہ کیا ہے جب کہ لئیق رضوی نے ''منٹو اور ادبی صحافت'' میں منٹو کو بنیادی طور پر صحافی قرار دیا جس نے اپنے ادبی سفر کا آغاز اخبارات ہی سے کیا۔ ان کی یہ صحافیانہ صلاحیت سب سے زیادہ، مصور اور کاروان میں کھل کر سامنے آئی۔ پھر وہ کئی ملکی اخبارات اور رسائل کے ساتھ وابستہ رہے۔ مغربی پاکستان میں منٹو کا کالم ''چشم روزن'' بہت مقبول رہا، پھر دو ماہی ''اردو ادب'' کا اجرا، غرض منٹو کی صحافیانہ زندگی کے متعلق یہ ایک عمدہ مضمون ہے بقول مضمون نگار:

''اگر منٹو کو سمجھنا ہے، ان کے تخلیقی اور نظریاتی سفر کو جاننا ہے تو پہلے ان کی صحافت کو سمجھنا ہوگا۔'' [۲۱۵]

کتاب میں شامل آخری تین مضامین منٹو اور تانیثی ڈسکورس، منٹو کی خاکہ نگاری اور منٹو بحیثیت افسانہ نگار، بالترتیب ابو ظہیر ربانی، صالحہ زریں اور عارفہ بیگم کی تحریریں ہیں۔ ڈاکٹر ابو ظہیر ربانی منٹو کی تحریروں سے تانیثی حوالے دینے کے بعد لکھتے ہیں کہ ممکن ہے آج کے تانیثی نظریات کی روشنی میں منٹو کے کردار اس حد تک اپیل نہ کریں کیوں کہ آج تانیثیت کی نوعیت زیادہ نکھر کر سامنے آ

گئی ہے تاہم دوسرے افسانہ نگاروں کی نسبت منٹو کے ہاں یہ عنصر زیادہ بہتر اور عمدہ طریقے سے موجود ہے۔ڈاکٹر صالحہ زریں اور عارفہ بیگم نے منٹو کی خاکہ نگاری اور ڈرامانویسی کی خصوصیات قلمبند کی ہیں۔

ادبستان پبلی کیشنز، دہلی سے شائع ہونے والی اس کتاب میں مرتّبہ ڈاکٹر صالحہ زریں کے مقدمہ کے علاوہ کل سترہ مضامین شامل ہیں۔ صفحات کی تعداد ۲۵۶ ہے۔اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں شامل زیادہ تر مضامین عہد حاضر سے تعلق رکھنے والے ناقدین منٹو کے ہیں اور بیشتر مضامین نئے ہیں۔اس لیے منٹوانہ تنقید میں یہ ایک خوشگوار اور تازہ ہوا کا جھونکا محسوس ہوتی ہے۔

''منٹو ہمارے عہد کا تخلیقی ضمیر''، احمد سلیم:

سعادت حسن منٹو کی ۱۰۰ ویں سالگرہ کو حکومتی سطح پر منانے اور اس صدی کو منٹو صدی قرار دینے کے اعلان کے ساتھ ہی منٹو کے باب میں خوب گہما گہمی ہوئی۔ اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اس ضمن میں جہاں بہت سے سیمینار، کانفرنسیں اور مباحثے ہوئے وہیں کتب ورسائل کی اشاعت میں بھی بہت سوں نے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کی۔اور یہ بھی خیال نہ رکھا کہ جو شاہکار وہ سامنے لا رہے ہیں کیا وہ منٹو اور منٹو شناسوں کے لیے کسی قسم کے فائدے یا اضافی معلومات و مباحث بہم پہنچائے گا؟ طبعزاد کتابیں پھر بھی اپنی اشاعت کا کوئی نہ کوئی زاویہ ضرور رکھتی ہیں۔ لیکن ایسی کتابیں جو مرتّب کی جاتی ہیں ان کی ترتیب وتدوین کا واحد مقصد ادیب کی شخصیت یا فن کے اُن گوشوں کو سامنے لانا ہوتا ہے جن سے ادبی دنیا اس سے پہلے واقف نہ ہو یا پھر کم کم واقف ہو۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ منٹو کے مرتّبین (ایک آدھ کو چھوڑ کر) اس مقصد کو ہرگز ہرگز خاطر میں نہ لائے۔ منٹو کی وفات کے بعد سے آج تک مرتّب کی جانے والی کتابوں میں شامل مضامین کی فہرست کو جانچ کر دیکھیں تو ہر کتاب دوسری کتاب یا پھر کسی معروف رسالے کے منٹو نمبر کا چربہ ہے۔ ایسا نہیں کہ نئے لوگوں نے منٹو پر تنقید کرنا چھوڑ دی یا پھر فی زمانہ منٹو اپنی تخلیقی حیثیت کھو چکا۔ یقیناً آج بھی منٹو پر اسی طرح لکھا جا رہا ہے جیسے ہمیشہ لکھا جاتا رہا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ منٹو کے مرتّبین چبائے ہوئے لقمے ہی بار بار چبا رہے ہیں۔ تساہل اور منٹو کے نام کے ساتھ اپنا نام چپکانے کے علاوہ اور کوئی وجہ سمجھ میں تو نہیں آتی۔ احمد سلیم کی نگرانی میں ترتیب و تدوین پانے والی کتاب ''منٹو، برصغیر کا تخلیقی ضمیر'' بھی منٹو صدی کی مناسبت سے شائع کی گئی۔

کتاب میں شامل اُنیس میں سے پندرہ مضامین منٹو کے ایک نام نہاد مرتّب طاہر اصغر کی اسی سال مرتّب ہونے والی کتابوں ''یہ ہے منٹو شخصیت''، اور ''یہ ہے منٹو فن'' کے علاوہ غلام زہرہ کی مرتّبہ ''منٹو کیا تھا'' میں بھی موجود ہیں۔ سب سے پہلے یہ مضامین ۱۹۵۵ء میں منٹو کی وفات کے بعد شائع ہونے والے ان خصوصی شماروں میں موجود ہیں جو افکار، نقوش، گل خنداں اور دانشور نے شائع کیے۔ یا پھر ان مضمون نگاروں نے پہلے مختلف رسائل اور پھر اُنھیں اپنی کتابوں میں شائع کیا۔ منٹو کا مقام، از محمد حسن عسکری، سعادت حسن منٹو کی یاد میں از ممتاز حسین، منٹو حقیقت سے افسانے تک، از شمیم حنفی، منٹو کا فن۔ حیات و موت کی آویزش، از وارث علوی، سعادت حسن منٹو، از حنیف رامے، منٹو کا تغیر، ارتقاء اور فنی تکمیل، منٹو ایک اخلاقی فنکار، از ممتاز شیریں، منٹو کا ادبی شعور، از وارث علوی، منٹو، از ابواللیث صدیقی، منٹو اور مارکسزم، منٹو فسادات اور ہجرت، از انیس ناگی، بو اور بوئے آدم زاد، از وارث علوی کے علاوہ جگدیش چندر ودھاون کا مضمون سیاسی اور سماجی احتجاج کے افسانے۔ یہ ہے وہ طویل فہرست جو اس کتاب کی اساس ہے۔ شامل مضامین

کی تعداد، ترتیب، پبلی شرز اور مرتّب کے نام کے فرق کے علاوہ کم و بیش سبھی کتابوں میں یہی مضامین ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ چاہے وہ طاہر اصغر کی مکتبہ جدید اور بک ایچ کے پلیٹ فارم سے شائع کردہ کتابیں ہوں، برائٹ بکس لاہور کی مرتّبہ غلام زہرہ کی کتاب ہو یا سنگ میل لاہور کی شائع کردہ مذکورہ بالا کتاب۔ مرتّب، اشاعتی ادارے اور قیمتوں کے فرق کے علاوہ سب نے ایک ہی جیسا چورن بیچا ہے۔

ڈاکٹر انوار احمد کا مضمون ''سعادت حسن منٹو، برصغیر کا تخلیقی ضمیر'' اسی عنوان کے ساتھ سب سے پہلے ''انگارے'' ملتان کے منٹو نمبر میں شائع ہوا۔ اسی مضمون پر جناب احمد سلیم نے اپنی کتاب کا نام رکھ کر اس کی ترتیب اور تدوین کی۔ کون سی ترتیب رکھی اور کیا چیز تدوین کی؟ یہ سوال اپنی جگہ جوں کا توں موجود ہے۔

ڈاکٹر انوار احمد کا یہی مضمون ''انگارے'' کے مرتّب ڈاکٹر سید عامر سہیل کی مرتّبہ کتاب ''منٹو۔ کون ہے یہ گستاخ'' میں بھی شامل ہے۔ گوپی چند نارنگ کا مضمون، منٹو کی نئی پڑھت۔ متن، ممتا اور خالی سنسان ٹرین، محمد یوسف ٹینگ کا مضمون، سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری، دیوندر اسر کا مضمون، منٹو: زندگی کے آئینے میں روح کا عکس' کے علاوہ سلمان عبدالصمد کا مضمون سعادت حسن منٹو فن اور شخصیت کو ہم منٹو پر لکھے گئے تازہ نہیں تو کم از کم نئے مضامین ضرور قرار دے سکتے ہیں۔ نئے ان معنی میں کہ منٹو کی شخصیت اور فن پر مرتّب کی جانے والی کتابوں میں ان کا گزر اس سے پہلے نہیں ہوا۔ منٹو ہمارے عہد کا تخلیقی ضمیر'' مجموعی طور پر ۲۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

''منٹو، میرا دوست میرا دشمن''، احمد سلیم:

منٹو صدی کی مناسبت سے احمد سلیم کی مرتّب کردہ پچیس شخصی نوعیت کے مضامین پر مشتمل اس کتاب کو سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے ۲۰۱۲ء میں شائع کر کے منٹو کو خراج عقیدت پیش کرنے کا ایک آسان ترین راستہ نکالا ہے۔ آسان ان معنی میں کہ کتاب میں شامل تمام مضامین کئی کئی بار مختلف رسائل اور منٹو کے متعلق ترتیب دی گئی کتب میں شائع ہو چکے ہیں۔ کتاب میں شامل مضامین کے عنوانات اور مضمون نگاروں کے ناموں کو دیکھ کر منٹو کے سنجیدہ قاری محض مسکرا کر رہ جائیں تو کچھ بعید نہیں۔ احمد سلیم صاحب عہد حاضر کے متحرک ادیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں وہ اس بات سے بخوبی آگاہ ہوں گے کہ کسی بھی کتاب کی اشاعت کی کوئی نہ کوئی غرض اور غایت ہوتی ہے اور کم از کم یہ تو ضرور ہوتی ہے کہ اس سے ادب یا جو بھی اس کا موضوع ہو اس میں کسی نہ کسی زاویے سے انفرادیت یا اضافے کا سبب بنے۔ زیر تبصرہ کتاب میں شامل کم و بیش سبھی مضامین منٹو کی زندگی سے لے کر آج تک بارہا شائع ہو چکے ہیں۔ اگرچہ مرتّب نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ:

> ''اس کتاب میں کچھ بھی نیا نہیں ہے۔ یہ تمام خاکے منٹو کے بارے میں ادبی جرائد کی خصوصی اشاعتوں کے ساتھ ساتھ منٹو کے بارے میں مرتّب کی جانے والی کتابوں کا بھی حصہ بن چکے ہیں۔'' [۲۱۶]

مگر صرف اعتراف کو کتاب کی وجہ اشاعت تو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کتاب میں شامل مضامین کی فہرست ہی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں قاری کے لیے کچھ بھی نیا نہیں ہے۔ فہرست ملاحظہ ہو:

منٹو، سعادت حسن، منٹو ماموں کی موت، حامد جلال، منٹو میرا دوست، اسد اللہ، منٹو میرا دشمن، اوپندر ناتھ اشک، منٹو کی موت، غلام عباس، میرا دوست، میرا دشمن، عصمت چغتائی، گنجا فرشتہ، عابد علی عابد، رحم دل دہشت پسند، ابو سعید قریشی، سعادت حسن

منٹو، کرشن چندر، چند مہینے امرت سر میں، باری علیگ، منٹو اور اس کا فن، ممتاز مفتی، چند یادیں، شورش کاشمیری، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، تاثرات، یوسف ظفر، منٹو مر گیا، بلقیس عابد علی، جو بک نہ سکا، حاجرہ مسرور، منٹو ایک انسان، احمد شجاع پاشا، سید اکمل علمی، منٹو ایک نفاست پسند پا انداز، وغیرہ۔

یہ تمام مضامین جیسے کہ مرتّب نے خود بھی لکھا ہے منٹو کی وفات کے بعد شائع ہونے والے خصوصی شماروں نقش، کراچی، گل خنداں، لاہور، نقوش، لاہور، قافلہ، لاہور دانشور، لاہور اور افکار، کراچی کے علاوہ ضیاء ساجد کی مرتّب کردہ کتاب، سعادت حسن منٹو، صہبا لکھنوی کی، منٹو ایک کتاب، انیس ناگی کی، سعادت حسن منٹو ایک مطالعہ، احمد سلیم کی اپنی مرتّبہ کتاب، سعادت حسن مر گیا، منٹو زندہ ہے، مبین مرزا کی مرتّبہ سعادت حسن منٹو اور غلام زہرہ کی تالیف، منٹو کیا تھا، کے علاوہ طاہر اصغر کی نصف درجن بھر کتابوں میں پہلے ہی سے موجود ہیں[۲۱۷]اور قارئین ان مضامین کو متعدد مرتّبہ پڑھ چکے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مضامین منٹو کی اصل تصویر ہمارے سامنے لاتے ہیں کیوں کہ ان کے لکھنے والے منٹو کے اپنے ہم عصر، دوست اور دشمن تھے۔ جنھوں نے اپنے تجربے اور مشاہدے کے روشنی میں منٹو کا عکس کھینچا ہے اور اس میں بھی کسی شک و شعبے کی گنجائش نہیں کہ ان میں سے کچھ مضامین بہت ہی عمدہ اور منٹو شناسی کے بے مثال مرقعے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ فی زمانہ ان کی اشاعت کی ضرورت کیوں پڑ گئی جب کہ منٹو کا قاری اُنھیں پہلے ہی ذہن نشین کر چکا ہے۔ کتاب برائے کتاب اور منٹو کے نام کو بیچنے کے علاوہ اس کتاب کا اور کوئی خاص فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔ اور پھر مرتّب کی سہل پسندی دیکھئے کہ ان ماخذات تک کی نشاندہی نہیں کرتے جہاں سے یہ مضامین لیے گئے ہیں۔ اگر ماخذات کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ ایک بھرپور مقدمہ لکھا جاتا جس میں ان مضامین کی اشاعت کی مکمل تفصیل دے دی جاتی تو بھی بھرم رہ جاتا۔ مگر چند برس پہلے مرتّب کی گئی کتاب ''سعادت حسن مر گیا''، منٹو زندہ ہے'' کی طرح اس کتاب میں بھی ماخذات کی عدم نشاندہی ایک سوالیہ نشان ضرور چھوڑ جاتی ہے۔

''یہ ہے منٹو شخصیت''، طاہر اصغر:

طاہر اصغر منٹو کی شخصیت اور فن پر آٹھ کتابیں مجتمع کر کے تعدادی اعتبار سے سب سے آگے ہیں۔ منٹو کے صد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر مکتبہ جدید نے منٹو کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے دو جلدوں پر مشتمل کتابیں ''یہ ہے منٹو شخصیت'' اور ''یہ ہے منٹو فن'' کے عنوان سے شائع کیں۔ ترتیب و تدوین کا سہرا طاہر اصغر کے سر بندھا۔ اُنھوں نے نقوش، افکار، دانشور، ضیاء ساجد کی مرتّبہ کتاب ''سعادت حسن منٹو'' غلام زہرہ کی مرتّبہ ''منٹو کیا تھا وغیرہ میں شامل مضامین میں سے چوراسی مضامین منتخب کر کے منٹو کی شخصیت کا باب مکمل کر دیا۔ کتاب میں شامل ان تمام مضامین کی فہرست دینا ہی راقم کے لیے ممکن نہیں کجا یہ کہ ان مضامین کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے۔ ویسے بھی یہ کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے جو اس سے پہلے بارہا مختلف رسائل و جرائد کے علاوہ مرتّبہ اور طبع زاد کتب میں شامل ہیں۔ اور گزشتہ صفحات میں ان مضامین پر تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے۔[۲۱۸]

اگرچہ کتاب کا سالِ اشاعت درج نہیں لیکن منتظم اعلیٰ مکتبہ جدید نے ''عرض ناشر'' میں اس کی نشاندہی کر دی ہے:

''چوں کہ یہ سال منٹو کے سو سالہ یوم پیدائش کے طور پر منایا جا رہا ہے لیکن اُردو دنیا میں مکتبہ جدید کو ہی یہ اعزاز حاصل ہوا ہے کہ وہ اپنے دیرینہ رفیق اور ادب کی قد آور شخصیت کی دوسروں کی بیان کردہ سوانح کو دو جلدوں میں یکجا کر کے پیش کر رہا ہے۔'' [۲۱۹]

کاش مکتبہ جدید کے منتظم اعلیٰ اپنے دیرینہ رفیق کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے کوئی دوسرا ڈھنگ کا راستہ نکالتے۔ ادب کا ادنیٰ سے ادنیٰ طالب علم کسی بھی غیر مشہور یا مقامی پبلی شرز کی مدد سے اس طرح کی غیر ضروری کتاب بنا کسی ذہنی و فکری مشقت کے بآسانی شائع کر سکتا ہے۔ اس طرح کی کتابیں کوئی شعبدہ باز قسم کا مرتّب اپنے ذاتی خرچ پر شائع کر دے تو چنداں حیرت نہیں ہوتی۔ لیکن مکتبہ جدید سے شائع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مرتّب کی نسبت جناب رشید احمد چودھری کا قصور کہیں زیادہ ہے۔ منٹو کی ۱۰۰ ویں سالگرہ پر بھی اگر وہی مضامین شائع کرنے ہیں جو اس کی وفات کے بعد زیادہ تر جذباتی اور تاثراتی نوعیت کے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ منٹو پر فی زمانہ لکھنے والوں کا قحط پڑ گیا ہے۔

ایک لمحہ کے لیے مان لیتے ہیں کہ مرتّب نے بڑی عرق ریزی سے ان مضامین کو اکٹھا کیا ہو گا لیکن کیا کسی بھی مرتّب کا فرض نہیں ہے کہ وہ ان ماخذات کی نشاندہی کرے جہاں سے اس نے مواد حاصل کیا۔ کتاب میں شامل مضامین کی ضرورت و اہمیت پر ہمیں ذرا برابر بھی شک و شبہ نہیں لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ تازہ یا پھر ایسے مضامین کا انتخاب شائع کیا جاتا جو اس سے پہلے کم کم یا بالکل شائع نہیں ہوئے۔ آپ منٹو کی شخصیت اور فن پر مرتّب ہونے والی کوئی بھی کتاب اٹھا کر مذکورہ کتاب کے ساتھ جانچیں۔ تمام کے تمام مضامین ان کتابوں میں نہ صرف موجود ہوں گے بلکہ ہر کتاب میں موجود ہوں گے۔

''یہ ہے منٹو فن''، مرتّب: طاہر اصغر:

طاہر اصغر کی مرتّب کردہ کتاب ''یہ ہے منٹو فن'' سعادت حسن منٹو کی ۱۰۰ ویں سالگرہ کے موقع پر مکتبہ جدید نے شائع کی۔ منٹو کے فن سے متعلق انچاس چھوٹے بڑے یہ مضامین اس سے پہلے بھی موقر ادبی رسائل و جرائد اور مرتّبہ کتب میں متعدد مرتّبہ شائع ہو چکے ہیں۔ خاص طور پر نقوش، افکار، گل خندان، دانشور اور پگڈنڈی کے خصوصی شماروں کے علاوہ غلام زہرہ کی مؤلفہ ''منٹو کیا تھا'' میں ان مضامین کی تکرار موجود ہے [۲۲۰] اور مقالہ ہٰذا میں ان کتب و رسائل کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ کرتے وقت ان مضامین پر سیر حاصل بحث کی جا چکی ہے۔

منٹو کی شخصیت اور فن کے بعض پوشیدہ گوشوں کے دعویدار منتظم اعلیٰ مکتبہ جدید چودھری رشید ان مضامین کے ذریعے کون سے پوشیدہ راز عریاں کرنا چاہتے ہیں۔ جب کہ یہ مضامین ۱۹۵۵ء سے لے کر ان کی کتاب کی اشاعت تک بارہا شائع ہو کر ان خفیہ رازوں سے پہلے ہی پردہ اٹھا چکے ہیں۔ کتاب برائے کتاب کے علاوہ منٹو شناسی کے باب میں اس مرتّبہ کتاب کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اکیسویں صدی منٹو کی ہے نہ کہ نام نہاد منٹو نگاروں کی جو محض منٹو کا نام استعمال کر کے اپنے نام اور کاروبار کو چمکانا چاہتے ہیں۔

’’منٹو کا آدمی نامہ‘‘، آصف فرخی:

منٹو صدی کی مناسبت سے شائع ہونے والی اس کتاب کے مرتّب آصف فرخی کراچی سے شائع ہونے والے کتابی سلسلے ’’دنیازاد‘‘ کے مدیر ہیں، زیر تبصرہ کتاب میں اُنھوں نے بیشتر ایسے مضامین کا انتخاب کیا ہے جو دنیازاد کے مختلف شماروں میں مختلف اوقات میں چھپتے رہے یا پھر اشاعت کے انتظار میں دھرے ہوئے تھے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ کتاب کے مرتّب، آصف فرخی کے دو مضامین، مانند صبح مہر: پاکستان میں ادیب کی ذمہ داریاں اور منٹو‘‘، ’’عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا: منٹو کو نہ پڑھنے کے نئے طریقے‘‘ پر مشتمل ہے۔ جب کہ دوسرا اور تیسرا حصہ بارہ، بارہ مضامین پر مشتمل ہے۔ آصف فرخی، فتح محمد ملک، مشرف عالم ذوقی، کھیم چند، فہمیدہ ریاض اور عاصم بٹ کے مضامین کا تانا بانا منٹو کی پاکستانیت یا ہندوستانیت ثابت کرنے کے متعلق بنا گیا ہے۔ بقول مرتّب یہ متنازعہ لیکن غیر منطقی سوال اس وقت اٹھایا گیا جب اُنھوں نے انتظار حسین کے ساتھ مل کر پاکستانی کہانیوں کا انتخاب چھاپا تھا۔ اس انتخاب میں شامل سعادت حسن منٹو اور اس کی کہانی ’’کھول دو‘‘ کی اشاعت کے بعد مشرف عالم ذوقی نے منٹو کو پاکستانی کی بجائے ہندوستانی شہری قرار دیتے ہوئے مرتّبین کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ پھر تو یہ سلسلہ چل نکلا۔ فتح محمد ملک نے تو تقریباً پوری کتاب ہی اس گتھی کو سلجھانے میں صرف کر دی۔ اس بحث کو منٹو کے افسانہ ’’ٹوبہ ٹیک سنگھ‘‘ کی نئی تعبیر نے مزید بھڑکا دیا۔ چناں چہ سرحد کے ہر دو طرف منٹو کو اپنے اپنے ملک کا ادیب تسلیم کرنے اور دوسروں سے اس کی تائید لینے کے لیے کئی کئی تاویلیں پیش کی جانے لگیں۔ فتح محمد ملک کے مضمون ’’انقلاب پسند منٹو اور نام نہاد ترقی پسند، کے عنوان ہی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے اس مضمون میں ترقی پسندوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہو گا۔ منٹو کے پاکستانی یا ہندوستانی ادیب کے متعلق چھڑی اس بحث میں اگرچہ متعدد دلیلیں دی گئیں مگر عاصم بٹ نے کتاب میں شامل اپنے مضمون ’’مزید منٹو‘‘ میں بڑے مزے کی بات کی ہے۔ ان کے مضمون میں شامل اس جملے کے بعد اس بحث کو ہمیشہ کے لیے روک دیا جانا چاہیے عاصم بٹ لکھتے ہیں:

> ’’اُردو جس جس ملک کی سرکاری زبان ہے، منٹو کو اس ملک کا ادیب مانا جانا چاہیے۔ سوا گر پاکستانی اسے پاکستانی ادیب اور ہندوستانیوں اسے ہندوستانی ادیب مانتے ہیں تو میرا خیال ہے کہ منٹو کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔‘‘[۲۲۱]

منٹو کے پاکستانی یا ہندوستانی ادیب ہونے یا نہ ہونے کی اس بحث میں جو نقطہ سب سے زیادہ سراہے جانے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ اب دونوں ممالک کے ادیب منٹو کی فنکارانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ زندگی میں ہر دو طرف کے ملکوں کی زمین سعادت حسن منٹو پر تنگ کر دی گئی تھی۔ اس تمام بحث میں اگر کسی مضمون یا مضمون نگار کو تعصب کی جھاگ بہاتے دیکھا گیا ہے تو وہ ’’مہاجر منٹو‘‘ کے فسادات سے متعلق افسانے‘‘ کے ریوتی شرن شرما ہیں۔ ریوتی شرن شرما نے منٹو کے فسادات کے موضوع پر لکھے گئے بیشتر افسانوں کا مطمع نظر جنس نگاری اور عریاں نویسی کو قرار دیا۔ مضمون نگار کے بقول فسادات کے متعلق بیشتر افسانوں میں منٹو عورتوں کے کپڑے اتروا کر ہی رہتا ہے۔ اپنے مضمون میں اُنھوں نے اتنی بار مہاجر منٹو، مہاجر منٹو کی تکرار کی کہ محمد حمید شاہد کو اس کا جواب دینا پڑا۔ ریوتی شرما کے اس مضمون کے متعلق محمد حمید شاہد لکھتے ہیں:

''تنقید کے نام پر شدید تعصب اور نفرت کے اظہار اور مہاجر'' کو منٹو کے نام کے ساتھ یوں تکرار کے ساتھ لکھنا کہ ظلم سہنے اور بہت کچھ چھین جانے کی علامت ایک معصوم سا لفظ گالی کا سا تاثر دینے لگے تنقید میں کیسے روا ہو جاتا ہے میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔''[۲۲۲]

پروفیسر صغیر افراہیم نے ریوتی شرما کے اس مضمون کو منٹو ناشناسی کی تازہ مثال قرار دیتے ہوئے کتاب میں شامل اپنے مضمون کی ابتدا ان الفاظ سے کی:

''اکثر تخلیقی فنکار گہرے تنقیدی شعور سے متصف ہوتے ہیں مگر بسا اوقات وہ معاصرین کے فن پاروں کی تعین قدر میں معروضیت کی پاسداری نہیں کرتے۔''[۲۲۳]

صغیر افراہیم کے مطابق ریوتی شرما کا مضمون متن کی سطحی اور سرسری قرات کی چغلی کھاتا ہے۔ اُنھوں نے شروع سے ہی منٹو کو ایک مخصوص زاویہ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ کشور ناہید نے عہد حاضر کے تناظر میں منٹو کی ضرورت و اہمیت کو خصوصاً پاکستان کے حوالے سے)اجاگر کیا تو شمس الحق عثمانی آج بھی نیا قانون کے منگو کا تجزیہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ن م دانش نے ٹوبہ ٹیک سنگھ کو شناخت کے بحران سے جوڑا تو شہلا نقوی منٹو کے کرداروں کے متعلق وہی پرانی بحث کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ انتظار حسین نے ''منٹو کا آدمی نامہ'' میں منٹو کی انسان دوستی کو موضوع بنایا جب کہ شمیم حنفی نے نئے اُردو افسانے اور منٹو کا ایک دوسرے سے رشتہ جوڑنے کی کوشش کی۔

کتاب کے مرتّب آصف فرخی نے مضامین کے انتخاب میں صرف نئے اور تازہ مضامین کا انتخاب کر کے مرتّبہ کتب کی اُس روش سے انحراف کیا جو ان سے پہلے کے بیشتر مرتّبین کا وتیرہ رہی۔ یعنی بار بار چھپے ہوئے مضامین کا ایک بار پھر انتخاب۔ شہرزاد کراچی سے ۲۰۱۲ء میں شائع ہونے والی یہ کتاب ۲۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

''منٹو غالب کا پرستار''، پرویز انجم:

پرویز انجم کی مرتّب کردہ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ منٹو کی اُن چھے تحریروں کے انتخاب پر مشتمل ہے جو غالب سے متعلق ہیں۔ جب کہ دوسرے حصے میں منٹو کی لکھی ہوئی فلم ''مرزا غالب'' کا اسکرپٹ شامل کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر طارق ہاشمی کا ایک مختصر روایتی دیباچہ نما مضمون ''منٹو کے غالب نوادرات'' ہے جس میں اُنھوں نے مرتّب کی کاوشوں کو سراہا۔ جب کہ دوسرا مضمون بعنوان منٹو غالب کا پرستار، خود مرتّب کی تحقیقی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس مضمون میں پرویز انجم نے غالب اور منٹو کی شخصی اور تخلیقی زندگی کے بہت سے اشتراکات کو منٹو کی غالب میں دلچسپی کا شعوری اور غیر شعوری سبب قرار دیا ہے۔ پرویز انجم کے مطابق ان دونوں شخصیات میں مزاج و اطوار کے اعتبار سے کافی مماثلت تھی، دونوں رند بلانوش تھے، بلا کے احساس برتری اور ناقدری زمانہ کا شکار تھے، دونوں پتنگ بازی کے رسیا تھے، دونوں کی زندگی پر ان کے عہد کے سیاسی و سماجی المیوں کے گہرے اثرات مرتّب ہوئے۔ دونوں کو مقدمات کا سامنا کرنا پڑا، اور مزید یہ کہ دونوں کی عزت افزائی ان کی زندگی میں کم اور مرنے کے بعد زیادہ ہوئی۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"دونوں اپنے اپنے عہد کے ایسے تخلیقی نابغے ہیں کہ جن کے تخلیقی تجربے میں دونوں زمانے اپنے تمام تر حوالوں سمیت بیک وقت سانس لیتے ہیں۔ دونوں کی تخلیقات میں جدیدیت جلوہ صد رنگ لیے ہوئے ہے۔"[۲۲۴]

اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ مزید لکھتے ہیں کہ :

"ہر دو غیر معمولی ذہانت، فلسفیانہ غور وفکر، منفرد انداز نظر اور اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے حامل فنکار تھے اور زندگی کی نئی سے نئی تعبیر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی خصوصیت کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔"[۲۲۵]

شخصی اور تخلیقی نوعیت کے اس اشتراک نے شاعری سے دلچسپی نہ ہونے کے باوجود منٹو کو غالب کا اسیر بنا دیا۔ چناں چہ اپنی کئی تحریروں میں نہ صرف منٹو غالب کے اشعار کا حوالہ دیتے ہیں بلکہ بعض کہانیوں اور مجموعوں کے نام بھی اُنھوں نے غالب کی تراکیب شعری سے لیے۔

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ غالب اور منٹو کی شخصیت اور مزاج کی کئی کڑیاں آپس میں ملتی ہیں لیکن دونوں میں مماثلت کے ساتھ ساتھ تفاوت بھی تھا۔ غالب تمام زندگی معاشی ابتری کا شکار رہے جب کہ منٹو کی زندگی کے آخری سات سال جب وہ پاکستان میں آ مقیم ہوئے معاشی بدحالی کے حامل تھے۔ غالب واپسی کے وعدہ پر قرض کی مئے پیتے رہے جب کہ منٹو کے ہاں واپسی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ شراب کے لیے دوستوں سے لی گئی رقم کو وہ اپنے اوپر قرض سمجھتے ہی نہیں تھے۔

غالب کی شراب نوشی روزِ ابر اور شب ماہتاب سے مشروط تھی لیکن منٹو رات کو پی جانے والی شراب سے بگڑنے والے منہ کے ذائقے کو نہار منہ شراب پی کر رفع کرتے۔ دونوں کی تخلیقات کا موضوعاتی تقابل تو ویسے بھی ممکن نہیں کہ ایک شاعر تھا تو دوسرا نثر نگار۔ ایک نے زندگی کے آخری سالوں میں غلامی کا طوق پہنا تو دوسرے کو آزادی کی صلیب پر چڑھا دیا گیا۔ انجام کار دونوں کا مقدر ذلت اور رسوائی ٹھہرا۔ لیکن اس سب کے باوجود منٹو کی شخصیت پر غالب ایک طلسم بن کر چھائے رہے اور منٹو غالب کے علاوہ اُردو کے اور کسی شاعر کے قائل نہ ہو سکے۔

جیسا کہ شروع میں ذکر کیا گیا کہ پرویز انجم کی مرتّبہ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول مندرجہ ذیل چھے تحریروں پر مشتمل ہے۔ جو منٹو کے قلم سے خاص کر غالب سے متعلق لکھی گئیں۔ آگرہ میں مرزا نوشہ کی زندگی، غالب اور چودھویں، غالب چودھویں اور حشمت خان، غالب اور سرکاری ملازمت، قرض کی پیتے تھے۔۔۔۔۔ اور 'مرزا غالب کی حشمت خان کے گھر دعوت۔

کتاب کے حصہ دوم کا خاصا منٹو کی شہرہ آفاق فلم "مرزا غالب" کے اسکرپٹ کا بطور متن شامل ہونا ہے۔ مرزا غالب کی شخصیت کو یوں تو کئی لوگوں نے ڈرامائی کردار میں ڈھالا ہے۔ لیکن منٹو وہ پہلے آدمی تھے جنھوں نے غالب کو فلمی کردار میں ڈھالا۔ منٹو نے بہت محنت اور ریاضت سے اس فلم کا اسکرپٹ لکھا تھا۔ لیکن فلم کی تکمیل اور نمائش کے وقت وہ پاکستان وارد ہو چکے تھے اور اپنی شدید خواہش کے باوجود اس کو دیکھنے ہندوستان نہ جا سکے۔ فلم آج بھی یقیناً کیمرے کی آنکھ میں محفوظ ہے۔ لیکن پرویز انجم نے اسے مکالموں کی صورت میں زیور طبع سے آراستہ کر کے ادبی دنیا کو ایک نادر تحفہ دیا ہے۔ یقیناً اس ضمن میں ان کی کی گئی تحقیقی کاوش لائق ستائش ہے۔

ارسٹھ ۶۸ مناظر پر مشتمل منٹو کی تحریر کردہ اس فلم کو مشہور ڈائریکٹر سہراب مودی نے ۱۹۵۴ء میں نمائش کے لیے پیش کیا۔ مکالمہ نویسی کے فرائض راجندر سنگھ بیدی نے ادا کیے۔ جب کہ غالب کا کردار اس وقت کے عظیم ہیرو بھارت بھوشن نے نبھایا۔ اس فلم اسکرپٹ سے پہلے مرتّب کے ایک مضمون بعنوان ''منٹو کی تحریر کردہ فلم ''مرزا غالب'' میں فلم لکھنے کے خیال سے اس کی نمائش تک کی تمام کہانی کو جس دقیق النظری سے زیر بحث لایا گیا ہے وہ مرتّب کے تحقیق شناس ہونے کی دلالت کرتا ہے۔ تحقیقی اعتبار سے ایک عمدہ کتاب ہے جس میں منٹو اور غالب دونوں زندہ و جاوید کردار کے طور پر محفوظ کر دیے گئے ہیں۔

''سعادت حسن اور منٹو''، ابدال احمد جعفری:

منٹو کی شخصیت اور فن پر مرتّب کردہ یہ کتاب ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے تفصیلی دیباچے اور محقق و مولف کے اظہار خیال کے علاوہ مجموعی طور پر چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ ناخن کا قرض، منٹو کے فن اور شخصیت پر لکھے گئے بارہ چھوٹے بڑے مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو مختلف اوقات میں مختلف رسائل میں چھپتے رہے۔ ''ناخن کا قرض'' کے عنوان سے اپنی شخصیت اور فن پر ایک کتاب شائع کرانے کا منٹو کا ایسا منصوبہ تھا جو پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ بعد میں ماہنامہ افکار کے منٹو نمبر میں منٹو کی شخصیت اور فن پر لکھے گئے مضامین اس عنوان سے شائع کیے گئے۔ [۲۲۶]

ممتاز مفتی، معین الدین حزیں کاشمیری، ابراہیم جلیس اور مظفر علی سید کے مضامین منٹو کی شخصیت سے متعلق ہیں۔ ممتاز مفتی کو چھوڑ کر دیگر تینوں احباب نے منٹو کی یادوں کو مفصل اور ہمدردانہ نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ ممتاز مفتی منٹو کے ہم عصر تھے اور بقول ان کے منٹو سے وہ چھے بار ملے تھے۔ جب کہ ایک بار اُنھیں سعادت حسن سے بھی ملاقات کا موقع ملا۔ لیکن ان کے مضمون میں ذاتی تجربات اور مشاہدات کی بجائے عمومی نوعیت کے واقعات کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ مصنف اور منٹو کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج حائل ہے۔ شخصیت سے متعلق دیگر تین مضامین اپنی اپنی جگہ انتہائی اہمیت کے حامل ہیں اور ان مضامین میں منٹو کی شخصیت چلتی پھرتی، لڑتی جھگڑتی، اپنے اصلی خدوخال کے ساتھ قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ ''سعادت حسن منٹو'' کے عنوان سے کتاب میں شامل معین الدین حزیں کاشمیری کا یہ مضمون اس سے پہلے ادبی جریدے ''سویرا'' میں شائع ہوا۔ [۲۲۷]

اس مضمون میں منٹو کی ابتدائی ادبی زندگی اور آخری زندگی میں معاشی بدحالی کے ذکر کو خاص طور پر زیر بحث لایا گیا ہے۔ ایک چیز جو اس سے پہلے کسی نے تحریر نہیں کی اور یقیناً منٹو کے قارئین کے لیے بھی دلچسپی کا سبب ہو گی وہ یہ ہے کہ منٹو ابتدائی دور میں اپنے افسانوں کی اصلاح اس دور کے مشہور شاعر اور ادیب نشتر جالندھری سے کراتے تھے۔ ایک اقتباس دیکھیے:

> ''اول اول جب میں نے افسانہ نگاری شروع کی تو زبان و بیان کے رموز سے آشنا نہ تھا چناں چہ میں نے بلا تکلف اپنے افسانے بغرض اصلاح نشتر جالندھری کے سپرد کر دیے۔'' [۲۲۸]

''منٹو: ہیولیٰ برق خرمن'' کا مظفر علی سید کا لکھا ہوا بہترین شخصی خاکہ ہے۔ خاکہ تحریر کرنے کے لیے بنیادی شرط ہی یہی ہوتی ہے کہ جس کا خاکہ لکھا جا رہا ہو اور لکھنے والا دونوں ایک دوسرے کی ظاہری ہی نہیں بلکہ باطنی پرتوں کو بھی جانتے ہوں اور یقیناً مظفر علی سید اور منٹو کے درمیان عمروں کے تفاوت کے باوجود منٹو کا ظاہر اور باطن روز روشن کی طرح عیاں تھا۔ مضمون کا زیادہ تر حصہ ان واقعات سے متعلق ہے جو قیام پاکستان کے بعد منٹو کی لاہور آمد سے شروع ہو کر اس کی موت تک کے درمیانی عرصہ پر محیط ہیں۔

معاشی اعتبار سے اسے منٹو کی زندگی کا بدترین دور سمجھا جاتا ہے۔ یعنی مظفر علی سید ہماری ملاقات ایسے منٹو سے کراتے ہیں جو اپنی زندگی کے بدترین دن گزار رہا ہے خاص طور پر منٹو کی شراب نوشی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی قباحتوں کا ذکر بہت ہی خوب صورت انداز میں کیا گیا ہے۔ بلاشبہ منٹو پر لکھے گئے شخصی مضامین میں مظفر علی سید کا یہ مضمون امتیازی اہمیت کا حامل ہے اسی وجہ سے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا یہ قول بجا ہے کہ :

"خاکے کی سطح پر منٹو سے متعلق اس سے اچھی تحریر کم از کم میری نظر سے نہیں گزری۔" [۲۲۹]

سعادت حسن اور منٹو کو دو الگ کرداروں میں ابراہیم جلیس نے اپنے مضمون "اُٹھاؤ بوتل اور مارو جھک" میں بہت خوبصورتی سے تقسیم کیا ہے۔ منٹو کی موت سے دو سال قبل کے زمانے پر مشتمل یادیں اس مضمون کا بنیادی محور ہیں۔ بقول مضمون نگار منٹو کی افسانوی دنیا جتنی آلودہ تھی، سعادت حسن کی شخصیت اس کے برعکس اتنی ہی شفاف اور پاکیزہ تھی۔ یہ ایک تاثراتی قسم کا مضمون ہے جو منٹو کی وفات کے بعد لکھا گیا۔ اس سے قبل یہ مضمون مختلف رسائل اور مرتّب کتب میں چھپ چکا ہے۔

قرۃ العین حیدر کا مضمون "دیکھ کبیرا رویا" ایک ایسا ادبی فریضہ ہے جو ضرورت زمانہ کے تحت ادا کیا جاتا ہے۔ اپنے زمانے کے مشہور افسانہ نگار کی موت پر اپنے زمانے کی کم مشہور ناول نگار کا موضوع کے لحاظ سے تاثراتی اور مفہوم کے لحاظ سے غیر تاثراتی قسم کا یہ مضمون محض رسم کے طور پر ہی لکھا گیا۔ وگرنہ قرۃ العین حیدر اور منٹو میں ایک تو تعلق نہ ہونے کے برابر تھا۔ دوسرے جو تھوڑا بہت تعلق تھا اسے بھی خوشگوار نہیں کہا جا سکتا۔

فیض احمد فیض، قدرت اللہ شہاب اور اشفاق احمد کے اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان تینوں نے منٹو کے متعلق اظہار رائے میں ذرا کنجوسی کا مظاہرہ کیا ہے۔ منٹو کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں سے وہ بخوبی آگاہ تھے جسے ان تینوں نے کسی نہ کسی مصلحت کے تحت عیاں نہیں کیا۔ فیض احمد فیض کے جیل سے لکھے گئے ایک خط کے اقتباس میں جو اُنھوں نے اپنی اہلیہ ایلس فیض کو ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء کو منٹو کی وفات کی خبر سننے کے بعد تحریر کیا تھا۔ فیض صاحب نے اپنے اس خط میں منٹو کو جو عمر میں ان سے صرف ایک سال دو ماہ اور اٹھائیس دن چھوٹے تھے، اپنا ذہین شاگرد قرار دیا ہے۔ اس سے پہلے بھی دو مقامات پر فیض احمد فیض یہ دعوی کر چکے تھے۔ ایک تو مجلہ "سوویت لٹریچر"، ماسکو کے چیخوف نمبر ۱۹۸۳ء میں اور دوسرے فیض احمد فیض کی آپ بیتی مؤلّفہ ڈاکٹر ایوب مرزا میں ایلس کے نام خط میں فیض احمد فیض منٹو کی موت پر اپنی اہلیہ کو بتا رہے ہیں :

"مجھے فخر ہے کہ وہ امرت سر میں میرا شاگرد تھا، کلاس میں کبھی کبھار آتا، مجھے گھر پر آکر ملتا اور موپساں چیخوف، فرائیڈ اور خدا جانے کن کن لوگوں کے بارے میں بحث کرتا۔" [۲۳۰]

زیر نظر کتاب کے دیباچے میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے فیض احمد فیض کے اس دعوے کو جو اُنھوں نے تین مختلف مقامات پر ایک ہی انداز سے کیا تحقیقی اعتبار سے رد کر دیا۔ ان کی تحقیق اور امرت سر کالج کے ریکارڈ کے مطابق فیض صاحب کا تقرر بطور لیکچرر (انگریزی) ۱۹۳۵ء میں ہوا۔ اس سے بہت پہلے ایف۔ اے کے امتحان میں فیل ہو جانے کے باعث منٹو ایم اے او کالج امرت سر چھوڑ چکے تھے۔ مزید یہ کہ ایف اے کے نتائج ۸ جون ۱۹۳۴ء کو نکلے جب کہ سعادت حسن منٹو ۱۹۳۵ء کی ابتدائی تواریخ میں علی گڑھ پہنچ چکے تھے جہاں سے اگست ۱۹۳۵ء میں ٹی بی کا شکار قرار دیے جانے کے بعد امرت سر واپس آ گئے۔ علی گڑھ سے فراغت کے بعد منٹو پھر

کبھی کسی جماعت میں زیر تعلیم نہیں رہے۔ اور پھر کبھی ایم اے او کالج امرت سر کے طالب علم نہیں ہوئے۔ یقیناً منٹو اور فیض امرت سر میں ایک دوسرے سے ملے ہوں گے اور ظاہر ہے کہ ۱۹۳۵ء میں منٹو کی علی گڑھ سے واپسی کے بعد ملے ہوں گے۔ لیکن گور کی کو تو وہ بہت پہلے ترجمہ کر چکے تھے اور فروری ۱۹۳۵ء تک منٹو ڈیڑھ درجن سے زائد روسی اور فرانسیسی شہ پاروں کے تراجم کر چکے تھے جو ہمایوں اور عالمگیر میں شائع بھی ہو چکے تھے۔ بلکہ وکٹر ہیوگو کی کتاب "The Last days of condemned" کا اردو ترجمہ سر گزشت اسیر کے عنوان سے کتابی صورت میں ۱۹۳۳ء میں شائع ہو چکا تھا۔ آسکر وائلڈ کا ڈراما ''ویرا'' اور روسی افسانوں کے تراجم کی کتاب روسی افسانے ۱۹۳۴ء میں طبع ہوئی۔ بقول ڈاکٹر مرزا حامد بیگ:

> ''درحقیقت اوائل جوانی میں ہی منٹو کی بے پناہ شہرت فیض صاحب کے لیے ایک مسئلہ بن گئی تھی اور فیض صاحب کے منٹو سے متعلق یہ بیانات ان کی معصوم سی خیالی تشکیل سے زیادہ کچھ نہیں۔''[۲۳۱]

ممتاز شیریں کا مضمون ''منٹو ایک اخلاقی فنکار'' ان کی کتاب ''منٹو نوری نہ ناری'' سے لیا گیا ہے۔[۲۳۲] کتاب کا دوسرا حصہ ''نقش قلم''، منٹو کی تیرہ تحریروں کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ ان تحریروں میں سہائے، گورمکھ سنگھ کی وصیت، ممد بھائی، نیا قانون، نعرہ، بابو گوپی ناتھ، اللہ کا بڑا فضل ہے، پارو دیوی، شہید ساز، ٹوبہ ٹیک سنگھ، موتری، خدا کی قسم اور خود نوشت خاکہ منٹو'' شامل ہیں۔ کتاب کے تیسرے حصے میں منٹو کی شخصیت و فن پر شعرا کرام کا خراج عقیدت شامل ہے۔ جس میں ۱۵ شعرا کے کلام کو منتخب کیا گیا ہے۔ ''تیری باتیں ہی سنانے آئے'' کے عنوان سے شامل اس حصے میں درج ذیل شعرا کا کلام منتخب کیا گیا ہے۔ امرتا پریتم، افضل توصیف، مجید امجد، شاد امرت سری، عبدالحمید عدم، حبیب جالب، راجہ مہدی علی خان، مصطفی زیدی، حفیظ ہوشیار پوری، قتیل شفائی، حمایت علی شاعر، خاطر غزنوی، احمد ریاض، نور بجنوری، قمر لدھیانوی، گلزار۔

(Trivia) ٹریویا کے عنوان سے قائم گوشے میں تین طرح کی چیزیں یکجا کر دی گئی ہیں:

۱۔ منٹو کے بچپن، لڑکپن سے تا وقت مرگ کچھ حیران کن واقعات، عرفیت، ابتدائی قلمی نام، تکیہ کلام، پسندیدہ سگریٹ انداز تخاطب اور آخری خواہشات وغیرہ۔

۲۔ منٹو کی مطبوعہ کتب سے متعلق ادبی جرائد میں چھپنے والے اشتہارات۔

۳۔ تلخ ترش، شیریں کے عنوان کے تحت منٹو کی زندگی کے چند حیران کن پہلو، بذلہ سنجی کے نمونے، وغیرہ۔

جب کہ کتاب کا آخری گوشہ منٹو صاحب اور فلم نگری کے متعلق ہے۔

منٹو کے شخصیت اور فن پر یہ ایک منفرد کتاب ہے جس میں زیادہ تر ایسی تحریریں شامل کی گئی ہیں جنھیں نادر اور نایاب کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ خاص طور پر کتاب کا آخری حصہ تو خاصے کی چیز ہے۔ اگرچہ کہ یہ تمام تحریریں اس سے قبل مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکی تھیں لیکن بکھری پڑی تھیں۔ اور کتاب کے مؤلف ابدال احمد جعفری کے علاوہ کسی اور کا ذہن اُنھیں یکجا کرنے کی طرف نہیں گیا۔ چناں چہ مجموعی طور پر اس کتاب کو منٹو شناسی کے باب میں ایک اہم پیش رفت قرار دیا جا سکتا ہے۔

''منٹو کے افسانے (انتخاب اور مطالعات)''، قاضی افضال حسین:

منٹو کے منتخب افسانوں کے تجزیات پر مشتمل قاضی افضال حسین کی مرتّبہ کتاب ''منٹو کے افسانے، انتخاب اور مطالعات'' مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ اس تجزیاتی مطالعے میں منٹو کی درج ذیل گیارہ کہانیوں، بانجھ، ہتک، دھواں، کبوتروں والا سائیں، بابو گوپی ناتھ، جانکی، میرا نام رادھا ہے، سڑک کے کنارے، ٹوبہ ٹیک سنگھ، فرشتہ اور پھندنے کا انتخاب اور تجزیہ کیا گیا ہے۔ منٹو کے فن میں عہد بہ عہد بدلتی ہوئی ترجیحات کو سمجھنے کے لیے یہ انتخاب اور تجزیات زمانی ترتیب کے اعتبار سے کیے گئے ہیں۔ بقول مرتّب منٹو کے تین افسانے، میرا نام، رادھا ہے، کبوتروں والا سائیں اور فرشتہ کے تجزیے باقاعدہ درخواست کر کے لکھوائے گئے ہیں تاکہ منٹو کے ایسے افسانے جن پر ناقدین کی توجہ ذرا کم رہی، حال آں کہ وہ منٹو کے فن کے عمدہ نمونے ہیں' قارئین کی توجہ حاصل کر سکیں۔ قارئین کی سہولت اور تنقید فہمی کے لیے ہر افسانے کے تجزیاتی مطالعہ سے پہلے اُس کا متن بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

''بانجھ'' ترتیب کے لحاظ سے سب سے پہلا انتخاب ہے۔ کتاب کے مرتّب قاضی افضال حسین اس کے تجزیہ نگار ہیں۔ قاضی افضال حسین کے مطابق: منٹو کے افسانے'' میں شامل دیگر افسانوں مثلاً نیا قانون، ٹیڑھی لکیر، خوشیا، بلاؤز اور بیگو کے متعلق اشاعت سے لے کر آج تک گفتگو ہو رہی ہے لیکن اس مجموعہ میں شامل افسانے ''بانجھ'' کا ذکر اکثر سرسری ہی ہوا ہے۔ اگرچہ وارث علوی اور ممتاز شیریں نے اسے منٹو کا غیر معمولی افسانہ ضرور کہا ہے۔ اور اس کی غیر معمولیت کے کچھ اسباب بھی گنوائے ہیں لیکن قاضی افضال حسین اس کہانی کو اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ قرار دیتے ہیں جتنا وارث علوی اور ممتاز شیریں نے سمجھا۔ ان کے مطابق منٹو کی اس کہانی کا بنیادی موضوع بانجھ پن ہے ہی نہیں بلکہ یہ تو تخلیقی قوت اور اس کے مظاہر کے متعلق ہے۔

شمیم حنفی کا مضمون ''ہتک کے حوالے سے اس سے پہلے ان کی کتاب ''کہانی کے پانچ رنگ'' میں نگارشات'' لاہور کے توسط سے ۱۹۸۶ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ مضمون نگار اسے انسان کے داخل اور خارج کی کشمکش کا بہترین اظہار یہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہتک کی کہانی بھی رات کے دو بجے آنے والے سیٹھ کی ''اونہہ'' پر ختم نہیں ہوتی، یہ لمحہ دراصل آغاز تھا اُس دہشت کا جو سوگندھی کو تمام انسانی روابط کے ٹوٹ جانے کے احساس کے ساتھ دکھوں سے بھرے ہوئے ایک سفر کی جانب دھکیل دیتا ہے۔'' [۲۲۳]

منٹو کے افسانے دھواں، کا تجزیہ سعادت حسن منٹو کے اس بیان کی نقل ہے جو اُنھوں نے اس کہانی پر چلنے والے مقدمہ کے سلسلہ میں عدالت کو جمع کرایا تھا۔ بعد میں اُنھوں نے اسے اپنے مضمون ''زحمت مہر درخشاں'' کا بھی حصہ بنایا۔ اس مضمون میں اس افسانے کا خوب صورت اور حقیقی معنی میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے تخلیق کے پوشیدہ اسرار و رموز کے متعلق خود تخلیق کار سے بہتر رائے اور کون دے سکتا ہے۔ منٹو نے اس افسانے کو فحاشی سے یکسر عاری افسانہ قرار دیتے ہوئے استغاثہ کے موقف کو حیرت اور استعجاب کا باعث قرار دیا۔

''کبوتروں والا سائیں'' کو قاضی افضال حسین نے ہمارے موجودہ معاشرے کا عکاس افسانہ قرار دیتے ہوئے اس کی فنی اور فکری خوبیوں کو خوب اجاگر کیا۔

کتاب کے مرتّب قاضی افضال حسین کے مضمون، ''جانکی کا افسانہ'' میں پیش رو ناقدین خصوصاً وارث علوی اور ممتاز شیریں کے موقف سے اختلاف کرتے ہوئے اُنھوں نے اس رائے کو رو کر دیا کہ جانکی کے ذریعہ دراصل منٹو عورت میں موجود ممتا کے جذبے کو آشکار کرنا چاہتا تھا۔ بقول مضمون نگار:

> ''ممتا عورت کی وہ داخلی صفت ہے جو اپنی ذات کے ایک حصہ کی تحریک پر خاص کیفیت اور اس کے نتیجہ میں ربط و تعلق کی ایک خاص نوعیت سے عبارت ہے۔ لیکن جانکی کی ''ممتا'' کا محرک کیا ہے؟ کیا افسانے کے ان تین مرد کرداروں میں کسی ایسی صفت کا اشارہ کہیں موجود ہے جس سے معلوم ہو کہ یہ مرد، جانکی میں ممتا کے جذبے کو جگانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔'' [۲۳۴]

مضمون نگار کے مطابق منٹو نے اس افسانے میں مرد کرداروں کی تشکیل میں یہ خیال رکھا ہے کہ یہ کردار کسی نوع کے داخلی ربط کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔

''میرا نام رادھا ہے'' کے متعلق پروفیسر معین الدین جینا بڑے کے دو مضامین بعنوان ''میرا نام رادھا ہے'' (سائیکی سے پردہ سیمیں تک کا سفر) اور ''میرا نام رادھا'' ہے (قصہ آہوئے رم خوردہ کا) شامل کتاب ہیں۔ ان مضامین میں اُنھوں نے راج کشور کے پردے میں مشہور ہندوستانی اداکار پرتھوی راج کے کردار کو تلاش کیا ہے۔ کہانی کے واقعات اور کردار کی حرکات و سکنات کی مماثلتیں ثابت کر کے مضمون نگار نے منٹو کے مشاہدے کو خوب سراہا۔ ن۔ م دانش نے ''منٹو: ٹوبہ ٹیک سنگھ اور شناخت کا بحران'' میں انسان کی شناخت کے گم ہونے کے خطرناک سوال کو پاگل خانے کے لوکیل میں بیان کرنے کے انتخاب کی افسانہ نگار کو خوب داد دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''یہ افسانہ پاگل خانے یا پاگل خانے کے تناظر میں ہی لکھا جا سکتا تھا کہ اس افسانے کا بنیادی خیال اتنا باریک، اتنا بھیانک، خطرناک، احمقانہ اور ناقابل برداشت ہے کہ اسے پاگلوں کے ذریعے ہی بیان کی جا سکتا ہے۔'' [۲۳۵]

اس افسانے کا بنیادی خیال کہ ہماری قومی اور تہذیبی شناخت کوئی مستحکم اور مستقل چیز نہیں ہے 'اگر پاگلوں کے ذریعے نہ کہلوائی جاتیں' اتنی خطرناک بات تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتیں جنھیں منٹو دُر فٹے منہ کہتا ہے، غدار، غیر محب وطن قرار دے کر پتہ نہیں کیا سلوک کرتیں۔

سید خالد قادری نے فرشتہ، کو زندگی کے جبر و تضادات سے متصادم ایک تباہ کن تخیل کی حامل کہانی قرار دیا ہے۔ جب کہ لنڈا ونٹک نے ''پھندنے'' اور ''فرشتہ'' کا تجزیہ کرتے ہوئے کتاب کے آخر میں ان دونوں کہانیوں کا پس منظر سماجی منظر نامے کی دو متضاد انتہاؤں کو قرار دیا۔ ان کے مطابق فرشتہ میں نچلے طبقے کا گھٹا ہوا خاندان دکھایا گیا ہے۔ جو غربت بیماری اور خاندان سے باہر خارجی دباؤ سے ٹوٹ پھوٹ رہا ہے۔ جب کہ پھندنے کا موضوع اعلیٰ طبقہ میں اخلاقی اقدار کا زوال اور خاندانی رشتوں کا فقدان ہے۔ لنڈا ونیٹک کے یہ دونوں مضامین انگریزی زبان میں لکھے گئے۔ کتاب کے مرتّب قاضی افضال حسین نے ترجمہ کر کے اُنھیں اُردو کے قالب میں ڈھالا۔ ۲۸۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب منٹو کی فنی حوالوں سے تفہیم میں قارئین کی خوب معاونت کرتی ہے۔

''منٹو اور ہم''، الطاف احمد قریشی:

یہ کتاب ان مقالات کا مجموعہ ہے جو سعادت حسن منٹو کے صد سالہ یوم ولادت کے حوالے سے اکادمی ادبیات پاکستان کے زیرِ اہتمام ایک سیمینار منعقدہ الحمرا ہال، بتاریخ ۱۹ اکتوبر کے موقع پر پڑھے گئے۔ کتاب کے مرتّب الطاف احمد قریشی، ریذیڈنٹ ڈائریکٹر اکادمی ادبیات' لاہور اس کانفرنس کے منتظم تھے۔ جب کہ صدارت اس وقت کے گورنر پنجاب لطیف کھوسہ نے کی۔ ۲۰۱۳ء میں منٹو صدی کی نسبت سے شائع ہونے والی اس کتاب میں مرتّب کے ابتدائیہ کے بعد سردار محمد لطیف خان کھوسہ، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، مسعود اشعر، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، عطیہ سید، ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی، ڈاکٹر قاضی عابد اور پروفیسر ڈاکٹر سعادت سعید کے مضامین شامل ہیں۔

الطاف احمد قریشی نے منٹو صدی کے موقع پر منعقدہ اس سیمینار کا مقصد منٹو کو روایتی انداز سے ہٹ کر نئے اور مختلف زاویوں سے دیکھنے کی کوشش قرار دیا۔ سیمینار کی خاص بات انتظار حسین کی وہ گفتگو تھی جو تمام مقالات سننے کے بعد اُنھوں نے بطور صدر نشین سیمینار کے شرکاء کے ساتھ کی۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ مرتّب ان کی گفتگو کو ریکارڈ کر کے اسے ضابطۂ تحریر میں لا کر کتاب کے متن کا حصہ بنا دیتے۔

سردار لطیف کھوسہ اپنے مضمون ''منٹو اور ہم'' کے عنوان سے لکھے گئے مضمون میں بجا طور پر فخر کرتے ہیں کہ:

> ''میں یہ بات فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ پاکستان پیپلز پارٹی کی موجودہ حکومت نے سعادت حسن منٹو کو ادب کا قومی اعزاز نشان امتیاز دے کر اس قومی اعزاز کی توقیر میں اضافہ کیا ہے۔'' [۲۳۶]

یقیناً پاکستان کی کسی سیاسی جماعت کا یہ ایک دلیرانہ اقدام ہے کہ ایک ایسا ادیب جو ادبی، فکری، مذہبی، سیاسی، سماجی اور حکومتی سطح پر معتوب قرار دیا جاتا رہا اسے ملک کے سب سے بڑے اعزاز سے نواز دیا جائے اور پھر یہ اعتراف کیا جائے کہ اس سے اعزاز کی عزت و توقیر میں اضافہ ہوا ہے۔ ''منٹو اور موجودہ انسانی رویے'' ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اپنے اس مضمون میں منٹو کے عہد اور آج کے عہد کا تقابل کرتے ہوئے سوال اٹھایا کہ آج جب دہشت گردی اور انسانیت سوزی عام ہے۔ جہاں تمام انسانی قدریں پامال ہو چکی ہیں، جہاں قبروں سے تازہ دفن شدہ عورتوں کو نکال کر ان کے ساتھ منہ کالے کیے جاتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے اگر آج منٹو زندہ ہوتا تو اس کی ذہنی کیفیت کیا ہوتی۔ بقول مضمون نگار:

> ''موجودہ دور کے یہ کردار اس کے تصور کی آخری حدوں تک بھی موجود نہ تھے۔ کیا ایشر سنگھ ان سے بہتر انسان نہیں تھا۔'' [۲۳۷]

ان کے مضمون کا لب لباب یہ ہے کہ عہد حاضر میں بھی ہمیں سعادت حسن منٹو کی ضرورت ہے جو ہمیں ہمارے موجودہ سماج کی اصل تصویر دکھا سکے۔

آنے والا سماج اور منٹو'' میں مسعود اشعر نے نقطہ اعتراض اٹھایا کہ یہ بات از خود تشویش کا باعث ہے کہ ہم اس بات پر غور کر رہے ہیں کہ کیا آنے والے دور میں منٹو کے افسانے قبول کیے جائیں گے یا نہیں۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے اپنے مضمون ''مابعد نائن الیون دنیا اور منٹو'' میں گیارہ ستمبر کے بعد کی دنیا کا نقشہ کھینچتے ہوئے فی زمانہ منٹو کی بطور ادیب اہمیت اور افادیت کا جائزہ لیا۔ اُنھوں نے بہت سے ایسے مضامین اور کہانیوں کے حوالے دے کر ثابت کیا کہ منٹو کی

تحریریں آج کی دنیا سے بھی اتنا ہی متعلق ہیں جتنا کہ اس کے اپنے زمانے میں تھیں۔ ان کے بقول، سیاستدانوں اور دوافروشوں کو منٹو محض اس وجہ سے ایک ہی زمرے میں رکھتا تھا کیوں کہ یہ دونوں دوسروں کے نسخے استعمال کرتے ہیں بقول مضمون نگار:

''یہ بات چھے دہائیاں پہلے جتنی درست تھی آج بھی اتنی ہی درست ہے۔ مابعد گیارہ ستمبر کی دنیا کے طالبان ہوں یا امریکی ایماپر ان کے خلاف جنگ کرنے والے' دوسروں ہی کے نسخے استعمال کر رہے ہیں۔'' [۲۳۸]

''مابعد ۹/۱۱ دنیا اور منٹو'' میں عطیہ سید نے اس تاریخی بھونچال کے ساتھ منٹو کی تحریروں کے ربط کو تلاش کیا ہے۔ ان کے بقول منٹو پاکستان کو امریکی امداد چاہے وہ کسی بھی مد میں دی جائے خصوصاً فوجی امداد کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چچا سام کے نام لکھے گئے خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ وہ افغانستان میں ہونے والی جنگ سے بالکل اسی طرح آگاہ تھے جیسے پرندے طوفان کے آنے سے بہت پہلے باخبر ہو کر تھر تھرانے لگتے ہیں۔ امریکہ کا طریقہ واردات اور امداد کے نام پر استحصال دنیا پر ۹/۱۱ کے بعد کھلا لیکن منٹو یہ سب پہلے سے ہی بھانپ چکے تھے۔

''ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی'' نے اپنے مضمون ''پاکستان میں میں سماجی تبدیلیاں اور منٹو کے افسانے'' کی ابتدا میں ۲۰۱۲ء کو منٹو کا سال قرار دینا اور اس مناسبت سے سیمینار کانفرنسیں، کتب اور رسائل وغیرہ کے خصوصی شمارے شائع ہونے کو بہت بڑی سماجی تبدیلی قرار دیا ہے۔ ان کے بقول یہ وہی معاشرہ اور سماج ہے جس نے منٹو اور اس کی تحریروں کو اپنے سخت ترین شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ رجعت پسند، فحش نگار، جنسی مریض، لاشوں کی جیبوں سے افسانے نکالنے والا، ذہنی عدم توازن کا شکار اور پتہ نہیں کیا کیا نار و اسلوک اختیار کیے رکھا۔ لیکن آج اس کی تکریم ہو رہی ہے۔ اعزاز دیے جا رہے ہیں اور عہد حاضر میں اس کی تحریروں کے بامعنی ہونے کے حوالے تلاش کیے جا رہے ہیں۔ باقیوں کو تو چھوڑیں خود ترقی پسند تحریک کا بھی منٹو کے بارے میں رویہ اب معذرت خواہانہ سا ہے۔ مضمون نگار کے مطابق منٹو صدی کی تقریبات کا آغاز انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے سے ہونا اپنی جگہ معنویت کا حامل ہے۔ اس اجلاس میں جہاں عابد حسن منٹو، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر سعادت سعید، ڈاکٹر ضیاء الحسن اور ڈاکٹر قاضی عابد کے مضامین لائق توجہ ہیں وہیں ڈاکٹر سعید ابراہیم کے مقالے کو ''اجتماعی کفارے'' قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اُنھوں نے ایک طور خود کلامی کے انداز میں کہا کہ ہم سے غلطی ہوئی جو منٹو پر ترقی پسند رسائل کے دروازے اس عہد میں بند کیے۔ اسے رجعت پسند کہنا، جنس پرستی کا دھبا لگا کر اسے اپنی صفوں سے نکالنا، اس کے نام کھلے خط لکھنا یہ سب غلط تھا۔'' [۲۳۹]

بو، یزید، چچا سام کے نام خط، دیکھ کبیرا رویا، اللہ کا بڑا فضل ہے۔ سو کینڈل پاور کا بلب اور شہید ساز منٹو کی ایسی تحریریں ہیں جن کے تجزیے کے بعد ڈاکٹر قاضی عابد نے ''موجودہ کارپوریٹ کلچر اور منٹو کی تخلیقی دنیا'' میں کارپوریٹ کلچر کے ان دیکھے جبر کو تلاش کیا۔ بقول مضمون نگار:

''وہ شاید اُردو کا پہلا اور آخری آزاد تخلیق کار تھا جو اپنے کئی ہم عصروں کی نسبت یوں بھی ممتاز تھا کہ وہ اس زمانے میں کارپوریٹ کلچر کے ان دیکھے استحصال کو اپنا موضوع بنا رہا تھا جب کہ اس کے کئی ہم عصر اسے سمجھنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے تھے۔'' [۲۴۰]

''کارپوریٹ کلچر کی انسان دشمنی اور منٹو کی بیگانہ آشنائی'' پروفیسر ڈاکٹر سعادت سعید کا کتاب میں شامل آخری مضمون ہے۔ کارپوریٹ کلچر سے منٹو کی بیزاریت کا محاکمہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ منٹو نے سماج کی ان حقیقی صداقتوں کو جو کیموفلاج کر دی گئی ہیں طشت از بام کر دیا ہے۔ کارپوریٹ کلچر نے انسانوں کی آنکھوں پر جو سیاہ پٹیاں باندھنے کا اہتمام کیا یا لوگوں کے کانوں میں جو پگھلا ہوا سیسہ اتارا جس کی وجہ سے وہ زندگی کی حقیقتوں اور اصلیت سے لطف اندوز نہ ہو سکے اس کی خوب صورت عکاسی منٹو کی تحریروں میں ملتی ہے۔

مجموعی طور پر یہ ایک بہترین کتاب ہے۔ تمام مضامین نہ صرف اپنی جگہ اہم ہیں بلکہ ان میں اس عمومی رویے کے خلاف جو منٹو شناسی کے باب میں عموماً برتا گیا، ایک جدت اور نیا پن محسوس ہوتا ہے۔ بلاشبہ ان میں منٹو کی تحریروں کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی گئی اور عہد حاضر میں منٹو کی تحریروں کے اطلاق بلکہ ایک نئے منٹو کی ضرورت بھی محسوس کی گئی۔

''منٹو کی گمشدہ تحریریں''، شہزاد منظر۔ ڈاکٹر اسد فیض:

شہزاد منظر اور ڈاکٹر اسد فیض کی مرتّب کردہ یہ کتاب ''مقدمہ'' کے بعد تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ بعنوان ''منٹو کی غیر مدون تحریریں'' منٹو کی ذاتی اور ترجمہ کردہ / تیرہ تحریروں پر مشتمل ہے۔ چیخوف کے خطوط گورکی کے نام، سنگتراش کا روزنامچہ، حمید اور حمیدہ، غالب کی وضع داری، گلاب کا پھول، بارہ روپے، دست بریدہ بھوت، عورت اور مرد، مقدمہ نگار خانہ/میراجی، نثر میں نظمیں، اشتراکی شاعری۔ کتاب کے حصہ دوم ''منٹو کی گمشدہ تحریریں'' میں درج ذیل چار تحریروں پگلا، بلا عنوان، حماقت اور کوئلے کو تلاش کر کے شائع کرنے کا دعویٰ ملتا ہے جب کہ کتاب کا حصہ سوم ''منٹو شناسی'' کتاب کے ایک مرتّب ڈاکٹر اسد فیض کے تین تحقیقی مضامین، چار ہم عصر شعرا کا منظوم خراج تحسین اور مرتّبین کے متعلق ''الگ الگ تعارفی مضامین پر مبنی ہے۔

ڈاکٹر اسد فیض نے دیباچے میں کتاب کے عنوان ''منٹو کی گمشدہ تحریریں'' کی افسوس ناک کہانی یہ سنائی کہ دراصل یہ عنوان شہزاد منظر نے اپنی اس کتاب کے لیے تجویز کیا تھا جو ہمایوں اور عالمگیر کے روسی و فرانسیسی ادب نمبروں میں منٹو کی شامل تحریروں کو اکٹھا کر کے شائع کرنا تھی۔ مگر رائلٹی کے چکر میں پڑے مصنف اور پبلی شرز کو محمد سعید نے ''منہ کی کھلادی'' اور ۲۰۰۹ء میں نوادرات منٹو کے نام سے ان تراجم اور مضامین کو شائع کر دیا۔ لہٰذا مرتّب نے کتاب کا عنوان تو وہی رہنے دیا البتہ اس کی صورت تبدیل کر دی گئی۔ اب کتاب میں ڈاکٹر اسد فیض کے تین مضامین، منٹو اور رسالہ ہمایوں، رسالہ عالمگیر کا ایک یادگار شمارہ اور منٹو کی چار نادر تحریریں کے علاوہ درج ذیل غیر مدون فیچر، مضمون، افسانے اور ڈراما تلاش کر کے اشاعت پذیر کیں۔ ان تحریروں میں حمید اور حمیدہ، بارہ روپے، عورت اور مرد، دست بریدہ بھوت اور گلاب کا پھول شامل ہیں۔ مرتّب کا دعویٰ ہے کہ یہ تحریریں اس سے پہلے منٹو کے کسی افسانوی مجموعہ یا کلیات میں نہیں چھپیں۔ ڈاکٹر اسد فیض نے ان کہانیوں کی بھی نشاندہی کی جو نام بدل بدل کر شائع کی گئیں۔ پگلا، بلا عنوان، حماقت اور کوئلے اب نعرہ، ڈارلنگ، نفسیات شناس اور نیلی رگیں کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔

محمد سعید کی جلد بازی کہیے یا شہزاد منظر کی سست روی، بہر حال اس کتاب میں شہزاد منظر کے پاس شائع کرنے کے لیے صرف تین غیر مدون تحریریں، چیخوف کے خطوط گورکی کے نام، ساحرہ اور سرخ پھول ہی رہ گئیں۔ مقدمے میں مرتّب نے ان غیر دستیاب مجموعوں کو تلاش کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا جن کے اشتہارات منٹو کی زندگی میں چھپتے رہے اور بعد میں بھی۔ اس ضمن میں

اُنھوں نے ''ماہ غسل''اور ''مجذوب کی بڑ'' کی نشاندہی کی۔ مقدمے میں مرتّب نے تمام ماخذات کی نشاندہی کر کے تحقیقی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔

ڈاکٹر اسد فیض کا پہلا مضمون ''منٹو اور رسالہ ہمایوں'' منٹو کی ابتدائی اور ادبی زندگی اور ''رسالہ ہمایوں'' کے تعارفی نوٹ کے بعد منٹو کی ان تحریروں کی تفصیل پر مبنی ہے جو گاہ گاہ 'ہمایوں' کے مختلف شماروں کی زینت بنیں۔ دست بریدہ بھوت، شغل، نیا قانون، خودکشی کا اقدام، منتر، تحدید اسلحہ، ریچھ، نسبت، تماشا گاہ نفس، تلون، قلوپطرہ کی موت، مرزا غالب، جادو گر، چھبیس مزدور اور ایک دوشیزہ کے علاوہ پتھر کی سر گزشت، سپاہی اور موت، میکسم گورکی اور طاقت کا امتحان بھی ہمایوں میں اشاعت پذیر ہوئے۔

اس فہرست میں منٹو کی دو دیگر تحریروں شیطان اور شراب، جلد ۲۵ شمارہ ۱، جنوری ۱۹۳۴ء کے علاوہ منٹو کے افسانہ ''پگلا'' کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ جو دسمبر ۱۹۳۹ء میں جلد ۳۶، شمارہ ۶ میں شائع ہوئے۔ بقول مضمون نگار رسالہ ہمایوں اور ان کے ایڈیٹر حامد علی خان کا یہ اُردو افسانے پر احسان ہے کہ اُنھوں نے منٹو کی بطور مترجم حوصلہ افزائی کر کے اُردو ادب کو ایک رجحان ساز افسانہ نگار سے متعارف کرایا۔ان کے مطابق:

> ''ہمایوں کے یہ اوراق ایک بڑے ادیب کے ابتدائی دور کی ایک ان کہی کہانی بھی ہمیں سناتے ہیں، جس میں اس کی پسند، دلچسپی، اس کے ابتدائی رویوں کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔''[۲۴۱]

اپنے دوسرے مضمون ''رسالہ عالمگیر کا ایک یادگار شمارہ'' میں رسالہ عالمگیر کے آغاز ۱۹۲۴ء سے انجام ۱۹۵۱ء تک کے ادبی کردار کا مجموعی جائزہ لینے کے بعد مضمون نگار نے عالمگیر کے روسی ادب نمبر مطبوعہ ۱۹۳۶ء کا خصوصی مطالعہ کیا ہے جو منٹو کی وساطت سے اس کے مدیر محمد عالم نے شائع کیا۔

بقول مرتّب منٹو نے اس خصوصی شمارے میں درج ذیل افسانوں کے تراجم کیے۔ قیدی، کتا، تین سوال، تسکین خواب اور چکر، ان افسانوں کے علاوہ منٹو نے روسی شاعری کے کچھ تراجم بھی کیے جب کہ ''میکسم گورکی کی تصانیف پر ایک نظر، کی صورت میں ایک مضمون بھی شامل اشاعت ہے بقول مضمون نگار:

> ''اس (منٹو) نے تراجم کے توسط سے افسانے لکھنے کے روسی اور فرانسیسی انداز کو اپنایا۔ یہ نقطہ اس کے منفرد اسلوب، مشاہدے کی گہرائی، جزئیات نگاری اور کردار آفرینی کی بنیاد بنا ہے۔''[۲۴۲]

آخری مضمون ''منٹو کی چار نادر تحریریں'' میں منٹو کا وفات سے ایک روز قبل ترقی پسند ادیب رفیق چودھری پر چلنے والے مقدمے کے ضمن میں لکھا گیا ایک سفارشی خط ہے۔، یہ خط اُنھوں نے مہدی علی صدیقی کے نام لکھا تھا۔ دوسری تحریر حمید اور حمیدہ'' کے عنوان سے اگست ۱۹۳۹ء کے ہمایوں میں صفیہ منٹو کے نام سے شائع ہونے والی ایک تمثیل، جو مضمون نگار کے قیاس کے مطابق منٹو ہی کی تحریر ہے، تیسری نادر تحریر منٹو کا افسانہ ''پگلا'' جو دسمبر ۱۹۳۹ء کے ہمایوں میں سب سے پہلے چھپا، بعد میں منٹو نے اس کا عنوان تبدیل کر کے نعرہ، تجویز کیا جب کہ چوتھی نادر تحریر چراغ حسن حسرت کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے ''شیرازہ'' میں غالب کی وضع داری'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ بعد میں یہ مضمون منٹو ڈرامے'' میں ترمیم و اضافوں کے ساتھ ''غالب اور سرکاری ملازمت'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ۲۲۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ظفر اکیڈمی کراچی نے ۲۰۱۴ء میں شائع کی۔

''منٹو اور سینما''، پرویز انجم:

فلمی تبصرے سے اپنے تحریری کیریئر کا آغاز کرنے والے سعادت حسن منٹو کی تخلیقی زندگی کا بڑا حصہ، فلم انڈسٹری اور اس سے ملحقہ ماحول اور شخصیات سے مسلسل جڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اسے حسن اتفاق کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے کہ اردو افسانے کے باب میں سب سے زیادہ جس تخلیق کار کو ہماری تنقید نے اپنا موضوع بنایا، اس کی تخلیقی زندگی کے اس پہلو پر گنتی کے دو، چار واجبی مضامین کے علاوہ کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی۔ پرویز انجم وہ واحد منٹو شناس ہیں جو اُن اچھوتے اور نادر پہلوؤں کو تلاشتے ہیں جن پر پہلے کسی کا دھیان تو کیا گمان بھی نہیں جاتا۔

۲۰۱۴ء میں سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور سے چھپ کر جب یہ کتاب ادبی دنیا کے سامنے پیش ہوئی تو پتہ چلا کہ منٹو شناسی کا کتنا اہم حصہ ہماری اُردو تنقید اور تحقیق فراموش کیے بیٹھی تھی۔

پرویز انجم کے مختصر دیباچے اور سعادت حسن منٹو کے مضمون ''صنعت فلمسازی پر ایک نظر'' کے بعد کتاب دو بڑے حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ ۱۶ ابواب پر مشتمل ہے جس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔ پہلا باب، ابتدائی رجحانات کا دور (امرت سر)، دوسرا باب، ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۰ء (بمبئی) تیسرا باب، ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۶ء، (دہلی) چوتھا باب، ۱۹۴۶ء، (بمبئی)، پانچواں باب، ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۷ء (بمبئی/پونا) چھٹا باب، ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۵ء (لاہور/پاکستان)۔ حصہ دوم تین ابواب پر مشتمل ہے۔ ابواب کا شمار حصہ اول سے جڑا ہوا ہے۔ چناں چہ حصہ دوم کا پہلا باب نمبر شمار کے اعتبار سے ساتواں باب قرار پایا ہے۔ جس کا عنوان فلمی شخصیات کے خاکے، ایک معلوماتی مطالعہ، آٹھواں باب، منٹو کے افسانے، شوبز کے حوالے سے جب کہ آخری باب منٹو اور سینما'' ہے۔ جسے کتاب کا عنوان بھی تجویز کیا گیا۔

پہلے باب ''ابتدائی رجحانات کا دور (امرت سر)'' میں سعادت حسن منٹو کے ادیب یا فلمی کہانی کار بننے سے پہلے ان کی فلمی دنیا سے دلچسپی کی تفصیلات کو بیان کیا گیا ہے۔ اگرچہ کہ باری علیگ کی تحریک پر منٹو نے سب سے پہلا فلمی تبصرہ تحریر کیا تھا لیکن فلمی دنیا کی خوابناکی اور فلمی اداکاروں اور خاص طور پر اداکاراؤں کے، وہ باری علیگ کے ساتھ ملاقات سے پہلے ہی دیوانگی کی حد تک اسیر ہو چکے تھے۔ مارلین ڈیٹرچ، گریٹا گاربو، للین گش، ڈورتھی گش، گلوریا۔ سوانسن، میری پکفورڈ یہ، روزینا پوڈسٹا، بیلا ڈورتھی اور نارما شرر کی تصویروں سے منٹو کا کمرہ ہمیشہ سجا رہتا۔ موسیقی اور اسٹیج ڈراموں سے رغبت کے آثار سعادت حسن منٹو کی ابتدائی زندگی میں واضح دکھائی دیتے ہیں۔ اس رغبت کا نتیجہ تھا کہ منٹو نے ادب کی بجائے شوبز کی دنیا میں پہلا قدم رکھا۔ ہفت روزہ مصور، کی ادارت نے اُنھیں فلمی دنیا کے نشیب و فراز سے متعارف کرایا جس کے بعد وہ فلمی دنیا سے منسلک ہو گئے۔ اس حوالے سے پرویز انجم لکھتے ہیں:

> ''ایک طویل عرصہ تک فلم ہی سے ان کا روزگار وابستہ رہا۔ منٹو کو جتنا فلم سے ملا، اتنا اُنھیں ادب نے نہیں دیا۔'' [۲۴۳]

یہ الگ بات کہ افسانہ نگار منٹو کی طرح فلم نگار منٹو نے اتنا نام نہیں کمایا۔ دوسرا باب ''۱۹۳۶ سے ۱۹۴۰ (بمبئی)'' منٹو کے بمبئی کی مختلف فلمی کمپنیوں کے ساتھ وابستگی اور فلم نویسی کی تفصیلات کا احاطہ کرتا ہے۔ فلم اسٹوڈیو کا ماحول، کمپنی مالکان کے رویے، اداکاروں اور اداکاراؤں کے درمیان چلنے والے معاشقے، مکمل تفصیلات کے ساتھ اس باب سمیت پوری کتاب کا خاصہ ہیں۔ بن کی

سندری، دو عورتیں، کسان کنیا، زندگی اور دھرم پتنی، ان چار سالوں میں منٹو نے مختلف فلم کمپنیوں کی ملازمت کرتے ہوئے مذکورہ بالا فلموں کی کہانیاں اور اسکرپٹ لکھے۔

تیسرا باب ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۲ء تک کے ایک سال پر محیط ہے۔ منٹو آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم ہوئے۔ آل انڈیا ریڈیو (دہلی پر اس وقت کے نامور ادیبوں کا جمگھٹا تھا۔ منٹو یہاں ڈرامانویسی کے ساتھ ساتھ فلمی کمپنیوں سے بھی منسلک رہے۔ بقول مرتّب، دہلی کے زمانہ قیام میں منٹو نے دو فلمیں لکھیں۔ کرشن چندر کے اشتراک سے فلمی کہانی بنجارہ کے علاوہ شہرہ آفاق فلم ''مرزا غالب'' بھی قیام دہلی ہی کے دوران لکھی گئی۔ پرویز انجم منٹو کی فلم مرزا غالب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اس کہانی پر منٹو نے ۱۹۴۱ء میں کام شروع کر دیا تھا۔ اس کی تشکیل پر اُنھوں نے بہت عرق ریزی کی تا کہ اس زمانے کی تہذیب و معاشرت کا حقیقی عنصر نظر آئے۔ تخلیقی حوالے سے فلم کے میڈیم میں منٹو کا یہ سب سے اعلیٰ اور اہم کام ہے۔'' [۲۴۴]

اس باب میں درج معروضات سے واضح ہوتا ہے کہ فلموں کی بجائے ریڈیو پر ڈرامانویسی میں منٹو کی زیادہ دلچسپی رہی۔ بنجارہ اور مرزا غالب کے علاوہ منٹو کی کسی اور فلم کا تذکرہ مرتّب کے ہاں نہیں ملتا۔ البتہ خودکشی، چوڑیاں، روح کا ناٹک اور رندھیر پہلوان فلمی انداز میں لکھے ہوئے ڈرامے ہیں۔ چوتھے باب میں منٹو کی ان فلمی سرگرمیوں کا ذکر ہے جن کا زمانہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک ہے۔ منٹو نے اس دور میں نوکر، اچھوت کنیا، پکار، چل چل رے نوجوان، بیگم اور شکاری، جھمکے اور آٹھ دن کی فلمی کہانیاں لکھیں۔ اس زمانہ میں منٹو دہلی چھوڑ کر دوبارہ بمبئی آ گئے تھے جہاں وہ فلمستان'' سے منسلک رہے۔ پانچویں باب کا زمانہ صرف ایک سال پر محیط ہے اس ایک برس میں منٹو بمبئی ٹاکیز سے منسلک رہے۔ فلمستان سے منسلکی کے زمانے میں منٹو نے چار فلمی کہانیاں لکھ کر اپنے بھانجے مسعود پرویز کو پونا بھیجیں۔ شالیمار اسٹوڈیو کے مالک نے ان میں سے ایک کہانی ''کنٹرولستان'' کو پسند بھی کیا۔ فاضل مرتّب نے ۵۳ صفحات پر مشتمل اس فلم اسکرپٹ کے ابتدائی مناظر بھی قلمبند کرا دیے ہیں۔

پرویز انجم نے ایسی کہانیوں 'جن کے ساتھ منٹو کا نام چسپاں ہے' کے علاوہ کئی ایسی کہانیوں کی تفصیل بھی بتائی ہے جو ابھی گوشۂ گمنامی میں پڑی ہیں۔ ان کا قیاس ہے کہ لاتعداد مناظر تو ایسے ہیں جن کو منٹو کی مشاورت کے بعد عکس بند کیا گیا۔ بمبئی ٹاکیز ہی کے زمانے میں جب منٹو کے سب سے پیارے دوست اشوک کمار نے منٹو کی بجائے عصمت کی کہانی کو فلمانا شروع کر دیا تو منٹو نے نہ صرف بمبئی ٹاکیز بلکہ بمبئی کو بھی خیر آباد کہہ دیا۔

حصہ اول کے چھٹے اور آخری باب کا تعلق منٹو کے قیام پاکستان کے زمانہ سے ہے۔ بقول مرتّب فلمی حوالے سے منٹو کا یہ ناکام ترین دور ہے۔ کیوں کہ پاکستان کی فلم انڈسٹری تقریباً مردہ ہو چکی تھی۔ لیکن ہندوستان میں اس کے اثرات اب بھی موجود تھے۔ چناں چہ:

''تقسیم کے بعد بھارت میں ۱۹۴۹ء میں پنجاب فلم کارپوریشن کے زیرِ اہتمام ریلیز ہونے والی فلم ''پدمنی'' کی کہانی بھی منٹو کی تھی۔ منٹو نے یہ کہانی ممتاز شانتی اور اشوک کمار کو سامنے رکھ کر لکھی تھی۔'' [۲۲۵]

بقول مرتّب منٹو نے اس کا نام کوئی دوسرا رکھا تھا مگر پروڈیوسر نے اسے تبدیل کر کے ''پدمنی'' رکھ دیا۔ اسی طرح منٹو کی لکھی گئی ایک فلم ''گھمنڈ'' بھی ۱۹۵۵ء میں ہندوستان سے ریلیز ہوئی۔ بلکہ مرتّب نے تو اس رائے کا اظہار بھی خوب کیا ہے کہ پاکستان میں فلم انڈسٹری کی زبوں حالی کو دیکھ کر سید امتیاز علی تاج اور حکیم احمد شجاع کے علاوہ سعادت حسن منٹو بھی فلمی کہانیاں لکھ لکھ کر ہندوستان بھجواتے رہے۔ جہاں ان کو فلمایا جاتا تھا۔

پاکستان میں سعادت حسن منٹو نے ''پنجاب'' کے نام سے پہلی فلم لکھی، بعد میں اس کا نام تبدیل کر کے ''بیلی'' رکھ دیا گیا۔ یہ فلم بری طرح ناکام رہی۔ پاکستان میں منٹو کی دوسری فلمی کہانی ''آغوش'' تھی۔ بیلی کی طرح اسے بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس ضمن میں مرتّب لکھتے ہیں:

> ''بہر کیف، آغوش کی شوٹنگ کے دوران منٹو صاحب اکثر سیٹ پر موجود رہتے اور اپنے تجربے کی بنیاد پر فلم کے اداکاروں کو ان کے کرداروں کے بارے میں خود بتاتے تھے کہ اُنھیں کس طرح اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔'' [۲۴۶]

مرتّب کے بقول ''دوسری کوٹھی'' پاکستان میں منٹو کی تیسری اور آخری کہانی تھی۔ منٹو نے اس کے مکالمے اپنے عزیز دوست نصیر انور سے لکھوائے تھے ''دوسری کوٹھی''، پر منٹو کی فلم نویسی کا باب اختتام پذیر ہو گیا۔ یہ فلم بس اسکرپٹ کی حد تک ہی رہی اور اسے فلمایا تک نہ جا سکا۔

اسی باب کے آخری صفحات میں مرتّب لکھتے ہیں کہ منٹو کی دہلی کے زمانے کی فلم مرزا غالب' کو سہراب مودی نے عکس بند کر کے اسے ریلیز کیا۔ باکس آفس پر ریلیز ہونے سے پہلے سنسر والوں کے اعتراضات اور اس کی نمائش کی اجازت نہ دینے کی کہانی بھی خوب بیان کی گئی ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے کے باب اول کا تعلق منٹو کے لکھے گئے ان شخصی خاکوں کے متعلق ہے جو اُنھوں نے فلم انڈسٹری کے جگمگاتے ستاروں کے متعلق لکھے۔ یہ خاکے ان کے دو مجموعوں لاؤڈ اسپیکر اور گنجے فرشتے میں شامل ہیں۔

ساتویں باب میں منٹو کے مختلف افسانوں پر بننے والی فلموں، ٹی وی اور اسٹیج ڈراموں کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں جب کہ کتاب کے آخری باب ''منٹو اور سینما'' کو کتاب کا مجموعی جائزہ کہا جائے تو چنداں غلط نہ ہو گا۔

۵۲۸ صفحات پر مشتمل پرویز انجم کی یہ کتاب منٹو شناسی کے باب میں ہمیشہ تحسین کی نظر سے دیکھی جائے گی۔ منٹو کے زمانے کی فلم انڈسٹری اور اس سے وابستہ شخصیات کی جتنی تفصیل ممکن ہو سکتی تھی مرتّب نے اس سے بھی بڑھ کر انتہائی محنت اور خلوص سے بہم پہنچائیں اور اس کتاب کو مرتّب کیا۔ اکثر مقامات پر ان کی پیش کردہ معلومات پڑھ کر قاری حیرت اور استعجاب میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ کتنے سالوں کی عرق ریزی کے بعد اتنی بھرپور اور مفصل معلومات نہ صرف یہ کہ اکٹھی کی گئی ہوں گی بلکہ اُنھیں مربوط انداز سے تحریر بھی کیا گیا ہو گا۔ منٹو پر اب تک جتنی بھی کتابیں مرتّب کی گئی ہیں ان میں یہ سب سے منفرد کتاب ہے۔ مضامین کے انتخاب جیسی سہولت اختیار کرنے کی بجائے مرتّب نے معلومات کو یکجا کر کے ایک خاص ضابطے کے تحت اسے ترتیب دیا ہے۔ بلاشبہ منٹو کی شخصیت اور فن کے متعلق ایسی معلومات ان سے پہلے نہ تو کسی مرتّب نے جمع کی ہیں اور نہ ہی کسی مصنف نے۔ منٹو کے باب میں یہ کتاب ایک تاریخی دستاویز کا درجہ رکھتی ہے جس پر درجنوں مرتّبہ اور طبع زاد کتابیں نچھاور کر دینے کو جی چاہتا ہے۔

''کامریڈ منٹو''، علی احمد فاطمی:

کتاب کے عنوان سے عیاں ہے کہ منٹو کو شخصی اور فنی لحاظ سے اشتراکی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب ہمارے موضوع سے میل نہ کھاتی اگر فاضل مرتّب کا جامع اور پُر مغز دیباچہ شاملِ کتاب نہ ہوتا، زیرِ تبصرہ کتاب مرتّب کے مقدمے کے علاوہ پندرہ ایسے مضامین کا مجموعہ یا انتخاب ہے جو سعادت حسن منٹو کی تخلیق ہیں اور ان مضامین میں منٹو نام نہاد ترقی پسندوں سے کہیں زیادہ ترقی پسند نقطۂ نظر کا نہ صرف اظہار کرتا بلکہ دیگر افراد کو بھی ترقی پسند افکار کی تعلیم دیتا دکھائی دیتا ہے۔ منٹو کے اشتراکی نقطۂ نظر کے حامل مضامین کی فہرست اس ترتیب سے ہے۔ میکسم گورکی، پشکن، روسی ادب پر طائرانہ نظر، اشتراکی شاعری، سرخ انقلاب، کسان، مزدور، سرمایہ دار، زمیندار''، جون آف آرک کا مقدمہ، عصمت فروشی، گناہ کی بیٹیاں، گناہ کے باپ، مجھے بھی کچھ کہنا ہے، مجھے شکایت ہے، ترقی یافتہ قبرستان، کارل مارکس، مقدمہ سر گزشت اسیر اور کسوٹی۔ مضامین کے عنوانات ہی کتاب کی ترتیب کے مقصد کی غمازی کے لیے کافی ہیں۔ منٹو کی ادبی زندگی کے ابتدائی زمانے کو علی احمد فاطمی نے اشتراکی نظریات سے متاثرہ دور کہا ہے جب مشہور اشتراکی ادیب باری علیگ کے ساتھ اس نے کچھ ماہ گزارے۔ بقول مرتّب:

> ''یہ وہ دور تھا جب منٹو کی بے چین و بیقرار طبیعت انسان دوستی، حب الوطنی اور ترقی پسندی کے سانچے میں ڈھل رہی تھی۔''[۲۴۷]

مرتّب کے مطابق منٹو کے یہ مضامین خالصتاً اشتراکی فکر کا نتیجہ ہیں اور ان کی بنیاد پر منٹو کے فکر و فن اور حقیقت نگاری کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔

ان مضامین کے مطالعے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ منٹو نہ صرف روسی ادب سے واقف تھے بلکہ ان کا مطالعہ اتنا دقیق تھا کہ بعض روسی ادیبوں خاص کر میکسم گورکی کے اثرات بھی اُنھوں نے قبول کیے۔ گورکی کے علاوہ ترگنیف، پشکن اور پھر کارل مارکس سے تو وہ بہت ہی زیادہ متاثر تھے۔ چناں چہ بعض روسی ادیبوں پر منٹو کی تحریریں اور ہمایوں کے روسی ادب نمبر کی اشاعت کے ساتھ ساتھ خود منٹو کے پہلے افسانوی مجموعے آتش پارے'' میں انقلاب کی شدید خواہش صاف جھلکتی ہے اور صرف ابتدائی ہی نہیں بلکہ ساری زندگی منٹو اشتراکیت یا پھر کسی حد تک ترقی پسند نقطۂ نظر کے حامی رہے۔ یہاں تک کہ عمر کے آخری حصے میں بھی وہ اس فکر سے الگ نہیں ہوئے۔ کارل مارکس پر ان کا مضمون پاکستان میں ہی لکھا گیا تھا۔ علی احمد فاطمی منٹو کو خالص ترقی پسند ادیب گردانتے ہیں۔ منٹو اور ترقی پسندوں کے درمیان ہمیشہ میدان گرم رہا' اس کا بائیکاٹ کیا گیا، رجعت پسند اور فحش نگار کہا گیا' یہاں تک کہ اس کی تحریروں کو بھی رسائل میں چھاپنے سے انکار کر دیا گیا۔ ظلم تو یہ ہے کہ حکومت نے اسے ترقی پسندی کی پاداش میں بین کیے رکھا جب کہ ترقی پسندوں نے رجعت پسند اور غیر ترقی پسند سمجھ کر۔ چناں چہ اس کتاب کی اشاعت کا مقصد مرتّب نے یہ بیان کیا ہے کہ:

> ''میں نے تو یہاں صرف منٹو، ترقی پسندی اور ترقی پسندوں کے درمیان پھیلی یا پھیلائی گئی غلط فہمی کو دور کرنے کی ادنیٰ سی کوشش کی ہے۔''[۲۴۸]

مقدمے اور مضامین کے مطالعہ کے بعد مرتّب کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ:

"ان مضامین کو پڑھے بغیر مکمل اور اصل منٹو کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا اور کامریڈ منٹو کو تو بالکل بھی نہیں۔ جب کہ اس کا پورا سرمایہ ادب اُنھیں اشتراکی اور ترقی پسند خیالات و نظریات کا مرہونِ منت ہے۔"[۲۴۹]

فکشن ہاؤس، لاہور سے یہ کتاب ۲۰۱۴ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن داخلی شہادتوں کے مطابق ۲۰۱۲ء میں منٹو صدی کے طور پر منائے گئے سال یعنی ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا۔ یہاں مرتّب کا یہ اقتباس بے جا نہ ہوگا:

"میں نے جلدی جلدی یہ کام کر ڈالا تا کہ اپنے محبوب فنکار کو اس کے صدی سال پر ہی ایک حقیر شکل میں خراج عقیدت پیش کر سکوں۔"[۲۵۰]

"دو باتیں" کے عنوان سے لکھے گئے اس مختصر پیش لفظ کے نیچے جو تاریخ درج ہے وہ نومبر ۲۰۱۲ء ہی ہے کتاب ۲۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

"منٹو نامے (مکاتیب سعادت حسن منٹو)"، مرتّب: پرویز انجم:

ہم منٹو صدی میں جی رہے ہیں۔ حکومتی اور ادبی سطح پر منٹو کے ۱۰۰ ویں یوم ولادت پر دنیا بھر میں تقریباًت منعقد ہوئیں، سیمینار، مباحثے رسائل کے خصوصی نمبر، کتابیں غرض ہر طرف منٹو ہی منٹو دکھائی دینے لگا۔ بالکل اس طرح جیسے وفات کے بعد مضامین، تاثرات، خصوصی شماروں اور کتابوں کا سیلاب اُمڈ آیا تھا۔ کتابوں کی کثرت سے اشاعت اور ان کے معیار (خصوصاً مرتّبہ کتب) کو دیکھ کر صاف محسوس ہوتا ہے کہ زیادہ تر مرتبین نے محض منٹو کے بہانے اپنا نام پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جیسا کہ منٹو کی وفات کے وقت کیا گیا تھا، افراد کی طرف سے بھی اور اشاعتی اداروں کے مالکان کی طرف سے بھی۔

مرتّبین کی اس بھیڑ میں ایک مرتّب ایسا بھی ہے جو منٹو سے متعلق کوئی بھی کتاب مرتّب کرنے کے لیے سالوں کا وقت اور میلوں کا سفر طے کرتا ہے۔ پرویز انجم یقیناً ایسے منٹو شناس ہیں جو روایتی قسم کے "انتخابات" کی بجائے منٹو کی شخصیت اور فن کے اُن پہلوؤں کو مجتمع کر رہے ہیں جو ان سے پہلے آج تک کسی نے نہ کیے۔ "منٹو نامے" بھی ان کی ایسی ہی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں اُنھوں نے سعادت حسن منٹو کے وہ مکاتیب جمع کیے ہیں جو آج سے پہلے مختلف رسائل اور کتب میں مختلف اوقات میں چھپے۔ احمد ندیم قاسمی کے نام منٹو کے لکھے گئے خطوط کے علاوہ منٹو کے خطوط کا کوئی مجموعہ منظر عام یا خاص میں نہ تھا۔ مرتّب نے ان خطوط کو کافی تلاش کے بعد سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور سے ۲۰۱۴ء میں شائع کر کے منٹو شناسوں کے آگے سعادت حسن منٹو کی شخصیت کو مزید واضح کر کے رکھ دیا ہے۔ سعادت حسن منٹو کی زود نویسی کے پیش نظر اس بات کے امکانات قوی ہیں کہ اُنھوں نے قاسمی صاحب کے علاوہ محض یہی ۵۳ خط نہیں لکھے ہوں گے بلکہ ان خطوط کی تعداد سیکڑوں بلکہ ہزاروں پر محیط ہو سکتی ہے اور یقیناً آئندہ دنوں میں ان کے مزید خطوط کے نمونے بھی ضرور اشاعت پذیر ہوں گے۔ جن کی مدد سے منٹو کی شخصیت کے مزید نادر پہلو قارئین کے سامنے آئیں گے۔ ان خطوط میں بھی منٹو کی شخصیت کی حقیقی جھلکیاں محفوظ ہیں۔ بقول مرتّب:

"ان کے روزن سے ہم منٹو کی نفسیاتی اساس کو کسی حد تک سمجھ سکتے ہیں۔ ان واضح بیانات، نفسیاتی اشاروں اور بین السطور مفہوم سے ان کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ بھی مستقبل کے سوانح نگار کے لیے کافی کار آمد ثابت ہو سکتی ہے۔"[۲۵۱]

''منٹو نامے'' تین حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلا حصہ سعادت حسن منٹو کے لکھے گئے ان خطوط پر مشتمل ہے جو اُنھوں نے مختلف مشاہیر ادب اور اپنے خاندان کے لوگوں کے علاوہ دوستوں کو لکھے۔ مجموعی طور پر منٹو کے لکھے گئے ان خطوط کی تعداد ۵۳ ہے۔

والدہ صاحبہ اور محمد طفیل کے نام ان کے دو دو خط، حسن عباس اور ممتاز شیریں کے نام تین تین خط، اپنی بہن اقبال کے نام منٹو کے چار خطوط، غلام حسین مصطفی کے نام پانچ خطوط جب کہ مولانا حامد علی خان مدیر ہمایوں کے نام ان کے چودہ خطوط شامل ہیں۔ اپنے بھائی، قاضی عبدالغفار، کرنل قریشی، نیاز فتح پوری، خلیفہ عبدالحکیم، یوسف مالک، شاد امرتسری، امرتا پریتم، مہدی علی صدیقی، ہرنیدر ناتھ چٹو پادھیائے، عبدالوحید، عشرت رحمانی، حاجرہ مسرور، نصیر انور، مجید امجد، ڈاکٹر محمد باقر، عزیز احمد، اے بی حلیم اور اشفاق احمد کے نام منٹو کا ایک ایک خط ہی دستیاب ہو سکا۔

اگرچہ کچھ ایسے خطوط بھی مرتّب کی نظر سے گزرے جن کے مکمل متن تو شائع نہیں ہوئے لیکن مختلف کتب و رسائل میں منٹو کے خطوط کے اقتباس درج کیے گئے ہیں۔ لہذا مرتّب نے اشفاق احمد، امرتا پریتم، مجید امجد اور عشرت رحمانی کے نام منٹو کے مکتوبات کے اکتساب بھی شامل کتاب کر دیے ہیں۔ ان اقتباسات کو اگر مکمل خطوط نہ گردانا جائے تو کتاب کے اس حصے میں شامل خطوط کی تعداد ۴۹ قرار پائے گی۔

کتاب کا دوسرا حصہ ''سعادت حسن منٹو کے نام'' مشاہیر ادب اور احباء و اعزہ کے اُن خطوط پر مشتمل ہے جو سعادت حسن منٹو کو لکھے گئے۔ ان خطوط میں علی سردار جعفری نے دو احمد ندیم قاسمی اور شیام نے تین تین خط منٹو کو لکھے۔ ان کے علاوہ سعید امرت، فکر تونسوی، ڈاکٹر جاوید اقبال، عبدالسلام خورشید، سلام مچھلی شہری، عارف عبدالمتین، کنہیا لال کپور، محمد علوی، ممتاز شیریں، باری علیگ، مظہر علی، نصیر انور اور نزہت شیریں کا ایک ایک خط شامل کتاب ہے۔ حامد علی خان کے ایک مکمل خط کے علاوہ ایک خط کا اقتباس بھی شامل ہے۔ اقتباس کو نکال کے اس حصہ میں شامل خطوط کی تعداد بائیس بنتی ہے۔ جب کہ حصہ سوم بعنوان ''خط جو پوسٹ نہ ہوئے'' میں سعادت حسن منٹو کا خط بنام پنڈت نہرو، احمد ندیم قاسمی کا منٹو کے نام کھلا خط اور منشا یاد کا منٹو کے نام ایک خط شامل ہے۔ تحقیقی اعتبار سے ''منٹو نامے'' ایک اہم کتاب ہے جس نے منٹو شناسوں کو ایک نئی راہ دکھادی ہے۔ یقیناً منٹو نے اس سے کہیں زیادہ خطوط لکھے ہیں اور اُنھیں بھی اسی مقدار میں خطوط لکھے گئے ہوں گے۔ ان خطوط کی تلاش بسیار ایک اہم تحقیقی پیش رفت ہو گی۔

''منٹو باتیں''، پرویز انجم:

''منٹو صدی'' کے موقع پر سعادت حسن منٹو کی شخصیت و فن پر شائع ہونے والی کتابیں بلا مبالغہ منٹو شناسی کے باب میں ایک نئے عہد کو وا کرنے کی کامیاب کوشش ہیں۔ سو سال بعد ہی سہی بالآخر منٹو کی فنکارانہ صلاحیتوں کا اعتراف اسی مملکت خداداد نے حکومتی سطح پر کر لیا ہے جس نے ایک طویل عرصہ اسے معتوب قرار دیے رکھا۔ سنگ میل پبلی کیشنز کی وساطت سے ''منٹو باتیں'' کے نام سے شائع ہونے والی تحقیقی نوعیت کی اس کتاب کے مرتّب پرویز انجم ہیں۔ جن کی منٹو دوستی کا ثبوت عملی صورت میں ہم سب کے سامنے ہے۔ منٹو کی شخصیت اور فن پر تسلسل کے ساتھ جس سنجیدگی کا مظاہرہ اُنھوں نے کیا وہ کسی دوسرے منٹو شناس کے حصے میں

نہیں آیا۔ ۲۰۱۴ء میں شائع ہونے والی یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز جب کہ دوسرے حصے میں مختلف مذاکروں میں منٹو کے متعلق کی جانے والی گفتگو/تبصروں کو یکجا کیا گیا ہے۔

حصہ اول ''سخن ور'' انٹرویوز پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں سب سے پہلا مطالعاتی/خیالاتی انٹرویو جو خود سعادت حسن منٹو کا ہے اور اسے نریش کمار شاد نے منٹو کی تحریروں سے اخذ کیا ہے۔ اس انٹرویو کے علاوہ پینتیس مشاہیر ادب کے انٹرویو شاملِ کتاب ہیں۔ یہ تمام لوگ ادب میں اپنا ایک خاص مقام اور شہرت رکھتے ہیں اور جید ادیبوں کے زمرے میں شمار کیے جاتے ہیں۔ فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، اختر حسین رائے پوری، ممتاز مفتی، احمد راہی، اوپندر ناتھ اشک، میرزا ادیب، جی ایم اثر، راجندر سنگھ بیدی، انتظار حسین، حمید اختر، ممتاز شیریں، قرۃ العین حیدر، سیف الدین سیف، حسن عسکری، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، غلام عباس، اے حمید، ڈاکٹر سلیم اختر، کمال احمد رضوی، سید قاسم محمود، دیوندر ستیار تھی، مستنصر حسین تارڑ، شمیم حنفی، شجاعت ہاشمی اور اشوک کمار کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان معاصرین کے علاوہ منٹو کی فیملی سے کیے گئے انٹرویوز بھی شامل کتاب ہیں۔ بیگم صفیہ منٹو، ذکیہ جلال، نگہت، نصرت اور نزہت منٹو کے علاوہ رضیہ وحید اور وقار گیلانی کی باتیں منٹو کی شخصیت اور فن کے اصل خدو خال قارئین کے سامنے لے آتی ہیں۔ کتاب میں شامل مشاہیر ادب کی گفتگو میں، انٹرویو کے صرف وہ حصے شائع کیے گئے ہیں جن میں ان شخصیات نے بالواسطہ یابلاواسطہ منٹو کی شخصیت یا فن کے کسی پہلو پر بحث کی یا رائے دی۔ مختلف نقطہ ہائے نظر رکھنے والی یہ ادبی شخصیات منٹو کے بارے میں کیا سوچتے یا سمجھتے ہیں اس کتاب کی اشاعت کا اصل سبب ہیں۔ البتہ احمد راہی، جی۔ ایم اثر، انتظار حسین اور ڈاکٹر سلیم اختر کے انٹرویوز مکمل طور پر منٹو کے متعلق ہیں۔

''منٹو باتیں'' کا دوسرا حصہ ایسے ادبی مذاکروں یا سیمیناروں کے اس متن پر مشتمل ہے جن میں منٹو موضوع گفتگو ہیں۔ مذاکرہ الف کے شرکاء میں حمید اختر، احمد ندیم قاسمی، سید وقار عظیم، حاجرہ مسرور، ڈاکٹر عبادت بریلوی، خدیجہ مستور، انتظار حسین اور محمد طفیل کے علاوہ خود سعادت حسن منٹو بھی شامل ہیں۔ مذاکرہ (ب) کے شرکاء کی تعداد دس ہے اور ان میں انتظار حسین، اشفاق احمد، انور سجاد، انیس ناگی، ڈاکٹر سہیل احمد، جیلانی کامران، اظہر جاوید، اصغر ندیم سید اور عذرا اصغر شامل ہیں۔ جب کہ مذاکرہ (ج) میں فہمیدہ ریاض، زاہدہ حنا، محمد علی صدیقی، حسن منظر، وسعت اللہ خان، اجمل کمال، غازی صلاح الدین اور بدر عالم شریک گفتگو ہیں۔ کتاب میں شامل یہ مکالمات صرف منٹو فہمی ہی کا ذریعہ نہیں بلکہ ان کی مدد سے مختلف ذہنوں، ادبی و سماجی رویوں اور نقد و تنقید کے معیار کو بھی پرکھنے کا موقع ملتا ہے مرتّب کی اس بات میں کافی صداقت ہے کہ:

> ''ان صحت مند ادبی مکالموں کی بدولت گزشتہ صدی کی ادبی پیش رفت کی بیشتر جہات واضح ہو کر سامنے آتی ہیں۔ یہ مکالمات مختلف ادبی دھاروں، تحریکوں اور نظریات کو سمیٹنے کی کوشش ہے۔'' [۲۵۲]

کتاب کو مرتّب کرنے کا مقصد بھی نظریاتی تضادات کے حامل افراد کا نقطۂ نظر جان کر اُس عہد کے ادبی معیار کو پرکھنا ہے:

> ''ان کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان کے ذریعے سے افکار کا وہ ٹکراؤ سامنے آسکے جس سے منٹو کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالی جاسکے۔'' [۲۵۳]

پہلے حصے کی طرح حصہ دوم میں بھی صرف انھی باتوں کو متن کا روپ دیا گیا ہے جو صرف منٹو سے متعلق ہیں۔

"امرت سر کا منٹو"، حیات۔ واقعات۔ تخلیقات "پرویز انجم:

پاکستان میں سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن کے متعلق منفرد کتابیں مرتّب کرنے والے پرویز انجم کی یہ کتاب سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور نے ۲۰۱۵ء میں شائع کی۔ یہ سعادت حسن منٹو کی پہلی مربوط اور سنجیدہ مگر نامکمل سوانح عمری ہے۔ نامکمل ان معنی میں کہ اس میں سعادت حسن منٹو کی زندگی کے اُس دور کے حالات، واقعات اور تخلیقات کو موضوع بنایا گیا جن کا تعلق امرت سر سے ہے۔ مرتّب نے منٹو کی ذاتی تحریروں کے علاوہ اُن کے ایسے معاصرین کی تحریروں کو ماخذ بنایا جو کسی نہ کسی حوالے سے منٹو کے امرت سر میں گزارے گئے دور سے براہ راست جڑے ہوئے تھے۔

سعادت حسن منٹو نے اپنی پیدائش ۱۹۱۲ سے ۱۹۳۴ء تک اپنی زندگی کا نصف سے بھی زیادہ حصہ امرت سر میں گزارا۔ یہ امرت سر ہی تھا جس میں رہ کر سعادت حسن منٹو بطور تخلیق کار شہرت کی ابتدائی سیڑھیوں پر قدم جما چکے تھے۔

بیس ابواب پر مشتمل یہ کتاب منٹو کی زندگی کے ابتدائی ۲۶ سال کی مکمل شخصی و فنی تصویر ہے۔ سعادت حسن منٹو کے آباء و اجداد کی کشمیر سے ہجرت اور منٹو خاندان کی تفصیلات 'خانگی صورتحال' منٹو کی پیدائش اور پرائمری سطح کی تعلیمی سرگرمیوں کی تفصیلات باب اول میں تحریر کی گئی ہیں۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی، ویسے ویسے منٹو کی سرگرمیاں بھی بڑھتی گئیں۔ مرتّب کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے حالات و واقعات اور تخلیقات کو بیان کرتے وقت اُس خاص ترتیب کو ملحوظ خاطر رکھا جس ترتیب سے وہ وقوع پذیر یا تخلیق ہوئی تھیں۔ گویا مرتّب نے منٹو کی زندگی کے اس حصے کا لمحہ بہ لمحہ پیچھا کیا۔ اور اُنھیں ایک ترتیب خاص سے سطح بہ سطح تعمیر کرتا گیا۔ یوں سردار بیگم کی گود میں لی گئی کلکاریوں سے لے کر بمبئی مراجعت تک کے جسمانی اور تخلیقی سفر کی لمحہ بہ لمحہ داستان پرویز انجم نے گویا چشم دید گواہ کے طور پر منٹو کے قارئین کو سنادی۔

ہندوستان میں چلنے والی سیاسی تحریکوں میں امرت سر اور اُس کے باسیوں کا کردار، منٹو کا بچپن، خاندان کا رویہ، درسی تعلیم سے بیزاری، شرارتیں، دوستیاں، مشاغل، سگریٹ نوشی، دینو یا فضلو کی بیٹھکیں، جوئے اور شراب کی عادت، آغا حشر سے ملاقاتیں، باری علیگ کی امرت سر آمد اور منٹو کی زندگی پر اس کے اثرات، انقلاب کی خواہش، پہلی تحریر، پہلا ترجمہ، پہلا افسانہ، روسی و فرانسیسی ادب نمبروں کی اشاعت اور ان تمام حالات و واقعات اور تخلیقات کی مکمل تفصیل مرتّب نے اپنی اس کتاب میں ایک ادبی سلیقے کے ساتھ ترتیب دی ہے۔ واقعات، جزئیات اور تفصیلات کے ضمن میں زیادہ تر منٹو کی ذاتی تحریروں کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ یہ تحریریں چاہے مضامین کی صورت میں لکھی گئیں یا پھر خطوط کی صورت میں، یہاں تک کہ منٹو کے ایسے افسانے جن کے مرکزی یا ضمنی کردار خود منٹو کو گردانا جاتا ہے، اُنھیں بھی متن کا ہو بہو حصہ بنا کر واقعات کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی گئی۔ پرویز انجم کی ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ ماخذات کی نشاندہی کیے بغیر آگے نہیں بڑھتے، وگرنہ ہمارے ہاں کے مرتّبین تو درکنار محققین بھی اس اہم ذمہ داری کے احساس کو خاطر تک میں نہیں لاتے۔ حواشی اور شخصیات کے اشاریے کے ساتھ ان کی یہ کتاب ۲۸۰ صفحات پر محیط ہے۔ ان مختصر صفحات میں مرتّب نے منٹو کی شخصی اور ادبی زندگی کی نمود اور نشوونما کو مفصل انداز میں ترتیب دے کر انیس ناگی مرحوم کی وہ خواہش اور شکوہ کسی حد تک دور کر دیا کہ منٹو کی مبسوط سوانح عمری آج تک نہیں لکھی گئی۔ [۲۵۴]

اگرچہ زیرِ تبصرہ کتاب بھی مکمل سوانح حیات نہیں بلکہ ایک خاص علاقے میں گزارے گئے حالات و واقعات سے متعلق ہے، لیکن کتاب کی ترتیب اور اختتام اس بات کی چغلی کھاتے ہیں کہ ہم جلد ہی بمبئی، دہلی اور لاہور کے منٹو سے بھی ملاقات کرنے والے ہیں۔

''میں نے منٹو کو کیسا پایا''(احمد ندیم قاسمی) پرویز انجم:

احمد ندیم قاسمی کے سعادت حسن منٹو پر لکھے گئے ایک مضمون کو عنوان بناتے ہوئے کتاب کے مرتّب پرویز انجم نے اس میں ان تحریروں کا انتخاب کیا ہے جو مختلف اوقات میں احمد ندیم قاسمی نے سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن کے متعلق تحریر کیں۔ منٹو اور قاسمی کھلا خط، بند چھٹی'' مرتّب کا مختصر دیباچہ ہے جس میں اُنھوں نے سعادت حسن منٹو اور احمد ندیم قاسمی کے تعلقات میں آنے والے نشیب و فراز کا تذکرہ کیا۔ ان خطوط کے بارے میں پائی جانے والی مختلف قیاس آرائیوں اور منٹو کی صاحبزادی نصرت منٹو کے اس انکشاف کے بعد کہ:

> ''قاسمی صاحب جب منٹو کے اپنے نام خطوط چھاپنا چاہتے تھے تو وہ امی سے (منٹو کے نام) اپنے خط یہ کہہ کر لے گئے تھے کہ وہ اپنے اور منٹو کے خطوط کو اکٹھا چھاپنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ خط چھپے نہیں۔ منٹو کے قاسمی صاحب کے نام خطوط ۶۲ء یا ۶۳ء میں چھپ گئے تھے، قاسمی صاحب کا ۲۰۰۶ء میں انتقال ہوا تو اس سارے عرصے میں وہ یہ خطوط چھاپنے سے محترز رہے۔''[۲۵۵]

مرتّب اب ان خطوط کی اشاعت سے مایوس دکھائی دیتے ہیں۔ فیض احمد فیض کا ایک مضمون بعنوان ''سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی'' کے بعد دو حصوں میں منقسم اس کا کتاب کا پہلا حصہ ''بعنوان احمد ندیم قاسمی ''تحریریں چند'' میں احمد ندیم قاسمی کی منٹو کے متعلق براہِ راست لکھی گئی نو تحریروں/مضامین کے علاوہ نصب العین کا مسئلہ، کے عنوان سے ڈاکٹر جاوید اقبال کا ترقی پسند ادیبوں اور سعادت حسن منٹو کے افسانے کھول دو پر ایک تفصیلی مضمون اور اس کے جواب میں احمد ندیم قاسمی کا نسبتاً مختصر مضمون بھی شامل ہے۔ قاسمی صاحب کے جواب میں ڈاکٹر جاوید اقبال کا ایک وضاحتی مضمون بھی اس سلسلے کی توسیعی صورت ہے۔ حصہ اول میں احمد ندیم قاسمی کے درج ذیل مضامین شامل ہیں۔ منٹو کی چند یادیں اور چند خطوط، میں نے منٹو کو کیسا پایا، سعادت حسن منٹو، میرے ہمسفر (یادداشتیں) افسانے میں حقیقت پسندی اور جرات مندی کی مثال۔ منٹو، منٹو کے فن کے بارے میں چند مختصر باتیں، سعادت حسن منٹو کے نام کھلا خط اور انتقال کے پچاس برس بعد منٹو زندہ ہو گیا۔ حصہ دوم، احمد ندیم قاسمی کے لیے گئے چار انٹرویوز اور ایک مذاکرے کو جن میں بالواسطہ منٹو کا ذکر ہوا، کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

حصہ اول میں شامل پہلا مضمون، منٹو کی چند یادیں اور خطوط اس سے قبل سعادت حسن منٹو، ایک مطالعہ، مرتّبہ، انیس ناگی، منٹو ایک کتاب، مرتّبہ، صہبا لکھنوی، منٹو کیا تھا، مؤلفہ غلام زہرہ، میں بھی اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ یہی مضمون نقوش منٹو نمبر میں بھی موجود ہے۔ اس طرح اردو افسانے میں حقیقت پسندی اور جرات مندی کی مثال۔ منٹو'' مرتّب کے درج کیے گئے ماخذ کے علاوہ، (لاہور کے چند بڑے ادیب) نقوش لاہور میں اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ سعادت حسن منٹو کے نام کھلا خط'' سنگ میل پشاور، ۱۹۴۸ء

میں سب سے پہلے شائع ہوا۔ مرتّب نے اس کی پہلی اشاعت کو اپنے متن کی بنیاد بنایا ہے۔ منٹو کے نام یہ کھلا خط معاصر، لاہور جلد ۴۳، شمارہ ۳، ۴، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۲ میں بھی اشاعت پذیر ہوا۔

سعادت حسن منٹو کے متعلق لکھی گئی احمد ندیم قاسمی کی تحریروں کی یکجائی سے یقیناً منٹو اور قاسمی کے تعلقات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ اس ضمن میں احمد ندیم قاسمی کی ایک اور تحریر کو بھی کتاب کا حصہ بنایا جاسکتا تھا۔ یقیناً فاضل مرتّب کے مشاہدے میں یہ نہیں آئی ہو گی۔

''منٹو میرا یار'' کے عنوان سے یک صفحاتی تبصرہ ماہنامہ، پگڈنڈی، امرت سر منٹو نمبر مطبوعہ ۱۹۵۵ ص ۳۶ پر موجود ہے۔ حصہ اول میں شامل مضامین زیادہ تر شخصی نوعیت کے ہیں اور ان میں دونوں اشخاص کے تعلقات کے آغاز سے منٹو کی وفات تک کے درمیانی عرصہ میں وقت کے ساتھ ساتھ آنے والی تبدیلیوں کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ منٹو کی شخصیت کے زیادہ تر مثبت اور کم کم منفی پہلوؤں پر مصنف نے بہت فنکارانہ اور ہمدردانہ انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ منٹو کی شخصیت میں موجود دو خامیوں شراب نوشی اور حد سے بڑھی ہوئی انانیت سے احمد ندیم قاسمی کے واضح اختلاف اور ان کی برملا نشاندہی کے باوجود ایک لمحے کے لیے بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ مصنف منٹو کی تحقیر یا تذلیل کر رہا ہے۔ ایک محبت کرنے والا شخص جس طرح محبوب کی تمام تر خامیوں کے باوجود اس سے حد درجہ محبت کرتا ہے، قاسمی صاحب کی تحریروں سے بھی یہی جذبہ محبت چھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

منٹو کے مزاج کی تیزی اور تندی کو وہ جس حوصلہ مندی سے مختلف اوقات میں برداشت کرتے رہے۔ اس کے پیچھے دراصل وہ منٹو تھا جس نے احمد ندیم قاسمی کو انگلی پکڑ کر ادب اور فلم کی دنیا میں چلنا سکھایا۔ احمد ندیم قاسمی نے ان مضامین میں برملا اظہار کیا ہے کہ منٹو نے پاکستان آمد تک احمد ندیم قاسمی کو ہر طرح کا تحفظ دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ چوں کہ ان مضامین میں زیادہ تر منٹو کی شخصیت سے جڑے ہوئے واقعات کو ہی موضوع بنایا گیا ہے اس لیے اکثر مضامین میں واقعات کی تکرار دکھائی دیتی ہے۔ ظاہر ہے اس تکرار سے مرتّب بری الذمہ ہے۔ تین مختلف مضامین ''میں نے منٹو کو کیسا پایا''، ''سعادت حسن منٹو'' اور ''اردو افسانے میں حقیقت پسندی اور جرات مندی کی مثال، منٹو'' میں احمد ندیم قاسمی نے ادیبوں اور شاعروں کے تاثرات پر مبنی اس کتاب کا تذکرہ کیا ہے جو سعادت حسن منٹو اپنی زندگی میں ''ناخن کا قرض'' کے نام سے چھپوانا چاہتے تھے۔ پہلے اور تیسرے مضمون میں اُنھوں نے اس کتاب کا نام ناخن کا قرض ہی درج کیا ہے مگر دوسرے مضمون بعنوان سعادت حسن منٹو'' میں وہ اسی کتاب کے متعلق کچھ یوں رقم طراز ہیں:

> ''ظاہر ہے کہ یہ آرا دو دو' چار چار سطروں پر مشتمل تھیں۔ منٹو چاہتا تھا کہ ان آرا کو'' چشم روزن'' کے نام سے ایک مجموعے میں یکجا کر دے۔'' [۲۵۶]

قاسمی صاحب کے علاوہ منٹو کے کسی معاصر یا نقاد نے ''چشم روزن'' نامی کتاب کا ذکر آج تک نہیں کیا۔ جب کہ ناخن کا قرض کے حوالے جا بجا ملتے ہیں۔ کتاب کے دوسرے حصے میں احمد ندیم قاسمی کے چار انٹرویوز کے علاوہ ایک مذاکرے میں کی گئی گفتگو کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ مذاکرے میں احمد ندیم قاسمی اور دیگر ادیبوں کے علاوہ سعادت حسن منٹو بھی شریک گفتگو ہیں۔ ۲۰۸ صفحات پر مشتمل پرویز انجم کی یہ کتاب سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور سے ۲۰۱۵ء میں شائع ہوئی۔

’’منٹو۔ کون ہے یہ گستاخ۔۔۔؟‘‘، ڈاکٹر سید عامر سہیل:

منٹو کی شخصیت اور فن پر لکھے گئے ۳۴مضامین کا یہ مجموعہ تین حصوں ’’منٹو۔ فکر و فن‘ منٹو: خصوصی مطالعے‘‘ اور منٹو: مباحث، میں منقسم ہے۔ کتاب میں ایسے مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔ جو مرتّب کے زیرِ ادارت شائع ہونے والے ماہانہ کتابی سلسلہ ’’انگارے‘‘ کے آغاز یعنی جنوری ۲۰۰۳ء جنوری ۲۰۰۸ء تک کے رسائل میں، جن کی تعداد ۶۱ بنتی ہے مختلف اوقات میں شائع ہوتے رہے۔ اسی طرح ’’انگارے‘‘ کے منٹو نمبر جنوری اور دسمبر ۲۰۰۸ء میں اشاعت پذیر مضامین بھی شامل کتاب ہیں۔۔ حصہ اول ’’منٹو۔ فکر و فن‘‘ میں ۱۳، حصہ دوم ’’منٹو۔ خصوصی مطالعہ‘‘ میں ۱۱ جب کہ حصہ سوم میں ۱۰ مضامین شامل ہیں۔ ’’انگارے کے منٹو کے متعلق شائع کیے گئے خصوصی شماروں میں درج ذیل مضمون نگاروں کے ۱۸ مضامین کی فہرست کچھ یوں ہے:۔

سعادت حسن منٹو۔ برصغیر کا تخلیقی ضمیر، ڈاکٹر انوار احمد، سعادت حسن منٹو۔ خطوط کے آئینے میں، ڈاکٹر انور سدید، منٹو اور منٹو کے مضامین، ڈاکٹر علی ثناء بخاری، منٹو کا مسخ شدہ ورژن، ابن حسن، منٹو پر چند ذہنی/تنقیدی تحفظات، ڈاکٹر قاضی عابد، منٹو کی سوانح۔ تھوڑا نیا، تھوڑا پرانا، ڈاکٹر روش ندیم، نایاب منٹو، محمود احمد قاضی، منٹو اور اردو افسانے کے جدید رجحانات، نسیم عباس احمر، منٹو کتابیات، ڈاکٹر علی ثناء بخاری، منٹو کا ایک افسانہ، احمد صغیر صدیقی، منٹو کی موذیل، ڈاکٹر شگفتہ حسین، منٹو کا کھول دو‘‘! چاک گریباں کی رفوگری کا ایک جتن، پروفیسر خالد سعید، بابو گوپی ناتھ: زندگی کے امکانات کا اشارہ، ڈاکٹر روبینہ شاہ جہاں، تماشا: تنقیدی اور توضیحی مطالعہ، ڈاکٹر غفور شاہ قاسم، تنقیدی محدودات اور ٹوبہ ٹیک سنگھ، ڈاکٹر خالد سنجرانی، منٹو کا ایک افسانہ موذیل، ایم۔ خالد فیاض، سعادت حسن منٹو کے اُداس اور تنہا متخصص، ڈاکٹر انوار احمد، منٹو کے بارے میں چند غلط فہمیاں، ڈاکٹر علی ثناء بخاری۔ ان ۱۸ مضامین کے متعلق تفصیلی گفتگو مقالہ کے باب رسائل و جرائد کے خصوصی شماروں کا جائزہ لیتے وقت کی گئی ہے۔[۲۵۷] کتاب میں موجود دیگر مضامین ڈاکٹر شگفتہ حسین، لیاقت علی، آصف فرخی، ایم۔ خالد فیاض، شوکت نعیم قادری اور طاہر عباس کی تحریریں ہیں۔

آصف فرخی نے اپنے مضمون ’’پاکستان میں ادیب کی ذمہ داریاں اور منٹو‘‘ میں پاکستان میں ادیب کے کردار اور سماجی ذمہ داری کا جائزہ منٹو کے حوالے سے مرتّب کرنے کی احسن کوشش کی ہے۔ لیاقت علی نے اپنے مضمون ’’منٹو کے فرشتے‘‘ میں گنجے فرشتے اور لاؤڈا سپیکر میں لکھے گئے خاکوں کی روشنی میں منٹو کے فن خاکہ نگاری کا محاکمہ کیا۔ ڈاکٹر شگفتہ حسین کے مضمون میں موذیل جب کہ ایم خالد فیاض نے منٹو کے دو کرداروں حنیف اور باسط کا تجزیہ کیا۔ کتاب میں شامل اپنے دوسرے مضمون ’’منٹو کا ایک فراموش شدہ افسانہ‘‘، ’’پھوجا حرام دا‘‘ میں اُنھوں نے مذکورہ افسانے کو ناقدین کی طرف سے فراموش کردہ افسانہ قرار دیا۔ طاہر عباس کے اس کتاب میں چار مضامین بعنوان ’’منٹو: ماہ و سال کے آئینے میں‘‘ منٹو کا ٹائپ رائٹر، سعادت حسن مر گیا، منٹو زندہ ہے کا بنیادی ماخذ اور منٹو پر مستند تحقیقی کتاب: سعادت حسن منٹو (تحقیق) شامل ہیں۔ منٹو کا ٹائپ رائٹر۔ میں مضمون نگار نے گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کی طرف سے منٹو کی پچاسویں برسی کی مناسبت سے شائع کردہ کتاب، سعادت حسن منٹو (پچاس برس بعد) کے سرورق پر کندہ اس اعلان کی دلائل کے ساتھ مخالفت کی جس میں منٹو کے ٹائپ رائٹر کی فروخت اور خریداری کے بعد ن م راشد کی وصیت کے مطابق ساقی فاروقی نے اسے اصل حقداروں یعنی جی سی یو کے سپرد کرنے کا اعلان کیا تھا۔ مضمون نگار نے ثابت کیا کہ منٹو نے نذر محمد راشد کے پاس اپنا ٹائپ رائٹر ہرگز فروخت نہ کیا تھا۔[۲۵۸]

طاہر عباس ہی کے دوسرے مضمون ''سعادت حسن مر گیا، منٹو زندہ ہے کا بنیادی ماخذ'' میں احمد سلیم کی مرتّبہ کتاب میں شامل مواد کو، افکار'' منٹو نمبر کے آخری حصے کا چربہ قرار دیتے ہوئے منٹوانہ سرقہ نگاری کی بدترین مثال قرار دیا گیا ہے۔[۲۵۹]

منٹو ماہ سال کے آئینے میں'' ڈاکٹر علی ثناء بخاری کی تحقیق پر ہاتھ صاف کرنے والے مضمون نگار شمشیر حیدر شجر کی تحقیقی بد دیانتی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جس میں اُنھوں نے سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن کے متعلق اشاریہ ڈاکٹر علی ثناء بخاری کے پی ایچ ڈی کے مقالے سے اٹھا کر بغیر حوالہ دیے اپنے نام کے ساتھ شائع کر دیا۔ ان کا یہ مضمون جی سی یو سے شائع ہونے والی کتاب ''سعادت حسن منٹو (پچاس برس بعد)'' میں شامل ہے۔[۲۶۰]

جیسا کہ شروع میں کہا گیا کہ زیر تبصرہ کتاب ڈاکٹر عامر سہیل کی ادارت میں چھپنے والے ماہانہ ادبی کتابی سلسلہ ''انگارے'' میں جنوری ۲۰۰۸ء تک شائع ہونے والے ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں منٹو کے فکر و فن کو موضوع خاص بنایا گیا تھا۔ علاوہ ازیں ''انگارے'' ہی کے دو خصوصی شمارے جو منٹو کے متعلق تھے، میں شامل مضامین بھی مذکورہ بالا کتاب میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ یہ مضامین تنقیدی، تخلیقی اور تحقیقی حوالے سے منٹو کی تخلیقی کائنات کو نئے تناظر اور نئی نسل کے نقطۂ نظر سے دریافت کرنے کا ذریعہ ہیں۔ دو چار مضامین کے علاوہ تمام مضامین انگارے کے بعد زیر تبصرہ کتاب میں ہی شائع ہوئے ہیں جس کی وجہ سے اس روایتی تاثر سے ہٹ کر ہیں جو عموماً منٹو کے باب میں مرتّب کی جانے والی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔

''منٹو کا انکار''، دانش علی:

''منٹو کا انکار'' بک ایچ پبلی کیشنز، لاہور نے ۲۰۱۶ء میں شائع کی۔ طاہر اصغر اس بار اپنی بجائے اپنے کسی عزیز کو منٹو شناسوں کی فہرست میں داخل کرنے پر تل گئے ہیں۔ یہ کتاب منٹو کے متعلق شائع کیے گئے اُسی چھ کتابوں کے سیٹ میں شامل ہے۔ جو طاہر اصغر نے مرتّب کیے تھے۔ اور طریقہ اشاعت یا طریقہ واردات بھی وہی پرانا ہے۔ جیسا کہ وہ ہمیشہ اپنی کتابوں کی ترتیب کے وقت اختیار کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ فاضل مرتّب نے منٹو صدی کے موقع پر منٹو کی شخصیت اور فن پر الگ الگ کتابیں مکتبہ جدید کے پلیٹ فارم سے شائع کیں۔ ان کتابوں میں تدوین و تحقیق و ترتیب کے اصولوں کی جو دھجیاں اڑائی گئیں ان سے قطع نظر جو سب سے مہلک کام کیا گیا وہ یہ تھا کہ مذکورہ بالا دونوں کتابوں میں شامل مضامین کو عنوانات کی تبدیلی کے بعد نئی کتاب کا رنگ دے دیا گیا۔ منٹو کی پہچان، سب سے بڑا افسانہ نگار اور منٹو کا انکار میں شامل تمام مضامین ''یہ ہے منٹو شخصیت'' اور یہ ہے منٹو فن'' میں بالترتیب اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ یہ بات کوئی بہت پرانی بات بھی نہیں صرف چار سال پہلے ہی کی ہے۔ یوں دو کتابوں کو پانچ کتابوں میں تبدیل کر کے اپنے تئیں مرتّب منٹو شناسوں کے سرخیل بن گئے۔

''منٹو کا انکار'' کے مرتّب کے طور پر اگرچہ کسی دانش علی کا نام لکھ دیا گیا ہے لیکن اس کی ترتیب کے پیچھے طاہر اصغر ہی کا ہاتھ ہے۔ کیوں کہ اس کتاب کے مرتّب نہ سہی ناشر تو بہر حال وہی ہیں۔ پھر کتاب میں شامل تمام پچیس مضامین بدنام منٹو' منٹو کا فن، وقار عظیم، منٹو، ابواللیث صدیقی' سعادت حسن منٹو، منٹو کا مقام، حسن عسکری، منٹو کی حقیقت نگاری، عبارت بریلوی، منٹو اور تحریک آزادی، جیلانی کامران، سعادت حسن منٹو اور فرانسیسی ادب، برج پریمی، منٹو عظیم افسانہ نگار یا فحش، نصرت نثار رانا، منٹو اور ادب جدید، مسز راحیلہ تنویر، منٹو کے افسانوں میں عورت، وزیر آغا، منٹو۔ ہیولا برق خرمن کا، مظفر علی سید، منٹو اور اس کا فن، عابد حسن

منٹو، نفی سے اثبات کی طرف مراجعت، سلیم اختر، منٹو! ممتاز شیریں کی نظر میں، سعادت سعید' منٹو اور اس کا فن، ممتاز مفتی، بابو گوپی ناتھ، وارث علوی، منٹو اور اس کے عہد کا افسانہ، اصغر ندیم سید اور منٹو کے تراجم از محمد علی صدیقی' بالکل اسی ترتیب سے طاہر اصغر کی کتاب، ''یہ ہے منٹو فن'' کے صفحات ۱۴۹ تا ۲۴۲ پر موجود ہیں۔ ''یہ ہے منٹو فن'' کی فہرست میں موجود مضمون نمبر گیارہ بدنام منٹو از وقار عظیم تا مضمون نمبر پینتیس بعنوان منٹو کے تراجم از محمد علی صدیقی' تمام کے تمام مضامین جوں کے توں شائع کر کے ایک نئی کتاب اپنے نام اور نئے مرتّب کے ساتھ منٹو صدی میں داخل کرا دی گئی ہے۔ مرتّبین کا یہ غیر سنجیدہ رویہ منٹو شناسی کے باب میں ایک دھوکے کے سوا اور کیا کہلائے گا۔

''سب سے بڑا افسانہ نگار''، طاہر اصغر:

منٹو کے نام کو بیچ بیچ کے کھانے اور مال بنانے کا سلسلہ ان کی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ منٹو کی وفات پر پبلشرز کا کاروبار اور زیادہ چمکا۔ پھر تو جس کو بھی موقع ملتا وہ کتاب کے ساتھ منٹو کے نام کا پھندنا لگا کر اپنے کاروبار کو مستحکم کرتا چلا گیا۔ کمال افسوس کہ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ زیر تبصرہ کتاب سعادت حسن منٹو کی شخصیت پر لکھے گئے مختلف ادیبوں کے مضامین پر مشتمل ہے۔ یہ مضامین زیادہ تر منٹو کی وفات کے فوراً بعد لکھے گئے۔ منٹو کی وفات کے بعد شائع ہونے والے تمام ایسے رسائل جنھوں نے منٹو کے حوالے سے خصوصی شمارے شائع کیے، میں موجود ہیں۔ منٹو کی شخصیت اور فن پر ایک ساتھ چھے کتابوں کا یہ انتہائی مہنگا سیٹ بک ایج پبلی کیشنز، لاہور نے ۲۰۱۶ء میں شائع کیا۔ یہ منٹو پر اب تک کی تازہ ترین کتابیں ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب ''سب سے بڑا افسانہ نگار'' کو کھول کے دیکھا تو احساس ہوا کہ یہ کتاب پہلے بھی راقم کے زیر مطالعہ رہ چکی ہے۔ معمولی کوشش کے بعد جب نظر طاہر اصغر ہی کی چار سال پہلے منٹو کی سالگرہ پہ شائع ہونے والی کتاب ''یہ ہے منٹو شخصیت'' پر پڑی تو میری مشکل آسان ہو گئی۔ جب دونوں کتابوں میں شامل مضامین کی فہرست کا تقابل کیا تو عقدہ کھلا کہ فاضل مرتّب نے اپنی پرانی کتاب میں شامل پہلے انیتس مضامین کو جو ظاہر ہے ان کے پاس پہلے ہی کمپوز شدہ صورت میں موجود ہوں گے۔ نئے نام سے شائع کر کے اسی پرانے اور روایتی ہتھکنڈے کو استعمال کیا جو منٹو کے باب میں عموماً روا رکھا گیا۔ کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، ابو سعید قریشی، خالد حسن، ابراہیم جلیس، صہبا لکھنوی، قرۃ العین حیدر، امرتا پریتم، ڈاکٹر انوار احمد، ثریا قمر، حاجرہ مسرور، اوپندر ناتھ اشک، ممتاز حسین، اے حمید، دیوندر ستیار تھی، فارغ بخاری، عزیز احمد، محمد طفیل، آغا بابر، شورش کاشمیری، حمید اختر، احمد راہی، باری علیگ، مجید امجد کی نظم ''منٹو'' اور مرزا ادیب سمیت تمام مضامین ان کی کتاب ''یہ ہے منٹو شخصیت کے بھی ابتدائی انیتس مضامین ہی ہیں، فاضل مرتّب شامل مضامین کی ترتیب ہی بدل لیتے۔

''منٹو کی پہچان''، طاہر اصغر:

طاہر اصغر کی یہ کتاب بھی بک ایج پبلی کیشنز، لاہور نے چھے کتابوں کے سیٹ کی صورت میں شائع کی۔ حسب سابق' کتاب میں شامل اڑتالیس چھوٹے بڑے مضامین ہو بہو اُسی طرح اپنی کتاب ''یہ ہے منٹو شخصیت'' سے لے کر ایک مرتّبہ پھر نئے نام یعنی ''منٹو کی پہچان'' کے عنوان سے شائع کر کے ادبی حلقے کو دھوکہ دینے کی کوشش کی۔ ''یہ ہے منٹو شخصیت'' مجموعی طور پر چوراسی مضامین کا مجموعہ انتخاب ہے۔ ان میں سے پہلے انیتس مضامین کو ''سب سے بڑا افسانہ نگار'' کا چغہ پہنایا گیا جب کہ کتاب میں شامل دیگر

چون میں سے اڑتالیس مضامین کو ''منٹو کی پہچان'' کا ذریعہ بنایا گیا۔ اس طرح ایک کتاب بیک وقت تین مرتّبہ تین مختلف ناموں سے اشاعت پذیر ہو کر کھلے عام مارکیٹ میں فروخت ہو رہی ہے۔ اس کتاب میں درج ذیل، ادیبوں و صحافیوں کی تحریریں شامل ہیں۔ سید عالم محمود، مجید لاہوری، قمر یورش، شاہد دہلوی، غلام عباس، حنیف رامے، ارون استھانہ، عارف وقار، سعیدہ تصدق ہاشمی، حامد جلال، غلام رسول، ضیاء الحسن موسوی، سید امجد الطاف، انور سدید، منیر احمد شیخ، یوسف ظفر، بلقیس عابد علی، محمد نذیر، احمد سعید، شہزاد سید، انتظار حسین، سلیم چوہدری، انور عنایت اللہ، سید اکمل علیمی، مظفر حسین شمیم، باقر علی شاہ، رئیس امروہوی، حاجی لق لق، احمد شجاع پاشا، شاہد پردیسی، اور شہزاد منظر۔ یہ تمام مضامین ''یہ ہے منٹو شخصیت'' کی فہرست مضامین کے لحاظ سے ۲۹ویں مضمون سے شروع ہو کر آخری یعنی چوراسیویں مضمون تک صفحہ نمبر ۲۲۵ تا ۴۷۹ پر موجود ہیں۔ [۲۶۱]

''نامور منٹو''، طاہر اصغر:

طاہر اصغر کی مرتّب کردہ چھوٹے بڑے تبصروں، تاثرات، انٹرویوز مضامین اور خطوط پر مشتمل یہ کتاب ۲۵۷ صفحات پر محیط ہے۔ پیش لفظ کے بعد کتاب میں شامل تین مضامین ''منٹو میرے مطابق، انیسویں صدی کے ادبی رجحانات اور افسانوں کا از سر نو جائزہ، نیرلی فلیمنگ کی کتاب ''The Life and works of saddat Hassan Manto'' کا ترجمہ ہیں۔ جو حال ہی میں مکتبہ جدید نے بغیر سن اشاعت کے شائع کی۔ اس کے مترجم سلیم شہاب ہیں۔ مرتّب نے بغیر ماخذ کی نشاندہی کیے ساری کی ساری کتاب جوں کی توں شامل کر کے مترجم کا نام دینا بھی گوارا نہ کیا۔ حال آں کہ لیزلی فلیمنگ کے مضامین کا یہ ترجمہ کتاب کے ۳۷ صفحات پر محیط ہے۔ [۲۶۲] کتاب میں شامل منٹو کی خواہران نسبتی اور منٹو کی بیٹیوں کے انٹرویو کے علاوہ محمد فاروق سلہریا کا مضمون ''منٹو ترقی پسند ! یہ کیا بے ہودگی ہے'' اس سے پہلے مزدور جدوجہد کے منٹو نمبر میں شامل ہیں۔ اس طرح منٹو کے افسانے از حسن عسکری، منٹو کی فنی تکمیل، منٹو کا تغیر اور ارتقاء' منٹو ایک فنکار اور منٹو کا ارتقا نہ صرف یہ کہ ممتاز شیریں کی منٹو پر لکھی گئی کتاب ''نوری نہ ناری'' میں شامل ہیں بلکہ فاضل مرتّب کی اس سے پہلے شائع ہونے والی کتاب ''یہ ہے منٹو فن'' میں بھی شامل ہیں۔ ان کی اسی کتاب میں اجمل کمال کا مضمون ''منٹو سنسر شپ کا نشانہ'' ابو سعید قریشی کا مضمون ''سعادت حسن منٹو کے عہد کا معاشرہ'' ظ انصاری کا مضمون ''سیاہ حاشیے'' علی سردار جعفری کا ''بد زبان'' اور محمد حسن عسکری کا مضمون 'منٹو اور اردو ادب' اگرچہ پرانے ہیں۔ لیکن مرتّب کی کتاب ''یہ ہے منٹو فن'' کے صفحہ نمبر ۱۶ تا ۴۸ پر بھی موجود ہیں۔ جب کہ ''منٹو کے ادیبوں کے نام خطوط'' نامی مضمون میں بغیر کسی ماخذ کی نشانہ ہی کیے اختر شیرانی کے نام ایک، حسن عباس کے نام تین، جب کہ مولانا حامد علی خان کے نام منٹو کے لکھے گئے خطوط کی تعداد تیرہ ہے۔

یہ خطوط پرویز انجم کی مرتّبہ کتاب ''منٹو نامے'' سے لیے گئے ہیں اور ہمیشہ کی طرح ماخذ کی نشاندہی نہیں کی گئی۔ البتہ ظفر سید، محمد حنیف اور عارف وقار کے علاوہ انور سن رائے، وسعت اللہ خان، طاہر اصغر اور زرک میر کے تبصرے، تاثرات اور مختصر مضامین جو صفحہ ۸۱ تا ۱۲۰ پر محیط ہیں نسبتاً نئی چیزیں ہیں۔ اگرچہ کہ ان میں سے کسی بھی مضمون، تبصرے، تاثر، انٹرویو یا خط کے ضمن میں ماخذات کی نشاندہی نہیں کی گئی لیکن پھر بھی کتاب کو مرتّب کرنے کا انداز وہی پرانا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اپنی ہی مرتّب کردہ

کتاب سے تمام مضامین لینے کے بجائے اس بار مرتّب نے صرف دس مضامین پر اکتفا کیا۔ باقی مواد لیزلی فلیمنگ اور پرویز انجم کی کتابوں سے مستعار لیا ہے۔

''دستاویز''، بلراج منیرا:

زیرِ تبصرہ کتاب سعادت حسن منٹو کے افسانوں پر چلنے والے مقدمات کی وہ روداد ہے جو منٹو نے مختلف اوقات میں، مختلف مضامین کی صورت میں خود ہی رقم کی۔ سعادت حسن منٹو پر چلنے والے مقدمات کو یکجا کر کے کتابی صورت میں سب سے پہلے بلراج منیرا نے ۱۹۸۲ء میں شعور پبلی کیشنز دہلی کے توسط سے شائع کیا۔ پاکستان میں یہی کتاب نواز چوہدری نامی غیر معروف مرتّب نے مکتبہ شعر و ادب، لاہور سے بغیر سال اشاعت ظاہر کیے شائع کی [۲۶۳] ترتیب کے لحاظ سے کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلا حصہ ''مملکت فرنگ'' سعادت حسن منٹو کے تین افسانوں، کالی شلوار، دھواں اور ''بو'' کے علاوہ مضمون ادب جدید کے ضمن میں چلنے والے مقدمات کی روداد پر مبنی ہے۔ مرتّب نے اس حصہ میں سب سے پہلے ان چاروں تحریروں کا متن شائع کیا۔ بعد میں منٹو کے درج ذیل مضامین، سفید جھوٹ، افسانہ نگار اور جنسی مسائل، کسوٹی اور عصمت فروشی کے انتخاب سے ان مقدمات کی روداد منٹو ہی کی زبانی پیش کر دی ہے۔

دوسرے حصے ''مملکت خداداد'' میں پاکستان میں معتوب قرار دیے جانے والے افسانے ''کھول دو''، ٹھنڈا گوشت، اور ''اوپر نیچے اور درمیان'' پر چلنے والے مقدمات اور ڈھائے جانے والے عتاب کی روداد جمع کی گئی ہے۔ اس حصے کی ترتیب کچھ یوں ہے۔ سب سے پہلے منٹو کے افسانوں ٹھنڈا گوشت اور کھول دو کا متن شامل ہے۔ جس کے بعد ان مقدمات کے ضمن میں لکھا گیا ان کا شہرہ آفاق مضمون ''زحمت مہر درخشاں'' شامل کتاب ہے۔ اس مضمون میں منٹو نے گواہوں کے بیانات کے علاوہ اپنا تحریری بیان بھی جو اُنھوں نے عدالت میں جمع کرایا تھا، جوں کا توں شامل کر دیا ہے۔ ساتھ ہی ماتحت اور اعلیٰ عدلیہ کے معزز جج صاحبان کے سنائے گئے متضاد فیصلوں کی نقول کا ترجمہ بھی اس مضمون کا حصہ ہے۔ منٹو کا یہ مضمون اُن کے افسانہ ٹھنڈا گوشت پر چلنے والے مقدمہ کی روداد خاص ہے۔ منٹو پر آخری مقدمہ اُن کے افسانے ''اوپر نیچے اور درمیان'' کے متعلق قائم کیا گیا۔ مذکورہ افسانے کے متن کے علاوہ اس افسانے کے متعلق تین مضامین: (۱) پانچواں مقدمہ (۲) پانچواں مقدمہ (۳) اور پانچواں مقدمہ کے عنوان سے شامل ہیں۔ پہلے دونوں مضامین منٹو کے تحریر کردہ ہیں جب کہ تیسرا مضمون ''اوپر نیچے اور درمیان'' کا فیصلہ سنانے والے جج مہدی علی صدیقی کا لکھا ہوا ہے۔ جو اُنھوں نے ''منٹو اور میں'' کے عنوان سے منٹو کی وفات کے چند ماہ بعد لکھا تھا۔ بعد میں یہ مضمون اُن کی کتاب ''بلا کم و کاست'' کا بھی حصہ بنا۔ [۲۶۴]

سعادت حسن منٹو کے افسانوں پر چلنے والے ان مقدمات کی روداد پر مشتمل کم و بیش تمام تحریریں خود سعادت حسن منٹو کی لکھی ہوئی یا پیش کی ہوئی ہیں۔ مرتّبین نے اُنھیں یکجا کر کے واقعی تاریخی دستاویز بنا کر محفوظ کر لیا ہے۔ لیکن مرتّب یا پبلی شرز نے اس کتاب کے متعلق ایک جملہ بھی کہیں نہیں لکھا۔ بلراج منیرا کی مرتّب کردہ یہ کتاب راقم کو دستیاب نہ ہو سکی۔ صرف نواز چوہدری کے نام سے شائع شدہ ایڈیشن ہی کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ ہمیں اندازہ نہیں کہ بلراج منیرا کی شائع شدہ کتاب کی کیا صورت اور ترتیب ہے۔ اُنھوں نے اس ضمن میں کوئی مقدمہ نما تحریر لکھی بھی تھی یا نہیں۔ دونوں کے تقابل کے بعد ہی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں کسی غیر

معرف مرتّب کے نام سے شائع ہونے والی اس کتاب میں کہیں ہندوستان کے بلراج منیرا کی کاوش پر تو ہاتھ صاف نہیں کیا گیا؟ بظاہر یہی لگتا ہے۔ مجموعی طور پر کتاب ۱۹۲ صفحات پر محیط ہے۔

''منٹو کے سیاسی افسانے''، تنویر عباس نقوی:

تنویر عباس نقوی کی مرتّبہ کتاب ''منٹو کے سیاسی افسانے'' دعا پبلی کیشنز، لاہور سے بغیر سال اشاعت کے شائع ہوئی۔ منٹو کے سیاسی موضوعات کی حامل چودہ کہانیوں کے انتخاب کی فہرست کچھ یوں ہے۔ آخری سیلوٹ، جھوٹی کہانی، ٹیٹوال کا کتا، ۱۹۱۹ء کی ایک بات، انقلاب پسند، تماشا، ہتک، نیا قانون، موذیل، شہید ساز، دیکھ کبیرا رویااور سوراج کے لیے۔ موضوع کے لحاظ سے ہتک، کا اس انتخاب میں شامل ہونا تعجب خیز ہے۔ کہانیوں کے اس انتخاب سے پہلے پروفیسر سجاد حارث کا مضمون ''منٹو کے سیاسی افسانے'' جب کہ مرتّب کا مضمون ''منٹو۔ سیاسی مورخ'' شامل ہیں۔ منٹو کی سیاسی بصیرت اور اس سے خائف برطانوی حکومت کے تحفظات پر سجاد حارث کا مضمون کافی بصیرت افروز ہے۔ اُنھوں نے منٹو کے ترقی پسند نظریات کا احاطہ کرتے ہوئے لکھا کہ یہ بات محض اس وجہ سے اتنی سادہ نہیں ہے کہ منٹو اور عصمت سمیت ''انگارے'' میں شامل افسانوں کو فحاشی کے الزامات کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ معاشرے کا ایک خاص طبقہ اُنھیں جنسی اشتعال کا باعث سمجھتا تھا۔ پروفیسر سجاد حارث کے مطابق ترقی پسند تحریک میں شامل کسی بھی ادیب یا بانیان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان افسانوں کو حکومت برطانیہ دفعہ ۲۹۵ الف تعزیرات ہند کے تحت ضبط کرے گی۔ اگرچہ حکومت نے یہ کہہ کر ''انگارے'' کو ضبط کیا تھا کہ یہ کتاب ایک خاص فرقے کے مذہبی عقائد و جذبات کو مجروح کرتی ہے۔ ''اُنھوں نے اس توجیہ کو ماننے سے انکار کرتے ہوئے لکھا کہ جو حکومت خود مذہب کے نام پر عوام میں نفرت پھیلانے کی خواہاں رہی ہو اور فرقہ واریت کو فروغ دیتی رہی ہو، وہ یہ اقدام کیوں کر اٹھائے گی۔ مصنف کے بقول حکومت کا یہ محض ظاہری جواز تھا جس کی آڑ میں اُنھوں نے ایسے ادیبوں کو اپنی گرفت میں لانے کی کوشش کی جن کے بارے میں اُنھیں غلط خفیہ اطلاعات تھیں یا پھر جن کی تحریریں ان کے نظام حکومت کے استحکام میں دراڑیں ڈال سکتی تھیں۔ و گرنہ اس دور میں جب حسن عسکری، ممتاز مفتی، ایم ایم اسلم اور عزیز احمد کے علاوہ بھی بہت سے شاعر اور ادیب اس گرفت میں بآسانی آسکتے تھے عتاب کا شکار صرف سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کو ہی کیوں بنایا گیا۔ بقول مضمون نگار:

> ''انگارے کے افسانوں پر جنس نگاری اور فحش نگاری کے الزامات حکومت کے نزدیک اتنے اہم نہیں تھے، جتنا کہ اس کتاب کے نوجوان افسانہ نگاروں کا باغیانہ لب و لہجہ، طرز فکر اور طرز احساس، ''خطرناک امکانات'' کے سامان لیے ہوئے تھا۔'' [۲۶۵]

یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کے آغاز سے ہی کلکتہ کے ایک نیم سرکاری 'انگریز سرمایہ داری کے طفیل چلنے والے اخبار ''اسٹیٹس مین'' نے عناد اور مغلظات کی دھول اڑانا شروع کر دی تھی۔ برطانوی حکومت کے اس ترجمان اخبار میں نئے ادب پر جو الزامات لگائے جا رہے تھے 'دراصل وہی تھے جو بعد میں منٹو اور عصمت پر لگائے گئے۔ ان الزامات کے ذریعے حکومت ملک کے قدامت پسند اور روایتی حلقوں کو متوجہ کر کے خود ان کی تشہیر کرنا چاہتی تھی تا کہ ترقی پسند ادب اور نظریات کے حامل ادیبوں کے خلاف کارروائی کا جواز پیدا کیا جا سکے۔ چناں چہ یہی ہوا کہ:

"فرد جرم بظاہر جنس نگاری، فحاشی اور فرائیڈ زدگی پر لگتی تھی لیکن اصل سزا روشن خیالی، حب الوطنی اور انسان دوستی کو دی جاتی تھی۔" [۲۶۶]

مضمون نگار کے مطابق حسن عسکری، ممتاز مفتی اور دیگر جنس نگار ادیبوں بشمول عزیز احمد نے صرف حرامجادی، پھسلن، چائے کی پیالی، اندھا، آپا، اور یہ دیوی جیسی ہی کہانیاں لکھیں۔ لیکن منٹو نے دھواں، کالی شلوار اور بلاؤز کے پہلو بہ پہلو، آتش پارے، دیوانہ شاعر، تماشا، ماتمی جلسہ، نیا قانون، نعرہ، سٹوڈنٹ یونین کیمپ، موم بتی کے آنسو اور سوراج کے لیے، جیسے استعمار دشمن اور استحصال مخالف افسانے بھی لکھے۔ حال آں کہ منٹو کے دیگر معاصر افسانہ نگار اپنے کرداروں پر پڑنے والے غلام اور استحصالی معاشرے کے اثرات سے لاعلم رہے۔ پروفیسر سجاد حارث نے منٹو کے افسانے 'بو' اور مضمون ادب جدید، کو جو ادب لطیف کے سالنامہ ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئے تھے' حکومت نواز اخبارات کی طرف سے حکومت کی مساعی ور باب جنگ میں روڑے اٹکانے کے الزام پر تعجب کا اظہار کیا بقول مضمون نگار:

"اس افسانے (بو) اور مضمون (ادب جدید) پر فحاشی کے علاوہ سیاسی الزامات بھی عائد کیے گئے تھے۔ منٹو حکومت کی نظروں میں ایک خطرناک اور سیاسی بغاوت کا مبلغ ادیب قرار پا چکا تھا۔" [۲۶۷]

اُنھوں نے باری علیگ کی صحبت اور تربیت کو خاصی اہمیت دیتے ہوئے لکھا کہ برطانوی خفیہ ادارے، منٹو اور باری علیگ کے تعلقات کی نوعیت سے بخوبی واقف تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب منٹو میں بھگت سنگھ بننے کی تمام صلاحیتیں بھرپور انداز میں موجود تھیں۔ اس زمانے میں منٹو مکمل اشتراکی نظریات رکھتے تھے۔ منٹو کی ابتدائی سیاسی اور ادبی زندگی کا حوالہ دیتے ہوئے مضمون نگار نے کہا کہ امرت سر کی ان ادبی سیاسی اور اشتراکی سرگرمیوں اور نظریات پر مبنی آسکر وائلڈ کے ڈراما ویرا کا ترجمہ 'روسی و فرانسیسی ادب نمبروں کی اشاعت، ترقی پسند تحریک سے وابستگی اور سیاسی نوعیت کے افسانوں کا یقیناً برطانوی خفیہ ادارے مکمل ریکارڈ رکھتے تھے۔ اور ان خفیہ معلومات ہی کی روشنی میں حکومت منٹو کو مشتبہ سمجھتی تھی' چناں چہ منٹو کی پیشانی پر فحش اور جنس نگار کی تختی لگانا برطانوی استعمار کی منصوبہ بندی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

منٹو کے افسانوں میں موجود ترقی پسند فکر کے علاوہ طنزیہ اور استہزائیہ انداز میں لکھے گئے چچا سام کے نام خطوط میں بھی منٹو امریکہ اور روس حتّٰی کہ کمیونزم کے بارے میں بھی اپنے دلی جذبات و احساسات اور خیالات کو چھپا نہ سکا۔ ان خطوط میں امریکی پالیسیوں پر کیا گیا طنز اپنے دور کے سیاسی حالات و نظریات کے تناظر میں سمجھنا بالکل آسان ہے۔ بقول مضمون نگار:

"۔۔۔ اس کے مضامین اور افسانے، ان کے موضوعات اور مرکزی نکات، اس کی فکری جہات اور نظریاتی رویوں کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔ اس کی فکر کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ وہ ہر نوع کے سیاسی، معاشی، معاشرتی، صنعتی استحصال کے خلاف ہے۔" [۲۶۸]

سجاد حارث کے اس عمدہ مضمون کے بعد کتاب کے مرتّب تنویر عباس نقوی کا مضمون ''منٹو۔ سیاسی مؤرخ'' کی ابتدا فن تاریخ نویسی کے اصول و تعریف سے ہوتی ہوئی منٹو کے مؤرخانہ کردار تک جا پہنچتی ہے۔ ان کے مطابق منٹو نے اسلوب اور دیگر ادبی محاسن کو اپنے افسانوں میں مد نظر رکھتے ہوئے خود میں موجود برائیوں کو سماج کی برائیاں قرار دیا۔ ان کی کہانیوں میں ان کے عہد کی

زندگی جیتی جاگتی محسوس ہوتی ہے اور یہی ایک مورخ کی کامیابی ہوتی ہے جو منٹو کے علاوہ اس کے کسی دوسرے معاصر افسانہ نگار کے حصے میں نہیں آئی۔

کتاب میں شامل ''ایک اور بات'' دراصل شکریہ نامہ ہے ان احباب کا جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت میں مرتّب کے ساتھ تعاون کیا۔ یہ کتاب مجموعی طور پر ۲۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

حوالہ جات

۱۔ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، کتب پبلی شرز، لمیٹڈ، بمبئی ۱۹۴۸ء، ص ۲۵۔

۲۔ ________ ایضاً ________ ص ۱۵۔

۳۔ مقالہ نگار کے پیش نظر مکتبہ میری لائبریری کا شائع کردہ ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۸۸ء ہے۔

۴۔ منٹو کا یہ مضمون اُن کے مجموعہ ''جیب کفن'' میں شامل ہے۔

۵۔ ابو سعید قریشی: ''منٹو''، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۲۔

۶۔ ________ ایضاً ________ ص ۴۶۔

۷۔ ________ ایضاً ________ ص ۷۸۔

۸۔ ________ ایضاً ________ ص ۱۷۸۔

۹۔ انیس ناگی: ''سعادت حسن منٹو''، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص۔ ۱۷

۱۰۔ محمد اسد اللہ: ''منٹو میرا دوست''، منٹو میموریل سوسائٹی، کراچی، ۱۹۵۶ء، ص ۲۱۔

۱۱۔ محمد اسد اللہ: ''منٹو میرا دوست''، ص ۳۵۔

۱۲۔ ________ ایضاً ________ ص ۴۴۔

۱۳۔ ________ ایضاً ________ ص ۲۷۔

۱۴۔ ________ ایضاً ________ ص ۸۳۔

۱۵۔ ________ ایضاً ________ ص ۸۴۔

۱۶۔ انیس ناگی: ''سعادت حسن منٹو''، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۱۷۔

۱۷۔ محمد نوید: ''منٹو شناسی کی روایت کا تنقیدی تحقیقی جائزہ''، ص ۴۰۔

۱۸۔ انیس ناگی: ''سعادت حسن منٹو''، ص ۱۶۔

۱۹۔ اوپندر ناتھ اشک، منٹو میرا دشمن، ص ۱۱، جمشید کتاب گھر، حیدر آباد، (س۔ن)۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۱۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۷۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۹۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۲۶۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۹۹۔

۲۵۔ محمد محسن، پروفیسر سعادت حسن منٹو، اپنی تخلیقات کی روشنی میں، ایک نفسیاتی تجزیہ، دار الاشاعت، ترقی، دہلی، ۱۹۸۲ء، ص، ۵۷۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۵۸۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۸۷۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۱۴۔

۲۹۔ وقار عظیم، سید، منٹو کا فن، اعجاز پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۔

۳۰۔ ______ ایضاً ______ ص ۶۷۔

۳۱۔ ممتاز شیریں، ''منٹو نوری نہ ناری'' مکتبہ اسلوب کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۴۳۔

۳۲۔ ______ ایضاً ______ ص ۴۵۔

۳۳۔ ______ ایضاً ______ ص ۶۰۔

۳۴۔ ______ ایضاً ______ ص ۱۲۳۔

۳۵۔ ______ ایضاً ______ ص ۱۴۰۔

۳۶۔ ______ ایضاً ______ ص ۱۵۸۔

۳۷۔ قاضی جاوید: ''منٹو اور ممتاز شیریں''، سعادت حسن منٹو--ایک مطالعہ، (مرتّبہ: انیس ناگی) مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۲۲۹۔

۳۸۔ انیس ناگی: ''منٹو کی انسان دوستی''، مشمولہ ''سعادت حسن منٹو''، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۱۰۴۔

۳۹۔ اصغر ندیم سیّد: ''منٹو صاحب اور ان کی کہانی''، مشمولہ ''سعادت حسن منٹو پچاس برس بعد'' ۲۰۰۵ء، ص ۱۱۰۔

۴۰۔ برج پریمی ڈاکٹر، سعادت حسن منٹو، حیات اور کارنامے، مرز ا پبلیکیشنز، سری نگر، ۱۹۸۶ء، ص ۱۸۵۔

۴۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ہمارے لیے منٹو صاحب، شہر زاد، کراچی، ۲۰۱۳ء ص ۵۱۔

۴۲۔ برج پریمی، ڈاکٹر، سعادت حسن منٹو، حیات اور کارنامے، ص ۲۶۳۔

۴۳۔ ______ ایضاً ______ ص ۲۹۴۔

۴۴۔ ______ ایضاً ______ ص ۳۴۷۔

۴۵۔ جگدیش چندر ودھاون، منٹو نامہ، مکتبہ شعر و ادب، لاہور ۱۹۸۹ء، ص ۱۱۔

۴۶۔ ______ ایضاً ______ ۳۰۴۔

۴۷۔ دیکھئے پرویز انجم، مرتّب، منٹو نامے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء۔

۴۸۔ انیس ناگی، ''سعادت حسن منٹو''، فیروز سنز، لاہور۔ ۱۹۸۹ء، ص ۱۷۔

۴۹۔ ______ ایضاً ______ ص ۳۱۔

۵۰۔ انیس ناگی: ''منٹو، فسادات اور ہجرت''، مشمولہ ''سعادت حسن منٹو''، ص ۶۳۔

۵۱۔ حمید کاشمیری، منٹو ادبی عدالت میں، مقبول اکیڈمی، لاہور ا، ۱۹۹۴ء، ص ۷۔

۵۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے، حمید کاشمیری، منٹو ادبی عدالت میں، ص ۳۱، ۳۷، ۳۸، ۵۰، ۵۳، ۵۴۔

۵۳۔ وارث علوی، منٹو ایک مطالعہ، وجے پبلی شرز، دہلی، ۱۹۹۷ء، ص ۲۰۔

۵۴۔ ______ ایضاً ______ ص ۳۷۔

۵۵۔ ______ ایضاً ______ ص ۳۷۔

۵۶۔ شکیل الرحمٰن، ڈاکٹر، ''منٹو شناسی، اردو مرکز، عظیم آباد، پٹنہ، ۱۹۹۷ء، ص ۱۴۔

۵۷۔ ______ ایضاً ______ ص ۲۲۔

۵۸۔ ـــــــ ایضاً ـــــــ ص ۴۹۔
۵۹۔ ـــــــ ایضاً ـــــــ ص ۶۴۔
۶۰۔ ـــــــ ایضاً ـــــــ ص ۸۱۔
۶۱۔ ـــــــ ایضاً ـــــــ ص ۱۱۰۔
۶۲۔ ـــــــ ایضاً ـــــــ ص ۱۵۳۔
۶۳۔ کہکشاں پروین، ڈاکٹر، منٹو اور بیدی تقابلی مطالعہ، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۲ء ص ۲۶، ۲۷۔
۶۴۔ ـــــــ ایضاً ـــــــ ص ۳۰۔
۶۵۔ ـــــــ ایضاً ـــــــ ص ۸۱۔
۶۶۔ ـــــــ ایضاً ـــــــ ص ۱۱۵۔
۶۷۔ ـــــــ ایضاً ـــــــ ص ۱۵۸۔
۶۸۔ نگار عظیم، منٹو کا سرمایہ فکر و فن، بزم ہم قلم، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۲۷۔
۶۹۔ ـــــــ ایضاً ـــــــ ص ۲۷۔
۷۰۔ ـــــــ ایضاً ـــــــ ص ۱۰۔
۷۱۔ ـــــــ ایضاً ـــــــ ص ۵۹۔
۷۲۔ ـــــــ ایضاً ـــــــ ص ۷۸۔
۷۳۔ ـــــــ ایضاً ـــــــ ص ۲۰۹۔
۷۴۔ اورنگزیب عالمگیر، ڈاکٹر، سعادت حسن منٹو، تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، سنگت پبلی شرز، لاہور ۲۰۰۵ء، ص ۱۔
۷۵۔ ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر کی کتاب میں موجود تحقیقی خامیوں کا جائزہ ایم خالد فیاض کے مضمون ''تحقیق پر تنقیدی روّیے کی سمت''، ص ۳۱--۳۴، انگارے، ملتان، نومبر ۲۰۰۵ء میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔
۷۶۔ فتح محمد ملک، پروفیسر: ''منٹو کی پاکستانیت''، ''سعادت حسن منٹو۔ایک نئی تعبیر''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۵۵۔
۷۷۔ فتح محمد ملک، پروفیسر: ''منٹو کی فکری صلابت اور نظریاتی استقامت''، مشمولہ، سعادت حسن منٹو۔ایک نئی تعبیر''، ص ۶۹۔
۷۸۔ فتح محمد ملک، پروفیسر: ''ٹوبہ ٹیک سنگھ ایک نئی تعبیر''، ''مشمولہ سعادت حسن منٹو۔ایک نئی تعبیر''، ص ۷۷۔
۷۹۔ ـــــــ ایضاً ـــــــ ص ۸۷۔
۸۰۔ اس سے قبل ڈاکٹر انوار احمد نے اپنے پی ایچ۔ڈی کے مقالہ میں منٹو کے پاکستانی تشخص پر بحث کی تھی لیکن اُنھوں نے فتح محمد ملک کی طرح نزاعی صورت اختیار نہیں کی۔ تفصیلات کے لیے دیکھئے: انوار احمد، ڈاکٹر، اُردو افسانہ تحقیق و تنقید، بیکن بکس ملتان، ۱۹۸۸ء، ص ۲۳۵، ۲۳۶۔
۸۱۔ مشرف عالم ذوقی: ''منٹو کو آپ نے 'پاکستانی' کیوں بنا دیا ہے، انتظار بھائی۔۔۔'' ''دنیا زاد''، کتابی سلسلہ ۱۳، مرتّبہ: آصف فرخی، اکتوبر ۲۰۰۴ء، ص ۲۲۵۔
۸۲۔ کھیم چند: ''منٹو پاکستان نہیں تو کیا ہندوستانی تھے؟'' ترجمہ: نبی احمد، دنیا زاد، کتابی سلسلہ ۱۳، ص ۲۳۳۔

۸۳۔ ایم خالد فیاض: ''ٹوبہ ٹیک سنگھ -- نئی تعبیر'' (ایک محاکمہ) ''انگارے''، منٹو سیمینار نمبر، ملتان، دسمبر ۲۰۰۵ء، ص ۳۲۔

۸۴۔ دیکھیے: ''دنیازاد'' کراچی، کتابی سلسلہ نمبر ۱۳، اکتوبر ۲۰۰۴ء، ص ۱۲۴۔

۸۵۔ انیس ناگی: ''پیش لفظ، سعادت حسن منٹو کے مقدمات''، جمالیات، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۵۔

۸۶۔ انیس ناگی: ''سعادت حسن منٹو کی بازیافت''، مشمولہ ''سعادت حسن منٹو کی کہانی'' جمالیات، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۵۔

۸۷۔ دیکھیے: مقالہ ہذا کے صفحات، ۸۶تا۸۸، ۱۷۶، ۱۷۷۔

۸۸۔ سعادت حسن منٹو (تحقیق) مصنف کے تحقیقی مقالہ کی کتابی شکل ہے۔ جس پر مفصل بحث مقالہ جات کے لیے مخصوص باب چہارم میں کی گئی ہے۔ تفصیل کے لیے مقالہ ہذا کے صفحات ۳۸۲تا۳۹۰ ملاحظہ کریں۔

۸۹۔ محمد حسن، پروفیسر، منٹو پر اطلاقی تنقید کا آغاز، مشمولہ ''فسانے منٹو کے اور پھر بیان اپنا'' مصنفہ، خالد اشرف ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی ۲۰۰۶ء، ص ۶۔

۹۰۔ ______ایضاً______ ص ۸۔

۹۱۔ ______ایضاً______ ص ۹۔

۹۲۔ سجاد شیخ، سیاہ حاشیے، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۰۔

۹۳۔ ______ایضاً______ ص ۲۲۔

۹۴۔ ______ایضاً______ ص ۴۹۔

۹۵۔ ______ایضاً______ ص ۹۶۔

۹۶۔ ______ایضاً______ ص ۸۰۔

۹۷۔ مبین مرزا، سعادت حسن منٹو: شخصیت و فن، اکادمی ادبیات، پاکستان، ۲۰۰۸ء، ص ۱۹۸۔

۹۸۔ روش ندیم، ڈاکٹر، دیباچہ، منٹو کی عورتیں، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء۔

۹۹۔ ______ایضاً______ ص ۱۱۱۔

۱۰۰۔ ______ایضاً______ ص ۲۰۹۔

۱۰۱۔ ______ایضاً______ ص ۲۸۶۔

۱۰۲۔ فاروق سلہریا، منٹو از عالم بالا، گڈ بکس، لاہور ۲۰۱۰ء، ص ۷۔

۱۰۳۔ صلاح الدین درویش، منٹو کا اسلوب اور طاہرہ اقبال، مشمولہ، منٹو کا اسلوب، از طاہرہ اقبال، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۷۔

۱۰۴۔ طاہرہ اقبال، منٹو کا اسلوب، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۸۶۔

۱۰۵۔ روبینہ یاسمین، منٹو کا سیاسی شعور، مثال پبلی کیشنز، فیصل آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۲۷۔

۱۰۶۔ ______ایضاً______ ص ۸۴۔

۱۰۷۔ ______ایضاً______ ص ۱۱۶۔

۱۰۸۔ ______ایضاً______ ص ۱۲۲۔

۱۰۹۔ ______ایضاً______ ص ۲۲۶۔

۱۱۰۔ عثمانی، شمس الحق، منٹو اور غالب، غالب اکیڈمی، دہلی، ۲۰۱۳ء، ص ۲۳۔
۱۱۱۔ منٹو، سعادت حسن، منٹو اپنے ہمزاد کی نظر میں، مشمولہ، کلیات منٹو، مدون، امجد طفیل، جلد ششم، نیر یٹو، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۴۵۲۔
۱۱۲۔ شمیم حنفی، منٹو: حقیقت سے افسانے تک، ص ۲۳، شہر زاد، کراچی، ۲۰۱۲۔
۱۱۳۔ ______ایضاً______ص ۳۲۔
۱۱۴۔ ______ایضاً______ص ۱۰۷۔
۱۱۵۔ ______ایضاً______ص ۲۴۵۔
۱۱۶۔ ______ایضاً______ص ۲۵۷۔
۱۱۷۔ ابوالحسن نغمی، سعادت حسن منٹو (ذاتی یادداشتوں پر مبنی اوراق)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۲ء، ص، ۴۵۔
۱۱۸۔ ______ایضاً______ص، ۴۵۔
۱۱۹۔ ______ایضاً______ص ۵۸۔
۱۲۰۔ ______ایضاً______ص ۹۰۔
۱۲۱۔ ______ایضاً______ص ۲۷۔
۱۲۲۔ فاروقی، شمس الرحمٰن، ہمارے لیے منٹو صاحب، شہزاد، کراچی، ۲۰۱۳، ص ۶۔
۱۲۳۔ ______ایضاً______، ص ۱۵۔
۱۲۴۔ ______ایضاً______، ص ۱۶۔
۱۲۵۔ ______ایضاً______، ص ۳۶۔
۱۲۶۔ ______ایضاً______، ص ۶۵۔
۱۲۷۔ ______ایضاً______، ص ۲۷۔
۱۲۸۔ ______ایضاً______، ص ۸۸۔
۱۲۹۔ ______ایضاً______، ص ۱۱۳۔
۱۳۰۔ محمد حمید شاہد "سعادت حسن منٹو" جادوئی حقیقت، نگاری اور آج کا اردو افسانہ، شہر زاد کراچی، ۲۰۱۳ء ص ۲۳۔
۱۳۱۔ ______ایضاً______، ص ۳۶۔
۱۳۲۔ ______ایضاً______، ص ۹۲۔
۱۳۳۔ پرویز انجم، سعادت حسن مر گیا، منٹو نہیں مرا"، مکتبہ جدید، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۶۵۔
۱۳۴۔ ______ایضاً______ص ۱۵۰۔
۱۳۵۔ حمیرا خان، منٹو کے باغی کردار، سماجی نفسیاتی مطالعہ، شمع بکس، فیصل آباد، ص ۴۱۔
۱۳۶۔ تفصیل کے لیے مقالہ ہذا کے صفحات ۴۱۹تا۴۲۳ ملاحظہ کریں۔
۱۳۷۔ وارث علوی دو ادیب سعادت حسن منٹو۔ راجندر سنگھ بیدی، شاہد پبلی کیشنز، لاہور، (س۔ن)، ص ۲۳۔
۱۳۸۔ ______ایضاً______ص ۲۳۔

۱۳۹۔ ________ایضاً________ ص۲۹۔

۱۴۰۔ قاسمی، احمد ندیم، دیبا منٹو کے خطوط، ندیم کے نام، طبع سوم، پاکستان بکس اینڈ لٹریری، ساؤنڈز ۱۹۹۱ء ص ۷۔

۱۴۱۔ نصرت منٹو، منٹو کے بارے میں، روزنامہ ایکسپریس، لاہور ۱۷جولائی، ۲۰۱۲۔

۱۴۲۔ ان تینوں مضامین پر بحث کے لیے مقالہ ہٰذا کے صفحات ۲۸۵تا۲۹۴ ملاحظہ کریں۔

۱۴۳۔ محمد نوید: ''منٹو شناسی کی روایت کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے، شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص۹۶۔

۱۴۴۔ ماہنامہ ''گل خنداں'' میں شامل ان مضامین پر بحث مقالہ ہٰذا کے صفحات ۲۸۱تا۲۸۵ پر ملاحظہ کریں۔

۱۴۵۔ یہ معلومات محمد سعید کے مضمون ''سعادت حسن منٹو اور محمد حسن عسکری کا اُردو ادب'' مشمولہ ''سعادت حسن منٹو پچاس برس بعد'' ص ۱۳۴ سے لی گئی ہیں۔ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہونے والی اس کتاب میں مضمون نگار نے دونوں شماروں میں شائع ہونے والے مضامین اور دیگر تحریروں کی فہرست درج کی ہے۔

۱۴۶۔ باری علیگ: ''چند مہینے امرت سر میں''، مشمولہ ''سعادت حسن منٹو'' مرتّبہ، ضیاء ساجد، ص۱۸۸۔

۱۴۷۔ دیکھئے: دوماہی ''سنگ میل''، پشاور، شمارہ ۳، ستمبر ۱۹۴۸ء۔

۱۴۸۔ دیکھئے: احمد ندیم قاسمی: ''سعادت حسن منٹو''، ''میرے ہم سفر'' اساطیر، لاہور، ۲۰۰۲ء۔

۱۴۹۔ دیکھئے: ''جیبِ کفن از سعادت حسن منٹو'' منٹو نامہ، ص۲۲۳، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء۔

۱۵۰۔ محمد سعید: ''سعادت حسن منٹو اور حسن عسکری کا اُردو ادب''، مشمولہ ''سعادت حسن منٹو پچاس برس بعد''، ص۱۲۸۔

۱۵۱۔ نقوش میں شامل مضامین پر بحث کے لیے دیکھئے مقالے کا ص ۲۸۵تا۲۹۴ جب کہ 'دانشور' میں شامل مضامین پر بحث ص پر ملاحظہ کریں۔

۱۵۲۔ ان مضامین پر بحث مقالہ ہٰذا کے صفحات پر ملاحظہ کریں۔

۱۵۳۔ مظفر علی سیّد: ''افسانہ ساز منٹو'' ''مشمولہ سعادت حسن منٹو۔ ایک مطالعہ''، مرتّبہ: انیس ناگی، مقبول اکیڈمی، لاہور، ص۱۳۵۔

۱۵۴۔ ________ایضاً________ ص۱۳۷۔

۱۵۵۔ دیکھئے: ''سعادت حسن منٹو، از انیس ناگی، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص۱۰۸تا۱۱۵۔

۱۵۶۔ تفصیلات مقالہ ہٰذا کے صفحات ۲۶۸تا۲۷۵ پر ملاحظہ کریں۔

۱۵۷۔ تفصیل: مقالہ ہٰذا کے صفحات ۲۶۸تا۲۷۵ پر ملاحظہ کریں۔

۱۵۸۔ یہ سعادت حسن منٹو کا مضمون ہے جو ''افکار'' منٹو نمبر ص ۸۵ پر اشاعت پذیر ہوا۔

۱۵۹۔ ان مضامین پر بحث، مقالہ ہٰذا کے صفحات ۲۸۵تا۲۹۴ پر ملاحظہ کریں۔

۱۶۰۔ نصر اللہ خان: ''سعادت حسن منٹو''، مشمولہ ''منٹو ایک کتاب''، مکتبہ افکار، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۱۸۲۔

۱۶۱۔ ________ایضاً________ ص۱۸۳۔

۱۲۶۔ دیکھئے: ''منٹو'' از شاہد احمد دہلوی''، مشمولہ ''منٹو ایک کتاب''، ص ۲۰۱۔

۱۶۳۔ مذکورہ مضامین پر گفتگو، مقالہ ہٰذا کے صفحات ۲۸۵تا۲۹۴ پر ملاحظہ کریں۔

۱۶۴۔ ان دونوں مضامین پر بحث کے لیے مقالہ ہذا کے صفحات ۲۶۸تا۲۷۵پر ملاحظہ کریں۔

۱۶۵۔ الطاف گوہر، ''ایک اور صنم''، مشمولہ ''منٹو ایک کتاب''، ص۳۸۱۔

۱۶۶۔ دیکھئے: جگدیش چندودھاون، ''منٹونامہ''، مکتبہ شعر و ادب، لاہور، ۱۹۸۹، ص۲۸۵تا۳۰۴۔

۱۶۷۔ ان مضامین پر بحث کے لیے مقالہ ہذا کے صفحات ۲۶۸تا۲۷۵پر ملاحظہ کریں۔

۱۶۸۔ ان مضامین پر بحث کے لیے مقالہ ہذا کے صفحات ۲۸۵تا۲۹۴پر ملاحظہ کریں۔

۱۶۹۔ فرید احمد: ''پیش گفتار''، ''دائیں بائیں اوپر نیچے''، المسلم پبلی شرز، کراچی ۱۹۹۵ء، ص۲۹۔

۱۷۰۔ ______ایضاً______ص۱۱۔

۱۷۱۔ جی ایم اثر: ''منٹو کا جگر چاہیے، منٹو کا تجسس''، مشمولہ ''دائیں بائیں اوپر نیچے''ص۲۸۰۔

۱۷۲۔ راقمہ اقبال: ''کچھ منٹو کے بارے میں''، نیرنگ خیال، راولپنڈی، جلد ۶۲، شمارہ ۷۰۳، جون ۱۹۸۶، ص۱۶تا۱۹۔

۱۷۳۔ فرید احمد: ''دیر آید درست آید''، مشمولہ ''دائیں بائیں اوپر نیچے''ص۳۰۵۔

۱۷۴۔ انیس ناگی: پیش لفظ ''سعادت حسن منٹو کے مقدمات''، جمالیات، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص۷۔

۱۷۵۔ دیکھئے: ''دستاویز'' مرتّب: نواز چودھری، مکتبہ شعر و ادب، لاہور، س۔ن، ص۱۵۱۔

۱۷۶۔ ان مضامین پر تفصیلی بحث مقالہ جات ہذا کے صفحات ۲۸۵تا۲۹۴پر دیکھیں۔

۱۷۷۔ دیکھئے، منٹو شخصیت اور فن'' مرتّبہ پریم گوپال متل، صفحہ ۲۶۵تا۳۳۶۔

۱۷۸۔ متّل، پریم گوپال، منٹو، منٹو ہے۔ مشمولہ سعادت حسن منٹو، موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۱۹۹۹ء، ص۹۔

۱۷۹۔ ان مضامین کا جائزہ مقالہ ہذا کے صفحات ۲۸۵تا۲۹۴پر ملاحظہ کریں۔

۱۸۰۔ ان مضامین پر بحث مقالہ ہذا کے صفحات ۲۶۸تا۲۷۵پر ملاحظہ کریں۔

۱۸۱۔ انوار احمد، ڈاکٹر: ''اُردو افسانہ تحقیق و تنقید''، بیکن بکس، ملتان، ۱۹۸۸ء، ص۲۰۶۔

۱۸۲۔ ممتاز شیریں: ''منٹو کا تغیر اور ارتقا''، مشمولہ معیار، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۶۳ء۔

۱۸۳۔ اس مضمون پر بحث مقالہ ہذا کے صفحات ۷۴، ۷۵پر ملاحظہ کریں۔

۱۸۴۔ وہاب اشرفی، پروفیسر: ''ترقی پسند اُردو افسانہ'' مشمولہ ''ترقی پسند ادب''، مرتّبہ: قمر رئیس، عاشور کاظمی، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص۹۔۳۳۵۔

۱۸۵۔ ''منٹو میرا دشمن'' از اوپندر ناتھ اشک، جمشید کتاب گھر حیدر آباد، ۱۹۵۵ء، ص۷۸تا۸۶۔

۱۸۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: افسانہ اور افسانہ نگار''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص۱۳۰تا۱۴۵۔

۱۸۷۔ دیکھئے: افسانہ اور افسانہ نگار'' از ڈاکٹر سلیم اختر، سنگ میل، پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء۔

۱۸۸۔ جیلانی کامران: ''منٹو اور تحریک آزادی''، مشمولہ ''منٹو ایک کتاب''، ص۴۰۹۔

۱۸۹۔ محمد نوید: ''منٹو شناسی کی روایت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص۱۱۹۔

۱۹۰۔ احمد سلیم: ''پیش لفظ، سعادت حسن مر گیا، منٹو زندہ ہے'' (مرتّبہ) احمد سلیم، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص۸۔

۱۹۱۔ ______ایضاً______ص۸۔

۱۹۲۔ دیکھیے: ''نقوش''، منٹو نمبر، شمار ۴۹-۵۰، ۱۹۵۵ء، ص ۱۹۱تا ۳۹۶۔

۱۹۳۔ دیکھیے: صہبا لکھنوی: منٹو ایک کتاب''، مکتبہ افکار، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۳۶ تا ۱۲۳۔

۱۹۴۔ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو (نئے ادب کے معمار)، کتب پبلی شرز لمیٹڈ، بمبئی، ۱۹۴۸ء، ص ۱۷۔

۱۹۵۔ اوپندر ناتھ اشک، ''منٹو میرا دشمن''، جمشید کتاب گھر، حیدر آباد، ۱۹۵۵ء، ص ۶۹۔

۱۹۶۔ ______ایضاً__________ص ۳۶۔

۱۹۷۔ ______ایضاً__________ص ۳۷۔

۱۹۸۔ ______ایضاً__________ص ۶۹۔

۱۹۹۔ ابو سعید قریشی، ''منٹو''، ص ۹۴۔

۲۰۰۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے: راقم کا مضمون ''منٹو ماہ و سال کے آئینے میں، تحقیقی جائزہ''، مشمولہ ''انگارے'') ۳۴ (ملتان، اکتوبر ۲۰۰۵ء، ص ۱۰۔

۲۰۱۔ انوار احمد، ڈاکٹر: ''سعادت حسن منٹو۔ پاکستان کا غیر معمولی تخلیق کار''، مشمولہ ''سعادت حسن منٹو۔ پچاس برس بعد'' مرتّبین: شمشیر حیدر شجر، نویدالحسن، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۹۳۔

۲۰۲۔ ڈاکٹر انوار احمد کے مضمون میں شامل اقتباسات ان کی کتاب ''اُردو افسانہ تحقیق و تنقید'' میں اس سے قبل ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئے تھے۔

۲۰۳۔ دیکھیے: عفت انیس، منٹو کے تین افسانے دانشور، منٹو نمبر، ۱۹۸۹ء، ص ۱۱۴۔

۲۰۴۔ اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، منٹو اور مزاح، بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۷۔

۲۰۵۔ ______ایضاً__________ص ۷۔

۲۰۶۔ ان مضامین اور مصنفین کی فہرست کے لیے ضمیمہ جات میں شامل مرتّبہ کتب کا اشاریہ ملاحظہ کریں۔

۲۰۷۔ ان مضامین پر بحث مقالہ ہذا کے باب سوم میں موجود مذکورہ رسائل کے خصوصی شماروں کے تجزیے میں ملاحظہ کریں۔

۲۰۸۔ وہاب اشرفی، ایک ادبی دستاویز، مشمولہ، سعادت حسن منٹو، ایک لیجنڈ، مرتّبہ ہمایوں اشرف، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۷ء، ص ۱۴۔

۲۰۹۔ ان مضامین کی فہرست ضمیمہ جات میں شامل مرتّبہ کتب کے اشاریہ میں موجود ''نوادرات منٹو'' میں ملاحظہ کریں۔

۲۱۰۔ اسد فیض ڈاکٹر، منٹو کی گمشدہ کڑیاں، ظفر اکیڈمی، کراچی، ۲۰۱۴، ص ۹۔

۲۱۱۔ مذکورہ مضامین نقوش، افکار، دانشور وغیرہ کے منٹو نمبرز کے علاوہ منٹو کے متعلق مرتّب کی جانے والی کم و بیش تمام کتب میں موجود ہیں۔

۲۱۲۔ درج ذیل مضامین کی تفصیل کے لیے متعلقہ کتب کے تجزیات ملاحظہ کریں۔

۲۱۳۔ شاہد ماہلی، منٹو کی افسانہ نگاری میں لسانی تجربے، مشمولہ، منٹو! ایک نیا مطالعہ، مرتّبہ، صالحہ زریں، ڈاکٹر، ادبستان پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۶۹۔

۲۱۴۔ صغیر افراہیم، منٹو: عورت، جنس اور طوائف، مشمولہ، منٹو ایک نیا مطالعہ، مرتّبہ، صالحہ زریں، ڈاکٹر، ص ۱۰۵۔

۲۱۵۔ لئیق رضوی، منٹو اور ادبی صحافت، مشمولہ، منٹو ایک نیا مطالعہ، ص ۲۱۸۔

۲۱۶۔ احمد سلیم، منٹو میرا دوست میرا دشمن، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۲ء، ص ۹۔

۲۱۷۔ تفصیل کے لیے مذکورہ رسائل و کتب کے تجزیات ملاحظہ کریں۔

۲۱۸۔ تفصیل کے لیے مقالہ ہذا کے وہ صفحات ملاحظہ کریں جن میں، نقوش، افکار، دانشور، کے منٹو نمبر پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ غلام زہرہ کی مرتّبہ کتاب منٹو کیا تھا کے علاوہ ضیاء ساجد کی کتاب ''سعادت حسن منٹو'' میں بھی یہ مضامین شامل ہیں۔

۲۱۹۔ رشید احمد چوہدری، عرض ناشر، دیباچہ ''یہ ہے منٹو شخصیت'' مکتبہ جدید، لاہور، (س ن) ص ۳۔

۲۲۰۔ تفصیل کے ضمیمہ جات میں موجودہ مذکورہ کتب و رسائل کا اشارہ دیکھئے۔

۲۲۱۔ عاصم بٹ، مزید منٹو، مشمولہ، منٹو کا آدمی نامہ، مرتّبہ، آصف فرخی، شہرزاد، کراچی، ۲۰۱۲ء ص ۹۸۔

۲۲۲۔ محمد حمید شاہد، سعادت حسن منٹو، جادوئی حقیقت نگاری اور آج کا افسانہ، ص ۹۶۔

۲۲۳۔ صغیر افراہیم، منٹو ناشناسی کی تازہ ترین مثال۔ چند وضاحتیں، مشمولہ، منٹو کا آدمی نامہ، مرتّب، آصف فرخی، ص ۱۳۵۔

۲۲۴۔ پرویز انجم، منٹو غالب کا پرستار، مثال پبلی شرز، فیصل آباد، ۲۰۱۲ء ص ۱۴۔

۲۲۵۔ ______ ایضاً ______ ص ۱۴۔

۲۲۶۔ دیکھئے ماہنامہ افکار، منٹو نمبر، مکتبہ افکار، ۱۹۵۵، کراچی ۲۲۷۔ دیکھئے، سویرا، شمارہ ۷۱، مئی، جون، ۲۰۰۳ء لاہور۔

۲۲۸۔ ابدال احمد جعفری، ''سعادت حسن اور منٹو'' نگارشات، پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۴۰۔

۲۲۹۔ ______ ایضاً ______ ص ۱۴۔

۲۳۰۔ ______ ایضاً ______ ص ۱۱۔

۲۳۱۔ ______ ایضاً ______ ص ۱۲۔

۲۳۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے مقالہ ہذا کا صفحہ نمبر ۷۵، ۷۶۔

۲۳۳۔ شمیم حنفی، ہتک کے حوالے سے، مشمولہ، منٹو کے افسانے۔ انتخاب و مطالعات، مرتّبہ، قاضی افضال حسین، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۱۳ء، ص ۶۷۔

۲۳۴۔ افضال حسین، قاضی، منٹو کے افسانے، انتخاب، مطالعات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۱۳ء، ص ۱۵۶۔

۲۳۵۔ ن، م دانش، منٹو، ٹوبہ ٹیک سنگھ، مشمولہ، منٹو کے افسانے انتخاب و مطالعات، ص ۲۳۳۔

۲۳۶۔ لطیف خاں کھوسہ، منٹو اور ہم، مشمولہ ''منٹو اور ہم'' مرتّبہ، الطاف احمد قریشی، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۲۔

۲۳۷۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، منٹو اور موجودہ انسانی رویے، مشمولہ، منٹو اور ہم، مرتّبہ الطاف احمد قریشی، ص ۱۹۔

۲۳۸۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، مابعد نائن الیون دنیا اور منٹو، مشمولہ، منٹو اور ہم، ص ۳۹۔

۲۳۹۔ خالد محمود سنجرانی، ڈاکٹر، ''پاکستان میں سماجی تبدیلیاں اور منٹو کے افسانے'' مشمولہ، منٹو اور ہم، ص، ۵۵۔

۲۴۰۔ قاضی عابد ڈاکٹر، موجودہ کارپوریٹ کلچر اور منٹو کی تخلیقی دنیا، مشمولہ، منٹو اور ہم، ص ۷۷۔

۲۴۱۔ اسد فیض، ڈاکٹر، ''رسالہ ہمایوں، مشمولہ، منٹو کی گمشدہ تحریریں، ظفر اکیڈمی، کراچی، ۲۰۱۴ء، ص ۲۰۰۔

۲۴۲۔ اسد فیض، ڈاکٹر، رسالہ عالمگیر کا ایک یادگار شمارہ، مشمولہ، منٹو کی گمشدہ تحریریں، ص ۲۰۴۔

۲۴۳۔ پرویز انجم، منٹو اور سینما، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۳۴۔

۲۴۴۔ ______ ایضاً ______ ص ۱۷۹۔

۲۴۵۔ ______ایضاً______ ص۳۱۱۔
۲۴۶۔ ______ایضاً______ ص۳۷۱۔
۲۴۷۔ علی احمد فاطمی، کامریڈ منٹو، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص۱۱۔
۲۴۸۔ ______ایضاً______ ص۸۔
۲۴۹۔ ______ایضاً______ ص۲۷۔
۲۵۰۔ ______ایضاً______ ص۸۔
۲۵۱۔ پرویز انجم، منٹو نامے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء ص۱۸۔
۲۵۲۔ پرویز انجم، ''منٹو باتیں''سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص۱۹۔
۲۵۳۔ ______ایضاً______ ص۱۹۔
۲۵۴۔ انیس ناگی، منٹو کے سوانح نگار، مشمولہ، سعادت حسن منٹو، فیروز سنز، لاہور، ص۱۳:۱۸۔
۲۵۵۔ نصرت منٹو، بحوالہ، منٹو کے بارے میں، مشمولہ، روزنامہ ایکسپریس، لاہور، ۱۷ جولائی ۲۰۱۲ء۔
۲۵۶۔ قاسمی، احمد ندیم، سعادت حسن منٹو، مشمولہ، میں نے منٹو کو کیسا پایا، مرتّب پرویز انجم، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۵ء، ص۹۷۔
۲۵۷۔ تفصیل کے لیے دیکھئے مقالہ ہذا کے صفحات۔ ۳۱۱تا۳۲۲۔
۲۵۸۔ تفصیل کے لیے دیکھئے راقم کا مضمون ''منٹو کا ٹائپ رائٹر، مشمولہ، منٹو۔ کون ہے یہ گستاخ، پاکستان رائٹرز کواپریٹو سوسائٹی، لاہور، ۲۰۱۵، مرتّبہ، ڈاکٹر عامر سہیل، ص۳۰۰تا۳۰۳۔
۲۵۹۔ تفصیل کے لیے دیکھیے راقم کا مضمون بعنوان ''سعادت حسن مر گیا، منٹو زندہ ہے کا بنیادی ماخذ'' مشمولہ، منٹو۔ کون ہے یہ گستاخ، مرتّبہ ڈاکٹر سید عامر سہیل، ص۳۰۴تا۳۱۰۔
۲۶۰۔ تفصیل کے لیے دیکھیے راقم کا مضمون بعنوان منٹو ماہ و سال کے آئینہ میں مشمولہ، منٹو۔ کون ہے یہ گستاخ، مرتّبہ ڈاکٹر سید عامر سہیل، ص۲۸۴تا۲۹۲۔
۲۶۱۔ سب سے بڑا افسانہ نگار ''منٹو کی پہچان''اور ''یہ ہے منٹو شخصیت'' میں شامل مضامین کا تقابلی جائزہ دیکھنے کے لیے ضمیمہ جات میں موجود مرتّبہ کتب کے اشاریے سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔
۲۶۲۔ دیکھیے، منٹو میرے مطابق، از لیزلی فلیمنگ، مکتبہ جدید، لاہور، س ن۔
۲۶۳۔ راقم نے نواز چوہدری کی کتاب کو اپنے مطالعے کی بنیاد بنایا ہے۔
۲۶۴۔ دیکھئے صدیقی، مہدی علی، بلا کم و کاست۔ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، ۲۰۰۲، ص، ۳۵۱تا۳۵۵۔
۲۶۵۔ سجاد حارث، پروفیسر، منٹو کے سیاسی افسانے، مشمولہ، منٹو کے سیاسی افسانے، مرتّبہ، نقوی، تنویر عباس، دعا پبلی کیشنز، لاہور، (س ن)، ص۱۳۔
۲۶۶۔ ______ایضاً______ ص۱۶۔
۲۶۷۔ ______ایضاً______ ص۲۳۔
۲۶۸۔ ______ایضاً______ ص۳۶۔

باب سوّم:

ادبی رسائل و جرائد کے منٹو نمبر
(تحقیقی و تنقیدی جائزہ)

(الف) خصوصی شمارے

(ب) رسائل و جرائد کے خصوصی گوشے

باب سوم:

ادبی رسائل و جرائد کے منٹو نمبر (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)

(الف) خصوصی شمارے

افسانہ نگاری کے آغاز سے اپنی وفات تک سعادت حسن منٹو اردو تنقید کا ایسا موضوع نہیں بن سکا جس کے ساتھ اس زمانے کی تنقید نے منصفانہ انداز اختیار کیا ہو۔ وفات کے بعد افسانوی ادب کی تنقید کا اہم موضوع بننے والا منٹو اپنی زندگی میں تنقید کی بجائے فتوؤں، طنز و تشنیع اور بے اعتنائی کا شکار رہا۔ منٹو پر معیاری تنقید لکھنے والی ممتاز شیریں کی تحریریں بھی کم و بیش تقسیم کے وقت تک منٹو کے ذکر سے خالی ہیں۔ ایک زمانے تک فکشن کے واحد شمار کیے جانے والے نقاد سید وقار عظیم بھی نرم لے میں سہی، لیکن مولوی عبدالماجد دریا آبادی اور مولانا ماہر القادری کی ہمنوائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ منٹو کی وفات تک اس پر لکھی جانے والی تنقید کا مطالعہ اس امر کی گواہی دیتا ہے کہ محمد حسن عسکری اور ممتاز شیریں کے علاوہ کسی بھی ناقد نے اس ہمدردانہ ایمانداری کا مظاہرہ نہیں کیا جو کسی بھی فن پارے پر تنقید لکھتے ہوئے کسی بھی اچھے نقاد کا وصف خاص ہوتی ہے۔ تینتالیس سال کی مختصر سی زندگی میں اردو افسانے کو خلاقی کی اعلیٰ سطح عطا کرنے والا تخلیق کار اپنی زندگی میں کسی ادبی رسالے کو اپنی طرف اس طرح متوجہ نہیں کر سکا کہ کوئی ادبی رسالہ / جریدہ اس پر اس کی زندگی میں کوئی خاص نمبر نکالتا۔ حتیٰ کہ جب اس عظیم تخلیق کار نے محمد طفیل سے اپنے اوپر نقوش کا ایک خاص نمبر نکالنے کو کہا تو تادیب کے خوف نے محمد طفیل کو منٹو کو موت کے انتظار پر محمول کر دیا۔ البتہ منٹو کی وفات کے فوراً بعد اردو کے اہم ادبی رسائل نے یکے بعد دیگرے منٹو پر خاص نمبر نکالنے شروع کر دیے گویا وہ منٹو کے مرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ذیل میں ان خصوصی شماروں کا زمانی لحاظ سے جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

''نقش''، کراچی:

زمانی اعتبار سے منٹو پر سب سے پہلا خصوصی نمبر ماہنامہ ''نقش'' کراچی نے شائع کیا۔ اسے شاہد احمد دہلوی، محمد حسن عسکری، ممتاز شیریں، سلیم احمد اور شمس زبیری نے مارچ ۱۹۵۵ء میں ترتیب دے کر مکتبہ کاشانہ اُردو کراچی نمبر ۳ سے شائع کیا۔ اس رسالہ میں شامل مضامین کی ترتیب اس طرح ہے:

سخن ہائے گفتنی، شمس زبیری، منٹو، شاہد احمد دہلوی، منٹو، ابو سعید قریشی، غیر افسانوی موت، انتظار حسین، گنجا فرشتہ، انور عنایت اللہ، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، منٹو کی یاد میں، ممتاز شیریں، نقد و تبصرہ، اسلم فرخی۔

ان تاثراتی مضامین کے علاوہ منٹو کی مندرجہ ذیل سترہ تحریریں، بطور انتخاب شامل کی گئی ہیں:

نیا قانون، سجدہ، محمودہ، ہتک، راسپوٹین کی موت، خالی بوتلیں خالی ڈبے، ڈرپوک، عشق حقیقی، لذت سنگ، دھواں، تین صلح پسند عورتیں، تقی کاتب، قبض، اس کا پتی، ممد بھائی، باتیں ہماری یاد رہیں، سرکنڈوں کے پیچھے۔

شمس زبیری نے اپنے اداریتی مضمون ''سخن ہائے گفتنی''،میں منٹو کی موت کو ادبی دنیا کا عظیم حادثہ قرار دیتے ہوئے لکھا کہ منٹو نے جس بے سروسامانی کے عالم میں جان دی وہ بھی اس کے افسانے سے کم چونکا دینے والی نہیں۔ اُنھوں نے شاہد احمد دہلوی کی تجویز کا حوالہ دیتے ہوئے پبلی شرز کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ وہ منٹو کی کتابوں کے حقوق اُن کی بیوی کے نام منتقل کر دیں۔

شاہد احمد دہلوی کا مضمون ''منٹو''، مصنف اور منٹو کی ملاقاتوں پر مشتمل ایک شخصی خاکہ ہے۔ یہ اس مضمون کی اوّلین اشاعت ہے۔ بعد میں یہ مضمون واقعات کی ترتیب اور فقروں کی ساخت میں ردوبدل کے ساتھ مصنف کی خاکوں پر مشتمل کتاب ''گنجینۂ گوہر''، میں شائع ہوا۔[۱]

پہلی ملاقات میں منٹو نے ''ساقی''، کا فرانسیسی ادب نمبر مرتب کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن بات بنتی نہ دیکھ کر فوراً ہی موضوع کو تبدیل کر دیا۔ شاہد احمد دہلوی کے مطابق جب منٹو دہلی ریڈیو اسٹیشن پر ملازم ہوئے تو اس زمانے میں اُنھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مولانا چراغ حسن حسرت، دیوندر ستیارتھی، ن م راشد اور احمد شاہ بخاری کے ساتھ اُن کی نوک جھونک کا ذکر کرتے ہوئے مضمون نگار نے بہت سے دلچسپ واقعات کی نشان دہی کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''ایک دفعہ کسی سلسلے میں احمد شاہ بخاری صاحب نے منٹو کو نصیحت کرنی چاہی، 'دیکھو بھئی! میں تمہیں اپنے بیٹے کے برابر سمجھتا ہوں' منٹو بھلا چھوٹے کیسے بن سکتے تھے۔ فوراً بولے 'مگر میں آپ کو اپنا باپ نہیں سمجھتا۔''[۲]

اُن کے بقول منٹو بظاہر اکھڑ اور بدتمیز نظر آتا تھا مگر دراصل اس کے پہلو میں ایک بڑا احساس دل تھا۔ دنیا نے اسے بڑے دکھ پہنچائے اس لیے اس میں نفرت کا جذبہ بہت بڑھ گیا تھا مگر اس کی انسانیت مرتے دم تک نہیں مری تھی۔

ابو سعید قریشی کا مضمون ''منٹو''، ریڈیو پاکستان پشاور پر منٹو کی وفات کے بعد پڑھا گیا۔ یہ ایک مختصر تاثراتی مضمون ہے۔ ابو سعید قریشی اور منٹو گہرے دوست تھے شاید اسی لیے یہ مضمون بھی جذباتی انداز میں لکھا گیا ہے۔ بعد میں اسی مضمون کو پھیلا کر باقاعدہ کتابی صورت میں ''منٹو''، کے نام سے شائع کیا گیا۔[۳]

''غیر افسانوی موت''، میں اُن لوگوں پر طنز کرتے ہوئے جو منٹو سے اپنا تعلق ظاہر کرنے کے لیے فرضی ملاقاتوں کا حال مزے لے کر سنایا کرتے تھے، انتظار حسین لکھتے ہیں کہ:

> ''شام کو اکثر لوگ ملے جن کے بیانات سے پتہ چلا کہ منٹو صاحب نے ایک دن پہلے شاید پورے لاہور کا گشت کر ڈالا تھا۔ ان میں سے اکثر لوگوں کو اپنے محبوب افسانہ نگار کی موت پر اظہار حیرت کرنے اور اس سے اپنا تعلق ثابت کرنے کا اس سے مؤثر اور مناسب طریقہ اور کوئی نظر نہ آیا کہ کسی واقعی یا فرضی ادھار کا تذکرہ چھیڑیں۔''[۴]

انتظار حسین ان لوگوں سے اتفاق نہیں کرتے جو منٹو کی موت کو اُن کے افسانوں کے آخری فقرے سے تشبیہ دیتے ہوئے اسے غیر متوقع انجام کا حامل ٹھہراتے ہیں۔ اُن کے خیال میں منٹو نے زندگی میں جتنے ہنگامے اور شور شرابہ کیا وہ اتنی ہی خاموشی سے پانی کے ایک بلبلے کی طرح آہستگی سے ٹوٹ گیا:

> ''جب وہ رخصت ہوا تو اتنی خاموشی سے کہ نہ تو مال روڈ کا ٹریفک بند ہوا نہ ریڈیو پاکستان کے پروگراموں میں خلل آیا اور نہ وضع دار بزرگوں کو میت میں شرکت کی زحمت اُٹھانی پڑی۔''[۵]

''گنجا فرشتہ'' انور عنایت اللہ کا مضمون ہے۔ مضمون کے آغاز میں منٹو کی موت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب تک منٹو زندہ رہا ہم نے اسے گالیاں دیں، معاشرت کی مختلف کسوٹیوں پر اسے کستے رہے اور جب وہ مر گیا تو ایک مردہ پرست قوم کی طرح اُس کا شدت سے سوگ منا رہے ہیں۔

مضمون نگار کے مطابق منٹو کے مزاج میں بلا کا چڑچڑا پن تھا۔ ترقی پسندوں اور رجعت پرستوں کے حملوں نے اسے ضدی بنا دیا حال آں کہ اسے ہنگامہ پسندی سے نفرت تھی۔

کرشن چندر کا مضمون ''سعادت حسن منٹو'' اُن سنی سنائی باتوں سے شروع ہوتا ہے جو اُنھیں پاکستان سے پہنچتی رہیں۔ مثلاً یہ کہ منٹو پاگل خانے میں ہے، کثرت شراب نوشی سے ہسپتال میں پڑا ہے، دوستوں سے قطع تعلق کر گیا ہے یا پھر یہ کہ وہ اپنے بیوی بچوں سمیت فاقوں تک پہنچ گیا ہے۔ اُنھوں نے اس بات پر شدید افسوس کا اظہار کیا کہ منٹو کی موت پر زندگی معمول کے مطابق رواں دواں رہی اور کاروبار زندگی جوں کا توں چلتا رہا۔ لکھتے ہیں:

> ''آل انڈیا ریڈیو بھی کھلا ہے، ہوٹل کا بار بھی، اُردو بازار بھی؛ کیوں کہ منٹو ایک غریب ادیب تھا، وہ وزیر نہ تھا کہ کہیں کوئی جھنڈا اس کے لیے سرنگوں ہوتا، وہ کوئی سٹہ باز بلیک مارکیٹا بھی نہیں تھا کہ بازار اس کے لیے بند ہوتا۔۔۔ وہ کوئی فلم سٹار نہ تھا کہ اسکول اور کالج اس کے لیے بند ہو جاتے۔''[۶]

یہ وہی شکوہ ہے جو گزشتہ صفحات میں انتظار حسین نے اپنے مضمون ''غیر افسانوی موت'' میں کیا تھا۔ 'ہتک'، 'ٹوبہ ٹیک سنگھ'، 'کھول دو' اور 'نیا قانون' کی مثال دیتے ہوئے اُنھوں نے کہا کہ منٹو نے ایسے درجنوں افسانے اور سماج کی نچلی تہوں میں گھس کر پسے ہوئے، کچلے ہوئے اور سماج کی ٹھوکروں سے مسخ شدہ کردار تخلیق کیے۔ منٹو کے یہ کردار اپنی نادر مصوری اور حقیقت نگاری میں گورکی کے گوئٹر ڈیتھ کے کرداروں کی یاد دلاتے ہیں۔ منٹو اور گورکی کی اپنے اپنے معاشروں میں پذیرائی کے تضادات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''فرق صرف اتنا ہے کہ لوگوں نے گورکی کے لیے عجائب گھر بنائے، مجسمے نصب کیے، شہر تعمیر کیے اور ہم نے منٹو پر مقدمے چلائے، اسے بھوکا مارا، اسے پاگل خانے پہنچایا، اسے ہسپتالوں میں سڑایا اور آخر میں اسے یہاں تک مجبور کر دیا کہ وہ کسی انسان کو نہیں، شراب کو اپنا دوست سمجھنے پر مجبور ہو جائے۔''[۷]

وہ اس بات پر اظہار افسوس کرتے ہیں کہ ہم شخصیات کی زندگی میں اُن کی قدر نہیں کرتے جب کہ مرنے کے بعد ان کی شان میں قصیدے کہتے اور افسوس میں مرثیے پڑھتے نہیں تھکتے۔ اُنھوں نے ہندوستانیوں / پاکستانیوں کو مقبروں کی پجاری قوم قرار دیا ہے۔ ایک ایسی قوم جو پانچ ہزار برس سے تمام بڑے ادیبوں کے ساتھ یہی سلوک کرتی چلی آئی ہے۔ منٹو بظاہر کھردرا، نوکیلا اور تلخ نظر آتا تھا لیکن اس کی اس تلخی اور کھردرے پن کے پیچھے اُنھیں ایک شفیق انسان چھپا نظر آتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''اس کے تیز نوکیلے خاردار الفاظ کو ذرا سا کھرچ کر دیکھئے اندر سے زندگی کا میٹھا میٹھا رس ٹپکنے لگے گا۔''[۸]

ممتاز شیریں کا مضمون ''منٹو کی یاد میں'' منٹو کے انتقال پر قائم کی جانے والی یادگاری کمیٹی کی رپورٹ ہے جو ممتاز شیریں نے سیکریٹری کی حیثیت سے لکھی۔ اس کمیٹی کا اجلاس بندر روڈ واقع زیلن کافی ہاؤس کراچی میں ۵ فروری شام ۵ بجے منعقد کیا گیا تھا۔ ان مضامین کے بعد منٹو کی تخلیقات کا انتخاب شامل کیا گیا ہے جس میں اُن کے چودہ افسانے، ایک ڈراما اور دو مضامین شامل ہیں۔

''افکار''، کراچی:

ماہنامہ ''افکار'' نے مارچ اپریل ۱۹۵۵ء میں مکتبہ افکار بندر روڈ کراچی سے منٹو نمبر شائع کیا۔ جس کے مدیر صہبا لکھنوی ہیں۔ رسالے میں شامل اکیس (۲۱) قلم کاروں کے دستخط ثبت ہیں جب کہ صفحات نمبر ۱۵، ۱۶ پر شامل ادیبوں اور شاعروں کی نثری اور منظوم تحریروں کی فہرست دی گئی ہے۔ اس فہرست میں منٹو کی موت پر مختلف ادبی و صحافتی حلقوں کے ردِ عمل کو چھے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا حصہ منظوم ہے اور اس میں برصغیر پاک و ہند کے دَس (۱۰) شعرا کا کلام شامل کیا گیا ہے جنھوں نے اپنے اپنے انداز میں منٹو کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ دوسرا حصہ ''منٹو کا فن اور شخصیت'' کے عنوان سے ہے اور اس میں تیرہ (۱۳) ادیبوں اور قلم کاروں نے منٹو کی شخصیت اور فن پر تاثراتی و تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ تیسرے حصہ میں منٹو کی پانچ تحریروں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ چوتھا حصہ ''ناخن کا قرض'' منٹو کے ہم عصر ادیبوں، شاعروں اور دوستوں کے تاثرات پر مشتمل ہے۔ ''سوگ میں ہے فسانہ گوئی آج'' اس شمارے کا پانچواں حصہ ہے اور اس میں صحافتی حلقوں کی طرف سے منٹو کی موت پر لکھے جانے والے مضامین کا انتخاب شامل ہے۔ جب کہ آخری حصہ منٹو کی موت پر سرکردہ فلمی شخصیات کے تاثرات پر مبنی ہے۔

رسالہ کے مدیر صہبا لکھنوی نے ''اشاریہ'' کے عنوان سے ادارتی صفحہ لکھتے ہوئے قوم کی مردہ پرستی پر افسوس کا اظہار کیا، منٹو نمبر کی اشاعت میں تین ہفتوں کی تاخیر کا سبب اُنھوں نے کاغذ کی کم یابی کو قرار دیا۔ چناں چہ دو ماہ کے شماروں کو یک جا کر کے اُنھوں نے ۱۷۶ صفحات پر مشتمل یہ شمارہ نکالا۔

ادارتی مضامین کے بعد منٹو کی موت پر برصغیر پاک و ہند کے دَس شعرا: حفیظ ہوشیار پوری، عبدالحمید عدم، قتیل شفائی، نور بجنوری، خاطر غزنوی، احمد ریاض، شاد امرتسری، حمایت علی شاعر، قمر لدھیانوی اور حسن حمیدی کا کلام شامل ہے۔ اس منظوم خراجِ عقیدت کے بعد ''منٹو کا آخری خط'' کے عنوان سے منٹو کے خط کی عکسی کاپی لگائی گئی ہے۔ منٹو نے یہ خط مہدی علی صدیقی کے نام اپنی موت سے ایک روز قبل یعنی ۱۷ جنوری ۱۹۵۵ء کو لکھا تھا۔ مہدی علی صدیقی کا مضمون ''منٹو اور میں'' ترتیب کے لحاظ سے سب سے پہلا مضمون ہے۔[9] منٹو، مہدی علی صدیقی کی عدالت میں اپنے افسانے ''اوپر نیچے اور درمیان'' پر مقدمہ کے سلسلے میں پیش ہوئے تھے جس پر اُنھیں ۲۵ روپے جرمانہ کی سزا سنائی گئی تھی۔ مہدی علی صدیقی نے اپنے مضمون میں اس مقدمہ کی رُوداد بیان کی ہے۔ اُن کے مطابق منٹو کو مقدمے سے نمٹنے کی اتنی جلدی تھی کہ اُنھوں نے بغیر کوئی بحث کیے اقبال جرم کر لیا اور فیصلے پر اصرار کرنے لگے۔ چناں چہ اگلے دن کی تاریخ کی مناسبت سے اُنھیں ۲۵ روپے جرمانہ ادا کرنے کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ منٹو کے لیے یہ صورت حال حیران کن تھی کیوں کہ وہ اس سے سخت سزا کی توقع کر رہا تھا۔ نیز کسی بھی عدالت میں اُس سے اتنا نرم رویہ نہیں برتا گیا تھا۔

اس کے بعد منٹو کی دعوت پر زیلن کافی ہاؤس میں دونوں کی ملاقات کا ذکر ہے جس میں منٹو نے اُن سے یہ سوال کیا کہ آپ نے مجھے جرمانہ کیوں کیا۔ مہدی علی صدیقی نے اس کا جواب کسی مناسب وقت پر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ مضمون دراصل اُسی سوال کا جواب ہے جس میں اُنھوں نے فحاشی کی قانونی توضیح کرتے ہوئے منٹو کے اس افسانے کو فحش تصور کیا اور اسے جرمانہ کی سزا سنائی۔

وقار عظیم اپنے مضمون ''بدنام منٹو'' میں منٹو کی مقبولیت اور رسوائی میں بڑا قریبی اور گہرا رشتہ بتاتے ہیں۔ منٹو نے اپنی ابتدائی تحریروں میں ہی یہ باور کرا دیا تھا کہ اس میدان میں ایک نیا شہ سوار آ گیا ہے۔ وقار عظیم اسے منٹو کی اوّلین منزل قرار دیتے ہیں جب کہ دوسری منزل وہ تھی جب منٹو نے چونکا دینے والی باتیں شروع کیں۔ اُن کے نزدیک یہی وہ مقام ہے جس نے بیک وقت منٹو کے حامئین اور مخالفین کی ایک بڑی تعداد پیدا کی۔

اُن کے بقول ''بو''، ''دھواں''، ''کالی شلوار''، ''کھول دو''، اور ''ٹھنڈا گوشت'' کا شمار ایسے ہی افسانوں میں ہوتا جنھوں نے منٹو کی بدنامی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی لیکن اس کے باوجود وہ ان افسانوں کو فنی طور پر بہت ہی کامیاب افسانے گردانتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''ٹھنڈا گوشت پڑھتے وقت آدمی کتنی ہی ناک بھوں کیوں نہ چڑھائے، اسے کتنا ہی مخرب الاخلاق اور فحش و عریاں کیوں نہ کہے، اسے پڑھنے اور پسند کرنے والوں پر کتنی ہی لعن طعن کیوں نہ کرے، وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ''ٹھنڈا گوشت'' میں فن کے مطالبات کا حق پوری طرح ادا کر دیا گیا ہے۔ جو کچھ بظاہر اخلاق کی بارگاہ میں مردود ہے وہ فن کی بزم میں مقبول اور پسندیدہ ہے۔'' [۱۰]

''دیکھ کبیرا رویا'' میں قرۃ العین حیدر نے اس بات کا شکوہ کیا کہ منٹو جب تک زندہ رہا اسے گالیاں دی جاتی تھیں، ترقی پسند اسے رجعت پسند جب کہ رجعت پسند اسے ترقی پسند گردانتے تھے اور یوں وہ ہر دو کے نزدیک ناقابل قبول ٹھہرا۔ لیکن اب اُس کی موت پر جلسے ہو رہے ہیں اور ان جلسوں میں اس کے حق میں قرار دادیں پاس کی جا رہی ہے اور دھڑا دھڑ کتابیں شائع کی جا رہی ہیں لیکن زندگی میں کسی نے بھی اُس کی پروا نہ کی۔ اُنھوں نے معاشرے کی بے حسی پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے ہاں فنکار کا اس طرح فاقوں مر جانا کوئی نئی بات نہیں۔ یہ ایسی روایت ہے جس پر ہم صدیوں سے عمل پیرا ہیں۔ اُستاد بندو خان کی موت بھی انھی حالات میں ہوئی تھی۔ اپنے مضمون کے آخر میں لکھتی ہیں کہ:

> ''ایک منٹو نہیں مرا، منٹو برابر مرتا رہے گا، کبھی وہ ناچتے ناچتے دم توڑ دے گا، کبھی سارنگی بجاتے بجاتے، جب تلک ہماری آنکھیں نہیں کھلیں گی۔'' [۱۱]

''بدزبان'' علی سردار جعفری کا مضمون ہے۔ اُن کے بقول منٹو بہت خود پسند واقع ہوا تھا جو اپنی خود پسندی کے زعم میں اپنے علاوہ کسی کو بھی اہم نہیں سمجھتا تھا۔ منٹو کی ذہانت اور فنکارانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''نئے ادیب منٹو سے یہ بھی سیکھیں گے کہ کیا لکھنا چاہیے اور کیسے لکھنا چاہیے اور یہ بھی سیکھیں گے کہ کیا نہیں لکھنا چاہیے اور کیسے نہیں لکھنا چاہیے، مگر ان میں سے کوئی بھی منٹو کی طرح ٹیڑھا، تیکھا، تلخ، ترش، اور شیریں نہیں ہو گا۔'' [۱۲]

علی سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے اہم رکن تھے۔ اسی نسبت سے وہ منٹو کے ساتھ دیگر ترقی پسندوں کی طرح نظریاتی اختلاف رکھتے تھے لیکن اختلافات کے باوجود وہ منٹو کی اہمیت سے انکار نہ کر سکے۔ لکھتے ہیں:

''آپ منٹو سے ادبی اور نظریاتی اختلافات کتنا ہی رکھیں، اس کے خلوص، دیانت داری، انسانیت دوستی، حب الوطنی اور سامراج دشمنی کا اعتراف کرنا پڑے گا۔'' [۱۳]

لیکن اس اعتراف کے باوجود بھی وہ اپنے نظریات پر قابو نہ پاسکے۔ ادب کے مقصد اور معاشرے کی تشکیل و تعمیر جس کا اعلان ترقی پسندوں نے کیا تھا، اُنھیں منٹو کے ہاں نظر نہ آیا۔ علی سردار جعفری اپنے نظریات کی روشنی میں منٹو کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ:

''اس نے چکلوں سے، بازاروں سے، شراب خانوں سے، گھروں کی چار دیواری اور دفتروں سے، سماج کے تمام نہاں خانوں سے انسانی لاشوں کو باہر نکالا اور منظر عام پر کھڑے ہو کر کہا 'دیکھو یہ وہ جانور ہیں جو کبھی انسان تھے' لیکن منٹو کی ٹریجڈی اس میں تھی کہ وہ اُن شکلوں کو نہ دیکھ سکا جنہیں منظر عام پر لا کر وہ کہہ سکتا 'دیکھو یہ ہیں وہ انسان جو کبھی جانور تھے۔'' [۱۴]

چناں چہ وہ اعتراض کرتے ہیں کہ منٹو حقیقت نگاری کو اس کی مکمل اور اصل شکل میں دیکھنے کی بجائے صرف ایک مسخ شدہ پہلو کو دیکھ کر احتجاج کرتا رہ گیا۔

منٹو کے معروف افسانوی کرداروں کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ منٹو نے اپنے ان کرداروں کے (جو معاشرے کے دھتکارے ہوئے، موالی، غنڈے اور جسم فروش تھے) انسانی پہلوؤں کو ہی روشن کیا ہے۔ ہم ایشر سنگھ کو اس دعوے کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں کہ دیکھو یہ ہے وہ انسان جو اس سے قبل جانور تھا۔ جسے منٹو نے تمام تر زندگی اور حیوانیت کے باوجود بطور انسان پیش کیا ہے۔ منٹو کا تو آدرش ہی یہی تھا کہ انسان اپنی تمام تر پستیوں کے باوجود بھی اپنی انسانیت نہیں کھوتا۔ وقار عظیم کی طرح علی سردار جعفری کا بھی یہی خیال ہے کہ فنی اعتبار سے منٹو نے بہت سے کامیاب افسانے لکھے۔ اس کے ہاں زبان کی سادگی، کردار نگاری میں تیکھا پن، پلاٹ میں گھٹاؤ، کہانی پن اور لہجے میں طنز کی تلخی کے ساتھ ساتھ شاعرانہ پن کی مٹھاس تھی اور یہ صرف منٹو کا خاصہ تھا کہ وہ دو جملوں میں کردار بنا کر کھڑے کر دیتا تھا اور جس طرح چاہتا تھا کہانی لکھتا تھا۔

شورش کاشمیری اپنے مضمون ''چند یادیں'' میں بتاتے ہیں کہ میں نے اُن کے کسی فیچر پر جب یہ جملہ لکھا کہ ''منٹو مومن کی طرح سوچتا اور کافر کی طرح لکھتا ہے'' تو منٹو یہ جملہ پڑھ کر بہت خوش ہوئے۔ اُنھوں نے مزید کہا کہ منٹو نے میری کتاب ''اُس بازار میں'' ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی تھی۔ وہ اس پر دیباچہ لکھنا چاہتے تھے مگر میں ڈر گیا کہ نہ جانے کیا لکھ دیں، کیوں کہ وہ اپنے نظریات میں بالخصوص طوائف کے مسئلہ میں سخت گیر تھے۔ لکھتے ہیں:

''اُن کا بس چلتا تو عورت کے اس خوان عزت کو جو آئے دن فروخت ہوتا ہے ان سفید داڑھیوں پر مل دیتے جو طوائف کے وجود پر نیزوں کی طرح تن جاتی ہیں لیکن چوری چھپے اس کی تخلیق کرتی ہیں۔'' [۱۵]

اُنھوں نے انکشاف کیا کہ قدرت اللہ شہاب کی وساطت سے منٹو کو برف خانہ میں حصہ دیا گیا تھا لیکن منٹو یہ کہہ کر اپنا حصہ واپس کر آئے کہ ''سخت پتھر تھا اُٹھ نہ سکا! چوم کے چھوڑ دیا۔'' [۱۶]

سیاہ حاشیے'' میں ظ۔ انصاری لکھتے ہیں کہ ہم نے منٹو کی زندگی میں اس کی قدر نہ کی اب اُس کی موت کے بعد ہمیں احساس ہو گا کہ وہ چیز جسے ''منٹو کہانی'' کہتے ہیں ہمارے درمیان نہیں رہی، تو اب احساس ہو گا کہ فن اور کہانی کی کیسی کیسی قیمتی روایتیں منٹو کے ساتھ اُس کی قبر میں اُتار دی گئی ہیں۔ اُن کے بقول انسانوں کی جنسی زندگی اُس کے قلم کا خاص نشانہ تھی۔ اُنھوں نے فرائیڈین نقطۂ نظر کو اپنائے بغیر زیادہ تر ایسے افسانے لکھے ہیں جن کے آئینے میں بے شمار ابنارمل اور نارمل لوگوں کی زندگی برہنہ نظر آتی ہے۔

ابراہیم جلیس کا شمار منٹو کے دوستوں میں ہوتا ہے، اُنھوں نے اپنے مضمون ''اٹھاؤ بوتل اور چلو منٹو کے پاس'' کے آغاز میں منٹو کی موت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ موت منٹو کو ٹھیک وقت پر اس دنیا سے اُٹھا لے گئی کیوں کہ پاکستان آمد کے بعد منٹو اپنے نام کو سکے کی طرح استعمال کرنے لگا تھا جو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں آتا جاتا رہا۔ اگر اس کی سرکولیشن اسی طرح جاری رہتی تو ایک دن وہ اپنی چمک کھو دیتا اور کھوٹا سکہ کہلانے لگتا۔ وہ منٹو کی نجی زندگی کو اُن کی افسانوی فضا اور ماحول سے یکسر متضاد قرار دیتے ہیں۔

صہبا لکھنوی ''اُردو کا نڈر اور بے باک افسانہ نگار منٹو'' میں لکھتے ہیں کہ منٹو کی موت سے جو خلا پیدا ہوا وہ طویل عرصہ تک پُر نہ ہو سکے گا۔ ضیاء الحسن موسوی نے اپنے مضمون ''بے غیرتی'' میں طنزیہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے اپنی روایات کے مطابق منٹو کی موت کے بعد اُس کی قدر دانی شروع کر دی ہے۔ ہمیں ادب سے غرض ہے نہ کہ ادیب سے۔ منٹو چوں کہ ادیب تھا اس لیے ہمیں اس بات کی پروا نہیں ہونی چاہیے کہ اُس کی ایک بیوہ اور تین بچیاں بھی ہیں۔ یہ منٹو کا ذاتی معاملہ ہے اور کسی کے ذاتی معاملات میں دخل دینا تہذیب کے خلاف ہے۔ البتہ ہم یومِ منٹو منائیں گے، رسائل منٹو نمبر شائع کریں گے اور ہم میں سے جس کو بھی موقع ملے گا اس کی قبر کا مجاور بن کر شاندار عرس کرائے گا۔

مضمون نگار کے مطابق ہم سب لکھنے والے، چھاپنے والے، پڑھنے والے بے غیرت ہیں، ادیب فاقے کرتا رہے گا لیکن مزدوری کرنے کی بجائے افسانہ لکھے گا، پبلی شرز کاتب تک کو پیسے دے دیں گے لیکن ادیب کو نہیں دیں گے۔ اسی طرح قاری سیاسی لیڈروں کو تو تھیلیاں پیش کر دیتے ہیں لیکن ادیب کی کتاب مانگ کر پڑھیں گے۔

سید اکمل علیمی کا مضمون ''منٹو کے آخری ایام'' کے مطابق منٹو پنجابی شاعری کے دلدادہ تھے۔ شاعری میں غالب کے علاوہ اُنھیں پنجابی شاعری سے عشق تھا۔ اسی نسبت سے اُستاد دامن کو بھی بہت پسند کرتے تھے۔ علیمی کے مطابق منٹو کو آخری بار اُنھوں نے ۱۷ جنوری کو دیکھا تھا۔ شاید اُسے پیسوں کی ضرورت تھی اور چوں کہ مضمون نگار کی جیب خالی تھی اس لیے وہ نظریں بچا کر نکل بھاگے۔

''کچھ منٹو کے بارے میں'' ثریا قمر کا مضمون ہے۔ ان کے مطابق منٹو کی تحریروں پر فحاشی اور عریانی کا الزام لگانے والے یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ وہ کون سا ماحول ہے جس نے منٹو کے ان کرداروں کو جنم دیا ہے اور یہ کہ منٹو کو زمانہ شرابی کہہ سکتا ہے لیکن اُسے جنسی مریض نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس کی جنسی صحت مندی کا ثبوت اُس کے گھر کا ماحول، بیوی اور تین بچیاں ہیں۔ منٹو نے جس ماحول کو پیش کیا ہے اس کی گندگی اور اس سے اُٹھنے والے تعفن کو وہ بذاتِ خود محسوس کرتا رہا ہے اور چوں کہ وہ خود اس ماحول کا حصہ رہا ہے اور

اسے یہ تعفن برداشت کرنا پڑا ہے لہٰذا سماج کی ایسی ناخوش گوار فضا میں جہاں انسانیت پڑے پڑے سڑ جائے وہاں منٹو گندگی کی برائی کو اچھال اچھال کر بیان نہ کرے تو کیا کرے۔

مضامین کے سلسلہ کے بعد ''منٹو ایک نظر میں'' کے عنوان سے منٹو کی شخصی و فنی زندگی کا گوشوارہ پیش کیا گیا ہے۔ ''منٹو ایک چراغ'' پھیلی ضو میں لو دیتے ہیں ہر دامن کے داغ''[۱۷] کے عنوان سے منٹو کی تخلیقات چند بہترین افسانوں کے نام اور دیگر زبانوں میں منٹو کی تخلیقات کے تراجم کے چارٹ کے ساتھ ساتھ منٹو کی تاریخ پیدائش، مقام پیدائش اور سن وفات کا گوشوارہ پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح ''منٹو ایک خمار۔ ٹوٹا جام، بکھرتی مہکیں، گیتوں کی گنجار''[۱۸] میں منٹو کی مختلف صحافتی اور فلمی اداروں سے وابستگی، فلمی کہانیاں، وہ کہانیاں جن پر مقدمے چلائے گئے اور منٹو کے چند دلچسپ انتساب جو اُنھوں نے مختلف کتابوں پر لکھے تھے، درج کیے گئے ہیں۔ منٹو کی لکھی ہوئی فلموں کی تعداد چھے (۶) درج کی گئی ہے جب کہ منٹو نے مجموعی طور پر گیارہ (۱۱) فلمی کہانیاں لکھی تھیں۔ اسی طرح منٹو کا پہلا افسانوی مجموعہ ''منٹو کے افسانے'' کو قرار دیا گیا ہے حال آں کہ منٹو کا پہلا افسانوی مجموعہ ''آتش پارے'' ہے۔

اگلے صفحہ پر ''منٹو ایک خیال'' کے عنوان سے منٹو کی ایک تصویر کا عکس لگایا گیا ہے جسے اُس وقت کے آرٹسٹ فضل نے بنایا تھا۔

''منٹو کے بہترین افسانے'' میں منٹو کی نمائندہ تحریروں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس انتخاب میں منٹو کی یہ تخلیقات شامل ہیں:

۱۔ اپنے ہمزاد کی نظر میں ۲۔ نیا قانون ۳۔ ہتک ۴۔ ممی ۵۔ پس منظر

عنوان کو مد نظر رکھتے ہوئے اس انتخاب میں صرف منٹو کے افسانوں کو شامل کیا جانا چاہیے تھا لیکن ''اپنے ہمزاد کی نظر میں'' کا شمار منٹو کے مضامین میں ہوتا ہے۔

''ناخن کا قرض'' منٹو کے ہم عصر ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں کے تاثرات پر مشتمل ہے۔ اس حصہ میں برصغیر پاک و ہند کے درج ذیل ادباء، شعرا اور دانش وروں نے منٹو کی بے وقت موت پر اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔

حاجرہ مسرور، اسرار الحق مجاز، ملک راج آنند، ممتاز حسین، ڈاکٹر محمد حسن، شاہد احمد دہلوی، سید احتشام حسین، نصیر انور، حفیظ ہوشیارپوری، محمد حسن عسکری، حیات اللہ انصاری، مختار صدیقی، علی عباس حسینی، سید ابوالخیر کشفی، ممتاز مفتی، خواجہ اطہر حسین، رشید اختر ندوی، حامد جلال، سبط فاروق، یوسف ظفر، عادل رشید، ظفر زبیری، راجندر سنگھ بیدی۔

پاکستان کے صحافتی حلقوں نے مختلف اخباروں کے ذریعے اپنے اپنے تاثراتی مضامین میں منٹو کی موت پر غم کا اظہار کیا۔ ''افکار'' منٹو نمبر کا یہ حصہ ''سوگ میں ہے فسانہ گوئی آج'' میں شامل مضامین روزنامہ ''امروز'' کراچی، روزنامہ ''جنگ'' کراچی، ''ٹائمز'' آف کراچی، ''پاکستان ٹائمز''، روزنامہ ''آفاق''، روزنامہ ''مغربی پاکستان'' لاہور، روزنامہ ''نوائے پاکستان'' لاہور، ''ملت'' لاہور، روزنامہ ''ہلال'' پاکستان لاہور، روزنامہ ''امروز'' کراچی، ''زمیندار'' لاہور، اور ''پنڈی میل'' کی ۱۹/ جنوری تا ۳۱/ جنوری تک کی مختلف اشاعتوں میں شائع ہوئے۔ ان میں دس (۱۰) تاثراتی مضامین جب کہ چھے (۶) اداریے ہیں۔

''تراشے'' کے عنوان سے برصغیر پاک و ہند کے اخبارات میں منٹو کی موت پر کیے گئے اظہار افسوس کے تراشے بھی نقل کیے گئے ہیں۔

''ٹوٹ گئے بینا کے تار'' اس شمارے کا آخری حصہ ہے۔ اس میں فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والی بیس نامور شخصیات محمد نذیر، راما نند ساگر، ایم اے مغنی، شکیل بدایونی، جیمنی دیوان، کیدار شرما، نوشاد علی، ایم۔ صادق، ایس۔ یو۔ سنی، ہیرا لال، ولی محمد خان، ملک راج بھاکڑی، ایف۔ حسن، پی۔ این۔ اروڑہ، رشید پرویز، مدن موہن مہرہ، اے۔ شاہ عاجز، ایس۔ کے اوجھا، واحد قریشی اور ہربنس نے اپنے اپنے انداز میں منٹو کی موت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے منٹو کی ادبیانہ صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔

۱۷۶ صفحات پر مشتمل ''افکار'' کا منٹو نمبر زمانی اعتبار سے پاکستان میں شائع ہونے والا دوسرا ادبی رسالہ ہے۔[۱۹] اس سے قبل ماہنامہ ''نقش'' کراچی نے مارچ ۱۹۵۵ء میں منٹو نمبر شائع کیا تھا۔ مجموعی طور پر ہم اسے ''نقش'' کے منٹو نمبر سے بہتر قرار دے سکتے ہیں کیوں کہ ''افکار'' میں منٹو کی زندگی اور موت پر مختلف حلقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے مضامین، تاثرات وغیرہ شامل ہیں، گو کہ زیادہ تر مضامین فوری ردِ عمل کا نتیجہ ہیں اور ان میں جذباتی پن ضرورت سے زیادہ چھلکتا ہوا نظر آتا ہے لیکن اسے ہم پاکستان میں منٹو شناسی کی پہلی سنجیدہ کوشش قرار دے سکتے ہیں جسے صہبا لکھنوی نے بہت محنت سے مرتب کیا۔

''شاعر'' بمبئی:

ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی نے سعادت حسن منٹو کی وفات کے بعد مارچ، اپریل کا شمارہ سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن کے لیے مخصوص کیا۔ ۱۰۴ صفحات پر مشتمل اس خصوصی شمارے کے مرتبین اعجاز صدیقی، مہندر ناتھ اور شکیل الرحمٰن ہیں۔ بنیادی طور پر یہ شمارہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ ''افکار ادارہ'' پہلا حصہ ہے جس میں اعجاز صدیقی کے تاثرات کے بعد منٹو کی زندگی کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

دوسرا حصہ بعنوان ''نظمیں'' منٹو کے معاصر شعرا کے منظوم خراج عقیدت پر مبنی ہے۔ اس حصے ہیں نامی انصاری، پریم برٹنی اور شاہ ضیاء مہر کی نظمیں بالترتیب مرگ منٹو، منٹو اور باغی افسانہ گو، شامل ہیں۔

تیسرا حصہ بعنوان ''تنقیدات'' وارث علوی، کوثر چاند پوری، مہندر ناتھ، شکیل الرحمٰن باقر مہدی کے مضامین پر محیط ہے۔ اس شمارے کا چوتھا حصہ ''تاثرات'' منٹو کی موت کے بعد لکھے گئے تاثراتی قسم کے مضامین پر مشتمل ہے۔ تاثراتی نوعیت کے یہ مضامین، بعنوان، منٹو، از نریش کمار شاد، منٹو کی موت پر، از، ظفر زبیری، منہ پھٹ، از ضیاء عظیم آبادی، شمع لحد خاموش ہے، نعیم کوثر اور سعادت حسن منٹو میرا محبوب فنکار، از ن م شاہد شامل ہیں۔ جب کہ پانچویں اور آخری حصے منتخبات میں سعادت حسن منٹو کی درج ذیل تحریریں شامل ہیں۔ منٹو اپنے ہمزاد کی نظر میں، افسانہ نگار اور جنسی مسائل، ٹوبہ ٹیک سنگھ، سڑک کے کنارے، بادشاہت کا خاتمہ، نیا قانون، صفائی پسندی، اصلاح، کرامت، آرام کی ضرورت، ہمیشہ کی چھٹی، اور پٹھانستان۔ مرتبین کی ادارتی نوعیت کی تحریروں اور نظموں کے بعد تنقیدی مضامین کے سلسلے میں سب سے پہلا مضمون وارث حسین علوی نے منٹو کی افسانہ نگاری کے عنوان سے لکھا۔ یہ وہی وارث حسین علوی ہیں جنھوں نے بعد میں وارث علوی کے نام سے، منٹو ایک مطالعہ' لکھ کر اپنے آپ کو منٹو کے سنجیدہ نقاد کے طور پر منوایا۔ وارث حسین علوی کے اس طویل مضمون میں منٹو کی افسانہ نگاری کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرا مضمون ''منٹو اور حقیقت نگاری''، از شکیل الرحمٰن ہے۔ وارث علوی کی طرح شکیل الرحمٰن بھی اپنی کتاب ''منٹو شناسی'' کے طفیل منٹو کے اہم ناقد شمار کیے جاتے ہیں۔ زیر تبصرہ رسالے میں شامل اپنے مضمون میں اُنھوں نے سعادت حسن منٹو کو بے رحم حقیقت نگار قرار

دیتے ہوئے ان کے افسانوں میں موجود، سیاسی، سماجی، نفسیاتی اور جنسی حقیقت نگاری کو منٹو کے فن کی اساس قرار دیا۔ بقول مضمون نگار انسانی فطرت اور رویوں کی جتنی سچی اور حقیقی تصویریں منٹو نے دکھائیں کسی اور افسانہ نگار کے ہاں دیکھنے کو نہیں ملتیں۔ باقر مہدی کے مضمون ''منٹو کے کردار'' کے عنوان ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے منٹو کی کردار نگاری کے نمایاں پہلو اس کے معروف نسوانی اور مردانہ کرداروں کی روشنی میں بیان کیے ہیں۔ بقول مضمون نگار، منٹو کو کردار تراشنے میں ملکہ حاصل تھا چناں چہ اُنھوں نے بہت سے زندہ اور لافانی کردار اردو ادب کو دیے ہیں۔ موذیل، سوگندھی، بابو گوپی ناتھ، بشن سنگھ وغیرہ منٹو کی کردار نگاری کے زندہ و جاوید ثبوت ہیں۔ نریش کمار، ظفر زبیری، ضیا، عظیم آبادی اور ن م شاہد کے تعزیتی قسم کے مضامین منٹو کی موت کے بعد دوستانہ، جذباتی اور تاثراتی انداز لیے ہوئے ہیں۔ منٹو کی متوقع مگر بے وقت موت کے بعد ان کی کمی کا احساس مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے سنجیدہ طبقوں کو بہت شدت سے محسوس ہوا۔ چناں چہ وفات کے بعد لکھی گئی اکثر تحریریں منٹو کی فنی اور شخصی عظمت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ احساس ندامت کا بھی اظہار یہ ہیں۔ مہندر ناتھ نے اپنے مضمون ''معصوم افسانہ نگار'' میں سعادت حسن منٹو کے جنسی موضوعات کا بہترین اور مدلل تجزیہ کیا ہے۔ اُن کے مضمون کی تمہید دیکھیے:

> ''منٹو اپنی زندگی میں جنسی افسانوں کی وجہ سے اتنا بدنام ہو گیا تھا کہ بیشتر نقادوں نے اس کے افسانوں کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔''[۲۰]

مہندر ناتھ کے مطابق منٹو ایک بے باک، نڈر اور منہ پھٹ افسانہ نگار ضرور تھا مگر اس کے افسانوں پر فرائڈ کا لیبل لگانا، منٹو کی توہین کرنا ہے۔ منٹو فرائیڈ سے کبھی متاثر نہیں ہوا اور نہ ہی اس نے کبھی فرائیڈ کے نتائج کو پڑھ کر افسانے لکھے اور نہ ہی انسان کی جنسی زندگی کے متعلق کبھی اپنا کوئی فلسفہ پیش کیا۔ بقول مضمون نگار:

> ''آپ کسی افسانہ نگار کو محض سیاسی افسانہ نگار نہیں کہہ سکتے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں افسانہ نگار محض اقتصادی افسانہ نگار ہے، یا جذباتی افسانہ نگار ہے، یا فلاں افسانہ نگار محض ہتھوڑوں اور کدالوں کا افسانہ نگار ہے۔''[۲۱]

پھر منٹو پر محض جنسی افسانہ نگار کا لیبل لگانا کہاں کا انصاف ہے۔ منٹو کے بدنام کرداروں کا حوالہ دیتے ہوئے مضمون نگار کا موقف ہے کہ منٹو کے زیادہ تر کردار منفی ہیں لیکن منفی ہونے کے باوجود بھی یہ کردار زندگی کی منفی قدروں کو عام کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ۳ نظموں ۱۰ تنقیدی و تاثراتی مضامین اور منٹو کی ۱۳ تحریروں کے انتخاب پر مشتمل شاعر کا یہ خصوصی نمبر ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

''پگڈنڈی''، امرتسر:

منٹو کی موت کے فوراً بعد ادبی رسائل و جرائد منٹو کے متعلق خصوصی شماروں کی اشاعت کے ضمن میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوششوں میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ اُس زمانے کے بیشتر مؤقر رسائل و جرائد نے خود کو منٹو کے لیے مخصوص کیا۔ ''ساقی''، ''ادب لطیف'' اور ''سویرا'' پتہ نہیں اس معاملہ میں کیوں خاموش رہے۔ ''پگڈنڈی'' کا منٹو کے بارے میں یہ خصوصی۔ شمارہ ۴، ۵، اپریل، مئی ۱۹۵۵ء کو اشاعت پذیر ہوا۔ ۲۳ چھوٹے بڑے تاثراتی قسم کے مضامین، ۱۰ چھوٹی بڑی نظموں اور سعادت حسن منٹو کی پانچ منتخب تحریروں کے اجتماع سے یہ خصوصی شمارہ مجموعی طور پر ۸۰ صفحات پر محیط ہے۔ شمارے میں شامل تمام

تحریریں دکھ، الم اور حیرت میں ڈوبی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ تحریروں کا یہ جذباتی رنگ اُس دور میں شائع ہونے والے تمام رسائل اور جرائد میں لکھی گئی تحریروں سے جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ''پگڈنڈی'' میں شامل محمود واجد کا سب سے پہلا مضمون منٹو کی موت سے پیدا ہونے والے خلا یا منٹو کی موت سے بالکل بے نیاز ہو کر لکھا گیا ہے۔ قیاس ہے کہ یہ مضمون منٹو کی موت سے پہلے لکھا گیا ہوگا ورنہ دیگر تمام مضامین منٹو کی موت کے بعد کے ردعمل کے طور پر ہی سامنے آئے ہیں۔ محمود واجد کے مضمون ''منٹو کے افسانوں میں نفسیاتی پہلو'' میں عالمانہ کی بجائے طالب علمانہ انداز ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ منٹو کی تحریروں میں موجود ہر خوبی کے ساتھ نفسیات کا لاحقہ لگا دینے کو مضمون نگار نفسیاتی جائزہ تصور کرتے ہیں۔ ''ایک شہید کی یاد میں'' ڈاکٹر محمد حسن کا مضمون ہے۔ مگر فہرست ترتیب اور مقام اشاعت پر اس کے مصنف کا نام ڈاکٹر محمد حسین درج کیا گیا ہے۔ اس بات کی تصدیق اسی مضمون کی اسی عنوان کے تحت دوسری اشاعت سے سامنے آتی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن کے نام سے یہی مضمون ''مشرب'' کراچی کے خاص نمبر مطبوعہ ۱۹۵۵ء ص ۱۷ اور ۱۸ پر موجود ہے۔ اپنے اس مضمون میں اُنھوں نے منٹو کی المناک موت اور ہمارے معاشرتی رویوں کے تذکرے کے بعد منٹو کی افسانہ نگاری کی مختلف خصوصیات مثلاً موضوع، کردار، مشاہدہ، اسلوب اور تکنیک کی بنیاد پر ان کی خدمات کو سراہا۔ ظہیر کاشمیری اور مختار صدیقی نے اپنے الگ الگ مگر ایک ہی عنوان ''منٹو'' کے تحت لکھے گئے مضامین میں اپنے اپنے انداز سے منٹو اور اس کی کہانیوں کو یاد کیا۔ ممتاز مفتی کے مضمون ''منٹو اور اس کا فن'' کا آغاز بھی منٹو کی موت کے ذکر سے ہوتا ہے۔ تمام محررین کی طرح ان کا خیال بھی یہی ہے کہ منٹو کو موت نہیں آسکتی اور وہ اپنی تحریروں سمیت ہمیشہ ادب کی دنیا میں روشن ستارے کی طرح جگمگا جگمگا کر اپنی ہستی کا ثبوت پیش کرتا رہے گا۔ منٹو کے افسانوں کے متعلق ان کا ایک جملہ دیکھئے:

> ''منٹو کا طریق کار اس امر کا شاہد تھا کہ شاعری کی طرح افسانہ بھی آمد کے زور پر لکھا جاسکتا ہے۔''[۲۲]

شاہد دہلوی کا مضمون ''منٹو'' صنف کے اعتبار سے منٹو کا شخصی خاکہ ہے۔ اپنے اس شخصی اور تاثراتی نوعیت کے مضمون میں مضمون نگار نے منٹو کا سراپا کچھ اس انداز سے کھینچا ہے:

> ''دبلا ڈیل، سوکھے سوکھے ہاتھ پاؤں، میانہ قد، چمپئی رنگ، بیقرار آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک، کریم کلر کا سوٹ، سرخ چہچہاتی ٹائی، ایک دھان پان سا جنٹلمین ایک دن مجھ سے ملنے آیا۔''[۲۳]

منٹو سے دہلی میں ہونے والی ملاقاتوں اور اس کے مزاج و کردار، عادات و اطوار کا خوب صورت احاطہ بہت عمدگی سے اس مضمون میں کیا گیا ہے۔ کشمیری لعل ذاکر نے اپنے مضمون میں منٹو کی شخصیت اور فن میں موجود حسن اور اس کی تراش خراش کو منٹو کا شخصی اور فنی خاصہ قرار دیا۔ ممتاز شیریں نے ''منٹو ہمارا موپساں'' میں منٹو کو اردو ادب کا موپساں قرار دیتے ہوئے اسے اس کے افسانوں کی روشنی میں ایک عظیم فنکار قرار دیا۔

''منٹو اور مختصر افسانہ نگاری'' میں آفاق صدیقی، منٹو کے افسانوں میں موجود خارجی محرکات کو فنکارانہ طریقے سے داخلی محرکات میں ڈھال کر اسے منٹو کی فنکارانہ اپج قرار دیتے ہیں بقول مضمون نگار:

> ''منٹو کے مختصر افسانوں میں زندگی کسی ایک مخصوص نظریے کی حلقہ بگوشی قبول کرتی ہوئی نظر نہیں آتی بلکہ اپنی اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ آزادانہ طور پر حرکت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔''[۲۴]

آفاق صدیقی کے مطابق منٹو نے مختصر افسانہ نگاری کو جو اسلوب نگارش دیا ہے اس کا نیا پن اردو افسانے کے لیے ایک مثال کا درجہ رکھتا ہے۔ منٹو کی بے وقت موت کو اُنھوں نے اردو افسانے کے لیے نا قابل تلافی نقصان قرار دیا۔

امرتا پریتم نے ''سیاہ لکیر'' میں منٹو کی بے وقت موت پر افسانوی انداز میں اپنے تاثرات قلمبند کیے۔ جب کہ رام پال نے مختلف افسانوی کرداروں کے تجزیوں کے بعد ان کرداروں کو منٹو کی فنی زندگی کے دوام کا باعث تسلیم کیا۔ ''منٹو میرا یار'' احمد ندیم قاسمی کا منٹو کی وفات کے بعد پہلا اور فوری رد عمل ہے۔ جذبات میں گندھے ان تاثرات کی ایک جھلک دیکھیے:

> ''زخم تازہ ہے، ٹیس شدید ہے اور پلکوں کی جڑیں ابھی تک بھیگی ہوئی ہیں۔ اس لیے اس وقت منٹو کے انتقال پر جی بھر کر لکھنا کم از کم میرے لیے تو ناممکن ہے۔ مجھے اپنے خلوص و عقیدت کی محرومیوں کا ماتم کر لینے دیجیے۔ اس کے بعد ہی میں منٹو کی شخصیت کے بارے میں کچھ کہہ سکوں گا۔''[۲۵]

اگرچہ کہ منٹو اور قاسمی کی دوستی میں اب وہ پہلے والی گرم جوشی بالکل نہ رہی تھی لیکن دونوں نے زندگی کے بہت سے سرد اور گرم موسم ایک ساتھ جھیلے۔ قاسمی صاحب کا جذبات میں ڈوبا یہ رد عمل منٹو کی شخصیت اور فن کے حوالے سے ان کے بعد میں لکھے جانے والے مضامین میں بھی واضح جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

ضیاء عظیم آبادی نے منٹو کی شخصیت اور فن کا جائزہ لیتے ہوئے منٹو کے اوپر لگائے جانے والے جنسی اور فحاشی کے الزامات کو یکسر رد کرتے ہوئے منٹو کے دامن کو اس بدعت سے پاک قرار دیا۔ ان کے بقول:

> ''اس (منٹو) نے اُردو افسانہ نگاری کو نیا طرز تحریر، نئی ہئیت اور نیا تجربہ دیا ہے۔ وہ مستقل ایک دبستان ہے اور غالباً یہ کہنا بجا ہو گا کہ کہانی کے وسیع میدان میں منٹو ایک الگ اور نمایاں حیثیت کا مالک ہے، جس میں نہ پریم چند کی جھلک ہے، نہ ٹیگور کی یخ بستہ فضا۔''[۲۶]

منٹو کی خاکہ نگاری اور ان کے خاکوں کے مجموعہ کا ذکر کرتے ہوئے مضمون نگار سے ایک غلطی ہو گئی جہاں اُنھوں نے منٹو کے خاکوں کے مجموعے کا نام کچھ یوں درج کیا ہے:

> ''وہ پلاٹ سے زیادہ انداز بیان کو اہمیت دیتا تھا اور معمولی سے واقعے کو اس عنوان سے الفاظ کا جامہ پہناتا تھا کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہو جاتی تھی۔ اس کی کتاب ''پردے کے پیچھے'' جو فلمی فنکاروں کے خاکوں کا مجموعہ ہے کہانیوں کے مجموعہ سے کم دلچسپ اور دلکش نہیں۔''[۲۷]

''پردے کے پیچھے'' کے عنوان سے منٹو کے فلمی ستاروں پر مشتمل خاکوں کی کوئی کتاب نہیں۔ گنجے فرشتے (اول) اور بعد میں ''لاؤڈ اسپیکر'' کے علاوہ منٹو کے خاکوں کا کوئی اور مجموعہ ابھی تک منظر عام پر نہیں آیا۔

یوسف ظفر اور انتظار حسین نے اپنے اپنے انداز میں منٹو کی کمی کو محسوس کیا۔ انتظار حسین نے منٹو کی موت کو غیر افسانوی قرار دیتے ہوئے ہنگامہ خیز منٹو کو یوں خاموشی سے گزرتے دیکھا کہ:

> ''نہ تو مال روڈ کا ٹریفک بند ہوا اور نہ ریڈیو پاکستان کے پروگراموں میں خلل آیا اور نہ دفعدار بزرگوں کو میت میں شرکت کی زحمت اٹھانی پڑی۔ مرنے کا یہ طور تو ایک افسانہ نگار کا ہی ہو سکتا ہے۔''[۲۸]

انور عنایت اللہ بھی اپنے مضمون گنجا فرشتہ میں منٹو کی موت پر آنسو بہاتے دکھائی دیتے ہیں۔ شفیق بانو نے ''منٹو کی باتیں'' کرتے ہوئے منٹو سے ہونے والی چند ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے۔ بقول مضمون نگار اُنھوں نے منٹو جیسے فنکار کو پبلشروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پایا تو افسردگی اور ملال کے ساتھ ساتھ اُنھیں بے پناہ صدمہ بھی ہوا۔ کہ ہمارا معاشرہ اتنے بڑے فنکار کے ساتھ کس قسم کا سلوک کر رہا ہے۔

ابو سعید قریشی نے منٹو کی وفات کے فوراً بعد حق دوستی ادا کرتے ہوئے ذاتی یادداشتوں اور منٹو کے ساتھ گزارے گئے اوقات کا اظہار کتابی صورت میں کیا۔ منٹو کے نام سے شائع ہونے والی اس کتاب میں اُنھوں نے بہت تفصیل کے ساتھ منٹو کی شخصیت اور فن کا خاکہ کھینچا ہے۔ اس مختصر سے مضمون۔ بعنوان ''منٹو'' کو منٹو کی موت پر ان کا پہلا اور فوری ردعمل کہا جا سکتا ہے۔ حارث غازی نے فنی و فکری اعتبار سے اُردو کا غیر فانی ادیب قرار دیا تو ابراہیم اختر کو اس بات کا ابھی تک یقین نہیں آیا کہ منٹو مر گیا ہے۔ حال آں کہ اخبارات میں چھپنے والی خبریں اس کی موت پر مہر صداقت ثبت کرنے کے لیے کافی تھیں۔ شمارے کے آخری مضمون ''منٹو اور فلم''، میں گور نام کھنہ منٹو کے فلمی سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سعادت حسن منٹو فلمی دنیا میں اُس وقت داخل ہوئے جب فلمی دنیا میں ناٹک کے منشیوں کا دور دورہ تھا۔ اور ہماری فلم انڈسٹری ادب کے نام سے بھی واقف نہ تھی۔'' [۲۹]

مضمون نگار کے بقول منٹو نے جتنی بھی فلمی کہانیاں لکھیں ان میں سے بیشتر ایسی تھیں جن میں سماج کے اجارہ داروں کی ریاکاری کا صحیح عکس پیش کیا گیا ہے۔ ان میں بناوٹ نہیں تھی اور ان کی کہانیاں فرسودہ اور بے معنی خیالات کا پروپیگنڈا نہیں تھیں۔ ۸۰ صفحات پر مشتمل ماہنامہ پگڈنڈی کے اس شمارے میں سعادت حسن منٹو کے موت پر تحریر کیے گئے ان مضامین میں زیادہ تر منٹو کے موت سے ابھرنے والے المیہ تاثرات کو قلمبند کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان مضامین میں تفصیل کی بجائے اختصار کا پہلو زیادہ غالب ہے۔

''گل خنداں''، لاہور:

ماہنامہ ''گل خنداں'' لاہور نے جون ۱۹۵۵ء میں منٹو نمبر نکالا، جسے مکتبہ گل خنداں، کشمیری بازار، لاہور سے عبدالرؤف بی اے اور امین ہاشمی نے ترتیب دے کر شائع کیا۔ ۱۶۰ صفحات پر مشتمل اس شمارے میں منٹو کی شخصیت اور فن پر دس (۱۰) مضامین کے علاوہ پانچ (۵) شعرا کا منظوم خراج عقیدت بھی شامل ہے جب کہ آخر میں منٹو کے آخری دور کی تخلیقات میں سے دس (۱۰) تحریروں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ پہلے صفحہ پر رسالے کا ٹائٹل جب کہ دوسرے صفحے پر منٹو کی تصویر کے اوپر منٹو کا وہ کتبہ درج کیا گیا ہے جو اُنھوں نے ظفر زبیری کو نصیر انور کے گھر آٹو گراف دیتے ہوئے تحریر کیا تھا۔ صفحہ نمبر ۳ پر فہرست مضامین جب کہ اگلے صفحہ پر مختصر سوانحی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

۶۳ صفحات پر مشتمل سلسلہ مضامین میں سب سے پہلا مضمون کرشن چندر کا ''سعادت حسن منٹو'' ہے۔ یہ مضمون اس سے قبل منٹو کی زندگی ہی میں شائع ہوا تھا۔ کتب پبلی شرز، بمبئی نے ''نئے ادب کے معمار'' کے سلسلہ میں اسے ۱۹۴۸ء میں شائع کیا تھا۔ مرتبین نے اس مضمون کو جوں کا توں شائع کرنے کی بجائے پیرا گراف کی ترتیب میں تبدیلی کر کے نئے مضمون کے طور پر شامل کر دیا ہے۔ [۳۰]

''منٹو'' سعادت حسن منٹو کا اپنا لکھا ہوا مضمون ہے۔ اس سے قبل یہ مضمون، ماہنامہ ''افکار'' میں ''منٹو، اپنے ہمزاد کی نظر میں'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ منٹو نے یہ مضمون حلقہ ارباب ذوق کے ہفتہ وار تنقیدی اجلاس میں پڑھا تھا۔

ممتاز مفتی کا مضمون ''منٹو اور اس کا فن'' اس سے قبل ''افکار'' کے منٹو نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں اُنھوں نے منٹو کے ایک مقالے کا ذکر کیا ہے جو اُنھوں نے حلقہ ارباب ذوق کی نشست میں پڑھا تھا اور اُس میں اُنھوں نے کہا تھا کہ ''اور یہ بھی ممکن ہے کہ سعادت حسن مر جائے، منٹو زندہ رہے۔'' اُن کے مطابق منٹو کا یہ خیال سچ ثابت ہوا ہے۔ ممتاز مفتی کے خیال میں افسانہ نویسی فن کاری کی نسبت کاری گری کے زیادہ قریب ہے لیکن منٹو سے مل کر اُنھیں اپنی رائے میں ترمیم کرنی پڑی۔ کیونکہ منٹو کا طریق کار اس امر کا شاہد تھا کہ شاعری کی طرح افسانہ بھی آمد کے زور پر لکھا جا سکتا ہے۔ مضمون نگار کے مطابق منٹو کو افسانہ لکھنے سے پہلے تفصیلات سوچنے اور اُنھیں مناسب طور پر جوڑنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

شورش کاشمیری کا مضمون ''چند یادیں'' [۳۱] کے بعد سلیم چودھری کا مضمون بعنوان ''سعادت حسن منٹو'' اس شمارے کا پہلا ایسا مضمون ہے جو اس سے قبل کہیں شائع نہیں ہوا۔ یہ مضمون دراصل اُن یادداشتوں پر مشتمل ہے جو مضمون نگار کی منٹو سے ملاقاتوں کے نتیجہ میں سامنے آئیں۔ مختلف واقعات کے ذریعے مضمون نگار نے منٹو کی دوست پروری اور انسان دوستی کو ثابت کیا ہے۔ اُن کے مطابق منٹو کی نظروں میں سماجی مرتبہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا اور وہ سب لوگوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتے تھے اور برابری کا سلوک روا رکھتے تھے۔ منٹو نے کبھی اپنے آپ کو قابل پرستش بنا کر پیش نہیں کیا اور نہ ہی اپنے مداحوں کو پجاری سمجھا بلکہ وہ تو سیدھے سادھے انداز میں عام فہم اور روزمرہ کی باتیں کرتے تھے لیکن اس انداز میں کہ سننے والا جھوم جھوم جاتا تھا۔

سید امجد الطاف اپنے مضمون ''منٹو۔ ایک نفاست پسند پا انداز'' میں کہتے ہیں کہ منٹو حسین بھی تھا اور نفاست پسند بھی، وہ نہ صرف حُسن کو پسند کرتا تھا بلکہ اسے تخلیق بھی کرتا تھا۔ منٹو بے داغ اور صاف ستھرا لباس پہنا کرتا تھا اور ہر چیز کو سلیقے سے رکھنا اور دیکھنا چاہتا تھا۔ حُسن اور نفاست پسندی کے باوجود وہ مکروہات اور بدصورتی سے نظر چرانے کی بجائے اسے کرید کرید کر دیکھتا تھا اور گندگی میں سے بھی حُسن کو تلاش کر لاتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اُس نے اس گندگی کو صاف ستھرا لباس پہنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اسے جوں کا توں ہمارے سامنے لا کھڑا کیا۔ منٹو کو اپنی سفید پوشی اور وضع داری کی بڑی بھاری قیمت چکانا پڑی۔ خصوصاً زندگی کے آخری سالوں میں تو اُس پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ لوگوں نے اُس کی محض کمزوریوں پر ہی نظر رکھی ہے اور اسے ایک عام گناہگار انسان سمجھنے کی بجائے نبیوں کا قاتل اور مذہب کا منکر سمجھا گیا حال آں کہ وہ اپنا ہر افسانہ خدا کے نام سے شروع کرتا تھا اور روحانیت کی عظمت کا بڑے سے بڑے مُلا سے بھی زیادہ قائل تھا۔

یوسف ظفر کے ''تاثرات'' اس سے قبل ''افکار'' کے منٹو نمبر میں شائع ہوئے تھے۔ یہ ایک جذباتی قسم کا ردِ عمل ہے جو مضمون نگار نے منٹو کی موت کی خبر سن کر ظاہر کیا تھا۔

احمد شجاع پاشا کے مطابق منٹو سے پہلی ملاقات ہی دونوں کی طویل دوستی کی تمہید بن گئی تھی۔ ''منٹو ایک انسان'' میں وہ منٹو کے دوستوں اور نقادوں کی اس رائے سے اختلاف کرتے ہیں کہ منٹو کی زندگی مسلسل عذاب تھی اور موت نے اُسے اس عذاب سے نجات دلا دی تھی۔ لکھتے ہیں:

''میں نے شدت سے اس بات کو محسوس کیا تھا کہ وہ زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا تھا اور اس نے شجر ممنوعہ کے ہر ریشے سے زندگی کا رس نچوڑا۔'' [۳۲]

مضمون نگار کے مطابق منٹو سمرسٹ ماہم سے بہت متاثر تھا اور اس جیسا لکھنے کی خواہش ظاہر کیا کرتا تھا۔ اُنھوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ علی گڑھ یونی ورسٹی سے اعلیٰ تعلیم کے حصول میں ناکامی نے بطور ادیب منٹو کو فائدہ پہنچایا:

''اگر وہ علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو وثوق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا اور وہ نئے نئے باب جو منٹو کے ناخن تدبیر نے وا کیے یونہی بند رہتے۔ کیوں کہ منٹو نے خود مجھ سے کہا کہ اعلیٰ تعلیم کے بعد اس کے ذہن میں زندگی گزارنے کے کئی منصوبے موجود تھے۔'' [۳۳]

وہ منٹو کو اعلیٰ پائے کا ادیب قرار دیتے ہیں لیکن بطور فلمی کہانی نویس اسے زیادہ کامیاب نہیں گردانتے۔ منٹو نے فلمی کہانیاں محض معاشی ضروریات کی تکمیل کے لیے ہی لکھیں اور ان پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ مضمون نگار کے مطابق اُنھیں یہ بات پسند نہیں تھی کہ ادیب فلموں کی طرف متوجہ ہوں کیوں کہ اسٹوڈیوز کی گھٹی گھٹی فضا اور گندہ ماحول ادیبوں کے لیے سم قاتل کا درجہ رکھتا ہے۔
حمید اختر اپنے مضمون ''منٹو زندہ ہے'' کے آغاز میں اس امر پر افسوس کرتے ہیں کہ تاجر پیشہ افراد نے منٹو کی زندگی میں تو اس کا نام استعمال کر کے پیسہ کمایا ہی تھا اب مرنے کے بعد بھی اُنھوں نے تجارت شروع کر رکھی ہے۔ مضمون نگار کے مطابق منٹو کے بارے میں عام تاثر یہی پایا جاتا ہے کہ وہ ضدی، انا پرست، شرابی اور منہ پھٹ قسم کا انسان تھا لیکن میں نے اسے اپنی بیوی اور بچیوں کے مستقبل کے لیے پریشانی کے عالم میں دیکھا ہے اور اس روپ میں منٹو کو دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوتی تھی۔ منٹو بظاہر جیسا نظر آتا تھا وہ ایسا نہیں تھا بلکہ بہت ہی نرم دل شخصیت کا مالک تھا۔ منٹو کی بے لگامی اور ہنگامہ پسندی دراصل ایک خول تھا جو اس نے اپنے اوپر چڑھا رکھا تھا:

''منٹو زندہ تھا تو عوام کو امید تھی کہ جب بھی کہیں کوئی بے انصافی ہو گی منٹو کے نوٹس میں آجائے گی اور پھر وہ سماج کو، عوام کو، حکومت کو مجبور کرے گا کہ اس حقیقت کے گھناؤنے گوشے کو کم از کم جھانک کر دیکھ لے جسے دیکھ کر کراہت پیدا ہوتی ہے اور ہم لوگ دانستہ آنکھیں چرا لیتے ہیں۔'' [۳۴]

یہ ابتدائی لائنیں بلقیس عابد علی کے مضمون ''منٹو مر گیا'' سے لی گئی ہیں۔ تنقیدی اصولوں سے ناواقفیت کا اعتراف کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں کہ ہمارے سماجی ناسور جو جگہ جگہ سے رِستے معلوم ہوتے ہیں، منٹو اُن پر کسی ماہر نباض کی طرح انگلی رکھ دیتا، جس سے سارا بدن تلملا اُٹھتا۔ مضمون نگار کے مطابق اُنھوں نے منٹو کو وائی ایم سی اے ہال میں دیکھا تھا جہاں وہ اپنا افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' پڑھ رہے تھے۔ حال آں کہ میں اسے پہچانتی نہیں تھی لیکن افسانے کی اپچ اور انوکھے پن کو بھانپ کر میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہو نہ ہو یہ منٹو ہے۔

مضامین کے بعد شاد امرتسری، لطیف انور، نور بجنوری، خاطر غزنوی اور قتیل شفائی کی نظمیں اور اشعار شامل کیے گئے جو اُنھوں نے منٹو کی وفات کے سلسلہ میں لکھے تھے۔ لطیف انور کی نظم بعنوان ''سعادت حسن منٹو'' پہلی دفعہ شائع ہوئی ہے جب کہ دیگر

چاروں شعرا کا کلام اس سے قبل ''افکار'' کے منٹو نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔[۳۵] شمارے کا آخری حصہ منٹو کے آخری دور کی تحریروں کے انتخاب پر مشتمل ہے اس میں منٹو کی مندرجہ ذیل تحریروں کو شامل کیا گیا ہے:

غالب، چودھویں اور حشمت خان، ٹوبہ ٹیک سنگھ، محمودہ، شاہ دولے کا چوہا، خواب خرگوش، تین موٹی عورتیں، آرٹسٹ لوگ، حافظ حسن دین، پھاتو۔

۱۶۰ صفحات پر مشتمل اس شمارے میں مجموعی طور پر ۱۰، مضامین، ۵ نظمیں / غزلیں اور منٹو کی ۹ تحریریں شامل ہیں۔ کرشن چندر، ممتاز مفتی، شورش کاشمیری اور یوسف ظفر کے مضامین سمیت منٹو کا اپنا لکھا ہوا مضمون اس سے قبل ''افکار'' کے منٹو نمبر میں شائع ہوئے تھے۔ اسی طرح شاد امرتسری، نور بجنوری، خاطر غزنوی اور قتیل شفائی کا منظوم کلام بھی مذکورہ رسالے میں شائع ہو چکا ہے۔ گویا کل پانچ مضامین اور ایک نظم پہلی بار اشاعت پذیر ہوئے۔ جب کہ منٹو کی تحریروں کا انتخاب پہلے ہی اُن کے مختلف مجموعوں میں چھپ چکا تھا۔ مرتبین کی نگاہوں سے ''افکار'' کا منٹو نمبر یقیناً گزرا ہوگا۔ اگر وہ مضامین کی تکرار کی بجائے نئے مضامین شامل کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا اور یہ مضامین اُنھیں بآسانی دستیاب بھی ہو سکتے تھے کیوں کہ منٹو پر لکھنے والوں کی کسی دور میں بھی کمی نہیں رہی۔

''نقوش''، لاہور:

ادبی رسالہ ''نقوش'' لاہور کا منٹو نمبر (۵۰-۴۹) رسالہ کے مدیر محمد طفیل نے ۱۹۵۵ء میں شائع کیا۔ اسے چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:۔ پہلے حصے میں منٹو کی بیس غیر مطبوعہ کہانیاں، دوسرے میں منٹو کی تحریروں میں سے دس کا انتخاب جب کہ تیسرے اور چوتھے حصے میں منٹو کی شخصیت اور فن پر مجموعی طور پر پندرہ مضامین شامل ہیں۔

پہلے حصہ میں منٹو کی مندرجہ ذیل بیس کہانیوں کو اس اعلان کے ساتھ شائع کیا گیا کہ اس سے پہلے منٹو کی یہ کہانیاں کہیں بھی شائع نہیں ہوئیں۔

بائی بائی، مائی جنتے، جان محمد، بارش، افشائے راز، آمنہ، تصویر، ملاوٹ، بس اسٹینڈ، نعیم، بدتمیزی، قادرا قصائی، خودکشی، پشاور سے لاہور تک، بجلی پہلوان، ایک زاہدہ ایک فاحشہ، شیدا، بڑھا کھوسٹ، انارکلی، کمیشن۔

دوسرا حصہ، منٹو کی کہانیاں، میں، ڈراموں اور مضامین میں سے مندرجہ ذیل نو(۹) تحریروں کا انتخاب شامل ہے:

ہتک، موذیل، ممی، بابو گوپی ناتھ، کالی شلوار، ٹوبہ ٹیک سنگھ، اس منجدھار میں، نیا قانون، شہید ساز۔

تیسرا حصہ منٹو کے فن سے متعلق سات تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔ ان میں ''منٹو کی فنی تکمیل'' از ممتاز شیریں، ''منٹو کا فن'' از وقار عظیم، ''منٹو کا مقام'' از محمد حسن عسکری، ''گنجا فرشتہ'' از سید عابد علی عابد، ''منٹو'' از ابواللیث صدیقی، ''منٹو کی حقیقت نگاری'' از عبادت بریلوی اور ''سعادت حسن منٹو کی یاد میں'' از ممتاز حسین شامل ہیں۔

ممتاز شیریں کا مضمون ''منٹو کی فنی تکمیل'' کی یہ اوّلین اشاعت ہے اس کے بعد یہ مضمون ان کی تنقیدی کتاب ''معیار'' میں ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا [۳۶] جب کہ مصنفہ کی کتاب ''منٹو: نوری نہ ناری'' مرتبہ آصف فرخی میں اسے دوبارہ شامل کیا گیا۔[۳۷] وقار عظیم نے اپنے مضمون ''منٹو کا فن'' میں افسانے کے فن اور تکنیک کے تناظر میں منٹو کے افسانوں کا فنی و فکری جائزہ لیا۔ بعد میں ان کا یہ مضمون کتابی صورت میں شائع ہوا۔[۳۸]

''منٹو کا مقام'' میں حسن عسکری کے مطابق منٹو کو افسانے کی بہت بڑی روایت ورثہ میں ملی تھی۔ اگر وہ موپساں یا چیخوف کا مقابلہ نہیں بھی کر سکتا تو اس میں قصور منٹو کا نہیں۔ منٹو کا مقام متعین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس روایت کے ساتھ ساتھ جو اسے ورثہ میں ملی اس کے معاصرین کے فن کا جائزہ بھی لیا جائے۔ پھر احساس ہوگا کہ منٹو نے اُردو ادب کو کتنا بڑا سرمایہ دیا۔ لکھتے ہیں:

''منٹو نے جو کنواں کھودا تھا وہ ٹیڑھا بھینگا سہی، اور اس میں سے جو پانی نکلا وہ گدلا یا کھارا سہی، مگر دو باتیں ایسی ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک تو یہ کہ منٹو نے کنواں کھودا ضرور، دوسرے یہ کہ اس میں سے پانی نکالا۔ اب ذرا گنیے تو سہی کہ اُردو کے کتنے ادیبوں کے متعلق یہ دونوں باتیں کہی جا سکتی ہیں۔'' [۳۹]

وقار عظیم نے چونکانے کو منٹو کی کمزوری قرار دیا تھا۔ حسن عسکری اسے خوبی قرار دیتے ہوئے ادب کا مقدس فریضہ سمجھتے ہیں۔ اُن کے مطابق اگر چونکانا ایک ادبی نقص ہے تو چونکنے سے ڈرنا بھی ایک ذہنی بیماری اور کمزور شخصیت کی نشانی ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ چونکانے کے بعد منٹو ہمیں دکھاتا کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اگر ہمیں جھنجوڑ کر جگانے کے بعد منٹو نے ہمیں انسانی فطرت اور انسانی معاشرے کا کوئی تماشا نہیں دکھایا، اگر اس نے ہمارے اندر زندگی کا کوئی نیا شعور پیدا نہیں کیا، تو پھر ہم اسے گالیاں دینے میں حق بجانب ہوں گے کہ اس نے ہمیں چین سے سونے بھی نہیں دیا لیکن کیا آپ ''نیا قانون''، ''ہتک''، ''بابو گوپی ناتھ'' جیسے افسانے پڑھ کر دیانت داری کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ منٹو نے ہمیں چونکا کر مفت میں ہماری نیند خراب کرائی۔'' [۴۰]

اُنھوں نے اعتراف کیا کہ منٹو نے بہت اچھے افسانے بھی لکھے اور برے بھی۔ برے افسانوں کو بُرا سمجھنے کے باوجود اُنھوں نے منٹو کو اُردو کا بڑا افسانہ نگار قرار دیا۔

سید عابد علی عابد منٹو کو حقیقت کا عکاس قرار دیتے ہوئے اپنے مضمون ''گنجا فرشتہ'' میں منٹو کی جزئیات نگاری اور واقعاتی بیان کو سراہتے ہیں۔ اُنھوں نے ''گنجے فرشتے'' کے ساتھ ساتھ منٹو کے افسانوں اور ڈراموں پر بھی بحث کی۔ اس طرح اُن کا یہ مضمون بیک وقت منٹو کی خاکہ نگاری، افسانہ نگاری اور ڈراما نویسی کا احاطہ کرتا ہے۔ منٹو کی خاکہ نگاری پر بحث کرتے ہوئے اُنھوں نے رائے دی کہ ''گنجے فرشتے'' میں منٹو نے بہت سے عناصر کو سمو کر سوانح نگاری کا ایک نیا اُسلوب پیدا کیا ہے۔ منٹو کا بے تکلف انداز نگارش ان کے خاکوں کی شخصیتوں کو ایک لڑی میں پرو دیتا ہے اور مزید یہ کہ کتاب میں شامل بارہ شخصیات ہی ہمارے سامنے نہیں آتیں بلکہ ایک تیرہویں شخصیت بھی کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے اور وہ خود منٹو کی شخصیت ہے۔ ان کے مطابق منٹو کی سوانح سے متعلق بہت سی معلومات ان خاکوں کی مدد سے معلوم کی جا سکتی ہیں۔ سید عابد علی عابد کے مطابق منٹو ادب فہم انسان تھا لیکن اس کا مطالعہ وسیع نہیں تھا۔ چناں چہ جب وہ نقاد کا بہروپ دھارتا ہے تو اس وقت بہت دلچسپ صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ کبھی تو پیشہ ور نقاد بھی اس کی بات پر بغلیں جھانکنے لگتے ہیں اور کبھی کبھی وہ ایسا شگوفہ چھوڑ دیتا ہے جس کا اثبات ممکن نہیں ہوتا۔ عصمت چغتائی کے خاکے میں لفظ ''دست درازی'' اور ''دراز دستی'' کی بحث کا حوالہ دیتے ہوئے وہ منٹو کی اس بات سے اتفاق نہیں کرتے کہ اصل لفظ ''دراز دستی'' ہے۔ اُنھوں نے رائے دی کہ منٹو نے سو سے زیادہ ڈرامے لکھنے کے باوجود ان کی تکنیک یا موضوع پر اتنی توجہ نہیں دی جتنی کہ افسانوں پر دی ہے۔

منٹو کی فلمی کہانی ''کٹاری'' کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے مضمون نگار نے کہا کہ اگر یہی موضوع منٹو اپنے افسانے کے لیے منتخب کرتا تو اس کی صورت مختلف ہوتی۔

ابواللّیث صدیقی کے مضمون ''منٹو'' میں افسانے کے فنی قوانین کی رو سے منٹو کے فحش اور غیر فحش افسانوں کا جائزہ ان کے تین افسانوی مجموعوں ''منٹو کے افسانے''، ''دھواں'' اور ''سرکنڈوں کے پیچھے'' کی روشنی میں لیا گیا ہے۔ اُنھوں نے ''ہتک'' اور ''نیا قانون'' میں منٹو کی جزئیات نگاری کو سراہنے کے بعد کہا کہ اس قسم کے افسانوں میں منٹو نے جزئیات کو پیش کر کے بڑا فائدہ اُٹھایا ہے۔ لیکن جہاں جہاں منٹو نے بعض اعضا اور اعمال و افعال اور حرکات و سکنات کے بیان میں جزئیات سے کام لیا ہے وہاں صاف محسوس ہوتا ہے کہ منٹو صرف مزے لینے کی خاطر ایسے لکھ رہا ہے اور اس کا مقصد سوائے لذتیت کے اور کچھ نہیں۔ ''پھاہا''، ''دھواں''، ''بلاؤز''، ''کالی شلوار''، ''مصری کی ڈلی''، ''خوشیا'' اور ''مسز ڈی کوسٹا'' اس کی واضح مثالیں ہیں۔

محمد حسن عسکری نے کہا تھا کہ منٹو کے بُرے افسانوں کی بُرا سمجھنے کے باوجود میں منٹو کو اُردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار کہتا ہوں۔ [۴۱] کم و بیش اسی رائے کو ذرا سا نرم کرتے ہوئے عبادت بریلوی اپنے مضمون ''منٹو کی حقیقت نگاری'' کے آغاز میں کہتے ہیں:

> ''منٹو اُردو کا سب سے بڑا نہیں تو بڑا افسانہ نگار ضرور ہے۔ اُس نے بہت اچھے افسانے بھی لکھے اور بہت بُرے بھی۔ اس کے یہاں بلندی اور پستی، روشنی اور تاریکی، سب سے بیک وقت دوچار ہونا پڑتا ہے۔'' [۴۲]

عبادت بریلوی منٹو کی کہانیوں کے موضوعات کو زندگی سے جڑا ہوا محسوس کرتے ہیں اور چوں کہ زندگی متنوّع ہے اس لیے منٹو کے موضوعات میں بھی تنوع پایا جاتا ہے۔ منٹو نے بیشتر افسانوں میں زندگی کو جس طرح دیکھا ہے اسے ہو بہو پیش کر دیا ہے اور چوں کہ اُس کا حقیقت نگاری کا کوئی مخصوص نظریہ نہیں اس لیے کہیں وہ زندگی کے عمرانی اور سماجی پہلوؤں کو حقائق کے روپ میں دیکھتا ہے اور کہیں انسانی زندگی سے عام واقفیت اس کے یہاں حقائق کو رونما کرتی ہے۔

چناں چہ انسانی زندگی سے متعلق حقائق کے بیان ہی کی وجہ سے مضمون نگار منٹو کو حقیقت نگار قرار دیتے ہیں۔ اُنھوں نے منٹو کے مختلف موضوعات پر مشتمل افسانوں کا تجزیہ کر کے ان حقائق کی نشان دہی کی جنھیں منٹو نے اپنے افسانوں میں آشکار کیا۔ سیاسی، سماجی، عمرانی، جنسی اور نفسیاتی موضوعات پر مبنی افسانوں اور ان میں شامل کرداروں کے تجزیہ سے منٹو کی حقیقت نگاری کی معراج ان کے چار افسانوں ''ہتک''، ''خوشیا''، ''کالی شلوار'' اور ''پہچان'' کو قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''منٹو نے ان موضوعات پر اور بھی افسانے لکھے ہیں لیکن حقیقت نگاری کا جو کمال ان چار افسانوں میں ملتا ہے وہ کسی اور میں نظر نہیں آتا۔ ان افسانوں میں طوائف کے ذکر کے ساتھ کسی قسم کی لذت، کسی طرح کی جنسی تسکین یا جسمانی آسودگی کا خیال نہیں پیدا ہوتا۔'' [۴۳]

''سعادت حسن منٹو کی یاد میں'' ممتاز حسین کا مضمون ہے۔ اُنھوں نے منٹو کی موت کے بعد اس کے جنازہ کی منظر کشی کرتے ہوئے منٹو کے مختلف افسانوی کرداروں کی تمثیل سے ان کے فن کا جائزہ لیا۔

آخری حصہ منٹو کی شخصیت پر لکھے گئے آٹھ خاکہ نما مضامین پر مشتمل ہے۔ ان میں ''میرا دوست میرا دشمن'' از عصمت چغتائی، ''منٹو میرا دشمن'' از اشک، ''جو بک نہ سکا'' از حاجرہ مسرور، ''رحم دل دہشت پسند'' ابو سعید قریشی، ''منٹو ماموں کی موت''

از حامد جلال، ''منٹو کی موت'' از غلام عباس، ''منٹو کا ایک خط'' از محمد طفیل اور ''منٹو کی چند یادیں اور چند خطوط'' از احمد ندیم قاسمی شامل ہیں۔

عصمت چغتائی نے ''میرا دوست میرا دشمن'' میں منٹو سے اپنی پہلی ملاقات سے لے کر آخری ملاقات، حتیٰ کہ منٹو کے پاکستان ہجرت کر جانے کے بعد بہت سی سنی سنائی باتوں کو اپنے مضمون میں بیان کیا ہے۔اس مضمون میں عصمت چغتائی نے نجی زندگی سمیت منٹو کے عادات واطوار، نظریہ محبت، بحث و مباحثہ، شراب نوشی، بیوی اور بچوں سے محبت اور نظریہ محبت کو اپنے روایتی اُسلوب میں پیش کیا ہے۔ عصمت چوں کہ خود ایک باکمال افسانہ نگار ہیں اس لیے اُن کے اُسلوب کی روانگی قاری کو اپنی رو میں بہا کر لے جاتی ہے۔

منٹو کی آنکھوں کو مور کے پروں سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

''موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے لپکتی ہوئی بڑی بڑی سیاہ پتلیوں والی آنکھیں جنھیں دیکھ کر مجھے بے ساختہ مور کے پر یاد آگئے۔ مور کے پر اور آنکھوں کا کیا جوڑ؟ یہ مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکا مگر جب بھی میں نے ان آنکھوں کو دیکھا مجھے مور کے پر یاد آگئے۔''[۴۴]

عصمت نے منٹو کے ساتھ ہونے والے مباحثوں کا بھی ذکر کیا جو ہمیشہ کج بحثی سے ہوتے ہوئے بغیر کسی نتیجہ کے لڑائی پر ختم ہوتے۔ منٹو کے افسانوں میں جو فحاشی اور لذتیت نظر آتی ہے،اپنی نجی زندگی میں وہ اس سے یکسر مختلف تھا۔ عصمت نے منٹو کی محبت کو پھسپھسا قرار دیا جو اسے بیگو سے تھی اور جس کا اظہار منٹو کے افسانوں ''مصری کی ڈلی'' اور ''بیگو'' وغیرہ میں ہوتا ہے۔ جب منٹو کے عشق پر عصمت نے چوٹ کی، تو منٹو نے اسے جواباً جو کلمات کہے وہ اس کے عورت اور محبت کے تصور کی عکاسی کرتے ہیں:

''تو اور کیا کرتا۔ اس کے ساتھ سو جاتا۔ ایک حرامی پلا اس کی گود میں چھوڑ کر آج اس کی یاد میں اپنی مردانگی کی ڈینگیں مارتا۔''[۴۵]

منٹو جنسی آلائشوں کے بجائے محبت کے پاکیزہ تصور پر یقین رکھتا ہے۔ اس کے افسانوں میں آپ کو جتنی بھی فحاشی نظر آئے گی وہ محض افسانوں کی حد تک ہے یا یوں کہیے کہ وہاں وہ معاشرتی صورت حال کا بیان کرتا ہے اور جو چیز اس کے مشاہدے میں آتی جاتی ہے اُسے افسانوی انداز میں جوں کا توں بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اس کی ذاتی / نجی زندگی اس قسم کی آلائشوں سے قطعاً پاک تھی اور وہ محبت کے مطہر جذبے کا قائل تھا۔ مضمون کے آخری حصے میں بعض مقامات پر عصمت جذباتی ہو گئی ہیں۔ نہ جانے کس مصلحت نے اُنھیں اس قسم کی بیان دینے پر مجبور کیا کہ منٹو پاکستان شہرت اور الاٹمنٹوں کے چکر میں گیا تھا لیکن وہاں اُس کی بات نہ بنی۔ فحاشی کے سلسلہ میں جیل ہوئی اور دو بار پاگل خانے داخل ہوا۔ اس حوالے سے لکھتی ہیں:

''پھر معلوم ہوا منٹو پر مقدمہ چلا اور جیل ہو گئی۔۔۔۔ پھر معلوم ہوا کہ دماغ چل نکلا اور پاگل خانے میں یار دوست پہنچا آئے ہیں۔''[۴۶]

عصمت چغتائی نے منٹو کے پاکستان آنے کی جو وجوہات بتائی ہیں حقائق اس کے بر خلاف ہیں۔ پاکستان آکر منٹو نے الاٹمنٹوں میں محض اس قدر ہی دلچسپی لی کہ اپنے نام الاٹ ہونے والے برف کے کارخانے کو بقول شورش کاشمیری یہ کہہ کر واپس کر آئے کہ

''بھاری پتھر تھا اٹھ نہ سکا چوم کے چھوڑ دیا۔''[۴۷] رہی شہرت تو شروع سے لے کر آج تک وہ عصمت چغتائی سے زیادہ مشہور اور بڑے افسانہ نگار چلے آ رہے ہیں۔ پاکستان آنے تک منٹو ایک متنازعہ اور شہرت یافتہ افسانہ نگار کے طور پر برصغیر پاک و ہند میں جانا جاتا تھا۔ اسی طرح نہ ہی منٹو خلل دماغ کے باعث پاگل خانے میں داخل ہوئے اور نہ ہی کسی افسانہ کے سلسلے میں مقدمہ کے بعد جیل گئے۔

ڈاکٹر علی ثنا بخاری اپنے مضمون ''منٹو کے بارے میں چند غلط فہمیاں'' میں عصمت چغتائی کے ان بیانات کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عصمت چغتائی اگر لاہور سے دور منٹو کے احوال سے غافل اور غلط فہمی کا شکار تھیں تو اُنھیں متذکرہ بالا غلط بیان کے ساتھ منٹو پر مضمون کی صورت احسان کرنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے تھی۔ ایک لمحے کے لیے اگر یہ تصور کر لیا جائے کہ عصمت نے جو لکھا نیک نیتی سے لکھا تو مدیر محمد طفیل کی نیک نیتی تلاش کرنے کے لیے ہم کس عذر کا سہارا لیں۔ وہ تو لاہور میں تھے۔ آخر وقت تک، جس بھی حوالے سے ہو، منٹو کے ساتھ ان کی ملاقات رہی۔ وہ منٹو کے تمام احوال سے باخبر تھے۔ ایڈیٹر ہونے کے ناتے ان کا فرض تھا کہ وہ ایسی اغلاط سے لکھنے والوں کو باخبر کرتے۔ ایسی تضحیک آمیز اور دُور از حقائق تحریروں کو نقوش کی ضخامت بڑھانے کا ذریعہ نہ بناتے لیکن اُنھوں نے ایسا کیا اور میں سمجھتا ہوں یہ اخلاقی ہی نہیں تعزیری جرم بھی ہے۔''[۴۸]

اوپندر ناتھ اشک کا مضمون ''منٹو میرا دشمن'' نامکمل صورت میں نقوش کے منٹو نمبر میں شائع ہوا۔ مکمل صورت میں یہ مضمون اوپندر ناتھ اشک کی کتاب ''منٹو میرا دشمن'' ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔[۴۹]

حاجرہ مسرور نے اپنے مضمون ''جو بک نہ سکا'' کا آغاز اس واقعہ کو یاد کر کے کیا جب منٹو نے ۱۹۴۲ء میں دیگر افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ اُنھیں بھی ''دھواں'' کے مقدمہ کے سلسلہ میں بطور گواہ سمن بھجوائے تھے۔ اُنھوں نے اس خط کا ذکر بھی کیا جو اُنھوں نے خوف، بیماری اور کم سنی جیسی ملی جلی وجوہات کی بناء پر منٹو کے مقدمہ میں بطور گواہ نہ پیش ہو سکنے پر معذرت خواہانہ انداز میں لکھا تھا اور بعد میں منٹو نے اپنے ایک مجموعے کا انتساب اسی خط کے نام کر دیا تھا۔ گو کہ اس میں سے مکتوب نگار کا نام حذف کر دیا گیا تھا۔ حاجرہ مسرور کا خیال ہے کہ منٹو شدید اور جری قسم کے افسانہ نگار تھے جنھوں نے پہلی بار ادب میں گرے پڑے طبقے کے مسائل کو بطور خاص موضوع بنایا اور ایسا کرنے میں اس کی انسان دوستی کا عمل دخل تھا۔ حاجرہ مسرور کے مطابق منٹو نے معاشی طور پر بدحالی کا شکار ہونے کے باوجود چچا سام کے بھیجے گئے نمائندوں کے ہاتھوں بکنا گوارا نہ کیا۔ اُنھوں نے تین سو روپے فی افسانہ لکھنے کی بجائے پچیس روپے فی خط کے حساب سے چچا سام کے نام خطوط لکھ ڈالے۔ وہ نظریات کے معاملے میں کبھی مصلحت کا شکار نہیں ہوا تھا۔

ابو سعید قریشی کا مضمون ''رحم دل دہشت پسند'' ان کی کتاب ''منٹو'' میں شامل ہے اور اس پر تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے۔[۵۰]

حامد جلال نے اپنے تاثراتی مضمون ''منٹو ماموں کی موت'' میں منٹو کی موت کا نقشہ جذباتی انداز میں کھینچا ہے۔ ان کے بقول موت سے قبل منٹو دو خواہشیں پوری کرنا چاہتا تھا۔ ایک تو حنیف محمد کو میچ کھیلتا دیکھنے کی خواہش تھی جب کہ دوسری یہ کہ وہ اُس عورت کے بارے میں افسانہ لکھنا چاہتا تھا جو اغوا اور اجتماعی زیادتی کے بعد اپنے کم سن بیٹے سمیت سردی سے ٹھٹھر کر مردہ حالت میں پائی گئی تھی۔ حامد جلال کے مطابق اُنھیں منٹو کی موت کی اطلاع اُس وقت ہوئی تھی جب وہ بہاولپور میں کھیلے جانے والے میچ کی کمنٹری میں مصروف تھے۔ اُنھوں نے اپنے مضمون میں انکشاف کیا کہ منٹو مرنے سے قبل شراب پینے پر اصرار کرتے رہے۔ س ضمن میں لکھتے ہیں:

"اُنھوں نے آہستہ سے کہا "میرے کوٹ کی جیب میں ساڑھے تین روپے پڑے ہیں۔ان میں کچھ اور پیسے ملا کر تھوڑی سی وہسکی منگا دو"۔۔۔۔ شراب کے لیے اُن کا اصرار جاری رہا اور ان کی تسلی کے لیے ایک پوا منگا لیا گیا۔ اُنھوں نے بوتل کو بڑی عجیب اور آسودہ نگاہوں سے دیکھا اور کہنے لگے "میرے لیے دو پیگ بنا دو۔ بستر مرگ پر منٹو ماموں نے شراب کے سوا کوئی اور چیز نہیں مانگی۔" [۵۱]

حامد جلال اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ :

"ایمبولینس جیسے ہی دروازے پر آ کر کھڑی ہوئی اُنھوں نے شراب کا پھر مطالبہ کیا۔ایک چمچہ وہسکی ان کے منہ میں ڈال دی گئی لیکن ایک قطرہ مشکل سے ان کے حلق سے نیچے اتر سکا ہو گا باقی شراب ان کے منہ سے گر گئی۔" [۵۲]

اس بات کا اعتراف خود حامد جلال اپنے اس مضمون کے آغاز میں کر چکے ہیں کہ منٹو کی موت کے وقت وہ بہاولپور میں کرکٹ میچ کی کمنٹری میں مصروف تھے۔ چناں چہ وہ اس واقعہ کے چشم دید گواہ نہیں ہیں جس کا حوالہ اوپر آیا ہے۔ منٹو جب بستر مرگ پر تھے تو ان کی بڑی بہن ناصرہ اقبال اور بیگم صفیہ منٹو تمام وقت منٹو کے ساتھ رہیں۔ ناصرہ اقبال اس واقعے کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتیں اس سلسلہ میں وہ حامد جلال سے بھی غصے ہوئی تھیں کہ اُنھوں نے یہ غیر ذمہ دارانہ بیان کیوں کر شائع کرایا۔ ڈاکٹر علی ثنا بخاری حامد جلال کے اس بیان کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"اس مضمون کے حوالے سے یہ غلط فہمی بھی پائی جاتی ہے کہ سعادت حسن منٹو نے موت سے قبل شراب کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ بات درست نہیں۔ حامد جلال منٹو کے عزیز ترین بھانجے بھی تھے اور قریب ترین دوست بھی۔ منٹو سے محبت کے جذبات سے مغلوب ہو کر اُنھوں نے یہ مضمون ڈرامائی اور فلسفیانہ انداز میں لکھا اور یہ بھول گئے کہ موضوع کے اعتبار سے اُن کے مضمون کی نوعیت تاریخی ہے۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ منٹو کی موت کے وقت حامد جلال بہاولپور میں تھے۔ تب منٹو کے پاس صرف ان کی ہمشیرہ ناصرہ اقبال موجود تھیں جنھوں نے حلفاً اس بات کی تردید کی کہ منٹو نے مرتے وقت شراب طلب کی تھی۔ ناصرہ اقبال کا کہنا ہے کہ جب اُنھوں نے نقوش میں حامد جلال کا مضمون پڑھا تھا تو وہ حامد سے خفا ہوئی تھیں کیوں کہ شراب کے معاملے والی بات غلط تھی۔" [۵۳]

غلام عباس نے "منٹو کی موت" میں منٹو کی زندگی کے آخری دور کا جائزہ لیتے ہوئے اس گوشہ نشینی کی طرف اشارہ کیا جسے منٹو اختیار کر چکے تھے۔ اُنھوں نے "اوپر نیچے اور درمیان" پر چلنے والے مقدمہ میں منٹو کے اعتراف جرم، کو ادب اور زندگی سے اکتاہٹ اور مایوسی سے تعبیر کرتے ہوئے منٹو کو اُردو ادب کا باغی اور زندہ ادیب قرار دیا۔ "منٹو کا ایک خط" میں محمد طفیل نے منٹو کے انداز نگارش کو اپناتے ہوئے اپنے خط نما مضمون میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ جیسے منٹو نے خود عالم ارواح سے یہ خط لکھا ہو۔ محمد طفیل نے منٹو کے انداز اور اُسلوب میں اُن کے نظریہ فن کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُنھوں نے منٹو کی موت، معاشی حالات، پبلی شرز کا سلوک، دوستوں کا رویہ اور موت کے بعد منٹو کے منائے گئے سوگ کے حوالے سے منٹوانہ انداز میں طنز سے کام نکالنے کی کوشش کی ہے لیکن پورے مضمون میں ایک جملہ بھی ایسا نہیں جسے منٹو کا جملہ کہا جا سکے۔ ان کی تحریر میں طنز کی نشتریت، اُسلوب کی روانگی اور تخلیقی تجربے کا فقدان نظر آتا ہے۔ منٹو اور محمد طفیل کی تحریروں میں بھی وہی فرق ہے جو دونوں کی شخصیت میں ہے۔

''منٹو کی چند یادیں اور چند خطوط'' میں احمد ندیم قاسمی نے منٹو سے ہونے والی پہلی ملاقات سے لے کر اُس کی موت تک کے دور کا چند واقعات کی مدد سے احاطہ کیا ہے۔ مضمون سے جہاں دونوں کے درمیان گہری دوستی کا سراغ ملتا ہے وہیں ان کے تعلقات کے بگڑنے کا بھی غماز ہے اور اس کی وجہ وہ نظریاتی اختلاف تھا جو منٹو اور ترقی پسند نقطۂ نظر کے حامی ادیبوں کے درمیان شدید صورت اختیار کر گیا تھا۔ احمد ندیم قاسمی کے بقول فحش تحریروں پر نکتہ چینی اور کثرت شراب نوشی سے منع کرنے پر منٹو اس سے ناراض رہنے لگا تھا اور یہ سلسلہ اس کی موت تک جاری رہا۔ مضمون میں منٹو کے مختلف اوقات میں احمد ندیم قاسمی کو لکھے گئے خطوط بھی شامل کیے گئے ہیں۔ جن کی تعداد دس (۱۰) ہے۔

''قافلہ'' لاہور:

سید قاسم محمود کی ادارت میں نکلنے والے پندرہ روزہ ادبی رسالہ ''قافلہ'' لاہور نے جنوری فروری ۱۹۸۰ء میں منٹو پر خصوصی نمبر شائع کیا۔ اس شمارے میں منٹو کے سولہ (۱۶) منتخب افسانوں کے علاوہ حامد جلال کا ایک مضمون ''منٹو ماموں کی موت'' شامل ہے۔ منٹو کے مختلف افسانوی مجموعوں سے منتخب کردہ سولہ افسانوں کی فہرست اس طرح ہے:۔

یزید۔ ممد بھائی، ڈھارس، نیا قانون، کھول دو، اُلو کا پٹھا، پانچ دن، حامد کا بچہ، شکاری عورتیں، سڑک کے کنارے، خودکشی، بابو گوپی ناتھ، ٹوبہ ٹیک سنگھ، کالی شلوار، ہتک، سرکنڈوں کے پیچھے۔ ان افسانوں کے بعد آخر میں حامد جلال کا تاثراتی مضمون ''منٹو ماموں کی موت'' شامل کیا گیا ہے۔ اُنھوں نے یہ مضمون منٹو کی وفات کے فوراً بعد لکھا تھا جو ادبی رسالہ ''نقوش'' کے منٹو نمبر ۱۹۵۵ء میں اس سے پہلے اشاعت پذیر ہوا۔[۵۴]

سترہ میں سے سولہ تحریریں خود منٹو کی ہیں۔ اس شمارے کو اگر منٹو کی کہانیوں کا انتخاب نمبر کہا جائے تو چنداں غلط نہ ہوگا کیوں کہ اس میں منٹو کی شخصیت اور فن پر ناقدین و معاصرین کی تنقید اور تاثرات کی بجائے منٹو کے افسانوی مجموعوں سے کہانیوں کا انتخاب کر کے رسالہ شائع کر دیا گیا ہے۔ گو کہ ان میں سے زیادہ تر کہانیوں کو منٹو کی کامیاب کہانیاں قرار دیا جاتا ہے اور اس حوالے سے مدیر کے انتخاب کی داد دینا پڑتی ہے لیکن تنقیدی مضامین کے نہ ہونے سے شمارے میں اچھی خاصی تشنگی محسوس ہوتی ہے۔

''دانشور'' لاہور:

سہ ماہی ادبی رسالہ ''دانشور'' منٹو نمبر عفت انیس کی ادارت میں شائع کیا گیا۔ عفت انیس، نقاد اور ناول نگار ڈاکٹر انیس ناگی کی صاحبزادی ہیں۔ منٹو پر نکالے جانے والے اس خصوصی شمارے پر سن اشاعت درج نہیں ہے۔ البتہ ادارتی صفحہ پر جسے ''منٹو کے لیے'' کا عنوان دیا گیا ہے، مدیر کے ایک بیان سے اس کے سال اشاعت کا تعین کیا جا سکتا ہے:

> ''دانشور کا دوسرا شمارہ نامور سعادت حسن منٹو کے لیے وقف ہے کہ جنوری کا مہینہ اس کی چونتیسویں برسی کا مہینہ ہے۔''[۵۵]

اس داخلی شہادت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کا سال اشاعت ۱۹۸۹ء بنتا ہے۔ یہ اس سال کا دوسرا شمارہ ہے چوں کہ یہ سہ ماہی رسالہ ہے؛ اس لیے اس کا دوسرا شمارہ یقیناً جون میں آیا ہوگا۔ دو حصوں میں منقسم اس شمارے کا پہلا حصہ جو منٹو سے متعلق ہے اور ۱۴۰

صفحات پر مشتمل ہے، میں بارہ (۱۲) مضامین شامل ہیں جب کہ احمد راہی، انیس ناگی اور اصغر ندیم سید کے درمیان گفتگو بھی شاملِ اشاعت ہے، آخر میں منٹو کی سوانح کا کیٹلاگ دیا گیا ہے۔

فہرست مضامین اور ادارتی صفحے کے بعد اگلے صفحے پر جلی حروف میں منٹو کا سال پیدائش اور تاریخ وفات جس کے لیے پورا صفحہ مختص کیا گیا ہے غلط درج کر دیے گئے ہیں۔ اس میں منٹو کا سال پیدائش ۱۹۱۳ء جب کہ تاریخ وفات ۱۷ جنوری درج ہے۔[۵۶]

محمد حسن عسکری کا مضمون ''منٹو کا مقام'' ترتیب کے لحاظ سے سب سے پہلا مضمون ہے۔ یہ مضمون اُنھوں نے منٹو کی وفات کے دو ماہ بعد لکھا تھا۔ سب سے پہلے یہ مضمون نقوش کے منٹو نمبر مطبوعہ ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔[۵۷]

ممتاز شیریں کے مضمون ''منٹو کی فنی تکمیل''[۵۸] کے بعد حنیف رامے کا مضمون ''سعادت حسن منٹو'' شامل کیا گیا ہے۔ حنیف رامے رقم طراز ہیں کہ شروع میں سماج اور زندگی کی حقیقتوں کو بڑی بے رحم صداقت اور بے باکی سے بیان کرنے میں منٹو کے قلم کی قوت منفی اور تخریبی تھی جب کہ آخر میں اُس کے ہاں زندگی اور وجود کا ایک مثبت فلسفہ جنم لیتا ہے۔ اُنھوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ منٹو کی شخصیت پر ایک بڑا ناول لکھا جانا چاہیے۔

افتخار جالب ''موذیل ایک پرسنل کہانی میں''، ''موذیل'' اور ''صاحب کرامات'' کو تحریر میں لاتے ہوئے مذہبی مطالب کے بیخ کنی بھی کرتے چلے گئے ہیں۔ اُنھوں نے موذیل کو منٹو کی پرسنل واردات قرار دیتے ہوئے سوال اُٹھایا کہ موذیل کیا نسوانیت اور فیمنزم کی راہ میں حائل دشواریوں کی تفہیم اور اُن کا انکشاف نہیں کرتی؟

انیس ناگی کے مضمون ''منٹو اور انسان دوستی'' (۵۹) کے بعد محمد علی صدیقی نے اپنے مضمون ''منٹو کے تراجم'' میں روسی اور فرانسیسی ادیبوں کے منٹو پر اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے منٹو کو گورکی، گوگول اور موپساں سے متاثر قرار دیا۔ اُن کے مطابق:

> ''منٹو نے یہ کیا کہ زندگی کرنے کا تناؤ اردگرد کے کرداروں سے براہِ راست اور زندگی لکھنے کا اسلوبیاتی اور معنویاتی تناؤ دنیا کے چند اعلیٰ ترین افسانہ نگاروں کی تقلید سے حاصل کیا۔''[۶۰]

مضمون نگار کے اس دعویٰ سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ منٹو اپنے پہلے افسانوی مجموعہ ''آتش پارے'' میں ''انگارے'' سے متاثر دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ یہ بات ازخود تحقیق طلب ہے کہ آیا منٹو کی نظروں سے افسانوی مجموعہ ''انگارے'' ۱۹۳۶ء تک گزرا بھی تھا یا نہیں۔ اُنھوں نے اس بات کو منٹو کے لیے اعزاز قرار دیا کہ ایک ایسا شخص جس کی ادبی زندگی کا آغاز تراجم سے ہوتا ہے، اُس کی تخلیقات کا دنیا کی بیس زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

قاضی جاوید کا مضمون ''منٹو اور ممتاز شیریں' دراصل ممتاز شیریں کی کتاب ''منٹو نوری نہ ناری'' مرتبہ آصف فرخی کی اولین اشاعت پر کیا گیا تبصرہ ہے۔ ابتدا میں مظفر علی سید کے دیباچہ پر تبصرہ کرنے کے بعد مضمون نگار نے ممتاز شیریں کے اس بیان کو جھٹلایا ہے کہ منٹو پر مضامین لکھتے ہوئے اُنھیں جنسی نفسیات پر بہت کچھ پڑھنا پڑا۔ قاضی جاوید کے مطابق ممتاز شیریں کے مطالعہ کے معیار کا اندازہ اُن کے اس بیان سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جس میں مصنفہ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ مارکسی تنقید کسی نزاکت اور گہرائی کو سمجھے اور محسوس کیے بغیر ہر چیز کو طبقاتی شعور کی لاٹھی سے ہانک دیتی ہے۔ ممتاز شیریں کی اس رائے کو مخصوص تعصبات، محدود بصیرت، فکری گہرائی کے فقدان، تصورات کی اہمیت کو سمجھے کی اہلیت سے محرومی اور غیر علمی رویے کا حامل قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جس زمانے میں شیریں لکھ رہی تھیں، عالمی سطح پر مارکسی تنقید فکری گہرائی اور خیال کی نزاکت کے بہترین نمونے پیش کر چکی تھی۔''[۶۱]

قاضی جاوید نے ممتاز شیریں کے خیالات کو اُس مخصوص گروپ کے تعصبات کا نتیجہ قرار دیا ہے جس کے سر براہ حسن عسکری تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ ممتاز شیریں نے اس کتاب میں بنیادی مسئلہ منٹو کے انسان کو بنایا ہے۔ وہ سمجھتی ہیں کہ انسان کے بارے میں تصور ادیب کے پورے فکری نظام اور کائناتی رویے کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس لیے منٹو کے انسان کو سمجھنا، منٹو کو سمجھنے کے مترادف ہے۔ لیکن اپنے تجزیے کے لیے ممتاز شیریں نے جس تعقلاتی نظام کا سہارا لیا ہے وہ بے حد کمزور اور بوسیدہ ہے اور ڈی ایچ لارنس سے مستعار ہے۔ مضمون نگار مزید لکھتے ہیں کہ ممتاز شیریں نے ''اس منجدھار میں'' کو بہت فکری گہرائی کا حامل قرار دیا ہے حال آں کہ یہ ڈی ایچ لارنس کے ناول ''لیڈی چیٹر لیز لور'' سے اخذ شدہ طفلانہ سی تحریر ہے۔ اسی طرح منٹو کے انسان کو سمجھنے کے لیے ممتاز شیریں نے جو تعقلاتی نظام ترتیب دیا ہے یہ سارا نظام سامی مذہب سے مستعار ہے اور محض یہی حقیقت اسے کسی جنوبی ایشیائی تخلیقی ادیب کو سمجھنے کے لیے غیر متعلق بنا دیتی ہے۔ لکھتے ہیں:

''منٹو کا انسان، اس کا ماحول، اس کے تضادات اور اس کے امنگیں سب کی سب نو آبادیاتی ماحول کی تخلیق کردہ ہیں۔''[۶۲]

چناں چہ مضمون کے آخر میں لکھتے ہیں کہ منٹو اور اس کے انسان کو سمجھنے کے لیے ٹی ایچ لارنس یا ہیمنگو کے تعقلاتی نظام کی بجائے اس نو آبادیاتی نظام کو سمجھنا چاہیے جس کا منٹو کو سامنا تھا۔ قاضی جاوید نے مدلل انداز میں ممتاز شیریں کی پوری کتاب اور اُن کے نظریات سے اختلاف کیا ہے البتہ اُن کے مباحث سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ کہیں وہ خود بھی اس تعصب کا شکار تو نہیں ہو گئے جس کا الزام اُنھوں نے ممتاز شیریں پر لگایا تھا اور اُن کے نظریات کی تکذیب محض اس لیے تو نہیں کی جارہی کہ وہ اس دبستان سے تعلق رکھتی تھیں جس کے فکری سر براہ حسن عسکری تھے۔ مضمون نگار کا یہ کہنا درست ہے کہ منٹو کے انسان کو سمجھنے کے لیے اُس کے اپنے ماحول اور نظام کا جائزہ لینا چاہیے نہ کی سامی مذاہب کا۔ لیکن اس کے باوجود یہ بات مانے بنا چارہ نہیں کہ منٹو کا پہلی بار کسی نقاد نے سنجیدہ مطالعہ ممتاز شیریں کی صورت میں کیا اور اُنھوں نے جس وسیع تناظر میں منٹو کے فن کو سمجھنے کی کوشش کی وہ منٹو شناسی کی روایت میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔

سعادت سعید کا مضمون ''منٹو پر ایک تحقیقی مقالہ'' میں ہندوستانی مصنف ڈاکٹر برج پریمی کی کتاب ''سعادت حسن منٹو، حیات اور کارنامے'' کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر برج پریمی کے تحقیقی مقالہ کی کتابی صورت ہے۔ جس پر مصنف کو ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری دی گئی تھی۔ سعادت سعید نے اسے تحقیقی کے بجائے صحافتی مقالہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ مصنف نے اس میں نصابی مباحث پر خواہ مخواہ صفحے کالے کر دیے ہیں حال آں کہ ان کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اُنھوں نے مقالے میں موجود مندرجہ ذیل خامیوں کی نشان دہی کی ہے:

۱۔ برج پریمی نے منٹو کی حیات اور شخصیت کی نفسیاتی گہرائیوں میں جھانک کر ایسے اصولوں اور نکتوں کی نشان دہی نہیں کی جن کے تناظر میں منٹو کے افسانوں کی نئی توضیحات سامنے آتی ہیں۔

۲۔ منٹو کے افسانوں کے سطحی تجزیے کیے گئے ہیں۔

۳۔ مقالہ مربوط دستاویز کی نشان دہی نہیں کرتا۔

۴۔ منٹو کے کلی نقطۂ نظر کی وضاحت نہیں کی۔

۵۔ منٹو کا اُردو افسانے کی روایت میں مقام اور آنے والے ادیبوں پر اثرات کا جائزہ بھی نہیں لیا گیا۔

۶۔ منٹو پر اُس وقت تک شائع ہونے والی تنقیدی و تحقیقی کتب سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے اور یہ اُن کا چربہ معلوم ہوتا ہے۔

ان خامیوں کی روشنی میں سعادت سعید اس کتاب کو منٹو فہمی کی ناکام کوشش قرار دیتے ہیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ برقرار ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں منٹو کی شخصیت اور فن پر پی ایچ ڈی کی سطح کا یہ پہلا کام ہے اور اس وقت جب کہ یہ مقالہ لکھا گیا منٹو پر شائع ہونے والی کتابیں اتنی ہی ہیں جتنی مضمون نگار نے گنوائی ہیں۔ لیکن ان مجبوریوں کی باوجود کتب میں موجود کمزوریوں کی نشان دہی کرنا ادبی ذمہ داری ہے جس سے مضمون نگار عہدہ برا ہوئے۔ البتہ اسے کتاب کا تنقیدی تجزیہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے کیوں کہ مضمون نگار کا اُسلوب تنقیدی زیادہ ہے اور تحقیقی کم۔

اصغر ندیم سید نے اپنے مضمون ''منٹو اور اس کے عہد کا افسانہ'' میں اس بات کا جائزہ لیا ہے کہ منٹو اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں کے مقابلے میں کس طرح اور کس حد تک مختلف ہے۔ ان کے خیال کے مطابق منٹو نے افسانے کے عمومی مزاج اور رویے کو اختیار کرنے کی بجائے اپنے لیے منفرد راہ کا انتخاب کیا۔ وہ منظر، پس منظر یا پیش منظر کے تحت افسانہ نہیں لکھتا، نہ ہی منٹو کے پاس اتنا ٹائم ہوتا ہے کہ کہانی کے تار و پود کئی کئی دن اپنے ذہن میں بُنتا رہے بلکہ اس کے ذہن پر موضوع اس بُری طرح سوار ہوتا کہ وہ مضطرب ہو جاتا اور جب تک کہانی لکھ نہ لے تسکین نہ پاتا تھا۔ اصغر ندیم سید مزید لکھتے ہیں کہ منٹو کا مسئلہ چھوٹی چیزیں نہیں تھا، یہ الگ بات ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزیں اُن کی نظر میں رہتی تھیں۔ اس کا مسئلہ فرد تھا اور پھر فرد کی نسبت سے معاشرہ۔ اُنھوں نے کہا کہ منٹو کو قاری پر پورا اعتماد تھا اور وہ ایسے افسانہ نگاروں سے بہت چڑتا تھا جو قاری کو الف ب پڑھانے بیٹھ جاتے تھے۔

احمد عقیل روبی کا مضمون ''منٹو کی خاکہ نگاری'' صفحات کی غلط ترتیب کی وجہ سے بے ربطی کا شکار ہو گیا ہے۔ یہ مضمون اس شمارے کے صفحہ نمبر ۸۹ سے شروع ہو کر صفحہ نمبر ۹۷ تک پھیلا ہوا ہے، بے ربط ہے اور اس کا کوئی سیاق و سباق نہیں ہے۔ احمد عقیل روبی نے منٹو کے فن خاکہ نگاری پر بحث کرتے ہوئے منٹو کے لکھے گئے خاکوں کو افسانوں کے خارجی اور باطنی مطالعے کا نام دیتے ہوئے اُنھیں دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اُن کے مطابق قائدِ اعظم، بابو راؤ پٹیل اور دیوان سنگھ مفتون کو چھوڑ کر باقی شخصیات کا تعلق ادب اور بمبئی کی فلم انڈسٹری سے ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل نے ''نیا قانون'' کو منٹو کا نمائندہ افسانہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ ایک ایسا افسانہ ہے جو موضوع، واقعیت اور نقطۂ عروج کے گھٹے ہوئے حصار میں مکمل ہوتا ہے۔

باقر علی شاہ کا استدلال ہے کہ ادب انسان کو موہوم سے معلوم تک اور امکان سے ممکن تک کا شعور بخشتا ہے۔ اپنے مضمون ''منٹو موہوم سے معلوم تک'' میں وہ اس خیال کو پیش کرتے ہیں کہ منٹو اپنے مشاہدہ کے ذریعے جس ماحول پر نظر ڈالتا ہے اس کے باریک سے باریک پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کرتا اور اسے اپنے افسانے کا منظر بناتا ہے جس سے قاری کے لیے موہوم سے معلوم تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔ اُن کے بقول:

''منٹو افسانہ لکھ رہا ہو یا ڈراما، خاکہ ہو یا انشائیہ، اس کے ہاں دریافت کا عمل مسلسل اور ہر جگہ نظر آتا ہے۔''[۶۳]

عفت انیس نے ''منٹو کے تین افسانے''''پھندنے''، ''بارده شمالی''، اور ''فرشتہ'' کو جدید اُردو افسانے کا نقطۂ آغاز قرار دیتے ہوئے کہا کہ منٹو سے قبل اس طرح کے تجزیے کسی اور افسانہ نگار کے ہاں نہیں ملتے۔ اُسلوب کے اعتبار سے ''پھندنے'' اور ''بارده شمالی'' کو ایک دوسرے کا مماثل قرار دیتی ہیں۔ مضامین کے بعد ''منٹو'' کے عنوان پر کی جانے والی گفتگو کو بھی تحریر کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ اس گفتگو میں احمد راہی، انیس ناگی اور اصغر ندیم سید شریک ہیں۔ احمد راہی نے انیس ناگی اور اصغر ندیم سید کے اُٹھائے گئے سوالات کی روشنی میں منٹو کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالی ہے۔ منٹو سے اپنے تعلقات کے حوالے سے اُنھوں نے کہا کہ میں منٹو کا دوست نہیں تھا بلکہ میں تو اس کا اردلی تھا۔ وہ اپنے چھوٹے موٹے کام مجھ سے کرایا کرتے تھے۔ اُنھوں نے بتایا کہ عسکری اور منٹو کی ادارت میں نکلنے والا رسالہ ''اُردو ادب'' عسکری اور منٹو کے گڑھ جوڑ کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ مکتبہ جدید نے اسے شائع کرنے کا پروگرام بنایا تھا، مکتبہ جدید کے مالکان ترقی پسند نہیں تھے اور اُن کے منٹو اور عسکری دونوں سے اچھے تعلقات تھے اور یہ دونوں ادیب اکثر وہاں بیٹھا کرتے تھے۔ باقی ایسی ویسی بات نہیں جس طرح کہ ترقی پسند سمجھتے ہیں۔ احمد راہی کے مطابق یہ کہنا کہ عسکری نے منٹو کو ورغلایا تھا سراسر غلط ہے۔ اُنھوں نے مزید بتایا کہ منٹو کا طبعی میلان ناول نگاری کی طرف نہیں تھا۔ ''بغیر عنوان کے'' اُن کا ناول نہیں ہے۔ منٹو نے بس یہ نام سوچ رکھا تھا البتہ ایک ناول ''طویلے کی بلا'' لکھنا شروع کیا تھا لیکن دو باب سے زیادہ نہ لکھ پائے۔ گفتگو کے اختتام پر اُنھوں نے کہا کہ یہ سراسر الزام ہے کہ منٹو کو جب پیسوں کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ ان افسانوں کو بھی بیچ دیتے تھے جو ان کے پاس اصلاح کے لیے آتے تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ منٹو صاحب کے پاس اتنا وقت کبھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی کا افسانہ ٹھیک کریں۔ اس کے علاوہ اس گفتگو میں منٹو کی عادات و اطوار، ان کے معاشی مسائل، مزاج غرض منٹو کی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ایک پُر مغز گفتگو ہے جو منٹو کی اصل شخصیت کو ہمارے سامنے لانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ شمارے کے آخر میں منٹو کے مختصر سوانحی حالات، قیامِ پاکستان اور اس کے بعد منٹو کی شائع ہونے والی کتابوں کی فہرست درج کی گئی ہے جس میں مندرجہ ذیل اغلاط پائی جاتی ہیں:

''ایک اسیر کی سر گزشت'' کا سن اشاعت ۱۹۳۲ء درج کیا گیا ہے جب کہ یہ پہلی بار ۱۹۳۳ء میں دارالادب لاہور سے ''سر گزشت اسیر'' کے نام سے شائع ہوئی۔ منٹو کے مجموعہ ''روسی افسانے'' کا سن اشاعت ۱۹۳۴ء ہے لیکن یہاں ۱۹۳۶ء درج ہے۔ اس طرح ''دھواں'' کا سن اشاعت بھی ۱۹۳۶ء غلط ہے۔ ''دھواں'' ۱۹۴۱ء میں ساقی بک ڈپو دہلی نے شائع کیا تھا۔ یہ کیٹلاگ دراصل انیس ناگی کا ترتیب دیا ہوا ہے جو اُن کی کتاب ''سعادت حسن منٹو'' مطبوعہ فیروز سنز، لاہور، ۱۹۸۹ء سے لیا گیا ہے۔

''دانشور'' میں اُن روایتی مضامین کی طرح جو منٹو کی وفات کے فوراً بعد شائع ہونے والے رسائل میں شامل ہیں، محض منٹو کی وفات پر جذباتی نوعیت کے لکھے گئے مضامین نہیں ملتے۔ منٹو کے فنی حوالوں کو جانچنے کا یہ سلسلہ ''نقوش'' کے منٹو نمبر سے شروع ہوا تھا، یہ شمارہ اسی کا سلسلہ ہے۔ سوائے ممتاز شیریں اور انیس ناگی کے باقی تمام مضامین پہلی بار زیور طبع سے آراستہ ہوئے ہیں۔ منٹو کی تاریخ وفات اور سال پیدائش کا غلط ہونا ناقابل فہم ہے۔ شمارے کا سال اشاعت بھی کہیں درج نہیں کیا گیا۔ اسی طرح قاضی جاوید کا مضمون ''منٹو اور ممتاز شیریں'' جو اس شمارہ کے صفحات نمبر ۶۱ تا ۷۱ پر موجود ہے، مضامین کی فہرست میں شامل ہونے سے رہ گیا ہے۔

''سپوتنک''، لاہور:

ماہنامہ ''سپوتنک'' لاہور نے فروری ۱۹۹۴ء میں منٹو کے متعلق خصوصی نمبر شائع کیا۔ اس کے مدیر آغا امیر حسین ہیں۔ آغا امیر حسین کی ''بھولی بسری باتیں'' کے علاوہ اس شمارے میں مجموعی طور پر دس (۱۰) مضامین شامل کیے گئے ہیں جب کہ ''منٹو کی بہترین کہانیاں'' کے عنوان سے ''ہتک''، ''نیا قانون'' اور ''موذیل'' کا انتخاب بھی شامل اشاعت ہے۔

آغا امیر حسین کا اداریہ اور یونس ادیب کے دو مضامین کے علاوہ دیگر تمام مضامین اس سے قبل مختلف کتب اور رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ذیل میں ان مضامین کی فہرست کے ساتھ اُن رسائل و کتب کی نشان دہی کی جائے گی جو ''سپوتنک'' میں شامل ہونے سے پہلے دوسرے رسائل یا کتب میں شائع ہوئے۔

۱۔ ''منٹو کا مقام'' از حسن عسکری، نقوش، منٹو نمبر، ۱۹۵۵ء دانشور (منٹو نمبر)، شمارہ نمبر ۲، لاہور

۲۔ ''افسانہ ساز منٹو'' از مظفر علی سید، قند (ممتاز شیریں نمبر/منٹو: نوری نہ ناری) مکتبہ اسلوب، کراچی ۱۹۸۹ء، لاہور ۱۹۸۹ء

۳۔ ''منٹو کی فنی تکمیل''، از ممتاز شیریں، (معیار، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۶۳ء) (دانشور، منٹو نمبر، لاہور، ۱۹۸۹ء)

۴۔ ''موذیل ایک پرسنل کہانی''، از افتخار جالب، دانشور (منٹو نمبر)

۵۔ ''منٹو اور انسان دوستی''، از انیس ناگی، دانشور (منٹو نمبر)، سعادت حسن منٹو، ص ۱۰۳، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۸۹ء

۶۔ ''منٹو کے تراجم''، از محمد علی صدیقی، دانشور (منٹو نمبر)

۷۔ ''تاثرات''، از اوپندر ناتھ اشک، ''منٹو میرا دشمن'' جمشید کتاب گھر، حیدر آباد ۱۹۵۵ء

۸۔ ''سعادت حسن منٹو: کتابیات''، از ڈاکٹر علی ثنا بخاری، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء

چوں کہ یہ مضامین اس سے قبل شائع ہو چکے تھے اور ان پر گزشتہ صفحات میں گفتگو ہو چکی ہے اس لیے یہاں صرف اُن مضامین پر گفتگو کی جائے گی جو اس قبل کہیں شائع نہیں ہوئے اور اگر ان کی اشاعت ہو بھی چکی ہے تو انھیں زیر بحث نہیں لایا گیا۔

سب سے پہلا ادارتی مضمون رسالے کے مدیر آغا امیر حسین کا ''بھولی بسری باتیں'' کے عنوان سے ہے جس میں مضمون نگار نے منٹو سے اپنی ملاقاتوں کا احوال بیان کیا ہے۔ دیگر عمومی واقعات بیان کرنے کے بعد مضمون نگار لکھتے ہیں کہ لیاقت علی خان کے قتل کے اطلاع سن کر منٹو ننگے پاؤں، مکتبہ جدید چلے آئے تھے۔ اُنھیں لیاقت علی خان کی موت کا بہت افسوس ہوا تھا۔ اُنھوں نے بتایا کہ منٹو کی فلم ''بیلی'' کی نمائش کے دوران فلم انڈسٹری کے وڈیروں نے سازش کر کے ہنگامہ کرایا تھا جس کی وجہ سے منٹو کو بہت مالی پریشانی اُٹھانا پڑی۔

یونس ادیب نے ''منٹو کے افسانے'' میں منٹو کے فن کا تدریجی جائزہ لیا ہے۔ منٹو کے کیے گئے تراجم اور روسی و فرانسیسی ادب سے دلچسپی اور رسائل کی ترتیب کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں: ''ممکن ہے یہ سچ ہو کہ ۱۹۳۰ء میں منٹو نے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ بھی لیا تھا۔'' منٹو کا علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لینا اور وہاں سے نکال دیا جانا ایک مسلمہ امر ہے اور اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ البتہ منٹو ۱۹۳۰ء میں علی گڑھ نہیں گئے تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ۱۹۳۱ء میں میٹرک پاس کرنے والا طالب علم ۱۹۳۰ء میں انٹرنس میں داخلہ لینے کے لیے علی گڑھ یونیورسٹی چلا گیا ہو۔ منٹو اور ابو سعید قریشی علی گڑھ یونیورسٹی میں طالب علم کی حیثیت سے مئی ۱۹۳۵ء میں گئے تھے۔

''منٹو ایک شخصی تاثر'' یونس ادیب کا دوسرا مضمون ہے۔ مضمون نگار کے مطابق اُردو افسانہ آج بھی اُسی مقام پر کھڑا ہے جہاں اسے منٹو نے چھوڑا تھا اور اس نے ارتقا کی کوئی منزل طے نہیں کی۔ اُنھوں نے منٹو کے ڈراموں اور فلم نویسی کو اُن کی معاشی ضرورتوں کی کفالت کا ذریعہ قرار دیا۔ اس مضمون میں بھی اپنے گزشتہ مضمون کی طرح یونس ادیب منٹو کے فن پر مجموعی تاثراتی انداز اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کے متعلق اُن کا خیال ہے کہ یہ ہندوستان کی تقسیم کے خلاف نہیں بلکہ ریڈ کلف ایوارڈ کے مطابق پنجاب کی تقسیم کے خلاف ایک بھرپور آواز ہے۔

اس شمارے میں صرف یہی دو مضامین ایسے ہیں جو اس شمارے سے پہلے کسی بھی منٹو نمبر میں شائع نہیں ہوئے۔ محمد حسن عسکری، ممتاز شیریں، افتخار جالب، محمد علی صدیقی اور انیس ناگی کے مضامین دانشور کے منٹو نمبر میں شامل ہیں۔ یہ مضامین اس سے قبل مختلف کتب و رسائل میں شائع ہو چکے تھے۔ ''تاثرات'' کے عنوان سے فہرست مضامین میں اوپندر ناتھ اشک، کرشن چندر اور علی سردار جعفری کے نام دیے گئے ہیں مگر صرف اوپندر ناتھ اشک کے تاثرات کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ تاثرات اوپندر ناتھ اشک کی کتاب ''منٹو میرا دشمن'' کے صفحہ ۸۷ تا ۹۹ سے مستعار لیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر علی ثنا بخاری کا مضمون ''سعادت حسن منٹو، کتابیات'' کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے جسے مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا تھا۔ چناں چہ یونس ادیب کے دو مضامین اور آغا امیر حسین کی بھولی بسری باتوں کے علاوہ اس شمارے میں کوئی بھی نئی تحریر پڑھنے کو نہیں ملتی۔ یونس ادیب کے مضامین بھی تاثراتی اور عمومی مزاج کی تنقید کے حامل ہیں۔ منٹو کی تین کہانیوں ''ہتک''، ''نیا قانون'' اور ''موذیل'' کے انتخاب سمیت یہ رسالہ ۱۷۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

''مزدور جدوجہد''، لاہور:

ہفت روزہ ''مزدور جدوجہد'' سوشلسٹ تحریک کا نمائندہ رسالہ ہے۔ اس رسالے نے سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن پر دو شمارے شائع کیے ہیں۔ پہلا شمارہ ۱۴ تا ۲۰ جنوری ۱۹۹۹ء میں جب کہ دوسرا شمارہ ۱۳ تا ۱۹ جنوری ۲۰۰۵ء میں منظر عام پر آیا۔ جنوری ۱۹۹۹ء میں فاروق طارق جب کہ جنوری ۲۰۰۵ء میں اس کے مدیر رضوان عطا تھے۔

جنوری ۱۹۹۹ء میں شائع ہونے والے شمارے میں اداریے [۶۴] کے بعد منٹو کی شخصیت اور فن سے متعلق پانچ (۵) مضامین کے علاوہ چھے کہانیوں کا انتخاب شامل ہے۔ اڑتالیس (۴۸) صفحات پر مشتمل اس رسالہ میں چوالیس (۴۴) صفحات منٹو کے لیے مختص کیے گئے ہیں جن میں منٹو کی مختلف اوقات اور مقامات پر لی گئی بتیس (۳۲) تصاویر کے علاوہ اوپندر ناتھ اشک کی تصویر بھی شامل ہے۔ صفحہ ۲۰، ۲۲، ۳۲، ۳۴، ۳۷، ۳۹ اور ۴۰ پر اشک، احمد ندیم قاسمی، عبادت بریلوی، ابواللیث صدیقی، دیوندر ستیار تھی، شمیم حنفی، سلیم اختر اور ہاجرہ مسرور کی منٹو پر لکھی گئی مختلف تحریروں سے اقتباسات دیے گئے ہیں۔ ابتدائی صفحہ پر منٹو کی تصویر اور منٹو کی قبر پر لکھے گئے کتبہ کی تحریر درج ہے جب کہ پچھلے صفحہ پر آذر زوبی کے بنائے گئے منٹو کے مجسمے کے عکس کے علاوہ لطیف انور کی منٹو کی موت پر لکھی ہوئی نظم بعنوان ''سعادت حسن منٹو'' سرخ حروف میں شائع کی گئی ہے۔ یہ نظم ماہنامہ ''گل خنداں'' کے منٹو نمبر میں شائع ہوئی تھی۔ [۶۵]

کل پانچ مضامین میں سے دو مضامین ''منٹو ایک شخصی تاثر'' از یونس ادیب اور ''منٹو اور مارکسزم'' از انیس ناگی اس سے قبل ماہنامہ ''سپوتنک'' لاہور کے منٹو نمبر اور انیس ناگی کی کتاب ''سعادت حسن منٹو'' میں شائع ہوئے تھے[۶۶] ان پر گزشتہ صفحات میں گفتگو کی جا چکی ہے۔

''یہاں منٹو دفن ہے'' بلونت گارگی کا مضمون ہے۔ ایڈیٹر کے مطابق یہ خاکہ نما مضمون بلونت گارگی کی مشہور پنجابی کتاب ''حسین چہرے'' سے لیا گیا ہے جس کا ترجمہ الفت تنویر بخاری نے کیا جو اس وقت رسالے کی ڈپٹی ایڈیٹر تھے۔ یہ بات تا حال تحقیق طلب ہے کہ آیا منٹو پر لکھا گیا یہ خاکہ نما مضمون واقعی بلونت گارگی کی کتاب ''حسین چہرے'' سے لیا گیا ہے؟ کیوں کہ نام ''حسین چہرے'' اُردو زبان کا لفظ ہے نہ کی پنجابی زبان کا۔ علاوہ ازیں یہی مضمون اس سے قبل ''منٹو کے بہترین افسانے'' میں ''حسین چہرے'' (دیباچہ) کے طور پر شائع ہو چکا ہے۔ اسے مکتبہ شعر و ادب لاہور نے شائع کیا۔ اس مضمون کو شائع کرتے وقت مرتب نے کہیں بھی یہ حوالہ نہیں دیا کہ اُنھوں نے یہ مضمون کہاں سے لیا اور اس کے مترجم کون تھے؟

جہاں تک مضمون کا تعلق ہے اس میں بلونت گارگی نے منٹو کی شخصیت اور فنی صلاحیتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ مضمون نگار کے مطابق منٹو سے پہلی ملاقات سے قبل وہ افسانوں کے ذریعے منٹو کی شخصیت کے سحر میں گرفتار ہو چکے تھے اور اُن کا افسانہ ''بُو'' پڑھ کر اُنھیں اندازہ ہوا کہ کہانی کیا ہوتی ہے اور اسے لکھنا کتنا مشکل کام ہے۔ ''بُو'' پڑھنے کے بعد اُنھوں نے پہلی مرتبہ اُردو ادب کے بارے میں ڈھنگ سے سوچا۔ اُنھوں نے منٹو کو ہندوستانی ادب کا اونچا مینار قرار دیتے ہوئے کہا کہ فیچر، ڈراما یا افسانہ لکھنا منٹو کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور وہ شرطیں لگا کر ڈرامے اور فیچر لکھتا تھا۔ مضمون نگار نے دو مقامات پر یہ کہا ہے کہ منٹو تانگہ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ لکھتے ہیں:

> ''یکہ آیا تو منٹو اس پر سوار ہو گیا۔ 'کسی اور نے جانا ہے؟ صرف ایک' میں نزدیک کھڑا تھا، فوراً آگے بڑھا اور بیٹھ گیا۔ منٹو ٹانگیں پھیلائے پچھلی نشست پر براجمان ہوا۔''[۶۷]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> ''ہم تینوں ایک اعلیٰ پشاوری یکے میں بیٹھے، میں اور عبدالباری اگلی سیٹ پر کوچوان کے ساتھ اور منٹو اپنی عادت کے مطابق زری کا جوتا پہنے پچھلی نشست پر ٹانگیں پسار کر بیٹھ گیا۔''[۶۸]

ابراہیم جلیس کا شمار منٹو کے دوستوں میں ہوتا ہے۔ اُنھوں نے اپنے مضمون ''اُٹھاؤ بوتل اور چلو منٹو کے پاس'' میں بلونت گارگی سے متضاد رائے دی ہے اور اس بات کو منٹو کی انانیت سے تعبیر کیا ہے کہ منٹو ہمیشہ جب بھی دوستوں کے ساتھ ہوتا تھا تو تانگہ کی اگلی نشست پر بیٹھا کرتا تھا اور اس بات پر اُن کی لڑائی ہو جایا کرتی تھی مگر منٹو کسی طور پیچھے بیٹھنے پر راضی نہ ہوتا۔ اس سلسلہ میں اُنھوں نے ایک واقعہ کا بھی ذکر کیا جس میں منٹو نے پیچھے بیٹھنے کی بجائے نیا تانگہ منگوا لیا تھا ہے۔[۶۹]

قمر یورش کا مضمون ''گنجا فرشتہ'' منٹو کی مضمون نگار سے ہونے والی ملاقاتوں کی رُوداد پر مبنی ہے۔ ان کا یہ مضمون اسی عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔[۷۰]

جان عالم نے اپنے مضمون ''منٹو اور اس کے کردار'' میں منٹو کے کرداروں منگو، ممی، بابو گوپی ناتھ، بشن سنگھ، سہائے، سلطانہ، ایشر سنگھ، موذیل اور سوگندھی کو اُردو ادب کے لافانی کردار قرار دیا ہے۔ جان عالم کا مضمون اس شمارے کا منٹو پر آخری مضمون ہے۔

''مزدور جدوجہد''، لاہور:

''مزدور جدوجہد'' کا دوسرا خصوصی شمارہ منٹو کی پچاسویں برسی کے موقع پر جنوری ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔ ''مزدور جدوجہد''، ''انگارے'' اور ''سپوتنک'' ایسے رسائل ہیں جنھوں نے برصغیر پاک و ہند کے عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن پر دو خصوصی نمبر شائع کیے۔ ''مزدور جدجہد'' نے ۱۹۸۰ء میں ایمسٹرڈیم (ہالینڈ) سے اپنی اشاعت کا آغاز کیا۔ پاکستان سے یہ رسالہ ۱۹۸۶ء میں پہلی بار اشاعت پذیر ہوا۔ ٹائٹل کے بعد ٹونی عثمان کا منٹو کی زبان میں ایک صفحے کا تعارفی مضمون ہے۔ اگلے صفحے پر فاروق سلہریا، نگہت پٹیل، سید مجاہد علی، نزہت ارشد، نصرت جلال اور ٹونی عثمان کی تحریروں اور انٹرویوز کے چھوٹے چھوٹے اقتباسات کے ساتھ اُن کی رنگین پاسپورٹ سائز تصاویر لگائی گئی ہیں۔ اگلے صفحہ پر شمارہ میں شامل مضامین، انٹرویوز اور منٹو کے افسانوں اور مضامین کے انتخاب کی فہرست دی گئی ہے۔

ایک سو صفحات پر مشتمل اس شمارے میں ۶ مضامین، ۱۴ انٹرویوز، ۲ رپورٹس، ایک گفتگو اور ایک پنجابی زبان میں لکھے گئے مضمون کے علاوہ منٹو کی ۱۷ تحریروں کا انتخاب شامل ہے۔ جب کہ سیالکوٹ کے آرٹسٹ اعجاز الحق کا بنایا گیا ایک سکیچ بھی شامل اشاعت ہے جس میں منٹو کے مختلف کرداروں کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ منٹو کی تحریروں کے انتخاب کو چھوڑ کر دیگر تحریروں کا ترتیب وار جائزہ ملاحظہ ہو۔

اداریہ ''قبر جنہاں دی جیوے ہو!'' اُردو کے ایک عظیم ادیب کو خراجِ تحسین اور ادارے کی ادبی وابستگی کا اظہار ہے۔ مجید امجد کی نظم ''منٹو'' کے آخری مصرعہ ''تناخ تڑاخ'' کو سید مجاہد علی نے اپنے مضمون کا عنوان بناتے ہوئے لکھا کہ منٹو ایک سچا اور کھرا انسان تھا اور وہ صرف اس سچائی کو بیان کرنے پر اصرار کرتا ہے جسے پورا معاشرہ بے کار شے سمجھ کر نظر انداز کرنے پر مصر ہے لیکن منٹو کے لیے ممکن نہیں کہ وہ ان حقائق سے چشم پوشی کر جائے۔ لٰہذا وہ اُن گالیوں سے کبھی نہ بدکا جو اُسے زندگی کے ہر دور میں کھانی پڑیں۔ منٹو کی زبان کو عام، بیان کو سطحی اور منزل پر پہنچنے کی بجائے راستے میں گُم ہو جانے والا افسانہ نگار کہہ کر اس کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ اُنھوں نے کہا:

> ''بڑی حیرت کی بات ہے ایک شخص وعظ دینا نہیں چاہتا لیکن ہم اس سے اخلاقی درس کی توقع کرتے ہیں۔ ایک شخص اپنے معاشرے کا پَرتو ہے مگر ہم اُس سے منزلوں کا سراغ پوچھتے ہیں۔'' [۱۷]

مجید امجد کی نظم ''منٹو'' کا حوالہ دیتے ہوئے اُنھوں نے کہا کہ ''تناخ تڑاخ'' کی یہ آواز ہر اس چوٹ کی گونج اور دھمک ہے جو منٹو کی کہانیاں پڑھتے ہوئے قاری کے دل و دماغ پر لگتی ہے۔

''منٹو نے ہمیشہ انسان دوستی کا پیغام دیا'' شری لعل نے اپنے اس مختصر مضمون میں منٹو کو انسان دوست ادیب قرار دیتے ہوئے اس پروپیگنڈے کو بے بنیاد قرار دیا جس کے ذریعے منٹو کو مذہب کا مخالف ٹھہرایا گیا۔ اُنھوں نے کہا کہ منٹو جیسے ادیب پوری

انسانیت کے نمائندے ہوتے ہیں اس لیے اُنھیں پاکستانی ادیب یا مسلمان ادیب قرار دینا خود اُن کے فن کے ساتھ زیادتی اور اُنھیں محدود کرنے کے مترادف ہے۔ آخر میں کہتے ہیں کہ:

> ''جس طرح استاد ولایت خان کے ستار اور استاد ذاکر حسین کا طبلہ سننے سے من کو شانتی ملتی ہے ٹھیک اسی طرح منٹو کی کہانیاں پڑھ کر دل و دماغ میں سرور محسوس ہوتا ہے۔'' [۷۲]

اس مضمون کے بعد سیالکوٹ سے تعلق رکھنے والے آرٹسٹ اعجاز الحق نے منٹو کے مختلف کرداروں کو ایک اسکیچ میں پیش کیا ہے۔ یہ اسکیچ اُنھوں نے خصوصی طور پر مزدور جدوجہد کے منٹو نمبر کے لیے بنایا۔ ''مزدور جدوجہد'' نے ''منٹو کی فلمی دنیا سے وابستگی'' کے متعلق ایک تفصیلی رپورٹ شائع کی ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق منٹو کی کہانیوں کو بنیاد بنا کر لاہور فلم انڈسٹری نے کئی کامیاب فلمیں بنائیں۔ ''بیلی'' اس سلسلے کی پہلی کوشش تھی جو ۱۹۵۰ء میں مکمل ہوئی۔ اس کے ڈائریکٹر مسعود پرویز [۷۳] جب کہ مرکزی کردار سنتوش کمار اور صبیحہ خانم نے ادا کیا۔ صبیحہ خانم کی یہ پہلی فلم تھی۔ [۷۴] اس سلسلے کی دوسری فلم ''بدنام'' تھی جس کا سکرپٹ ریاض شاہد نے لکھا۔ اس فلم کا مشہور گیت ''بڑے بے مروت ہیں یہ حُسن والے'' ثریا ملتانیکر کی آواز میں آج بھی مقبول ہے۔ فلم کی کہانی منٹو کے افسانہ ''جھمکے'' پر مبنی ہے۔ گو کہ اصل کہانی اور سکرین پر پیش کی جانے والی کہانی میں کافی اختلاف ہے لیکن منٹو کی کہانی کی بطور فلم تشکیل ایک قابلِ تعریف تجربہ تھا جو کامیاب رہا۔ ''ایک گناہ اور سہی'' منٹو کے افسانے ''ممی'' سے ماخوذ ہے۔ اس کا شمار پاکستان کی چند کامیاب فلموں میں ہوتا ہے۔ صبیحہ خانم، رانی اور شاہد نے مرکزی کردار ادا کیے۔ اسی طرح شوکت حسین رضوی نے ''نوکر''، فلم ۱۹۴۳ء میں بنائی۔ اس میں نور جہاں اور چندر موہن نے مرکزی کردار ادا کیے۔ [۷۵]

منٹو کی کہانیوں پر فلمیں صرف ماضی میں ہی نہیں بنائی گئیں بلکہ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ نہ صرف فلمیں بلکہ آج کل تو منٹو کی کہانیوں کو اسٹیج پر بھی پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ ٹیلی ڈراموں کی صورت میں مختلف چینلز نے بھی مختلف اوقات میں منٹو کے افسانوں کو ڈرامائی تشکیل دی ہے۔ ''کالی شلوار'' کو فلم ساز فریدہ سید نے فلمی شکل دی۔ نصیر الدین شاہ نے اپنے فیملی تھیٹر کی جانب سے منٹو کی کہانی ''بُو'' اور عصمت چغتائی کے افسانے ''لحاف'' کو اسٹیج کیا ہے۔ بھارتی ٹی وی چینل دُوردرشن کی بنائی گئی ٹیلی فلم ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' منٹو کے افسانے پر مبنی ہے۔ رپورٹ میں مزید بتایا گیا کہ ۱۹۹۷ء میں ''انترین'' کے نام سے دُوردرشن ہی نے منٹو کی کہانی کو ڈرامائی تشکیل دی تھی جب کہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کو مختلف ملکوں میں اسٹیج کیا گیا۔

منٹو کی فلمی دنیا سے وابستگی پر مشتمل یہ رپورٹ بہت عمدہ معلومات پر مبنی ہے اور اسے منٹو شناسی کی روایت میں اضافہ قرار دیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ اس سے قبل کسی بھی مصنف و ادیب نے ان امور کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ فاروق سلہریا اپنے مضمون ''منٹو ترقی پسند!! یہ کیا بے ہودگی ہے؟'' میں لکھتے ہیں کہ تمام تر تنازعات کی باوجود منٹو کی ترقی پسندی میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں نکلتی۔ اس کے باوجود کہ اوسط درجے کے ترقی پسند ادیب منٹو کے درپے آزار رہے لیکن ترقی پسند ادبی تحریک کے سرخیل فیض احمد فیض، کرشن چندر، سجاد ظہیر اور عصمت چغتائی منٹو اور حسن عسکری کے ''گٹھ جوڑ'' کے باوجود اس کی عظمت کے قائل رہے۔ اُنھوں نے کہا کہ منٹو اوائل عمری سے ہی ترقی پسند رجحانات رکھتا تھا۔ روسی ادب کے تراجم اور باری علیگ کی رہنمائی جیسی تاریخی

شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ جس وقت ترقی پسند تحریک وجود میں نہیں آئی تھی منٹو ترقی پسند نقطۂ نظر اختیار کر چکا تھا اور کئی مرتبہ خشکی کے راستے روس پہنچنے کی اسکیمیں تیار کر چکا تھا۔

فاروق سلہریا کے مضمون کا عنوان منٹو کے مضمون ''ادب جدید'' سے لیا گیا ہے۔ منٹو نے یہ مضمون جوگیشوری کالج بمبئ میں پڑھا تھا۔

''منٹو کا قلم شعلے اگلتا تھا'' نبیل منظور کا مضمون ہے جو انگریزی میں لکھا گیا تھا۔ اسے فاروق سلہریا نے ترجمہ کر کے اُردو کا جامہ پہنایا۔ اپنے مضمون کے آغاز میں وہ سوالات اُٹھاتے ہیں کہ کیا منٹو پر قائم کیے جانے والے مقدمے جائز تھے؟ اور کیا واقعی وہ فحاشی اور جسم فروشی کو فروغ دیتا رہا؟۔ اُنھوں نے خود ہی ان سوالات کے جوابات دیتے ہوئے کہا کہ دراصل منٹو نے ایسے معاشرے میں جنم لیا تھا جو کسی بھی آزاد خیال شخص کو برداشت کرنے کی صلاحیت سے عاری ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ منٹو کے افسانے عالمگیر شہرت اختیار کر چکے ہیں اور دیگر زبانوں میں نہ صرف ان کے تراجم کیے جا رہے ہیں بلکہ اُنھیں اسٹیج بھی کیا جا رہا ہے۔ منٹو ایک بڑا فنکار تھا، وہ جن مسائل پر بھی قلم اُٹھاتا اس کا قلم شعلے اُگلتا تھا۔ اُنھوں نے ان کے افسانے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ:

> ''آج کی جدید ادبی دنیا میں 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' پاکستان کے ایک شہر نہیں بلکہ منٹو کی ایک کہانی کے طور پر مشہور ہے۔'' [۷۶]

ہندوستان سے تعلق رکھنے والے پنجابی زبان کے ادیب نندرِ گل نے اپنے مضمون ''منٹو پوربی زبان وچ'' میں منٹو پر مضمون لکھتے ہوئے کہا کہ منٹو کا ناول ''یہ مرد یہ عورتیں'' کا پنجابی ترجمہ ''ایہ مرد ایہ عورتاں'' پڑھ کر اُنھیں پہلی بار احساس ہوا کہ منٹو کتنا بڑا ادیب ہے۔ [۷۷] اُنھوں نے بتایا کہ دیگر زبانوں کی طرح منٹو کی تحریروں کے تراجم پنجابی زبان میں بھی ہوئے ہیں اور کئی رسائل نے اس کی شخصیت اور فن پر خاص نمبر بھی شائع کیے ہیں۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ ہمیشہ سیاسی مرکز رہا'' اس عنوان کے تحت سید ذوالفقار محمود شاہ سے ہونے والی گفتگو میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کی سیاسی، تاریخی اور انقلابی اہمیت کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ اس گفتگو کو طارق محمود ضبط تحریر میں لائے ہیں۔

منٹو کے افسانے ٹوبہ ٹیک سنگھ کو تقسیم کے موضوع پر خاصی اہمیت حاصل ہے۔ اسے دنیا کے مختلف ملکوں میں اسٹیج کیا جا چکا ہے۔ ہندوستان کے ٹی وی چینل دُور درشن نے اس موضوع پر ٹیلی فلم بھی بنائی۔ فاروق سلہریا نے تبصرہ نما مضمون ''انڈیا میں دُور درشن کا ٹوبہ ٹیک سنگھ'' میں اس ٹیلی فلم کی خوبیوں اور خامیوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ ''دُور درشن'' نے ہدایت کار شکتی براباکی معاونت سے اس کام کی ابتدا کی۔ تبصرہ نگار کے مطابق اس فلم کا آغاز منٹو کے افسانے سے ہٹ کر ہے۔ نیز منٹو کے افسانے ''کھول دو'' کو بھی اس فلم میں ایڈجسٹ کیا گیا ہے۔ جب کہ پاکستان ٹیلی ویژن کے اداکار شجاعت ہاشمی نے اس فلم میں ''بشن سنگھ'' کا مرکزی کردار ادا کیا۔ اُنھوں نے فلم کی ایڈیٹنگ کو غیر معیاری قرار دیا جس کی وجہ سے فلم میں ربط نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔

''ٹوبہ ٹیک سنگھ برطانیہ میں'' کے عنوان سے پیش کی جانے والی جدوجہد رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۸۷ء میں منٹو کی اس کہانی کو فلم ساز کن مک ملن (Ken McMullen) نے فلمی شکل دی تھی۔ جو نوے (۹۰) منٹ کے دورانیے پر مشتمل تھی۔ فلم کا

اسکرپٹ طارق علی نے لکھا جب کہ اس کا نام پارٹیشن (Partition) رکھا گیا۔ اس مختصر تبصرے کے ساتھ فلم کے مرکزی کرداروں کو سیٹ پر ریہرسل کرتے ہوئے بھی دکھایا گیا ہے۔

مضامین، رپورٹس اور تبصروں کے بعد انٹرویوز کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں چار انٹرویو شامل کیے گئے ہیں۔ پہلا انٹرویو پاکستان ٹیلی ویژن کے ڈراما آرٹسٹ شجاعت ہاشمی سے لیا گیا ہے۔ شجاعت ہاشمی ''دُوردرشن'' کے زیرِ اہتمام منٹو کی کہانی ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' پر بنائی جانے والی ٹیلی فلم میں بشن سنگھ کے مرکزی کردار کے طور پر منتخب کیے گئے تھے۔ فاروق طارق اور الفت بخاری نے مزدور جدوجہد کے طرف سے یہ انٹرویو کیا۔ شجاعت ہاشمی نے تکنیکی اعتبار سے فلم کو کمزور قرار دیا۔

ناروے میں مقیم پاکستانی اداکار ٹونی عثمان نے نارویجن زبان میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ترجمہ کر کے اسے اسٹیج کیا۔ اس سلسلہ میں جدوجہد پینل کو دیے گئے ایک انٹرویو بعنوان ''ٹوبہ ٹیک سنگھ ناروے میں'' کے متعلق ٹونی عثمان نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ منٹو کی کہانیاں تہہ در تہہ ہوتی ہیں اس لیے اُنھیں اسٹیج کرنے کے بہت امکانات ہوتے ہیں۔ خصوصاً ان کہانیوں کا اختتام ڈرامائی ہوتا ہے۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کے انتخاب کی یہی وجوہات تھیں۔ اسے محض ہندوستان کی تقسیم پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اس ڈرامے کو اسٹیج کرنے کا مقصد ناروے کے باشندوں کو اُردو کے عظیم ادیب سے متعارف کرانا بھی تھا۔ اُنھوں نے بتایا کہ ناروے میں اس ڈراما کو بہت اچھا رسپانس ملا۔ بھارتی سفارت خانے کے دو اہلکار ہماری دعوت پر یہ ڈراما دیکھنے آئے مگر ناروے میں مقیم پاکستانی سفیر عطاالحق قاسمی نے اس میں شرکت گوارا نہ کی، نہ ہی اُنھوں نے سفارتی آداب کا خیال رکھتے ہوئے کوئی نمائندہ بھیجا۔ حال آں کہ ان کے ملک کے سب سے بڑے ادیب کی کہانی ناروے میں پہلی مرتبہ اسٹیج ہو رہی تھی۔

منٹو کی اہلیہ صفیہ منٹو کی بہنوں ذکیہ حامد جلال اور رفیعہ وحید کا انٹرویو ''مزدور جدوجہد'' کے مدیر رضوان عطا نے کیا۔ یہ انٹرویو ''منٹو بکاؤ نہیں تھا'' کے عنوان سے اس شمارے میں شامل کیا گیا ہے۔ اس انٹرویو میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ منٹو بہت ہی رحم دل اور ہر دل عزیز انسان تھے۔ بظاہر وہ بہت مضبوط اور کھردرے نظر آتے تھے لیکن اندر سے بہت ہی نازک تھے۔ البتہ ان میں خود پسندی کا عنصر ضرورت سے زیادہ تھا۔ منٹو کی کتابوں کی رائلٹی کے حوالے سے ان دونوں بہنوں نے بتایا کہ اب صورت حال کافی بہتر ہے۔ جب بھی منٹو کی صاحب زادیاں کتابوں کی اشاعت کا معاوضہ لیتی ہیں تو اُنھیں وہ وقت یاد آتا ہے جب منٹو کو رقم کی ضرورت ہوتی تھی لیکن پبلی شرز ان کا خون چوستے رہے۔ منٹو کے تحریر کردہ کتبے کے حوالے سے اُنھوں نے بتایا کہ منٹو کی بہن ناصرہ اقبال نے اس کتبہ کو لگانے سے منع کیا تھا۔

سعادت حسن منٹو کی تینوں بیٹیوں نگہت، پٹیل، نزہت ارشد اور نصرت منٹو سے وقار گیلانی نے انٹرویو کیا۔ یہ اس شمارے کی آخری تحریر ہے۔ نگہت پٹیل سعادت حسن منٹو کی سب سے بڑی بیٹی ہیں اور گزشتہ پانچ سال سے لکشمی مینشن کے اس گھر میں رہائش پذیر ہیں جہاں سے منٹو کا جنازہ اُٹھایا گیا تھا۔ نگہت پٹیل نے کہا کہ سوسائٹی میں ہماری عزت منٹو صاحب کی وجہ سے ہے و گرنہ ہم کچھ بھی نہیں۔ منٹو کے کام کو تحقیقی اور تعلیمی اداروں میں آگے بڑھانے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے وہ تسلیم کرتی ہیں کہ اُنھوں نے منٹو کے کام کو آگے بڑھانے میں خود بھی دلچسپی نہیں لی۔ چناں چہ نہ تو کبھی منٹو کی یاد بھرپور طریقے سے منائی گئی اور نہ ہی ہم میں سے کسی کا رجحان لکھنے پڑھنے کی طرف ہوا۔ اس میں والدہ کی سختی کا بھی کافی عمل دخل تھا۔ نگہت پٹیل کے مطابق منٹو کی بہن نے اس خوف سے

منٹو کا تحریر کردہ کتبہ اُن کی قبر پر لگانے کی مخالفت کی تھی کہ اس کو پڑھ کر لوگ خواہ مخواہ شور شرابہ کریں گے۔ البتہ اگر کوئی اُن کی قبر پر یہ کتبہ دوبارہ لگانا چاہتا ہے تو اُنھیں ہر گز اعتراض نہ ہو گا۔

نزہت ارشد کو جو منٹو کی وفات کے وقت سات سال کی تھیں نے، گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ لوگ عورتوں کو ایک گمراہ کن کردار کے طور پر پیش کرتے ہیں جب کہ منٹو نے عورت کو بطور مظلوم پیش کیا ہے۔ اُنھوں نے بتایا کہ منٹو کہانی لکھنے کے بعد امی کو سنایا کرتے تھے اور سمجھ نہ آنے پر اُنھیں سمجھاتے رہتے تھے۔ نصرت جلال نے منٹو کو اُن کی تحریروں سے جانا۔ یہ منٹو کی سب سے چھوٹی بیٹی ہیں۔ ان کے مطابق منٹو کی وفات کے بعد ان کے گھر میں کسی قسم کا ادبی ماحول نہ تھا اور ہماری تمام تر توجہ انگریزی میڈیم اسکولوں اور کالجوں کی طرف رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی منٹو کی روایت کو آگے نہ بڑھا سکا۔ مختلف کالج اور یونیورسٹیاں منٹو پر کام کر رہی ہیں لیکن پاکستان ٹیلی ویژن میں اب بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں جو منٹو کے کام کو آگے بڑھانا پسند نہیں کرتے۔ پبلی شرز کے رویے کا ذکر کرتے ہوئے اُنھوں نے کہا کہ آج بھی ان کے پاس وہ چیک محفوظ ہے جو اُنھیں منٹو صاحب نے دیا تھا لیکن اکاؤنٹ میں رقم نہ ہونے کی وجہ سے اسے بوگس قرار دیا گیا تھا۔ نصرت جلال کے مطابق ایک شخص نے اُن کے نام برف کا کارخانہ الاٹ کر دیا تھا لیکن منٹو نے یہ کہہ کر کارخانہ لینے سے انکار کر دیا تھا کہ اس کی ملکیت والے فارم میں جھوٹ بولنا پڑتا تھا۔

۱۶۰ صفحات پر مشتمل یہ شمارہ بہت سی خصوصیات کا حامل ہے۔ اول یہ کہ منٹو پر شائع ہونے والے رسائل کی روایت سے ہٹ کر اس میں تنقیدی نوعیت کے ضخیم اور ثقیل مضامین کی بجائے ہلکے پھلکے اور تحقیقی نوعیت کے مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ تقریباً تمام لکھاری خاص ادبی شہرت نہ رکھنے کے باوجود منٹو کی شخصیت اور فن سے بھرپور آگاہ ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر مضمون نویس یا تبصرہ نگار ''مزدور جدوجہد'' سے کسی نہ کسی طور پر منسلک ہیں۔ خصوصاً ناروے میں مقیم ''مزدور جدوجہد'' کے ممبران نے اس نمبر میں خصوصی شرکت کی۔ تیسری اور سب سے اہم بات منٹو کی کہانیوں پر بننے والی فلمیں اور اُن کے ڈراموں خصوصاً ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کو مختلف ممالک میں اسٹیج کرنے سے متعلق دی گئی معلومات کافی دلچسپ اور پہلی بار منظر عام پر لائی گئیں۔ منٹو خاندان کے انٹرویو کے ذریعے بھی منٹو فہمی کے کئی دَر وا ہوئے۔ مضامین، تبصروں، رپورٹس اور انٹرویوز کے علاوہ مختلف صفحات پر منٹو کی کہانیوں کے اقتباسات کے ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل تحریریں، ''ادب جدید''، ''شغل''، ''اشوک کمار''، ''مساوات''، ''دو قومیں''، ''کارل مارکس''، ''گنجے فرشتے''، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، ''ممی''، ''یوم استقلال''، ''ٹیٹوال کا کتا''، ''اوپر نیچے اور درمیان''، ''کالی شلوار''، ''دھواں'' اور ''ٹھنڈا گوشت'' شمارہ کے مختلف صفحات پر شائع کی گئیں۔ منٹو کی اپنے خاندان کے ساتھ دو تصاویر علاوہ اس شمارے میں شامل تمام لکھاریوں کا مختصر تعارف مع تصاویر کے اُن کے مضامین کے ساتھ شائع کیا گیا۔ نیز منٹو کی کہانیوں اور ڈراموں میں کام کرنے والے اداکاروں اور اداکاراؤں کی تصاویر کے علاوہ ریہرسل کے دوران مختلف آرٹسٹوں کی لی گئی تصاویر بھی خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔

''انگارے''، ملتان:

ملتان سے شائع ہونے والے ماہانہ کتابی سلسلہ ''انگارے'' کے مرتب سید عامر سہیل نے سعادت حسن منٹو کی پچاسویں برسی کی مناسبت سے جنوری ۲۰۰۵ء میں خصوصی نمبر شائع کیا۔ ترقی پسند ادب کے ترجمان رسالے کا منٹو پر خصوصی نمبر نکالنا جہاں منٹو کی فنی عظمت کا اعتراف ہے وہیں ''انگارے'' کے مرتب کی روشن خیالی کی دلیل بھی ہے۔ اس شمارہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ

مجید امجد کی شہرت یافتہ نظم ''منٹو'' کے علاوہ اس میں شامل تمام مضامین اس سے قبل کہیں شائع نہیں ہوئے۔ مرتب کی ''چند باتیں'' اور مجید امجد کی نظم کے بعد مضامین اور ''خصوصی مطالعے'' کے عنوان سے مندرجہ ذیل تنقیدی و تحقیقی مضامین کو شامل کیا گیا ہے:۔

۱۔ ''سعادت حسن منٹو خطوط کے آئینہ میں'' ڈاکٹر انور سدید

۲۔ ''سعادت حسن منٹو کے اُداس اور تنہا متخصص'' ڈاکٹر انوار احمد

۳۔ ''منٹو کے بارے میں چند غلط فہمیاں'' ڈاکٹر علی ثنا بخاری

۴۔ ''مضمون اور منٹو کے مضامین'' ڈاکٹر علی ثنا بخاری

۵۔ منٹو کا مسخ شدہ ورژن'' ابن حسن

۶۔ ''منٹو پر چند ذہنی / تنقیدی تحفظات'' ڈاکٹر قاضی عابد

۷۔ ''منٹو کی سوانح: تھوڑا نیا، تھوڑا پرانا'' روش ندیم

۸۔ ''نایاب منٹو'' محمود احمد قاضی

۹۔ ''منٹو تجھے سلام'' محمد مصطفی

''خصوصی مطالعے'' کے عنوان سے ایسے مضامین شامل ہیں جن کا دائرہ منٹو کی کسی ایک کہانی کے گرد گھومتا ہے۔ اس حصہ میں پانچ مضامین شامل ہیں جن میں منٹو کی مختلف کہانیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کی ترتیب اس طرح ہے:

۱۔ ''منٹو کا ایک افسانہ'' احمد صغیر صدیقی

۲۔ ''منٹو کی موذیل'' ڈاکٹر شگفتہ حسین

۳۔ ''تماشا، تنقیدی اور توضیحی مطالعہ'' ڈاکٹر غفور شاہ قاسم

۴۔ ''تنقیدی محدودات اور ٹوبہ ٹیک سنگھ'' خالد محمود سنجرانی

۵۔ منٹو کا ایک افسانہ موذیل'' ایم خالد فیاض

اس طرح اس شمارہ میں شامل مضامین کی کل تعداد چودہ (۱۴) بنتی ہے۔

''سعادت حسن منٹو خطوط کے آئینہ میں'' ڈاکٹر انور سدید کا مضمون ہے جس میں منٹو کے لکھے گئے اُن خطوط کا جائزہ لیا گیا ہے جو اُنھوں نے احمد ندیم قاسمی کو جنوری ۱۹۳۷ء تا فروری ۱۹۴۸ء کے درمیانی عرصہ میں لکھے۔ ڈاکٹر انور سدید کے مطابق منٹو کے پہلے خط سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اُن میں عالی ظرفی اور کشادہ نظری کا مادہ پایا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو جگہ جگہ احمد ندیم قاسمی، جو کہ اُن سے جونیئر ادیب تھا، کی حوصلہ افزائی اور مشاورت کرتے دکھائی دیتے ہیں:

> ''اُنھوں نے پہلے ہی خط میں تحسین سخن شناس کا در کشادہ کر دیا اور مصنف کی تعریف اس موثر انداز میں کی کہ وہ اپنے فن کے ارتقا کا اگلا قدم اُٹھا سکے۔'' [۷۸]

یہ خطوط نہ صرف مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان تعلقات اور دونوں کی شخصیتوں کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ ان میں منٹو کی اپنے معاصرین کے بارے میں بھی کھردری آرا پڑھنے کو ملتی ہیں۔ مضمون نگار منٹو کی پہلی ترجمہ شدہ کتاب کا سن اشاعت ۱۹۳۴ء درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''منٹو کی پہلی کتاب ''اسیر کی سر گزشت'' ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی جو وکٹر ہیو گو کی کتاب ''لاسٹ ڈیز آف کنڈ مڈ'' کا ترجمہ تھا۔ اس سے پہلے ان کے مطالعے کے آثار تو ملتے ہیں لیکن کسی تخلیقی سر گرمی کا نشان نہیں ملتا، چناں چہ منٹو کی ادبی زندگی صرف ۲۵ برس پر محیط ہے۔''[۷۹]

یہاں مصنف سے کچھ غلطیاں سر زرد ہو گئی ہیں۔ اوّلین اشاعت کے مطابق ترجمہ کا عنوان ''سر گزشت اسیر'' ہے نہ کہ ''اسیر کی سر گزشت''۔ دوم ''سر گزشت اسیر کا اوّلین سن اشاعت ۱۹۳۳ء ہے ۱۹۴۴ء میں منٹو نے آسکر وائلڈ کے ڈراما ''ویرا'' کا ترجمہ کیا۔ سوم، مضمون نگار کے دعویٰ کے مطابق ۱۹۳۴ء سے پہلے منٹو کے مطالعہ کے آثار تو ملتے ہیں لیکن تخلیقی نشانات نہیں ملتے لہٰذا منٹو کی ادبی زندگی ۲۵ برس پر محیط ہے۔ مصنف کے دیے گئے اعداد و شمار کو ہی جمع تفریق کیا جائے تو منٹو کی ادبی زندگی ۲۵ برس نہیں بلکہ ۲۱ برس کے عرصہ پر ہی محیط نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر انوار احمد کا مضمون ''سعادت حسن منٹو کے اُداس اور تنہا متخصص'' میں مجموعی طور پر چار منٹو شناسوں پروفیسر سجاد شیخ، ڈاکٹر علی ثنا بخاری، ممتاز شیریں اور انیس ناگی کا تعارف کرایا گیا ہے۔ پروفیسر سجاد شیخ گورڈن کالج راولپنڈی میں انگریزی کے استاد رہے ہیں۔ مضمون نگار ان کی روشن خیالی، بے باکی اور مزاحمتی رویے کو اس فضا اور ماحول کا اثر قرار دیتے ہیں جو منٹو کے مطالعہ کے دوران اُن پر طاری ہوا۔ ڈاکٹر انوار احمد کے مطابق پروفیسر سجاد شیخ کے پاس منٹو کے حوالے سے بہت سا نادر اور کم یاب مواد موجود ہے۔ مثلاً منٹو کی تمام تخلیقات کے اولین نسخے، منٹو پر چلنے والے تمام مقدمات کا ریکارڈ، منٹو کے مرتب کردہ عالمگیر اور ہمایوں کے روسی اور فرانسیسی ادب نمبر اور منٹو کی بہن ناصرہ اقبال کے طویل انٹرویو کا ٹیپ جس میں بہت سی نادر معلومات محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر انوار احمد کے مطابق پروفیسر سجاد شیخ کے اس دعویٰ کو آسانی سے رَد نہیں کیا جا سکتا جس میں اُنھوں نے منٹو کے علی گڑھ یونیورسٹی سے اخراج کو طبّی کی بجائے سیاسی قرار دیا تھا۔[۸۰]

ڈاکٹر علی ثنا بخاری آج کل لاہور میں قیام پذیر ہیں۔ اُنھوں نے ۱۹۸۴ء میں سعادت حسن منٹو پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا اور اس کے بعد ملازمتی امور میں گم ہو گئے۔ مضمون نگار نے جو اس مقالے کے بیرونی ممتحن بھی تھے، اس مقالہ کے تنقیدی حصے کو اپنی رپورٹ میں کمزور قرار دیا لیکن منٹو کی سوانح کے حوالے سے دی گئی معلومات کو اُنھوں نے خوب سراہا۔ مضمون نگار کے مطابق اس میں پہلی مرتبہ منٹو کی میٹرک کے امتحان سے متعلق روداد کو یونیورسٹی ریکارڈ کے ذریعے ثابت کیا گیا۔ نیز پاکستانی پبلی شرز کا استحصالی روپ دستاویزات کی مدد سے سامنے لانا ڈاکٹر علی ثنا بخاری کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ اُنھوں نے ۲۰۰۳ء میں اُن کی ملازمت سے برطرفی کو اُن کے اہل خانہ کے لیے صدمے کا باعث جب کہ تخلیقی دنیا کے لیے خوش آئندہ قرار دیا۔

ممتاز شیریں منٹو کی ایک اہم نقاد ہیں، ان کے منٹو پر مضامین کا انتخاب آصف فرخی نے ۱۹۸۵ء میں مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر انوار احمد ممتاز شیریں کے ان مضامین کو عسکری اور ''سویرا''[۸۱] کی اُس مہم کا حصہ گردانتے ہیں جو اُنھوں نے ترقی پسندوں کو چڑانے کے لیے منٹو کے حق میں چلا رکھی تھی۔

منٹو کے چوتھے متخصص انیس ناگی کے متعلق مضمون نگار رقم طراز ہیں:

"اُنھوں نے منٹو کی افسانہ نگاری پر ایک کتاب لکھی، منٹو پر چلنے والے مقدمات کے ریکارڈ کو کتابی صورت میں یکجا کیا اور اپنی زیرِ ادارت شائع ہونے والے جریدے "دانشور" کا منٹو نمبر شائع کیا۔" [۸۲]

جہاں تک کتابوں کا تعلق ہے مضمون کی اشاعت تک انیس ناگی کی منٹو پر طبع زاد اور مرتبہ کتب کی تعداد پانچ ہے۔ "دانشور" پس پردہ انیس ناگی ضرور شائع کرتے ہوں گے لیکن منٹو نمبر کی پیشانی پر بطور مدیر انیس ناگی کے بجائے ان کی صاحبزادی عفت انیس کا نام درج ہے۔ مضمون نگار انیس ناگی کو بدمزاج، خود پسند اور تند خو خیال کرتے ہیں۔

ڈاکٹر علی ثنا بخاری کے اس شمارے میں دو مضامین شامل ہیں۔ یہ وہی ڈاکٹر علی ثنا بخاری ہیں جن کی ادبی گمشدگی کا ذکر ڈاکٹر انوار احمد نے اس شمارہ میں شامل مضمون "سعادت حسن منٹو کے اداس اور تنہا متخصص" میں کیا ہے۔ ڈاکٹر علی ثنا بخاری نے اپنے پہلے مضمون "منٹو کے بارے میں چند غلط فہمیاں" میں چند شخصی اور تاریخی غلطیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے اصل حقائق سے پردہ اُٹھایا ہے۔ لفظ منٹو کی وضاحت کے بعد اُنھوں نے انیس ناگی کے اس بیان کو غلط قرار دیا جس میں اُنھوں نے لکھا تھا کہ منٹو ۱۸ جنوری کی صبح گورنمنٹ کالج میں پروفیسر جی ایم اثر سے شراب کے لیے پیسے مانگنے آئے تھے۔ [۸۳] ڈاکٹر علی ثنا بخاری کے مطابق:

"جس روز کے دو بجے دوپہر، وہ (انیس ناگی) منٹو سے پیسے منگوا رہے تھے اس روز کی صبح ساڑھے دس بجے سعادت حسن، صفیہ، نگہت، نزہت اور نصرت کے علاوہ بے چارے منٹو کو تنہا چھوڑ کر راہی ملک عدم ہو چکے تھے۔" [۸۴]

صاحب مضمون نے یونیورسٹی ریکارڈ کے ذریعے ثابت کیا کہ منٹو میٹرک کے امتحان میں تین بار فیل ہونے کے بعد چوتھی کوشش میں کامیاب ہوئے، اُردو میں پھر بھی فیل تھے۔ ڈاکٹر علی ثنا بخاری نے پروفیسر سجاد شیخ کے اس موقف کو رَد کیا جس میں اُنھوں نے منٹو کے علی گڑھ یونیورسٹی سے اخراج کو سیاسی حکمت عملی قرار دیا تھا۔

مضمون نگار منٹو کی آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت، برف خانہ کی الاٹ منٹ اور مرتے وقت شراب طلب کرنے کے واقعات میں پائی جانے والی غلط فہمیاں، جن کی بنیاد لیزلی فلیمنگ، الطاف گوہر اور حامد جلال کی تحریروں پر رکھی گئی، مدلل انداز میں تحریری شواہد کے ساتھ دُور کرتے گئے ہیں۔ ڈاکٹر علی ثنا بخاری کا یہ مضمون بہت اہم ہے اور اس کے ذریعے اُنھوں نے منٹو کی شخصیت کے متعلق پائی جانے والی بہت سی غلط فہمیوں کو تحقیقی نقطۂ نظر سے رَد کیا ہے۔

اپنے دوسرے مضمون میں ڈاکٹر علی ثنا بخاری نے منٹو کی مضمون نگاری کا فنی حوالے سے جائزہ لیا ہے۔ "مضمون اور منٹو کے مضامین" میں مضمون نویسی کے آغاز و ارتقا کے بعد اُنھوں نے منٹو کی مضمون نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے اسے دو ادوار میں تقسیم کیا۔ پہلے دور کا تعلق قیام پاکستان سے قبل، جب کہ دوسرے کا قیام پاکستان کے بعد کے عرصہ پر محیط ہے۔ "میکسم گورکی ملت احمریہ کا مایہ ناز مفکر" کو پہلا جب کہ "کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا" کو منٹو کا آخری مضمون قرار دیتے ہیں۔ "منٹو کے مضامین" اور "تلخ ترش اور شیریں" کے علاوہ "اوپر نیچے اور درمیان" میں شامل مضامین کا فنی و فکری جائزہ لیا گیا ہے۔

ابنِ حسن نے اپنے مضمون "منٹو کا مسخ شدہ ورژن" میں منٹو کے فکر و فن پر اب تک کی جانے والی تمام تنقید کو مسترد کرتے ہوئے منٹو کو فنی و فکری سطح پر ادنیٰ درجے سے بھی کم تر حیثیت کا افسانہ نگار قرار دیا ہے۔ مضمون نگار منٹو کے تمام معروف و غیر معروف افسانوں کے کرداروں بشمول "بابو گوپی ناتھ"، "منگو"، اور "بشن سنگھ" وغیرہ کو کٹھ پتلی، اس کی طوائفوں کو نسوانی اعضا کی نمائش کا

ذریعہ، سیاسی و سماجی افسانوں کو وژن کی کمزوری، اُسلوب کو بھونڈا اور ذہنی اپچ کو محدود قرار دیتے ہوئے منٹو کے حق میں یا مخالفت میں دی جانے والی ہر دو آرا کو سطحیت کا حامل قرار دیتے ہیں۔[۸۵] کرشن چندر سے لے کر اب تک منٹو پر کی جانے والی تنقید کو وہ کسی کھاتے میں نہیں لاتے:

''منٹو اپنے تخلیق کیے گئے کرداروں اور عام زندگی میں پائے جانے والے افراد کے مابین فرق نہیں کر پایا۔ اس وجہ سے یا تو وہ ہاتھی جتنے بڑے ہو جاتے ہیں لیکن آخر میں ایک سوئی اس ربڑ کے ہاتھی سے تمام ہوا نکال دیتی ہے۔ یا وہ چوہے جتنے چھوٹے نظر آتے ہیں اور ان میں ہوا بھر دی جاتی ہے۔''[۸۶]

مضمون نگار نے اپنے موقف کے استدلال کے لیے منٹو کے موضوعات، تکنیک اور کرداروں کا عالمی ادب کے شاہکار ناولوں سے تقابل کیا ہے۔ افسانے کے پلاٹ، تکنیک اور موضوعات کا ناول سے تقابل کرتے ہوئے غالباً وہ اپنی علمیت اور اعلیٰ وژن کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں۔ ابنِ حسن ادب کو بھی فلسفہ اور نفسیات کا مرہونِ منت بنانا چاہتے ہیں حال آں کہ اپنی تحریر میں وہ ان علوم کو بھی مسترد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ گویا اُنھوں نے نہ صرف منٹو کو رَد کیا بلکہ ان پر کی جانے والی تنقید کے ساتھ ساتھ دیگر علوم کو بھی وہ خاطر میں نہیں لاتے اور فلسفیانہ انداز سے اُردو ادب کے بہت بڑے افسانہ نگار کو محض افسانہ نگار بھی تسلیم نہیں کرتے۔ اس قسم ک شگوفے باز نقادوں کے بارے میں ڈاکٹر قاضی عابد رقم طراز ہیں:

''ایسے انفرادیت پسند لکھاری / نقاد یہ سمجھتے ہیں کہ کسی ادیب کی دائمیت، عظمت، آفاقیت اور بڑائی محض ان کے لکھے ہوئے ''بصیرت افروز'' مضامین کی مرہونِ منت ہوتی ہے اور وہ اگر کسی چھوٹے قد کے ادیب کو عظمت، دائمیت اور آفاقیت کا سرٹیفکیٹ دے دیں تو وہ ادیب ان خصوصیات کا حامل ہو جائے گا اور اس کے برعکس اگر وہ فی الواقع کسی بڑے ادیب کے بارے میں ایسے جملے لکھ دیں جن سے ان کے لکھے ہوئے بڑے ادب کے بارے میں تنقیص کا پہلو نکلتا ہو تو ایسے جملوں سے وہ ادب /ادیب اپنے درجے سے نکل کر تیسرے درجے کے ادبی زمروں /مسافروں میں شامل ہو جائے گا۔ یقیناً ایسا نہیں ہوتا۔''[۸۷]

ڈاکٹر قاضی عابد کے اس اقتباس کے بعد ابنِ حسن کے مضمون پر مزید تبصرہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ تاریخ شاہد ہے کہ تمام تر مخالفت کے باوجود منٹو کی اہمیت میں برابر اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ نقاد تخلیق کار پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر قاضی عابد ''منٹو پر چند ذہنی / تنقیدی تحفظات، تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' میں کہتے ہیں کہ منٹو پر کی جانے والی تنقید بہت کم توازن کی حامل رہی ہے۔ چناں چہ بہت سے خود پسند اور منٹو مخالف نقاد منٹو کے ادبی قد کو چھوٹا کرنے کے لیے ایسے ایسے نظریات پیش کرنے لگے جنھیں پڑھ کر ان نقادوں کی تنقیدی بصیرت مشکوک ہونے لگتی ہے۔ اُنھوں نے وزیر آغا کی اس رائے کو مسترد کیا جس میں اُنھوں نے غلام الثقلین نقوی کو طوائف کے موضوع پر منٹو سے بڑا افسانہ نگار قرار دیا تھا[۸۸] آج کل وزیر آغا کے اس نظریے کو ڈاکٹر مرزا حامد بیگ فروغ دینے میں مصروفِ عمل ہیں۔ ڈاکٹر قاضی عابد ان نقادوں کی آرا کو مد نظر رکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کیاان آرا سے غلام الثقلین نقوی اور رحمن مذنب دائمی عظمت کے اس تخلیقی ہالے کا حصہ بن گئے جو بڑے لکھنے والوں کا لازمی مقدر ہوتا ہے۔ یقیناً ایسا نہیں ہوا اور جو ہوا ہے وہ یہ ہے کہ یہ آرا خود اس بڑے نقاد کے لفظوں کی تحریم اور وقعت کے آگے سوالیہ نشان بن گئی ہیں۔" [۸۹]

اُنھوں نے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے مضمون "رحمان مذنب کی خوشبودار عورتیں" [۹۰] میں منٹو اور غلام الثقلین نقوی کے باب میں کی جانے والی بحث کو اپنے مضمون کا موضوع بناتے ہوئے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے اس موقف کو غلط قرار دیا جس میں اُنھوں نے منٹو کی فطرت نگاری اور طوائف کو موپساں کے اثرات کا نتیجہ قرار دیا تھا، جب کہ غلام الثقلین نقوی کو ان امور کی پیش کش میں منٹو کے مقابلے میں کئی گنا بڑا افسانہ نگار۔ ڈاکٹر قاضی عابد لکھتے ہیں:

"رحمن مذنب کو منٹو سے بڑا افسانہ نگار قرار دینا ایسے ہی ہے جیسے کوئی احمد طفیل کو حامد بیگ سے بڑا افسانہ نگار قرار دے دے اور موازنہ کے لیے انٹیک شاپ اور بابے نور محمد کا آخری کبت چن لے۔" [۹۱]

مضمون نگار کے مطابق مرزا حامد بیگ کا یہ خیال درست نہیں کہ منٹو نے طوائف کا ماڈل موپساں سے لیا، لکھتے ہیں:

"اس کے (منٹو کے) افسانوں ہتک، بابو گوپی ناتھ، جانکی، سو کینڈل پاور کا بلب اور کالی شلوار میں پائے جانے والے کردار فرانس کے گلی کوچوں سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ ان کے قدم برصغیر کی سرزمین پر ٹکے ہوئے ہیں۔" [۹۲]

"منٹو کی سوانح: تھوڑا نیا تھوڑا پرانا" سوانحی نوعیت کے اس مضمون میں روش ندیم نے سعادت حسن منٹو کی شخصی و فنی زندگی کا مختصر جائزہ پیش کیا ہے اس مضمون میں تحقیقی اعتبار سے مضمون نگار سے بہت سی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ وضاحت کے لیے مندرجہ ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"۱۹۴۳ء تک ۳۱ سال کی عمر میں مرتب شدہ رسائل سمیت منٹو کی چھے مطبوعات سامنے آچکی تھیں اور وہ اپنا شمار اپنے عہد کے اہم افسانہ نویسوں میں کرا چکا تھا۔" [۹۳]

"منٹو کا پہلا افسانوی مجموعہ چوبیس سال کی عمر میں (۱۹۳۶ء) سامنے آیا۔ اسی سال اس کا مرتب شدہ "نیرنگ خیال" روسی افسانہ نمبر چھپا۔" [۹۴]

"اس دور میں فضلو کمہار کے جوا خانے، عاشق حسین فوٹو گرافر کی دکان اور ہجو کے ہوٹل پر ہونے والی بیٹھکوں کے دوران اشتراکی انقلاب کے خواب اس کی فکر کا حصہ بنے۔" [۹۵]

"اسی سال اس کا اوّلین طبع زاد افسانہ "تماشا" باری کے رسالے "خلق" میں "آدم" کے فرضی نام سے چھپا۔" [۹۶]

"۱۹۴۱ میں کرشن چندر کی وساطت سے منٹو آل انڈیا ریڈیو دہلی میں سکرپٹ رائٹر کے طور پر نوکری کے لیے چلا آیا۔" [۹۷]

پہلے اقتباس کے مطابق ۱۹۴۳ء تک منٹو کی چھے مطبوعات سامنے آچکی تھیں حال آں کہ اس وقت تک منٹو کی گیارہ تخلیقات/ترجمے سامنے آچکے تھے۔ ان مطبوعات میں منٹو کے مرتب شدہ رسائل شامل نہیں ہیں۔ "نیرنگ خیال" کا روسی ادب نمبر منٹو نے مرتب نہیں کیا ورنہ ہی "ہجو کے ہوٹل" نام کا کوئی ہوٹل ایسا تھا جہاں منٹو بیٹھا کرتا تھا۔ منٹو شیراز ہوٹل بیٹھا کرتا تھا جو ہجے کے ہوٹل کے نام سے مشہور تھا اور اکثر ادیب یہاں آیا کرتے تھے۔ اختر شیرانی کے ساتھ منٹو کی ملاقات اسی ہوٹل میں ہوئی تھی۔ [۹۸]

جہاں تک منٹو کے پہلے افسانے ''تماشا'' کا تعلق ہے اس کی اشاعت تو ''خلق'' ہی میں ہوئی تھی اور منٹو نے اسے فرضی نام ہی سے شائع کیا تھا لیکن یہ نام آدم نہیں تھا۔ کیونکہ خلق کے اس شمارے میں آدم کے فرضی نام سے ابو سعید قریشی کا مضمون ''مزدور'' شائع ہوا تھا۔[۹۹] مضمون نگار کا یہ بیان بھی محل نظر ہے کہ منٹو کرشن چندر کی وساطت سے آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم ہوا تھا۔ یہ منٹو پر پی ایچ ڈی کرنے والی خاتون ڈاکٹر لیز لی فلیمنگ کی پیدا کردہ غلط فہمی ہے۔ منٹو، کرشن چندر یا کسی دوسرے ادیب کے توسط سے آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم نہیں ہوا تھا۔[۱۰۰]

روش ندیم، سعادت حسن منٹو کے نسوانی کرداروں کے حوالے سے اپنا تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لنگویجز، اسلام آباد میں جمع کرا کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں، منٹو پر پی ایچ ڈی کرنے والے محقق کے مضمون میں اس طرح کی اغلاط کا در آنا حیران کن امر ہے۔

''نایاب منٹو'' میں محمود احمد قاضی، منٹو کی شخصیت اور فن کے امتزاج کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ سعادت حسن منٹو بیک وقت ایک فنکار بھی ہے اور آدمی بھی۔ وہ انسانیت کے اعلیٰ رتبے پر فائز نہ ہونے کے باوجود بہت اونچے درجے کا فنکار ہے۔

احمد صغیر صدیقی، ڈاکٹر شگفتہ حسین، ڈاکٹر غفور شاہ قاسم، خالد محمود سنجرانی اور ایم خالد فیاض نے اپنے اپنے مضامین: ''منٹو کا ایک افسانہ''، ''منٹو کی موذیل''، ''تماشا تنقیدی و توضیحی مطالعہ''، ''تنقیدی محدودات اور ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اور منٹو کا ایک افسانہ موذیل'' میں منٹو کے افسانوں ''رشوت''، ''موذیل''، ''تماشا'' اور ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کا تجزیہ کیا ہے۔

۱۲۸ صفحات پر مشتمل ''انگارے'' کا یہ شمارہ مجموعی طور پر چودہ (۱۴) مضامین پر مشتمل ہے۔ ان میں سے نو (۹) مضامین تحقیقی و تنقیدی نوعیت کے ہیں جن میں منٹو کے فن کا ہر دو حوالے سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں منٹو کی مخالفت میں لکھا گیا۔ ابنِ حسن کا مضمون ''منٹو کا مسخ شدہ وژن'' بھی شامل ہے جس میں منٹو کو سرے سے افسانہ نگار ہی نہیں تسلیم کیا گیا اور اس کے برخلاف منٹو کی حمایت میں بھی مضمون لکھے گئے جیسے کہ محمد مصطفی کا مضمون'' منٹو تجھے سلام'' جس میں منٹو کے کسی بھی افسانے کو کمزور تسلیم نہیں کیا گیا۔ جب کہ ڈاکٹر علی ثناء بخاری کا تحقیقی مضمون ''منٹو کے بارے میں چند غلط فہمیاں'' بھی اپنی نوعیت کا اہم مضمون ہے۔ تنقیدی، تحقیقی، توصیفی اور تنقیصی مضامین کے اس سلسلہ کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ منٹو کی مخالفت اور حمایت میں اب دو طرفہ تعصبانہ رویہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ تجزیاتی قسم کے پانچ مضامین میں منٹو کے چند افسانوں ''رشوت''، ''موذیل''، ''تماشا'' اور ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

''انگارے (منٹو سیمینار نمبر)''، ملتان:

ترقی پسند ادب کے ترجمان ماہانہ کتابی سلسلہ ''انگارے'' نے دسمبر ۲۰۰۵ء میں منٹو سیمینار نمبر شائع کر کے ایک ہی سال یعنی ۲۰۰۵ء میں منٹو پر دو خصوصی شمارے شائع کیے۔ پہلا شمارہ جنوری ۲۰۰۵ء میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔ منٹو شناسی کی روایت میں یہ پہلا موقع ہے کہ کسی ادبی جریدے نے ایک ہی سال میں دو منٹو نمبر نکالے۔ اس سے قبل ''مزدور جدوجہد'' نے ۱۹۹۹ء اور ۲۰۰۵ء میں منٹو پر خصوصی نمبر شائع کیے تھے۔ منٹو کی پچاسویں برسی کے موقع پر ''انگارے'' اور ''مزدور جدوجہد'' کے علاوہ کسی رسالے نے بھی منٹو پر خصوصی نمبر شائع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

کتابی سلسلہ ''انگارے'' کا یہ ۱۳۶واں شمارہ جسے ''منٹو سیمینار نمبر'' کا نام دیا گیا ہے، دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں منٹو کے فکر و فن اور پچاسویں برسی کی مناسبت سے گوجراں والا میں منعقدہ منٹو سیمینار کی روداد جب کہ دوسرے حصے میں جسے ''مزید مطالعے'' (منٹو شناسی کے باب میں) کا نام دیا گیا ہے، منٹو کے فکر و فن سے متعلق پانچ مضامین شامل ہیں۔ پہلا حصہ منٹو کے فکر و فن کے حوالے سے منعقد ہونے والے دو روزہ سیمینار کی روداد پر مشتمل ہے۔ اس سیمینار کے محرک ایم خالد فیاض تھے۔ جنھیں معاشی مجبوریوں کے سبب یہ سیمینار گجرات سے گوجرانوالہ منتقل کرنا پڑا۔ ۲۰-۲۱اگست کو ہونے والے اس سیمینار کو چھے نشستوں/اجلاسوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلی نشست کی صدارت ڈین فیکلٹی آف آرٹس، جی سی یو سرگودھا ڈاکٹر علمدار حسین بخاری نے کی۔ اُنھوں نے ''منٹو کی تفہیم نو'' پر صدارتی خطبہ دیتے ہوئے منٹو کی فکری و فنی اہمیت کو اُجاگر کیا۔

اجلاس میں ایم خالد فیاض نے اپنا مضمون ''ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ نئی تعبیر (ایک محاکمہ)'' پڑھا۔ جس میں اُنھوں نے پروفیسر فتح محمد ملک کی کتاب ''سعادت حسن منٹو۔ ایک نئی تعبیر'' میں فتح محمد ملک کے موقف کو جھٹلاتے ہوئے منٹو کی پاکستانیت سے متعلق اُن کی دی گئی آرا سے اختلاف کیا۔

تیسرا اجلاس ایک مباحثے پر مبنی تھا۔ اس مباحثے کے محرک سید عامر سہیل تھے جب کہ عنوان تھا ''اکیسویں صدی میں منٹو کی Validity'' عامر سہیل نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے شرکاء کے سامنے بنیادی سوال پیش کیا کہ دورِ جدید میں منٹو کے افسانوں کی Validity کیا ہے؟ کیا آج منٹو بامعنی ہے یا نہیں ہے؟ ہے تو کیوں ہے اور اگر نہیں تو کیوں نہیں ہے؟ اس بحث میں ابنِ حسن، لیاقت علی، خالد فتح محمد، آدم پال، مظہر عباس اور طاہر عباس نے حصہ لیا۔ ابنِ حسن، خالد فتح محمد اور آدم پال منٹو کو ادنیٰ درجے کا افسانہ نگار اور اس کے کرداروں کو مضحکہ خیز قرار دیتے رہے۔ اُن کے دلائل سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ محض مشہور ہونا یا چند مشہور کردار دے دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ جب کہ عامر سہیل، لیاقت علی، طاہر عباس اور مظہر عباس کا موقف ان تینوں کے متضاد تھا۔ بحث میں شدت پیدا ہوئی تو محرک بحث سید عامر سہیل نے گفتگو کو سمیٹتے ہوئے کہا کہ اکیسویں صدی میں منٹو کی Validity اسی سے ثابت ہے کہ پچاس برس گزرنے کے بعد ہم منٹو پر اتنی گرم جوشی سے گفتگو کر رہے ہیں ۲۱اگست کی صبح سیمینار کا چوتھا اجلاس خالد فتح محمد کی صدارت میں شروع ہوا۔ اس میں مندرجہ ذیل تین مضامین پڑھے گئے: ''منٹو کے فرشتے'' از لیاقت علی، ''منٹو کے ڈراما 'کروٹ' کا بنیادی ماخذ'' از شوکت نعیم قادری اور ایم خالد فیاض کا مضمون ''منٹو کے دو کردار: حنیف اور باسط۔''

لیاقت علی نے افسانوی اُسلوب میں منٹو کے ''گنجے فرشتے' اور ''لاؤڈ اسپیکر'' میں شامل خاکوں کا تجزیہ کرتے ہوئے منٹو کی خاکہ نگاری کا عمدہ جائزہ لیا۔ شوکت نعیم قادری نے اپنے مضمون میں منٹو کے ڈراما 'کورٹ' کو سمرسٹ ماہم کے افسانے 'رین' کا سرقہ قرار دیتے ہوئے دونوں تحریروں کے متون کا تقابلی جائزہ پیش کیا اور دونوں متون میں موجود مماثلتوں کی نشاندہی کی۔ جب کہ ایم خالد فیاض نے اپنے مضمون میں منٹو کے دو کرداروں حنیف اور باسط کا تجزیہ کرتے ہوئے ان وجوہات کی نشان دہی کی کہ ایک جیسی صورت حال سے گزرنے کے باوجود دونوں کردار مختلف ردِ عمل کیوں ظاہر کرتے ہیں۔

پانچویں اجلاس میں ''نیچرل ازم، رئیلزم اور منٹو'' کے عنوان سے ابنِ حسن نے گفتگو کی۔ اُنھوں نے اپنی گفتگو میں نیچرل ازم اور ریلیزم کا فرق واضح کرتے ہوئے منٹو کی حقیقت نگاری کا جائزہ لیا۔ اس بحث میں عامر سہیل، خالد محمود سنجرانی، لیاقت علی اور مظہر عباس نے حصہ لیا۔

چھٹا اور آخری اجلاس ۲۱ اگست کی شام کو منعقد ہوا۔ ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی نے ''منٹو کے افسانے اور تحلیل نفسی'' پر لیکچر دیتے ہوئے منٹو کے افسانوں کی تحلیل نفسی کرتے ہوئے ایڈی پس الجھاؤ کی طرف نشان دہی کی۔ اُنھوں نے کہا کہ منٹو کے ہاں لا شعوری طور پر اپنے والد کے خلاف نفرت جب تخلیق کا روپ ڈھالتی ہے تو حکومتوں، غاصبوں اور اجارہ داروں سے انتقام لیتی نظر آتی ہے۔ اُنھوں نے منٹو کے افسانوں کے اقتباسات کی مدد سے اُن مقامات کی نشان دہی کی جہاں والد کے خلاف لاشعور میں دبی نفرت مختلف اتھارٹیوں کے خلاف مزاحمت کا سبب بنتی ہے۔ اس گفتگو کے بعد دو روزہ منٹو سیمینار اپنے اختتام کو پہنچا۔

شمارے کا دوسرا حصہ ''مزید مطالعے (منٹو شناسی کے باب میں)'' پانچ مضامین پر مشتمل ہے:

۱۔ ''سعادت حسن منٹو برصغیر کا تخلیقی ضمیر'' از ڈاکٹر انوار احمد۔

۲۔ ''سعادت حسن منٹو کا 'کھول دو'، چاک جگر کی رفوگری کا ایک جتن'' از خالد سعید۔

۳۔ ''بابو گوپی ناتھ، زندگی کے امکانات کا اشارہ'' از ڈاکٹر روبینہ شاہ جہاں۔

۴۔ ''منٹو اور اُردو افسانہ کے جدید رجحانات'' از نسیم عباس۔

۵۔ منٹو۔ کتابیات''، از ڈاکٹر علی ثنا بخاری۔

ڈاکٹر انوار احمد کے مضمون ''سعادت حسن منٹو، برصغیر کا تخلیقی ضمیر'' میں منٹو کے فکر و فن کے تقریباً سبھی پہلوؤں کا جامع انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں منٹو کے فن کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جو زیرِ بحث نہ آیا ہو۔ ڈاکٹر انوار احمد کا یہ مضمون اس سے قبل ان کی کتاب ''اردو افسانہ تحقیق و تنقید'' میں پہلی بار شائع ہوا تھا[۱۰۱] جب کہ دوسری بار اس مضمون کا کچھ حصہ ''سعادت حسن منٹو، پچاس برس بعد'' میں تمہید کی معمولی تبدیلی سے ''سعادت حسن منٹو، پاکستان کا ایک غیر معمولی تخلیق کار'' کے عنوان سے بھی شائع ہوا۔[۱۰۲]

ڈاکٹر روبینہ شاہ جہان کے مضمون ''بابو گوپی ناتھ، زندگی کے امکانات کا اشارہ'' میں منٹو کے کردار بابو گوپی ناتھ کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ جب کہ نسیم عباس نے اپنے مضمون ''منٹو اور اُردو افسانہ کے جدید رجحانات میں جدید اُردو افسانے کے غالب رجحانات کو زیرِ بحث لاتے ہوئے منٹو کی افسانوں ''پھندنے''، ''فرشتہ''، ''باردہ شمالی''، ''نعرہ'' اور ''سجدہ'' کو علامت نگاری اور تحلیل نفسی کے ساتھ شعور کی رو اور سرئیلزم کی اوّلین صورتیں قرار دیا، جو جدید افسانے کا پیش خیمہ ہیں۔

ڈاکٹر علی ثنا بخاری نے ''منٹو۔ کتابیات'' کے عنوان سے منٹو سے متعلق کتب اور مضامین کا اشاریہ مرتب کیا ہے۔ اس سے قبل ۱۹۸۶ء میں اُنھوں نے مقتدرہ قومی زبان کے تعاون سے ایک کتابچہ اسی موضوع پر تحریر کیا تھا۔ زیرِ نظر مضمون اسی کتابچے کی اضافہ شدہ (up-date) صورت ہے۔ اُنھوں نے آغاز سے ۲۰۰۵ء تک منٹو کی شائع ہونے والی سوانحی اور تنقیدی کتب کی فہرست شائع کی ہے۔ شامل کتب، رسائل اور مضامین کی تعداد مکمل نہیں اور اس میں بہت سے اضافے ممکن ہیں۔ مضامین اور مقالہ جات کا گوشوارہ خصوصاً اضافہ طلب ہے۔

ماہنامہ ''حرف جعفر''، فیصل آباد:

منٹو صدی کی مناسبت سے اپریل مئی ۲۰۱۲ء میں سعادت حسن منٹو سے مخصوص کیے گئے اس خصوصی شمارے کی ترتیب و تدوین کے فرائض طارق محمود ہاشمی اور فیصل آباد کے رہائشی پاکستان کے بڑے منٹو شناس پرویز انجم نے سرانجام دیے۔ پرویز انجم کی ترتیب اور تصنیف کی گئی سات کتب منٹو شناسی کے باب میں بہت منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ جعفر حسن مبارک جو اس رسالے کے چیف ایڈیٹر ہیں، کے اداریے کے بعد درج ذیل تحریروں کو شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ اُردو افسانے میں جرأت مندی کی مثال منٹو از احمد ندیم قاسمی، شجر ممنوعہ، از قدرت اللہ شہاب، خالی بوتل بھرا ہوا دل، از کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، از اشفاق احمد، سیاہ لکیر، از امرتا پریتم، سعادت حسن منٹو، از صفدر میر، سعادت حسن منٹو کے آخری دن، از اے حمید، سعادت حسن منٹو سے آخری ملاقات، از حبیب جالب، منٹو چند یادیں، از شورش کاشمیری، منٹو ایک اجنبی، از خالد حسن، کیا آج سعادت حسن منٹو کی ضرورت ہے، از سلیم اختر، منٹو کو زندہ ہی سمجھئے کیوں کہ منٹو زندہ ہے، از کوشا سوبتی، منٹو ہمارا موپاساں، از ممتاز شیریں، منٹو اور غالب۔ ایک صلیب دو عہد، از پرویز انجم، منٹو۔ آج، از نزہت منٹو اور سعادت حسن منٹو کے لطیفے، از تنویر عالم کے علاوہ منٹو کی دو کہانیوں، نیا قانون اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کا انتخاب بھی رسالے میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ رسالے کے ایک مرتب طارق محمود ہاشمی کا محمد سعید کی مرتبہ کتاب نوادرات منٹو، مطبوعہ ۲۰۰۹ء پر ایک تبصرہ بھی شامل ہے۔ ان کے اس تبصرے کو فہرست مضامین میں شامل نہیں کیا گیا۔ مزید یہ کہ مضامین کی فہرست میں موجود ۱۶ویں مضمون ''منٹو۔ ہمارا موپاساں'' کے مصنف کا نام ممتاز شیریں کی بجائے ڈاکٹر برج پریمی درج ہو گیا ہے۔ حال آں کہ برج پریمی کا مضمون منٹو اور شراب'' کے عنوان سے شامل ہے۔ اور یہ فہرست مضامین میں درج نہیں ہے۔

''منٹو صدی'' کے عنوان سے لکھے گئے اداریے میں رسالے کے چیف ایڈیٹر جعفر حسن مبارک نے منٹو کی اہمیت اور انفرادیت پر روشنی ڈالی۔ اس ڈیڑھ صفحاتی تجزیے میں اُنھوں نے چار مقامات پر ٹھوکر کھائی۔ لکھتے ہیں:

> ''سعادت حسن منٹو جیسا عظیم افسانہ نگار ایک صدی قبل بیرسٹر غلام حسین منٹو کے گھر ان کی دوسری بیوی سردار بیگم کے بطن سے پیدا ہوا۔ مسلم ہائی سکول امرت سر میں دو بار میٹرک میں فیل ہوا۔ ۱۹۱۹ء میں سعادت حسن منٹو کا پہلا افسانہ ''جلیانوالا باغ'' کے قتل عام پر مبنی تھا۔ ۱۹۴۷ء میں دوبارہ لاہور آ گئے۔'' [۱۰۳]

پہلی بات تو یہ کہ منٹو کے والد کا نام غلام حسین کی بجائے غلام حسن منٹو تھا۔ دوسری یہ کہ منٹو میٹرک میں دو کی بجائے تین بار فیل ہوا تھا۔ ڈاکٹر علی ثناء بخاری کی تحقیق کے بعد اب اس غلطی کو درست کر لیا جانا چاہیے۔ [۱۰۴]

جہاں تک منٹو کے پہلے افسانے کا تعلق ہے وہ تھا تو جلیانوالا باغ ہی کے متعلق مگر ۱۹۱۹ء کی بجائے یہ افسانہ تماشا کے نام سے باری علیگ کے شمارے ''خلق'' میں آدم کے فرضی نام کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ جہاں تک منٹو کی تقسیم کے بعد پاکستان آمد کا تعلق ہے تو وہ ۱۹۴۸ء میں کراچی کے راستے لاہور آئے تھے نا کہ ۱۹۴۷ء میں۔ کسی بھی رسالے کے خصوصی شمارے کے اداریے میں اس طرح کی تاریخی اغلاط کی اشاعت سے گریز کرنا چاہیے۔

اس خصوصی شمارے کا پہلا مضمون ''منٹو اپنے ہمزاد کی نظر میں'' خود سعادت حسن منٹو کا اپنا لکھا ہوا خاکہ ہے۔ ماہنامہ افکار اور شاعر کے منٹو نمبر ۱۹۵۵ء میں اسے ''منٹو اپنے ہمزاد کی نظر میں'' کے عنوان سے شائع کیا گیا۔ یہ شہرہ آفاق مضمون منٹو کی شخصیت کا بھرپور عکاس ہے۔ منٹو کے علاوہ جتنے بھی لوگوں نے منٹو کی شخصی مرقعے کھینچے ہیں، خود منٹو کا یہ مرقع سب سے عمدہ قرار پاتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے اپنے مضمون ''اردو افسانے میں جرات مندی کی مثال منٹو'' کا آغاز منٹو کے افسانوں میں موجود شدید جنسی احساسات کے در آنے سے کیا ہے۔ اس ضمن میں پہلے ادب لطیف میں ''بو'' اور پھر نقوش میں ''کھول دو'' کی اشاعت کے بعد چلنے والے مقدمے اور چھ ماہ کی پابندی کو انہی جنسی افسانوں کے مرہون منت گردانا۔ ''کھول دو'' کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں کہ :

> ''میں نے وہ افسانہ ''بو'' جیب میں ڈالا اور یہ سوچتا ہوا واپس آیا کہ اگر اس افسانے کو بھی عریاں افسانے کہنے والے موجود ہیں تو پھر ہم سب افسانہ نگاروں کو افسانہ نگاری ترک کر کے کوئی اور مفید کام کرنا چاہیے۔''[۱۰۵]

مضمون نگار کے مطابق یہ بات درست ہے کہ منٹو کے بعض افسانوں میں جنس کا عمل دخل زیادہ ہے اور اس نے اچھے افسانوں کے ساتھ ساتھ برے افسانے بھی تخلیق کیے مگر کسی بھی ادیب کا محاکمہ کرتے ہوئے اس کے اچھے فن پاروں کو معیار بنایا جاتا ہے نہ کہ اوسط یا نچلے درجے کی تخلیقات کو۔ ہماری تنقید کا عمومی رویہ بھی یہی رہا ہے لیکن منٹو کے باب میں اس رویے سے اغماض برتا گیا اور زیادہ تر لوگوں نے منٹو کے عریاں نگار ہونے سے ہی اپنی بات کا آغاز کیا۔ اُنھوں نے منٹو کو عریاں نگار قرار دینے والے نقادوں سے گزارش کی کہ وہ اس کی تحریر کے ایک ایک لفظ پر گرفت کر کے بیٹھ جانے کی بجائے اس کے افسانوں کے مجموعی تاثر کو گرفت میں لانے کی کوشش کریں۔

''قدرت اللہ شہاب اور اشفاق احمد کا شمار ادبی اشرافیہ'' میں ہوتا ہے ان دونوں نے اپنے مضامین شجر ممنوعہ اور سعادت حسن منٹو، میں محتاط قسم کی گفتگو کرتے ہوئے منٹو کی وفات کے بعد اپنے تاثرات کو ان مضامین میں رقم کیا ہے۔ یہ مضامین خصوصی طور پر بھی نہیں لکھے گئے بلکہ ان دونوں حضرات کی تصانیف شہاب نگر، مرتبہ شیما مجید اور بابا صاحبا سے مقتبس ہیں۔ کرشن چندر کا مضمون ''خالی بوتل بھرا ہوا دل'' سب سے پہلے ہفتہ روزہ آئینہ دہلی میں ۳۱ جنوری ۱۹۵۵ء کو شائع ہوا۔ اس کے بعد یہ مضمون اسی عنوان سے افکار کے منٹو نمبر مطبوعہ ۱۹۵۵ء کے علاوہ مدیر افکار صہبا لکھنوی کی مرتب کردہ ''منٹو ایک کتاب'' مطبوعہ ۱۹۹۴ء میں بھی شامل ہے۔ بعد میں غلام زہرہ کی مرتبہ ''منٹو کیا تھا'' مطبوعہ ۲۰۰۳ء میں بھی اس سے قبل اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ کرشن چندر اور منٹو ایک دوسرے کے اچھے دوستوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اس نبھاؤ میں کرشن چندر کے مصلحانہ رویے کا زیادہ ہاتھ ہے۔ کرشن چندر کے مطابق تقسیم کے بعد منٹو کے متعلق بہت سی بری بری افواہیں ہندوستان پہنچتی رہیں لیکن جب تک اس کے افسانے چھپتے رہے ہم اُنھیں منٹو کے خیریت نامے سمجھ کر پڑھتے رہے۔ منٹو کی موت کی خبر کے صدمے کے نتیجے میں لکھے گئے اس تاثراتی مضمون میں کرشن چندر نے بہت جذباتی لہجے میں ہمارے اجتماعی ضمیر کو جھنجھوڑا جو منٹو کی اس المناک موت کا براہ راست ذمہ دار ہے۔

امرتا پریتم نے ''سیاہ لکیر'' میں منٹو کی موت سے پیدا ہونے والے ادبی خلا کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے منٹو کی فنی خدمات کا افسانوی انداز میں اعتراف کیا۔ امرتا کے یہ تاثرات منٹو کی وفات کے بعد امرتسر سے شائع ہونے والے رسالے ''پگڈنڈی'' منٹو نمبر ۱۹۵۵ء میں سب سے پہلے شائع ہوئے۔[۱۰۶]

صفدر میر کا مضمون بعنوان ''سعادت حسن منٹو'' مئی ۱۹۶۳ء میں انگریزی اخبار ''ڈان'' میں شائع ہوا۔ رسالے کے مرتبین نے حوالہ جات کے ضمن میں مہینہ اور سال تو لکھے مگر تاریخ درج ہونے سے رہ گئی۔ چوں کہ یہ مضمون مئی کے مہینے میں اشاعت پذیر ہوا اس لیے قیاس ہے کہ یہ منٹو کی پیدائش کی دن کی مناسبت سے ۱۱ مئی ۱۹۶۳ء کو شائع ہوا ہوگا۔ صفدر میر کے اس مضمون کا انگریزی سے اُردو ترجمہ عتیق الرحمٰن کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس مضمون میں اُنھوں نے ناشرین، معاصرین، ادبی تحریکوں اور ان کے اکابرین کو کاروباری اور نظریاتی وجوہات پر منٹو کے معاشی اور فنی استحصال کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ لیکن اس شش جہتی استحصال کے باوجود منٹو کی شہرت کو گہنایا نہ جاسکا۔

شورش کاشمیری کا مضمون ''چند یادیں'' اس سے قبل افکار اور گل خنداں کے منٹو نمبر کے علاوہ ''منٹو ایک کتاب'' مرتبہ صہبا لکھنوی، ''سعادت حسن منٹو'' مرتبہ ضیا ساجد، ''منٹو کیا تھا'' مولفہ، غلام زہرہ اور احمد سلیم کی مرتبہ ''سعادت حسن مر گیا''، منٹو زندہ ہے'' میں بھی اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔[۱۰۷] اے حمید کے مضمون ''منٹو کے آخری دن'' میں مضمون نگار نے منٹو کی زندگی کے آخری اور تکلیف دہ ایام کا نقشہ کھینچتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عمر کے اس حصے میں منٹو کی تمام توانائیاں صرف اور صرف شراب کے حصول پر صرف ہوتی تھیں۔ دوست اُنھیں دیکھ کر کترانے لگے تھے بلکہ بعض تو غسل خانوں تک میں چھپ جایا کرتے تھے۔ منٹو کو اگر شراب کی شدید طلب نہ ہوتی تو شاید وہ اتنے تواتر سے افسانے نہ لکھتے۔ کثرت شراب نوشی نے ہم سے اردو ادب کے ایک عظیم افسانہ نگار کو وقت سے پہلے چھین لیا۔ ''سعادت حسن منٹو سے آخری ملاقات'' نامی مختصر مضمون 'جالب بیتی'' سے ماخوذ ہے۔ جس میں حبیب جالب نے منٹو کے ساتھ مل کر شراب پینے کے مواقع کو یاد کیا۔ منٹو کی وفات پر ان کی لکھی ہوئی ایک نظم بعنوان ''منٹو'' بھی مضمون کے بعد شامل کی گئی ہے۔

خالد حسن نے اپنے مضمون ''منٹو۔۔ ایک اجنبی'' میں اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ منٹو کی ادبی شہرت اب برصغیر سے نکل کر دور دور تک پہنچ چکی ہے لیکن ہم اُسے اب بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ جب کہ ہمارے مقابل میں ہندوستان اُسے اپنا شہری بنانے اور تسلیم کرانے پر مصر ہے۔ ہم آمروں اور مرے ہوئے حکمرانوں کے ناموں کے ساتھ تو اپنے بڑے بڑے تہذیبی ورثے اور شاہراہیں منسوب کر دیتے ہیں مگر:

> ''کسی سڑک، کسی چوک حتیٰ کہ کسی چھوٹی سی بند گلی کا نام بھی، یادگار کے طور پر منٹو صاحب کے نام پر نہیں رکھا گیا۔''[۱۰۸]

ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے مضمون ''کیا آج سعادت حسن منٹو کی ضرورت ہے'' میں عہد حاضر کے سیاسی، معاشی اور سماجی تناظر میں منٹو جیسے سچے، بہادر اور منافقت وریاکاری سے پاک افسانہ نگار کی کمی کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے عہد حاضر میں منٹو کو ایک بار پھر ناگزیر قرار دیتے ہوئے لکھا کہ:

''آج کا افسانہ نگار عہد غلامی کے افسانہ نگار سے زیادہ خوفزدہ نظر آرہا ہے وہ جماعت اسلامی سے لے کر ناقدین بلکہ تبصرہ نگاروں تک سے سہما رہتا ہے اور اسی لیے گیلی لکڑی بن کر سلگتا ہے۔ چناں چہ آج کے افسانہ نگار کو مہمیز کرنے کے لیے ایک منٹو کی ضرورت ہے۔''[۱۰۹]

کرشنا سوبتی نے اپنے مضمون ''منٹو کو زندہ ہی سمجھئے کیوں کہ منٹو زندہ ہے'' میں سعادت حسن منٹو کو اُس کی فکری اور فنی عظمت کی بنیاد پر ایک عظیم افسانہ نگار قرار دیتے ہوئے لکھا کہ منٹو نے سچے فنکار کی حیثیت سے انسان کے جسم اور روح پر چڑھی دھول، مٹی اور بھوک پیاس اتارنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

ممتاز شیریں کا مضمون ''منٹو۔۔۔ ہمارا موپساں'' ان کی کتاب منٹو، نوری، نہ ناری میں شائع ہو چکا ہے اس مضمون میں اُنھوں نے فنی تشکیل، مرکزی تھیمز، موضوعات اور نظریہ حیات کی روشنی میں منٹو کو اُردو کا موپساں قرار دیا۔[۱۱۰] ''منٹو اور شراب'' میں ڈاکٹر برج پریمی نے منٹو کے فنی ارتقاء کے ساتھ ساتھ اُس کی شراب نوشی کا بھی ارتقائی جائزہ پیش کیا ہے۔ جو امرتسر میں منٹو کے لڑکپن میں ہری سنگھ امرتسری کی صحبت سے شروع ہو کر باری علیگ سے ہوتا ہوا دہلی اور بمبئی کی فضاؤں میں اپنے عروج کو پہنچا اور بالآخر پاکستان میں اُس کی موت کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

''منٹو اور غالب۔۔۔ ایک صلیب دو عہد'' پرویز انجم کا یہ مضمون اس سے پہلے ان کی کتاب ''منٹو غالب کا پرستار'' میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس مضمون میں مضمون نگار نے منٹو اور غالب کی شخصیت اور فن میں موجود اشتراک اور مماثلتوں کے ذریعے منٹو کو غالب کا پرستار قرار دیا ہے۔[۱۱۱]

منٹو کی منجھلی بیٹی نزہت منٹو کا مضمون ''منٹو۔ آج، روزنامہ اُردو ٹائمز'' بمبئی میں منٹو کی برسی کے موقع پر ۱۸ جنوری، ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ اس مختصر مضمون میں نزہت منٹو نے اپنے والد کے انتقال کے بعد کے تلخ حالات کا ذکر اس شکوے کے ساتھ کیا کہ ناشرین نے جو رویہ منٹو کی زندگی میں اختیار کر رکھا تھا وہ وفات کے بعد بھی جاری رہا۔ اُنھیں نہ تو کسی نے رائلٹی دی اور نہ ہی پروڈیوسروں نے کوئی معاوضہ، حال آں کہ ان کی کہانیوں پر کئی کامیاب فلمیں نمائش کے لیے پیش کی گئیں۔ یہاں تک کہ منٹو کے نام سے عقیدت کا اظہار کرنے والے اس کے دوستوں اور ہمدردوں نے بھی ان کا ہر ممکن استحصال کیا۔ بلراج مینرا کے متعلق وہ یہ افسوسناک انکشاف کرتی ہیں کہ:

''ایک ہندوستانی ادیب (بلراج مینرا) لاہور آکر ہم سے ملے اور درخواست کی کہ وہ ہمارے والد کے غیر مطبوعہ افسانوں کا انتخاب مرتب کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے سارے افسانے ان کے حوالے کر دیے۔ لیکن افسوس کہ بار بار کے تقاضوں کے بعد بھی اُنھوں نے اور یجنل مسوّدے ہمیں واپس نہیں کیے اور سارے افسانے لے کر رفو چکر ہو گئے۔''[۱۱۲]

آخری مضمون ایک تبصرہ ہے جو طارق محمود ہاشمی نے ۲۰۰۹ء میں شائع ہونے والی محمد سعید کی مرتبہ کتاب ''نوادرات منٹو'' کی اہمیت و افادیت اجاگر کرنے کے لیے لکھا۔[۱۱۳]

حرف جعفر کے اس خصوصی شمارے میں زیادہ تر ایسے مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے جو منٹو کی وفات کے بعد شائع ہونے والے رسائل و جرائد میں تواتر کے ساتھ شائع ہوئے۔ خاص طور پر پاکستان کے رسائل اور جرائد کے علاوہ مرتبہ کتب ان مضامین سے بھری

پڑی ہیں۔ رسالے کے مرتبین نے اس بات کا خصوصی خیال رکھا کہ ایسی تحریروں کا انتخاب کیا جائے جو منٹو کی وفات کے فوراً بعد تو شائع ہوئیں لیکن بار بار کی اشاعت سے محفوظ رہ گئیں۔ چناں چہ یہ تحریریں/مضامین پرانے ہونے کے باوجود بھی اپنے اندر ایک نیا پن رکھتے ہیں۔ زیادہ تر مضامین کا تعلق ان تاثرات پر مبنی ہے۔ جو دوستوں، معاصر افسانہ نگاروں، نقادوں اور شاعروں نے منٹو کی وفات کی خبر سن کر جذباتی انداز میں لکھے اور مختلف واقعات کو یاد کر کے منٹو کی شخصی اور فنی عظمت کو، مرنے کے بعد ہی سہی کھلے دل سے سراہا۔ مرتبین کسی تحقیقی بصیرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُنھوں نے شمارے میں شامل کم و بیش سبھی مضامین کے ماخذات کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔ ۶۴ صفحات پر مشتمل یہ خصوصی شمارہ منٹو صدی کی مناسبت سے اپریل، مئی ۲۰۱۲ء میں فیصل آباد سے شائع کیا گیا۔

''فکر و تحقیق''، نئی دہلی:

منٹو سے منسوب یہ خصوصی شمارہ، جولائی اگست، ستمبر ۲۰۱۲ء منٹو صدی کے موقع پر نئی دہلی سے شائع ہوا۔ مدیر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین جب کہ نائب مدیر ڈاکٹر عبدالحئ ہیں۔ شمارے میں ادارتی نوٹ ''حرف اول'' کے بعد مجموعی طور پر ۳۲ مضامین شامل ہیں۔ تمام کے تمام مضمون نگار ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جنھوں نے ادارے کی خصوصی فرمائش پر تازہ مضامین لکھ کر منٹو کی متعدد فکری و فنی جہتوں کو اپنے اپنے نقطہ نظر سے اجاگر کیا۔ عتیق اللہ، قدوس جاوید، علی احمد فاطمی، صغیر افراہیم، مشرف عالم ذوقی، طارق چھتاری، ہمایوں اشرف، پریمی رومانی، خالد اشرف، نگار عظیم، صالحہ زرین، اور فاروق اعظم قاسمی کا شمار منٹو کے سنجیدہ ناقدین میں ہوتا ہے اور ان میں سے بیشتر ناقدین منٹو کے باب میں صاحب کتاب بھی کہلاتے ہیں۔ شمارے کی سب سے عمدہ بات یہ ہے کہ بیشتر مضامین پہلی دفعہ پڑھنے کو میسر ہوئے۔ شمارے کا سب سے پہلا مضمون ''منٹو: آج بھی با معنی کیوں؟'' عتیق اللہ کا تحریر کیا ہوا ہے۔ اُنھوں نے عہد حاضر میں منٹو کی تحریروں میں موجود معنویت کے پیش نظر آج بھی منٹو کو اتنا ہی اہم اور عہد حاضر سے جڑا ہوا افسانہ نگار قرار دیا جتنا وہ اپنے زمانے سے تھا۔

پروفیسر قدوس جاوید اپنے مضمون ''منٹو، تکنیک اور بیانیہ'' میں سعادت حسن منٹو کے معاصرین، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی وغیرہ کے ساتھ تقابل کے بعد یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ فنی اور تکنیکی اعتبار سے منٹو اپنے تمام معاصرین سے بہتر تھے۔ علی احمد فاطمی کا مضمون منٹو کے وارث ''منٹو ایک مطالعہ'' کے مصنف وارث علوی کی منٹو شناسی کا تفصیلی جائزہ ہے۔ منٹو کے خلق کردہ جسم فروش کردار ''صغیر افراہیم کا مضمون ہے۔ وہ منٹو کے ناقدین کو تین مختلف دھڑوں میں تقسیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ایک وہ (ناقدین)، جو اس (منٹو) کو اور اس کے افسانوں کو جنسی بے راہ روی کی ترویج و اشاعت کا آلہ سمجھتے ہیں۔۔۔
> دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ وہ فرائیڈ سے متاثر ہو کر فحش، مخرب الاخلاق چیزیں لکھ کر ہماری تہذیبی شائستگی پر جارحیت کا مظاہرہ کرتا تھا۔ لیکن دانشوروں کا تیسرا حلقہ اس کے فن پاروں کو فنی تناظر میں دیکھتے ہوئے فن اور فنکار کی اہمیت و افادیت کو قائم کرتا ہے۔'' [۱۱۴]

مضمون نگار نے منٹو کے جنسی حوالوں سے معتوب کرداروں کا ناقدین کے تیسرے حلقے کے نقطہ نظر کی روشنی میں فنی جائزہ لیا۔ مضمون کے اختتام میں صغیر افراہیم لکھتے ہیں:

''اکیسویں صدی کے بدلے ہوئے ادبی تناظر میں ضرورت اس بات کی ہے کہ بیان کے مختلف اسالیب اور منٹو کی افسانوی تکنیک کو بیانات کے جدید تصورات کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی جائے تاکہ بدنام زمانہ افسانہ نگار کے افسانوں میں تکنیک کے متنوّع، لطیف اور نازک پہلوؤں تک رسائی ممکن ہو سکے۔'' [۱۱۵]

''منٹو ایک کولاژ'' میں مشرف عالم ذوقی منٹو کی محبت کے کچھ زیادہ ہی اسیر دکھائی دیے۔ ان کے مطابق جتنے فنی تجربے منٹو نے کیے اتنے تو شاید چیخوف اور موپساں نے بھی نہیں کیے ہوں گے۔ منٹو کے فن خاکہ نگاری اور غلامی و فسادات کے متعلق لکھے گئے افسانوں کی روشنی میں مشرف عالم ذوقی اپنے مضمون کے آخر میں یہ نتیجہ نکالتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ جب غلامی یا تقسیم کے المیہ کو لے کر دوسروں کے قلم رو رہے تھے، یہ منٹو ہی تھا جو ادب میں مضبوط طریقے سے اپنا غصہ، احتجاج اور مداخلت درج کرا رہا تھا۔'' [۱۱۶]

طارق چھتاری نے منٹو کی کہانیوں کو تخلیقی قوت کا توانا اظہار قرار دیا۔ جب کہ وضاحت حسین رضوی ''منٹو کے ناولٹ بغیر عنوان کے میں موجود فکری و فنی خوبیوں کے گرد اپنے مضمون کا تانا بانا بنتے دکھائی دیے ہیں۔ محمد اسلم پرویز نے مراٹھی زبان و ادب میں منٹو کی معنویت اور اہمیت پر روشنی ڈالی، ان کے مطابق دیگر زبانوں کی طرح مراٹھی میں بھی منٹو کے لگ بھگ تمام اہم اور نمائندہ افسانے ترجمہ کیے جا چکے ہیں۔

''سعادت حسن منٹو اور کشمیر'' غلام نبی خیال نے اپنے اس مضمون میں منٹو کی مختلف تحریروں اور واقعات سے منٹو کی کشمیر سے محبت اور دلچسپی کو اپنے مضمون کا موضوع بنایا۔

ڈاکٹر ہمایوں اشرف ایک اعلیٰ ظرافت نگار منٹو'' میں سعادت حسن منٹو کی غیر افسانوی تحریروں یعنی مضامین کو بھی ان کی دیگر تخلیقات کی طرح زندگی کی مختلف صورتوں کو پیش کرنے کا وسیلہ قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''منٹو کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین ایسے ہی نشتر ہیں جن سے تکلیف تو ملتی ہے لیکن مریض کو راحت بھی میسر آ جاتی ہے۔ ایک صاف ستھرے معاشرے کی تعمیر کے لیے یہ تخریب برداشت کرنا ہی چاہیے۔'' [۱۱۷]

پریمی رومانی نے شخصیت اور فن کا عمومی جائزہ لیتے ہوئے سعادت حسن منٹو کو اردو افسانے کی آبرو قرار دیا۔

''منٹو افسانہ اور تحریک آزادی'' میں ڈاکٹر خالد اشرف نے منٹو کے سیاسی موضوعات پر لکھے گئے افسانوں کے تناظر میں یہ نتیجہ نکالا کہ منٹو سیاست پر بھی اسی کمٹ منٹ اور مہارت سے خامہ فرسائی کرتے ہیں جس طرح کہ وہ نفسیاتی اور سماجی نوعیت کی کہانیاں لکھتے وقت کرتے ہیں۔ صغیر افراہیم کی طرح اے رحمن نے بھی منٹو کے افسانوں پر کیے جانے والے تبصروں کو احمقانہ، معاندانہ اور ایماندارانہ کے زمروں میں تقسیم کرتے ہوئے ہر طبقے کے طریق تنقید کا جائزہ لیا۔ اپنے طویل مضمون میں ان تینوں طریق ہائے تنقید پر بحث کے بعد مضمون نگار یہ نتیجہ نکالتے ہیں:

''منٹو کے افسانوں کی درست اور منصفانہ تشریح و تفہیم صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ تمام اخلاقی اور مذہبی قیود نیز گھسی پٹی تنقیدی تکنیک و لفظیات سے پیچھا چھڑا کر نفسیات اور جنسیات کے آفاقی اصولوں کی روشنی میں منٹو کے فن کی بازیافت کی پُرخلوص کوشش کی جائے۔'' [۱۱۸]

سعید احمد قادری، نگار عظیم، اسلم جمشید پوری، آفتاب احمد آفاقی، عظیم اقبال اور اطہر مسعود خان نے اپنے مضامین میں منٹو کی ڈرامانویسی، ترقی پسندی، انشاء پردازی، کردار نگاری اور غیر معروف افسانوں کے تجزیے سے منٹو کی مختلف فنی اور فکری جہتوں پر روشنی ڈالی۔

شائستہ فاخری کی ادبی تربیت ایسی محفلوں میں ہوئی جن کا مرکزی کردار اوپندر ناتھ اشک ہوا کرتے۔ اپنے مضمون ''منٹو کاش تم نے ہم کو جانا ہوتا'' میں اوپندر ناتھ اشک کے تجزیوں کے متعلق لکھتی ہیں:

> ''انہی بحثوں کے درمیان۔ اشک جی اپنے ٹھیٹھ پنجابی انداز میں منٹو کی کہانیوں کے ایک ایک نسوانی کردار کو لے کر اس طرح بوٹی بوٹی ادھیڑتے کہ میرے رونگھٹے کھڑے ہو جاتے۔''[۱۱۹]

مضمون نگار کے مطابق منٹو اپنے نسوانی کرداروں سے محبت نہیں کرتے تھے اگر ایسا ہوتا تو ان کے ساتھ وہ سلوک نہ کرتے جو اُنھوں نے کیا۔ شائستہ فاخری اپنی گفتگو کا اختتام عجیب و غریب اور غیر منطقی طور پر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ منٹو کو عورتوں کو سمجھنے اور احترام دینے کا ہنر نہیں آیا۔ وہ عورتوں کی نفسیات سے واقف ہی نہیں۔ یہاں تک کہ اپنی بیوی تک کی نفسیات کو وہ نہ سمجھ پائے۔ اس ضمن میں لکھتی ہیں:

> ''منٹو زندگی کی آخری سانسوں تک جو لکھتے رہے وہ بہت حد تک ایک مشینی عمل ہے۔ ان کے لیے لکھنا ہی اوڑھنا، بچھونا سب کچھ تھا۔ اور شاید اس لیے اپنی بیوی کی نفسیات کو سمجھنے کا حق بھی منٹو ادا نہیں کر سکے۔ نسوانی کرداروں کے ساتھ انصاف کا حق کیا ادا کرتے۔''[۱۲۰]

لئیق رضوی، شمیم احمد، صالحہ زریں اور اعظم انصاری کے مضامین میں منٹو کی ادبی صحافت نگاری، نفسیاتی افسانہ نگاری اور خاکہ نگاری کی خصوصیات کو زیر بحث لایا۔ حسن رضا نے گوپی چند نارنگ کی منٹو شناسی پر بات کی تو ریحانہ سلطانہ نے منٹو کو سماج کا عکاس کہا۔

سعادت حسن منٹو کے متعلق اس خصوصی شمارے کا آخری اور طویل مضمون شمس الحق عثمانی کا تحریر، ترتیب کردہ ہے۔ ''منٹو بقلم خود (ایک اسمبلاژ)'' میں شمس الحق عثمانی نے سعادت حسن منٹو کی ذاتی تحریروں کو ایک خاص سلیقے سے ترتیب دے کر منٹو کی کہانی اُن کی اپنی زبانی سنانے کا خوب طریقہ نکالا۔ ۳۸۲ صفحات پر مشتمل یہ ضخیم خصوصی شمارہ منٹو شناسی کے جدید رجحانات کا بہترین عکاس ہے۔

''زیست''، کراچی (منٹو صدی نمبر):

منٹو صدی کی مناسبت سے شائع ہونے والا یہ خصوصی کتابی سلسلہ نمبر ۴، سعادت حسن منٹو کی شخصیت، فکر اور فن کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔

''زیست'' کے اس کتابی سلسلے کے مرتب ڈاکٹر انصار شیخ نے اسے نومبر ۲۰۱۲ء میں ادارہ رموز، کراچی سے شائع کیا۔ یہ خصوصی نمبر چار حصوں: نقش جدید، منظوم خراج تحسین، نقش کہن اور منتخبات کی صورت میں ڈھالا گیا ہے۔ پہلا حصہ ''نقش جدید'' تیس مضامین پر مشتمل ہے۔ اور رسالے کا سب سے اہم حصہ ہے۔ اس میں شامل تمام مضامین (ایک آدھ کو چھوڑ کر) عہد جدید سے تعلق رکھنے والے ناقدین کے قلم سے لکھے گئے ہیں۔ چناں چہ اُس روایتی تاثر اور تکرار سے محفوظ ہیں جو عموماً منٹو کے متعلق ترتیب دیے

گئے رسائل یا کتب کا خاصا بن چکا ہے۔ اس حصے میں شامل تیس مضمون نگاروں کے نام دیکھ کر پہلا تاثر یہ ابھرتا ہے کہ اب منٹوانہ تنقید وقار عظیم، عبادت بریلوی، وارث علوی، یا ممتاز شیریں وغیرہ کے ''سحر'' سے نکل کر نئی نسل کے نئے تناظرات میں ڈھل چکی ہے۔ پرویز انجم، زاہدہ حنا، ڈاکٹر محمد رضا کاظمی، روف نیازی، اجمل کمال، آصف فرخی، مبین مرزا، شہناز پروین، طاہرہ اقبال، تشنہ بریلوی، نصرت انور، احمد مبارک، ڈاکٹر روش ندیم، روبینہ فیصل، محمد سعید، ڈاکٹر جمال نقوی، رئیس فاطمہ، سیما سراج، عنبرین حسیب عنبر، ڈاکٹر کامران کاظمی، ایم خالد فیاض، سائرہ غلام نبی، نجیب عمر، ذوالفقار علی دانش، ڈاکٹر محمد کاظم، ڈاکٹر نزہت عباس، ڈاکٹر سمیرا بشیر اور ڈاکٹر علی ثناء بخاری سمیت سبھی لکھاری عہد جدید یعنی اکیسویں صدی کے تنقیدی معیاروں کی روشنی میں سعادت حسن منٹو کی از سر نو تفہیم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

کمال احمد رضوی کا مضمون ''منٹو صاحب'' اگرچہ نیا نہیں لیکن بہت کم چھپا ہے۔ یادوں اور ملاقاتوں کے ذکر سے بھرا یہ شخصی خاکہ مضمون نگار اور منٹو کے مراسم کے ساتھ ساتھ منٹو کی شخصیت کا بھی عکاس ہے۔ پرویز انجم نے ''منٹو کی بیگو'' کا لینڈ اسکیپ منٹو کی دس عشقیہ کہانیوں سے کشید کیا تو زاہدہ حنا نے ڈاکٹر انوار احمد کی طرح منٹو کو برصغیر کا تخلیقی ضمیر قرار دیا۔ ڈاکٹر محمد رضا کاظمی نے ''سعادت حسن منٹو کی تنقید نگاری'' کے عنوان سے لکھے گئے مضمون میں منٹو کی ناقدانہ صلاحیتوں کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اُس کا ارتقائی جائزہ بھی خوب لیا' روسی اور فرانسیسی ادب نمبروں کی اشاعت کے دوران روسی اور فرانسیسی ادیبوں اور شاعروں کے تعارف، خصوصاً گی سم گورکی پر لکھا گیا ان کا مضمون تو خاصے کی ''تنقید'' ہے۔ اپنی ابتدائی ادبی زندگی کے زمانے میں مختلف اخبارات سے وابستگی اور فلموں پر کیے گئے تبصروں کے علاوہ احمد ندیم قاسمی کے نام لکھے گئے خطوط سے بھی منٹو کی تنقیدی بصیرت کے آثار بآسانی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے مضمون ''بہت ہولی'' اب منٹو سے زیادتی نہ کرو'' میں فیض احمد فیض کے اس بیان کو تاریخی حوالوں سے رد کیا گیا۔ جس میں اُنھوں نے سعادت حسن منٹو کو اپنا شاگرد قرار دیا تھا۔ رؤف نیازی نے منٹو کے افسانے ''موتری'' کا اکیسویں صدی کے انتقادی شعور کی روشنی میں تجزیہ کیا تو اجمل کمال نے منٹو کے باب میں اختیار کیے گئے تنقیدی رویوں کو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا کہ:

> ''موجودہ صورتحال میں تو پڑھنے والوں کو منٹو (اور دوسرے تخلیقی ادیبوں) کی تحریروں سے نقادوں کی مدد کے بغیر ہی مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔'' [۱۲۱]

اجمل کمال کے ساتھ ساتھ آصف فرخی کا مضمون ''منٹو کو نہ پڑھنے کے طریقے'' منٹو کے متعلق شائع ہونے والے ''نیا ورق'' کے خصوصی گوشے کے علاوہ اُن کی مرتبہ کتاب ''منٹو کا آدمی نامہ'' میں بھی شامل ہے۔ آصف فرخی نے اس مضمون میں اُن نقادوں پر تنقید کی ہے جو موقع کی مناسبت سے منٹو کے افسانوں سے اپنے مطلب کی چیز نکالنے کے ماہر ہیں۔ طارق علی، اشیش نندی اور فہمیدہ ریاض کے مطالعات اور مضامین پر گرفت کرتے ہوئے اُنھوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ منٹو کے ایک خاص دور کے افسانوں کو معیار بنا کر مکمل منٹو قرار دینا مبنی بر انصاف نہیں۔ منٹو کا اس طرح بٹوارا کرنے سے اُس کی جنس اور تقسیم کے علاوہ دیگر موضوعات پر لکھی گئی کہانیوں سے نظر نہیں ہٹائی جا سکتی۔ اس زاویے سے ہم منٹو کے ساتھ وہی زیادتی کر رہے ہیں جو اس کے اپنے عہد

کے سماج اور ادب نے روا رکھی تھی۔ چناں چہ مصنف نے حصوں بخروں میں ''تقسیم منٹو'' کی بجائے پورا منٹو پڑھنے پر زور دیا۔ مبین مرزا، شہناز پروین، تشنہ بریلوی، نصرت انوار اور احمد مبارک نے منٹو کی افسانوی قدر و قیمت کا عمومی جائزہ لیا۔

طاہرہ اقبال نے مضمون ''سعادت حسن منٹو امر ہے'' میں منٹو صدی کے حوالے سے ہندوستان میں ہونے والی تقاریب اور ہندوستانیوں کی منٹو سے محبت اور پذیرائی کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔ اُنھوں نے تحقیقی میدان میں منٹو کی اصل جائے پیدائش ''پیروڈی'' تحریر کر کے بہت سے منٹو شناسوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ اس حوالے سے وہ لکھتی ہیں:

> ''ہمارے لیے یہ ایک خبر تھی کہ منٹو سمبرالہ تحصیل کے ایک چھوٹے سے گاؤں ''پیروڈی'' میں پیدا ہوئے، کیوں کہ عموماً کتابوں میں ان کی جائے پیدائش سمبرالہ ہی لکھی جاتی ہے۔'' [۱۲۲]

تشنہ بریلوی کے مختصر مضمون میں ایک بہت اہم اطلاع دی گئی ہے۔ اُن کے مطابق حاجرہ مسرور خدیجہ مستور اور احمد ندیم قاسمی کی مشترکہ رہائش گاہ ''افسانہ خواں'' میں ترقی پسند تحریک کے اکابرین منٹو اور عسکری اتحاد کے خلاف چلائی گئی مہم کے سلسلے میں مرزا ادیب کو گھیرے بیٹھے تھے اور ان کے رسالے کو حسن عسکری اور سعادت حسن منٹو کی تحریروں سے پاک کرانے کے خواہاں تھے۔ اس حوالے سے ایک اقتباس دیکھیے:

> ''مرزا ادیب کو یہاں اس لیے بلایا گیا ہے کہ ان کو پابند کیا جائے کہ وہ اپنے رسالے میں صرف ''پرولتاری'' یعنی مزدور ادب پیش کریں گے اور منٹو وغیرہ کو نہیں چھاپیں گے۔'' [۱۲۳]

ترقی پسند تحریک اس زمانے میں سب سے بڑی اور طاقتور تحریک تھی۔ منٹو کے مزاج کو دیکھتے ہوئے ان کے ترقی پسندوں سے ٹکرانے کے عمل کو بعید از قیاس نہیں کہا جاسکتا۔ مگر اس اجلاس کے دوران جو پوزیشن مرزا ادیب نے لی وہ کمال ہے۔ تشنہ بریلوی لکھتے ہیں:

> ''مرزا ادیب تھوڑا سا لنگڑاتا ہوا یہاں آیا تھا۔ مگر اب وہ مضبوطی سے اپنے دونوں پیروں پر کھڑا ہو گیا اور ''پارٹی لائن'' قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔'' [۱۲۴]

''کون ہے یہ گستاخ۔۔۔ تاخ تڑاخ'' ڈاکٹر روش ندیم کے مضمون کا عنوان ہے۔ ان کے مطابق نئے عصری شعور کے تحت منٹو کا تصور انسان وہی تھا جو اس کے افسانوں میں عوامی طبقات کی عورتوں کو مرکزی حقیقت اور کردار کے طور پر لے آیا ہے۔

محمد سعید نے منٹو کے ایک نادر اور نایاب ترجمے ''سرخ پھول'' کو ۱۹۳۶ء کے معروف رسالے عالمگیر سے تلاش کر کے قارئین کے سامنے رکھا۔ جب کہ ڈاکٹر جمال نقوی منٹو کو ان کی تحریروں کی مدد سے ترقی پسند ثابت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

''منٹو بطور خاکہ نگار'' ڈاکٹر کامران کاظمی کے مضمون کا عنوان ہے۔ اپنے اس مضمون میں اُنھوں نے تحقیقی اور تنقیدی دونوں پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے سعادت حسن منٹو کی خاکہ نگاری کا ارتقائی جائزہ بہت عمدگی اور تفصیل سے لیا ہے۔ ڈاکٹر کامران کاظمی کی طرز کا ایک مضمون منٹو کی ڈراما نگاری کے اجمالی جائزہ پر مشتمل ہے جو ڈاکٹر محمد کاظم کی تحریر ہے۔ حصہ اول میں شامل آخری اور اہم مضمون ڈاکٹر علی ثناء بخاری کا ''سعادت حسن منٹو (کتابیات) شائع شدہ، ۱۹۸۶ء مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کی ترمیم و اضافہ شدہ صورت ہے۔ مضمون تحقیقی اہمیت کے پیش نظر مضمون نگار نے اُن عناصر کی بھی نشاندہی کی ہے جنھوں نے اُن کے پی ایچ ڈی کے

مقالے اور مذکورہ بالا کتابچے سے بغیر حوالہ دیے پورا پورا استفادہ کیا۔ اس ضمن میں نوید الحسن، شمشیر حیدر شجر، ڈاکٹر انیس ناگی، اور ہمایوں اشرف کے نام اُنھوں نے واضح کر کے لکھے ہیں۔ اگرچہ کہ ڈاکٹر علی ثناء بخاری کی فراہم کردہ تنقیدی و تحقیقی کتب و مقالہ جات اور رسائل و مضامین وغیرہ کی فہرست بھی کچھ کچھ نامکمل ہے لیکن پھر بھی اس کی تحقیقی اہمیت کی داد دینا پڑتی ہے۔

''زیست'' کے اس خصوصی شمارے کا دوسرا حصہ حمایت علی شاعر، ظفر اقبال، تشنہ بریلوی، غالب عرفان اور تزئین راز زیدی کا ''منظوم خراج تحسین'' ہے۔

''نقش کہن'' رسالے کا تیسرا حصہ، نو ایسے مضامین پر مشتمل ہے جو منٹوانہ تنقید کے ابتدائی یا وسطی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

سب سے پہلا مضمون اُردو افسانے میں منٹو کا مقام، نصرت یاسین کا تحریر کردہ ہے۔ نصرت یاسین ۱۹۶۱ء میں ''منٹو کے افسانے'' کے موضوع پر پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اُردو کا مقالہ لکھ چکی ہیں۔ منٹو کی شخصیت اور فن پر پاکستان کی کسی بھی جامعہ میں لکھا جانے والا یہ پہلا مقالہ ہے۔ اُردو افسانے میں منٹو کا مقام ان کے مقالے کا آخری باب ہے۔ ان کا یہی مضمون اسی عنوان سے ''فنون'' لاہور کے خاص نمبر اکتوبر ۱۹۶۳ء میں بھی اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ بلونت گارگی کا ''حسین چہرے۔ سعادت حسن منٹو''، شخصی نوعیت کا مضمون ہے۔ اسی حصے میں شامل ممتاز شیریں کا مضمون ''منٹو کی فنی تکمیل'' ان کی کتاب ''نوری نہ ناری'' کے علاوہ متعدد بار مختلف رسائل اور مرتبہ کتب میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔ اسی طرح ابراہیم جلیس، سلیم اختر، جگدیش چندر ودھاون اور شکیل الرحمٰن کے مضامین کے عنوان دیکھتے ہی اپنے متن کی یاد دلا دیتے ہیں۔

منٹو صدی پر شائع ہونے والے اس شمارے کا چوتھا اور آخری حصہ ''منتخبات'' سعادت حسن منٹو کی تحریروں موذیل، موتری، شہید ساز، اس، منجدھار میں، چچا سام کے نام نواں خط اور سیاہ حاشیے کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ ۴۴۸ صفحات پر مشتمل یہ خصوصی شمارہ منٹو شناسی کی اولین اور آخریں تنقیدی روایت کے حامل مضامین پر مشتمل ہے۔ جس کی مدد سے ہمارے بدلتے ہوئے تنقیدی رویوں کو سمجھتے ہیں بہت مدد ملتی ہے۔

''ایوان اُردو''، دہلی:

''ایوان اُردو'' دہلی اکادمی کا ماہانہ ادبی پرچہ، انیس اعظمی کی ادارت میں ادبی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ فروری، ۲۰۱۳ء، میں اس شمارے کا خصوصی نمبر سعادت حسن منٹو کے فنی و فکری موضوعات کے احاطے کے لیے مخصوص کیا گیا۔ بقول مدیر رسالہ، سعادت حسن منٹو کے متعلق خصوصی شمارہ شائع کرنے کا خیال اُنھیں اُس وقت آیا جب اُنھوں نے دسمبر ۲۰۱۲ء، کے شمارے میں پروفیسر یوسف سرمست کا ایک مختصر سا مضمون منٹو کے افسانے کھول دو کے متعلق شائع کیا۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد بہت سے قارئین کے تبصرہ نما خطوط یا خطوط نما تبصروں کے علاوہ کچھ مضامین بھی ادارہ ہذا کو بغرض اشاعت موصول ہوئے۔ چناں چہ اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ ان مضامین کے ساتھ ساتھ کچھ اور مضامین لکھوا کر منٹو کے متعلق خصوصی شمارہ شائع کیا جائے۔ نئے مضامین لکھواتے ہوئے اُنھوں نے اس بات کا خاص اہتمام کیا کہ مضمون نگار عہد حاضر کے تناظر میں منٹو کے فن کا جائزہ لیں۔ چناں چہ منٹو پر شائع ہونے والے ''ایوان اردو'' کے اس خصوصی نمبر میں شامل مضامین کی نوعیت دو طرح کی ہے۔ ایسے مضامین جو یوسف سرمست کے

مضمون ''کھول دو'' کے ردّ عمل میں لکھے گئے۔ یا پھر جدید اور حالیہ عہد کے تناظر میں لکھے گئے۔ اس حوالے سے ایم خالد فیاض کی یہ رائے درست ہے:

> ''اس وضاحت سے دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ منٹو پر خصوصی شمارہ کا خیال اُن تحریروں کی بدولت پیدا ہوا جو یوسف سرمست کے مضمون ''کھول دو'' کے رد عمل میں سامنے آئیں اور دوسرا یہ کہ مزید تحریریں حاصل اور شامل کرنے کے لیے منٹو کا آج کے تناظر میں مطالعہ ضروری سمجھا گیا۔''[۱۲۵]

کاش مدیر ''ایوان اردو'' کو یہ خیال کچھ ماہ پہلے آ جاتا تو وہ سال ۲۰۱۲ء جسے منٹو صدی کے طور پر منایا گیا، کے موقع پر یہ خصوصی شمارہ شائع کر کے موقع کی مناسبت کا فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ منٹو کی تحریروں کو عہد حاضر کے تناظر میں پرکھنے کی ضرورت و اہمیت کا تقاضا گزشتہ چند سالوں سے زور پکڑتا جا رہا ہے۔ خاص طور پر عہد حاضر کے بہت سے ناقدین نے اپنے اپنے مضامین کی بنیاد مطالعے کے اس نئے انداز پر استوار کی ہے۔

بارہ مضامین پر مشتمل اس مختصر خصوصی شمارے میں مشتاق احمد نوری کا مضمون بعنوان ''کھول دو، کو کھولنے کی کوشش'' اور ڈاکٹر ندیم احمد کا مضمون ''کھول دو، ایک مکمل افسانہ'' یوسف سرمست کے گزشتہ شمارے میں شائع ہونے والے مضمون کی توسیع یا ردّ عمل کہلائے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر خالد علوی نے اپنے مضمون ''منٹو پر ایک نظر'' میں بہت چبھتے ہوئے سوال اٹھائے ہیں۔ اس حوالے سے خالد فیاض کہتے ہیں:

> ''اگرچہ عنوان میں ایک نظر لکھا گیا ہے۔ لیکن مصنف نے مضمون میں منٹو پر بیک وقت ''کئی نظریں'' ڈالی ہیں، بہت چبھتا ہوا، سوالات اٹھاتا ہوا اور ہلاتا، جھنجھوڑتا مضمون ہے۔''[۱۲۶]

پروفیسر قدوس جاوید نے اپنے مضمون ''منٹو، ممتاز شیریں اور لذت گناہ'' میں ممتاز شیریں کی منٹو پر کی گئی تنقید کو موضوع بنایا ہے۔ جب کہ ڈاکٹر مظہر احمد نے ''ظرافت اور منٹو'' میں منٹو کی تحریروں خاص طور پر ہلکے پھلکے مضامین اور انشائیوں میں موجود طنز و مزاح کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ ڈاکٹر عقیل احمد کا مضمون ''منٹو کے افسانوی اسلوب کا جمالیاتی پہلو'' سعادت حسن منٹو کی فنی خوبیوں خاص طور پر زبان و بیان کے جائزہ پر مشتمل ایک اہم مضمون ہے۔ اس رسالے میں شامل تمام مضامین نئے زمانے کے فنی و فکری ضابطوں اور تقاضوں کو مد نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ مضامین کی تعداد اگرچہ زیادہ نہیں لیکن یہ خصوصی شمارہ مضامین کے انتخاب اور طرز مطالعہ کی بنیاد پر منٹو کے متعلق شائع ہونے والا ایک اہم شمارہ گردانا جائے گا۔

''روشنائی''، کراچی:

کراچی سے ہر تین ماہ بعد شائع ہونے والے اس ادبی جریدے کے مدیر احمد زین الدین ہیں۔ منٹو صدی کی مناسبت سے جہاں مصنفہ اور مرتبہ کتابوں کی اشاعت زوروں پر رہی، وہیں رسائل و جرائد نے بھی اُردو کے اس عظیم افسانہ نگار کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے اپنے رسائل کو خاص طور پر منٹو اور اس کے فن کے لیے مخصوص کیا۔ حیران کن حد تک ان رسائل کی تعداد، کتب کے مقابلے میں بہت کم ہے، سہ ماہی، روشنائی کا شمارہ نمبر ۵۲، جہان منٹو، کے عنوان سے شائع ہوا، مدیر اعلیٰ احمد زین الدین کے پر مغز اداریے میں اُن اعتراضات پر سوالات اٹھائے گئے ہیں جو ڈاکٹر شمیم حنفی نے منٹو کے فن کے متعلق اٹھائے۔ آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی کی

جانب سے پانچویں اردو عالمی کانفرنس، منعقد دسمبر ۲۰۱۲ء میں ڈاکٹر شمیم حنفی نے اپنا کلیدی مقالہ پڑھتے ہوئے سعادت حسن منٹو کو وژن سے عاری افسانہ نگار قرار دیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی فاضل نقاد نے منٹو کو اپنی تنقید کے سخت شکنجے میں جکڑا۔ احمد زین الدین نے اپنے اس اداریے میں نہ صرف شمیم حنفی کے اعتراض پر کئی اعتراض کیے بلکہ قارئین ادب اور قارئین منٹو کے آگے بھی بہت سے سوال ایک نئے انداز سے اٹھادیے ہیں۔ شمیم حنفی کے سعادت حسن منٹو پر کیے گئے یہ اعتراضات ہی دراصل اس اداریہ کی تسوید کا محرک بنے ہیں۔

منٹو کے متعلق یہ خصوصی شمارہ، بنیادی طور پر تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ ایسے مضامین پر مشتمل ہے۔ جو منٹو کے متعلق لکھے گئے مضامین کے نئے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ مدیر اعلیٰ نے خاص طور پر اس بات کا خیال رکھا ہے کہ روایتی اور بار بار چھپنے والے مضامین کی بجائے نئے اور تازہ مضامین لکھوا کر سعادت حسن منٹو کی فکر و فن کا عہد نو کے ناقدانہ نظریات کی روشنی میں جائزہ لیا جائے۔ چوں کہ زیادہ تر مضامین ہندوستان سے تعلق رکھنے والے ناقدین کی تحریروں پر مشتمل ہیں۔ اس لیے پاکستان کے قارئین کے لیے ان کا اسلوب اور طرز تنقید بھی نسبتاً نیا اور اچھوتا ہے۔ شارب ردولوی ڈاکٹر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر ہمایوں اشرف، کوثر مظہری، اے خیام اور صبا اکرام کے مضامین خاصے اہم ہیں۔ ان مضامین میں فاضل مضمون نگاروں نے منٹو کے فنی اسرار ' رموز کو از سر نو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرا حصہ جسے ''بازگشت'' کا عنوان دیا گیا ہے۔ سات ایسی تحریروں پر مشتمل ہے جو ماضی کے تنقیدی ورثے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں باری علیگ، عابد علی عابد، وارث علوی، دیوندر اسر، پروفیسر محمد صادق، نریندر موہن اور طارق چھتاری کے لکھے گئے مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے۔ باری علیگ، عابد علی عابد اور وارث علوی کے مضامین، خاص طور پر پاکستان سے شائع ہونے والے رسائل اور مرتبہ کتب میں بار بار اشاعت پذیر ہو کر اپنا اثر کھو چکے ہیں۔ البتہ دیوندر اسر، پروفیسر صادق، نریندر موہن اور طارق چھتاری کے مضامین محض اس لیے زیادہ اہم اور توجہ طلب دکھائی نہیں دیتے کہ پاکستان میں ان کی اشاعت اور دستیابی مشکل تھی بلکہ یہ تمام مضامین اس لیے بھی اہم ہیں کہ ہندوستان سے تعلق رکھنے والے ان ناقدین نے اختصار اور طوالت کے ساتھ منٹو کے فن پر بہت اخلاص اور محنت سے روشنی ڈالی ہے۔ اسی حصے میں شامل پروفیسر جی ایم اثر سے لیا گیا ایک انٹرویو بھی شامل کیا گیا ہے۔ پروفیسر غلام محی الدین اثر جو قیام پاکستان کے بعد منٹو کی ہمسائیگی اور دوستی کا شرف رکھتے تھے، کے بارے میں ان کے معاصرین کو بہت تحفظات رہے ہیں۔ ابوالحسن نغمی نے حال ہی میں شائع ہونے والی اپنی کتاب ''سعادت حسن منٹو، ذاتی یادداشتوں پر مبنی اوراق،، میں جی ایم اثر کو منٹو کی موت کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔ ان کے خیال میں جی ایم اثر اور شاد امرتسری شراب پینے کے لیے منٹو کی دوستی کی آڑ لیتے تھے۔ جی ایم اثر کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے ان کے اس جملے میں پوشیدہ درد اور حسرت کو محسوس کیجیے:

''کاش وہ سعادت حسن منٹو کے پڑوسی نہ ہوتے۔'' [۱۲۷]

جی ایم اثر سے کی جانے والی اس گفتگو کے شرکاء میں حمید علوی، بیگم قیصرہ علوی، مظفر علی سید، منیر احمد شیخ اور بیگم نصرت منیر جیسی اہل علم و ادب ہستیاں شامل تھیں۔ پروفیسر جی ایم اثر سے لیا گیا یہ انٹرویو فرید احمد کی مرتب کردہ کتاب ''''دائیں بائیں اوپر نیچے'' کا حصہ بھی رہ چکا ہے۔ [۱۲۸] جب کہ اس سے قبل یہ انٹرویو ''نیرنگ خیال'' راولپنڈی کے سالنامہ، جون، ۱۹۸۴ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ منفی نوعیت کی اس گفتگو میں جی ایم اثر نے آخری ایام میں منٹو کو ایک ایک سے پیسے مانگتے والا ایسا شرابی قرار دیا جس کی زندگی کا واحد

مقصد شراب پینا ہو۔ اور جس کے نزدیک کسی رشتے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ منٹو کی ازدواجی زندگی کو ناکام، صفیہ اور منٹو کے تعلق کو واجبی جب کہ منٹو کے ساتھ ان کی بیگم صفیہ منٹو کے سلوک کو انتہائی غیر اخلاقی قرار دیتے ہوئے اُنھوں نے ''یہ انکشاف'' بھی کر ہی ڈالا کہ منٹو کی بہن اقبال روزانہ اسے بی کمپلیکس کا ٹیکہ لگاتی تھیں حال آں کہ صفیہ اس عذاب سے یعنی منٹو سے جان چھڑانا چاہتی تھیں۔ گویا منٹو کی موت سے صفیہ کی زندگی پرسکون ہو گئی۔

اپنی اس بات کے ثبوت میں منٹو کی وفات کے تین دن بعد کا واقعہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اُنھوں نے صفیہ منٹو سے وہ گلاس مانگا جس میں منٹو شراب پیتے تھے تو موصوفہ نے بتایا کہ وہ ان گلاسوں کو قلعی کرا چکی ہیں۔ اور اُس واقعے کے بیان کے آخر میں کہتے ہیں کہ ''یہ صرف تین دن کی بات ہے''، یعنی منٹو کی رسم سوم سے بھی پہلے ان کی بیگم میاں کا غم منانے کی بجائے گلاسوں کو قلعی کرواتی پھر رہی تھیں۔ اس طرح کی کئی باتیں جی ایم اثر نے اپنے اس انٹرویو میں کہی ہیں۔ جن کو پڑھ کر منٹو اور صفیہ کے تعلقات پر تو شبہ نہیں ہوتا البتہ جی ایم اثر پر غصہ ضرور آتا ہے۔ کیوں کہ اپنی گفتگو میں اُنھوں نے اُن تمام معلومات سے مختلف باتیں کی ہیں جن پر آج تک منٹو کے سبھی معاصر، سوانح نگار اور ناقدین متفق الآرا ہیں۔ منٹو کی بڑی بہن ناصرہ اقبال نے یہ انٹرویو پڑھنے کے بعد منٹو کی بیٹی نصرت منٹو کے توسط سے ''نیرنگ خیال'' سالنامہ، ۱۹۸۶ء میں ایک خط جی ایم اثر کے نام چھپوایا۔ جس میں اُنھوں نے پروفیسر صاحب کی باتوں کو جھوٹ اور بہتان قرار دیا۔[۱۲۹] جی ایم اثر کے صفیہ منٹو کے سلوک اور منٹو سے بیزاری کے رد میں پروفیسر دلیر شیرانی کا یہ اقتباس بہت اہم ہے۔ جو اُنھوں نے ''پگڈنڈی'' کے منٹو نمبر میں منٹو کے متعلق اپنی لکھی گئی نظم ''بلبل ادب کہاں'' سے پہلے نوٹ کی صورت میں لکھا:

> ''پچھلے دنوں لاہور مشاعرے کے لیے گیا اور ۹ مارچ ۱۹۵۵ء کو منٹو صاحب کی نیک اور بہادر بیوی سے ملاقات ہوئی محترمہ کی آنکھیں ساون بھادوں بنی ہوئی تھیں۔ کہنے لیکن، دلیر صاحب! منٹو تو اب آپ سے اور ہم سے بہت دور چلے گئے ہیں۔''[۱۳۰]

تیسرا حصہ، منٹو کی تحریروں کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ یہ حصہ مزید تین ضمنی حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلے حصے میں ''سرگزشت اسیر'' میں شامل منٹو کا لکھا گیا دیباچہ، تین گولے'' کے عنوان سے میراجی کا خاکہ، جب کہ دو افسانے، تماشا، اور مسز گل شامل ہیں۔ تماشا منٹو کا پہلا افسانہ ہونے کی وجہ سے اہم ہے جب کہ ''مسز گل'' کے متعلق مدیر روشنائی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ افسانہ منٹو کے کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ دوسرے حصے کا عنوان ہے ''دیگر اسلوب کے چند افسانے'' اس میں برمی لڑکی، بلاوز اور پھندنے کو شامل کیا گیا ہے۔ جب کہ آخری حصے میں ایسے چار افسانے شامل ہیں جن کو فحاشی کے الزام کا سامنا کرنا پڑا۔ ''روشنائی'' کا منٹو کے متعلق یہ خصوصی شمارہ مارچ ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔

''سپوتنک''، لاہور:

ماہنامہ ''سپوتنک، لاہور کے مدیر اعلیٰ جناب آغا امیر حسین کو ایک بار پھر منٹو کی یاد ستائی۔ چناں چہ اُنھوں نے ''منٹو کی یاد میں'' جنوری ۲۰۱۶ء میں اپنے تئیں ایک یادگار منٹو نمبر شائع کر دیا۔ اچھا ہوا کہ آغا امیر حسین نے خود ہی اس بات کی نشاندہی کر دی کہ :

"اس شمارے کی ترتیب ہمارے لیے آسان ہو گئی جب ادبی جریدہ افکار نظر سے گزرا۔۔۔ ہم جناب سحر انصاری صاحب کے مشکور ہیں کہ اُنھوں نے "افکار" کے منٹو نمبر سے استفادہ کی اجازت دی۔"[۱۳۱]

یعنی ۱۹۵۵ء میں چھپنے والے "افکار" کا منٹو نمبر مدیر اعلیٰ سپوتنک کی نظر سے ۲۰۱۶ء میں گزرا۔ جب کہ فاضل مدیر اس سے قبل ۱۹۹۴ء میں پہلے بھی ایک بار اپنے رسالے سپوتنک کا منٹو نمبر شائع کر چکے ہیں۔ یہیں سے اُن کی منٹو سے دلچسپی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال خوش آئند بات یہ ہے کہ اُنھوں نے ادبی دیانت داری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے اکلوتے ماخذ کی نشاندہی کر کے اُس روش کو توڑا جوان سے قبل احمد سلیم اختیار کر چکے تھے۔ احمد سلیم نے ۲۰۰۵ء میں منٹو کی پچاسویں برسی کے موقع پر ایک کتاب بعنوان "سعادت حسن مر گیا، منٹو زندہ ہے" مرتب کر کے سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور سے شائع کرائی۔ چار حصوں پر مشتمل اس کتاب میں شامل پہلے تین حصوں کا تمام مواد اُنھوں نے "افکار"، "منٹو نمبر سے لے کر بغیر کسی اعترافی بیان کے اپنی تحقیقی خدمات کے طور پر پیش کر دیا۔[۱۳۲]

آغا امیر حسین کی "بھولی یادیں" کے علاوہ تمام تحریریں افکار ہی کے منٹو نمبر کی دین ہیں۔ صہبا لکھنوی کا مضمون "سعادت حسن منٹو" زندگی شخصیت اور فن اور ڈاکٹر حنیف فوق کے سخن ہائے گفتنی کے علاوہ نور بجنوری، عبدالحمید عدم، قتیل شفائی، حسن حمیدی، اور حمایت علی شاعر نے منٹو کو منظوم انداز میں خراج تحسین پیش کیا۔ ادیبوں، دانشوروں اور شاعروں کے منٹو کی موت پر تحریر کردہ تاثرات کے علاوہ منٹو کی وفات پر پاک و ہند کے اخبارات کا اظہار غم بھی اس خصوصی شمارے کا حصہ بنا۔ یہ غالباً منٹو کی شخصیت اور فن پر شائع ہونے والا اب تک کا تازہ ترین شمارہ ہے۔ ۱۹۵۵ء کی متعدد بار چھپنے والی تحریروں کو شائع کر کے مدیر منٹو شناسی کے باب میں کیا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ عقدہ کھلتا دکھائی نہیں دیتا۔ منٹو سے دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ مدیر موصوف نے اس سے قبل شائع ہونے والے سپوتنک کے منٹو نمبر مطبوعہ ۱۹۹۴ء میں "بھولی بسری باتیں" کے عنوان سے جو مقدمہ یا دیباچہ نما مضمون لکھا تھا، ۲۰۱۶ء کے شمارے میں بھی وہی دیباچہ بغیر ایک لفظ کی تبدیلی کے جوں کا توں شائع کر دیا۔ اس طرح کے شماروں سے منٹو شناسی کی روایت میں تو کوئی اضافہ نہیں ہوتا البتہ رسالے یا مدیر کی شہرت کا سامان پیدا ہونے کے امکانات ضرور بڑھ جاتے ہیں۔ ۱۴۴ صفحات پر مشتمل اس رسالہ کی پیشانی پر جنوری جب کہ اندر کے صفحہ پر ستمبر ۲۰۱۶ء درج ہے۔ چوں کہ مدیر کی طرف سے قارئین کو نئے سال ۲۰۱۶ء کی مبارک دی گئی ہے۔ لہٰذا اندریں صفحے پر درج مہینہ غلط ہے۔

(ب) رسائل و جرائد کے خصوصی گوشے

"زیست"، کراچی:

ڈاکٹر انصار شیخ کی ادارت میں شائع ہونے والے اس کتابی سلسلے کا آغاز جنوری ۲۰۱۰ء میں ہوا۔ انصار احمد سعادت حسن منٹو کی سماجی حقیقت نگاری کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر جامعہ کراچی سے ۲۰۰۹ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔ شاید اسی ذہنی مناسبت کی وجہ سے اپنے کتابی سلسلے میں اُنھوں نے ایک خصوصی گوشہ سعادت حسن منٹو کے لیے بھی مخصوص کر دیا۔ "زیست" جنوری ۲۰۱۰ء کے اس خصوصی گوشے میں مختلف ناقدین کے چار مضامین اور منٹو کا ایک افسانہ "خدا کی قسم" بطور انتخاب شامل کیا گیا

ہے۔ شامل مضامین کی ترتیب کچھ اس طرح ہے ''سعادت حسن منٹو۔ اجمالی جائزہ'' از ڈاکٹر علی ثناء بخاری ''منٹو اور اس کا فن'' از، ن پرویز، ''منٹو شناسی۔ ایک تقابلی مطالعہ'' از، اے خیام، ''منٹو اور زبان کا استعمال'' لیز لی فلیمنگ۔ ڈاکٹر علی ثناء۔ بخاری نے چھے صفحاتی مضمون میں منٹو کی شخصیت اور فن کے بیشتر پہلوؤں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی ہے۔

ن۔ پرویز کا مضمون اس سے قبل ماہنامہ ''پگڈنڈی'' امرتسر کے منٹو نمبر میں شائع ہوا۔ منٹو کی موت کے بعد ان پر لکھی جانے والی دیگر تحریروں کی طرح ن۔ پرویز کی تحریر بھی جذباتی اور تاثراتی انداز اختیار کیے ہوئے ہے۔ منٹو کی فکری اور فنی اہمیت کو اُنھوں نے جنسیات اور سیاہ حاشیے پر مبنی افسانوں اور افسانچوں کی روشنی میں پرکھا۔ اے خیام نے اپنے مضمون 'منٹو شناسی'' ایک تقابلی مطالعہ'' میں گزشتہ صدی میں منٹو پر لکھی گئی چار اہم تنقیدی کتابوں کا تقابل کیا ہے۔ ان کتابوں میں سعادت حسن منٹو، اپنی تخلیقات کی روشنی میں (ایک نفسیاتی تجزیہ) از سید محمد محسن، منٹو نوری نہ ناری، از ممتاز شیریں، منٹو نامہ، از، جگدیش چندر ودھاون اور منٹو شناسی، از ڈاکٹر شکیل الرحمٰن شامل ہیں۔ مضمون نگار گزشتہ صدی میں شائع ہونے والی ان چار کتابوں کو موضوع اور مطالعے کے لحاظ سے منفرد اور قابلِ قدر گردانتے ہیں۔ سید محمد محسن کی تصنیف کو مضمون نگار اس لیے منفرد گردانتے ہیں کیوں کہ اس میں پہلی مرتبہ معروف کرداروں کے تناظر میں منٹو کی تحلیل نفسی کی گئی ہے اور اس نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی گئی کہ آخر منٹو نے ان کرداروں کا انتخاب کیوں کیا یا منٹو کا زاویہ نظر ایسا کیوں تھا؟۔ یہی منفرد زاویہ اُنھیں ممتاز شیریں کی تصنیف میں بھی دکھائی دیا۔ جگدیش چندر ودھاون اور ان کی کتاب ''منٹو نامہ'' کے متعلق چند توصیفی جملوں کے بعد ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کی تصنیف منٹو شناسی کے متعلق ان کی رائے دیکھیے:

> ''تخلیق اور تخلیقی انداز میں تجزیہ۔۔ یہ ایک الگ نوعیت کا کام ہے اور منٹو کو تلاش کرنے کا ایک انوکھا، دلچسپ اور فکر انگیز طریقہ ہے۔ منٹو کی جمالیات کا تطابق اساطیری کرداروں سے بھی کیا گیا ہے اور مختلف مذاہب کے افکار اور مختلف زبانوں کی کلاسیک سے بھی مدد لی گئی ہے۔''[۱۳۳]

لیز لی فلیمنگ کے مضمون ''منٹو اور زبان کا استعمال'' کو پروفیسر مشہود انور نے اردو کے قالب میں ڈھالا۔ اپنے اس مضمون میں لیز لی فلیمنگ منٹو کے کشمیری حسب نسب کے باوجود اُن کے ''پنجابی پن'' کو ثابت کرنے پر مصر دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن مضمون کے آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ:

> ''اُنھوں (منٹو) عقل مندی سے دونوں انتہاؤں، پنجابی زدہ اردو اور مصنوعی فصیح و بلیغ اُردو سے گریز کیا اور غالباً بے جانے بوجھے نوجوان اُردو ادیبوں کے لیے ایک قیمتی ورثہ چھوڑ دیا۔ جن کے لیے ان کی زبان جو کسی علاقائی حدود کی پابند نہیں، معاصر غیر حقیقی فکشن کے لیے ایک مکمل وسیلہ ہے۔''[۱۳۴]

منٹو کا افسانہ ''خدا کی قسم'' اس خصوصی گوشے کی آخری تحریر ہے۔

--۲--

سابقہ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ''زیست'' کراچی کے مرتب ڈاکٹر انصار احمد نے نئے شمارے میں بھی منٹو کے لیے ''الگ مقام'' مختص کیا۔ اگست، ۲۰۱۰ء میں شائع ہونے والے اس شمارے کے گوشہ ''سعادت حسن منٹو'' میں تین مضامین اور منٹو کا افسانہ ''موتری'' بطور انتخاب شامل ہے۔ شامل مضامین اور مضمون نگار حسب ذیل ہیں:

''منٹو اور مختصر افسانہ نگاری'' آفاق صدیقی، ''شمع لحد خاموش'' نعیم کوثر، ''منٹو کا افسانہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' اور کیمرہ'' از پرویز انجم۔

آفاق صدیقی کے مطابق منٹو کی مختصر افسانہ نگاری میں ان کی اپنی مخصوص ذہانت، فنکارانہ بے باکی، معنی خیزی اور دور رس رمزیت، طنز و مزاح میں لپٹی ہوئی معنویت اور اسلوب نگارش کی جدت طرازی کا امتزاج کچھ اس طرح سے شکلیں بدل لیتا ہے کہ ہر تبدیلی میں ہمیں ایک نئی فنی حس ابھرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ نعیم کوثر نے اپنے مضمون میں منٹو کے جنسی نقطہ نظر کا دفاع اور اُنھیں جنسی تلذذ یا فحاشی کا مرتکب قرار دینے والے ناقدین کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے اپنا نقطہ نظر یوں بیان کیا:

> ''اُردو میں سعادت حسن منٹو ایسے افسانہ نگار تھے، جنھوں نے جنس کے ہر پہلو سے اس طرح بحث کی اور اس کی بے راہ روی کا نفسیاتی تجزیہ اس طرح کیا کہ اس کی تہہ میں جو سماجی حقیقتیں اور انسانی مقاصد تھے وہ اجاگر ہو گئے۔'' [۱۳۵]

مضمون نگار کے بقول اگر منٹو نے پڑھنے والوں کے جذبات میں ہیجان پیدا کیا ہے تو یہ بھی ایک آرٹ ہے۔ ایک بلند، مشکل اور غیر فانی نازک پن جو جذبات میں ہیجان برپا کرنے کے باوجود جنس کے تلذذ کے لیے نہیں اکساتا، منٹو ہی کا کمال ہے۔ اس حوالے سے ان کی رائے دیکھیے:

> ''منٹو اپنے افسانے پڑھنے والوں کو جذباتی دنیا میں ڈبو کر ایک دم اوپر اچھال دیتے ہیں اور قاری اپنی نگاہوں کے سامنے اپنے خطوط کھنچے ہوئے پاتا ہے۔ جن کے دائروں میں سماج کے تاریک سائے پھیلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔'' [۱۳۶]

''منٹو کا افسانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ، اور کیمرہ'' پرویز انجم کا تحقیقی نوعیت کا مضمون ہے۔ تمہید میں اُنھوں نے منٹو کے اس افسانے کو آفاقی افسانہ قرار دینے کے بعد ٹیک سنگھ کے بسائے ہوئے اس شہر کی مختصر تاریخ بھی بتائی۔ جس کے بعد وہ اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ بقول پرویز انجم:

> ''دنیا کی تاریخ میں تقسیم کے سب سے بڑے نوحے، سب سے بڑی ٹریجڈی کو ''Partition'' کے نام سے ۱۹۸۷ء میں برطانوی فلم میکر Ken Mc Mullen نے منٹو کی کہانی ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کو انگلینڈ میں فلمی شکل دی۔'' [۱۳۷]

نوے منٹ پر محیط اس ٹیلی فلم کے اسکرپٹ رائٹر طارق علی تھے جب کہ اداکاروں میں روشن سیٹھ، زہرہ سہگل، ضیاء محی الدین، جان شراپنل اور سعید جعفری شامل تھے۔ مضمون نگار کے مطابق دوسری بار ۱۹۹۵ء میں انڈیا میں دوردرشن کی ڈائریکٹر شکتی میر ابھانے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کو فلم بند کیا۔ اس فلم میں بشن سنگھ کا کردار پاکستانی اداکار شجاعت ہاشمی نے بہت خوبصورتی سے ادا کیا۔ جس کی پاداش میں پاکستان کے مذہبی اور فلمی حلقوں نے ان پر زبردست تنقید کی۔ اس تنقید کی بنیاد پر شجاعت ہاشمی کا پاکستانی فلمی اسٹوڈیوز میں

داخلہ تک بند کر دیا گیا۔ بقول مضمون نگار، شجاعت ہاشمی نے مودی آرٹس ایسوسی ایشن کے چیئر مین، اداکار یوسف خان کے رویے کو افسوس ناک قرار دیتے ہوئے ایک انٹرویو میں کہا کہ :

> ''یوسف خان صاحب نے نہ ہی دوردرشن کی یہ فلم دیکھی ہے اور نہ ہی منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ'' افسانہ پڑھا ہے، جس میں ایسی کوئی بات تھی جس میں پاکستان کے خلاف بات ہو۔'' [۱۳۸]

برطانیہ اور انڈیا کے بعد ۲۰۰۵ء میں پاکستان میں اس افسانے کو انگریزی زبان میں عکس بند کیا گیا۔ کینرڈ کالج لاہور کی عافیہ نتھائل جو اس فلم کی ڈائریکٹر اور سکرین پلے رائٹر تھیں، نے اسے واہگہ بارڈر پر شوٹ کیا۔ بقول مضمون نگار منٹو کی اس کہانی کا لوکیل اتنا جاندار اور فلموں کے لیے مرغوب ہے کہ صرف فلم یا ٹیلی ڈرامے ہی نہیں بلکہ بالی ووڈ میں بھی اس پر فلمیں بنانے کا رجحان دکھائی دینے لگا ہے۔ بالی ووڈ کے معروف آرٹ اداکار عامر خان نے بھی اس کہانی کو فلمانے کا اعلان کر رکھا ہے۔ جس میں بشن سنگھ کا مرکزی کردار وہ خود نبھائیں گے۔ مضمون نگار نے اس مختصر مضمون میں منٹو کی اس کہانی پر بنائی گئی فلموں اور ٹیلی ڈراموں کے حوالے سے روشنی ڈالی ہے۔ منٹو کے اس ڈرامے کو دنیا کے مختلف ممالک میں اسٹیج پر بھی کھیلا گیا ہے۔ اس حوالے سے بھی اگر معلومات دے دی جاتیں تو مضمون مزید معلوماتی ہو جاتا۔ ''زیست'' کا یہ دوسرا خصوصی گوشہ ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

۔۔۳۔۔

''زیست'' کراچی نے منٹو کے لیے مئی جون، ۲۰۱۵ء آٹھویں کتابی سلسلہ میں بھی خصوصی گوشہ مختص کیا۔ اس خصوصی حصے میں اصغر ندیم سید، پرویز انجم، اور ایم خالد فیاض کے مضامین اور منٹو کی ایک تحریر ''دیکھ کبیرا رویا'' شامل ہیں۔

اصغر ندیم سید نے اپنے مضمون ''منٹو کے آخری ساڑھے چار سال'' میں منٹو کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا۔

پرویز انجم کے مضمون ''علی گڑھ یونیورسٹی اور منٹو'' میں بطور طالب علم اُن چند ماہ کی روداد بیان کی گئی ہے جو منٹو اور ان کے لنگوٹیے ابو سعید قریشی نے علی گڑھ یونیورسٹی میں گزارے۔ گو کہ چند ماہ بعد تپ دق کا مریض ثابت ہونے پر اُنھیں یونیورسٹی چھوڑنا پڑی لیکن مضمون نگار کے بقول :

> ''منٹو نے اس قیام میں اپنے باطنی تصورات اور تجربات میں، اردو ادب اور اردو نثر میں علی گڑھ کی ادبی تحریک سے بہت کچھ حاصل کیا۔۔۔ اگرچہ وہ علی گڑھ چند ماہ ہی رہے مگر ان کی تحریروں میں روشن خیالی اسی تعلق کی مرہون منت تھی۔'' [۱۳۹]

ایم خالد فیاض نے اپنے مضمون میں ڈاکٹر اسد فیض اور شہزاد منظر کی مرتب کردہ کتاب ''منٹو کی گمشدہ تحریریں'' کا جائزہ لیتے ہوئے انتظار حسین کے اس اعتراض سے اختلاف کیا جس میں اُنھوں نے اس کتاب میں شامل منٹو کی گمشدہ تحریروں کی تلاش کو منٹو کے لیے کسی فائدے یا نقصان سے بے نیاز تحریریں قرار دیا تھا۔ [۱۴۰]

ایم خالد فن کے مطابق تنقیدی نقطہ نظر سے ہم انتظار حسین کی بات سے اتفاق کر بھی لیں تو تحقیقی نقطہ نظر سے اس رائے کی تائید نہیں کی جاسکتی۔ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''ایسی دریافت شدہ تحریریں بعض اوقات ایسے انکشافات کرتی ہیں جو ہمارے کسی نہ کسی طرح کے علم میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔ پھر یہ کہ بڑے فنکار کی دریافت کردہ تحریریں، اگر کمزور بھی ہوں تو وہ اس فنکار کے فکری اور فنی نشیب وفراز سے آگاہی کا اہم وسیلہ بنتی ہیں۔'' [۱۴۱]

کتاب میں شامل منٹو کی غیر مدون تحریروں کے جائزہ کے بعد اس میں موجود بعض تحقیقی نوعیت کی چھوٹی چھوٹی خامیوں کی بھی مضمون نگار نے نشاندہی کر دی ہے۔ مضامین اور منٹو کی ایک تحریر کے انتخاب پر مشتمل یہ خصوصی گوشہ مجموعی طور پر ۲۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

--۴--

زیست کراچی نے سعادت حسن منٹو کے متعلق آخری خصوصی گوشہ مئی ۲۰۱۷ء میں شائع کیا۔ زیست کے اس کتابی سلسلہ نمبر ۱۱ میں پرویز انجم کے دو اور ڈاکٹر کامران کاظمی کے ایک مضمون کے علاوہ منٹو کا افسانہ ا''موچنا'' بطور انتخاب شامل کیا گیا ہے۔ پرویز انجم نے اپنے مضمون ''منٹو اور ذکر غالب! ایک اجمالی جائزہ'' میں عظیم شاعر غالب اور عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور حالات میں موجود مماثلتوں کی بنیاد پر منٹو کو غالب کا پرستار قرار دیا۔ اُنھوں نے منٹو کے غالب کے متعلق لکھے گئے سات مضامین کے تعارف کے علاوہ منٹو کی دیگر تخلیقات سے بھی غالب کے نقوش ڈھونڈے ہیں۔ اس حوالے سے مضمون نگار لکھتے ہیں:

''منٹو کی غالب سے متعلقہ تحاریر، ڈرامے اور کلام غالب سے اخذ کردہ عنوانات اور پھر تصنیف ''گنجے فرشتے'' کا انتساب 'گنج معانی حضرت غالب کے نام' سے بھی منٹو کی غالب کے ساتھ عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔'' [۱۴۲]

پرویز انجم نے اپنے دوسرے مضمون ''منٹو ایک فلمی نقاد'' میں منٹو کی فلمی دنیا سے وابستگی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کے مطابق منٹو نے ایک منشی سے کہانی کار تک اور ایک زمانے میں فلمستان کے آقاؤں میں سے ایک کی حیثیت سے فلمی دنیا کو بہت قریب سے دیکھا۔ بلکہ اس سے بھی پہلے مختلف اخبارات سے وابستگی خصوصاً مصور کے زمانہ ادارت میں اُنھوں نے فلمی دنیا کے متعلق بہت سے تبصرے اور مضامین لکھے۔ ہندوستان کی فلمی صنعت پر ایک نظر، ''میں سینما کیوں نہیں دیکھتا''، ان کی فلموں کے متعلق تنقیدی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اس مضمون سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ منٹو نے عام پیشہ ور افراد کے برخلاف اور اس بات سے بے نیاز ہو کر کہ وہ اپنے متبادل فلمی دنیا سے متعارف کروا رہے ہیں، ادبی شخصیات کے لیے فلم میں جگہ بنانے کی عملاً کوشش کی۔ کبھی اختر شیرانی کو فلمی کہانی لکھنے کی ترغیب دیتے دکھائی دیتے ہیں تو کبھی مولانا حامد علی خان کو۔ احمد ندیم قاسمی اور اوپندر ناتھ اشک کی فلمی دنیا سے وابستگی بھی سعادت حسن منٹو ہی کے مرہون منت ہے۔ ڈاکٹر کامران کاظمی منٹو کی اداکاراؤں سے خوب واقف ہیں۔ اپنے مضمون کے شروع میں ہی مضمون نگار نے زیر بحث موضوع کا نتیجہ نکال دیا کہ:

''منٹو کے خاکوں سے اردو خاکہ نگاری کے پاکستانی دور کا آغاز ہوتا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ منٹو تکنیک اور اسلوب کے اعتبار سے اردو خاکہ نگاری کا نقطہ عروج ہیں تو یہ بات بے جا نہ ہوگی۔'' [۱۴۳]

نرگس، نور جہاں، ستارہ، پارو دیوی، پراسرار نینا، پری چہرہ نسیم اور کلدیپ کور کے خاکوں کی روشنی میں فاضل مضمون نگار نے منٹو کی خاکہ نگاری کے فنکارانہ پہلوؤں کا بڑی تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا۔ زیست کا یہ گوشہ منٹو ۴۰ صفحات پر محیط ہے۔

”تناظر“، گجرات:

ایم۔ خالد فیاض کی ادارت میں شائع ہونے والے کتابی سلسلہ (۲) جولائی تا دسمبر ۲۰۱۲ء میں ”مطالعہ: سعادت حسن منٹو“ کے عنوان سے خصوصی حصہ مختص کیا گیا۔ سات مضامین پر مشتمل اس خصوصی حصے میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری، مبین مرزا، پرویز انجم، ڈاکٹر امجد طفیل، اعتزاز حسن، ڈاکٹر اسد فیض اور ایم خالد فیاض کے مضامین شامل ہیں۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مضمون ”موذیل“ کا آغاز کچھ یوں ہوتا ہے:

> ”یہ اتفاق کی بات ہے کہ منٹو کے وہ افسانے جو شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں بنیادی طور پر کرداری افسانے ہیں۔“[۱۴۴]

قدرتی بہاؤ میں بہنے والے منٹو کے ان کرداروں کے تناظر میں اُنھوں نے منٹو کے افسانہ اور مرکزی کردار موذیل کو اپنے مطالعے کی بنیاد بنایا۔ ”منٹو کے افسانوں کے بنیادی سروکار“ مبین مرزا کا طویل مضمون ہے۔ اُنھوں نے منٹو فہمی کے لیے ان کی تحریروں کو سنجیدگی سے از سرِ نو پڑھنے کی ضرورت پر زور دیا۔ کیوں کہ منٹو کو محض جنس زدہ یا فحش اور سنسنی خیز سمجھ کر پڑھنے سے اس کی تحریروں کے اصل معنی تک رسائی ممکن نہیں۔

پرویز انجم نے بڑی محبت کے ساتھ منٹو کے بمبئی اور بمبئی میں گزارے گئے دنوں کو یاد کیا۔ منٹو اور ان کے معاصرین کی تحریروں سے اخذ شدہ اس مضمون میں منٹو کے بمبئی چھوڑنے کی کوئی ٹھوس بڑی وجہ سامنے آئی ہے تو وہ شیام ہے۔ جب فسادات کے دنوں میں ایک سکھ خاندان پر ڈھائے جانے والے مظالم کا ذکر سن کر منٹو کے اس سوال پر کہ میرے مسلمان ہونے کی بنا پر تمہارا دل نہیں چاہتا کہ مجھے قتل کر دو؟ تو شیام نے جواب میں کہا تھا کہ ”اس وقت نہیں، لیکن اس وقت جب کہ مسلمانوں کے ڈھائے ہوئے مظالم کی داستاں سن رہا تھا، میں تمھیں قتل کر سکتا تھا“۔ شیام کے منہ سے یہ الفاظ سن کر منٹو کو بہت دھچکا لگا چناں چہ وہ دل گرفتہ باجو کی گلی سے پاکستان چلا آیا۔ مضمون نگار نے بمبئی کے دور کو منٹو کی زندگی کا سب سے آسودہ زمانہ کہا ہے۔ اس کے بعد اُنھیں اذیتیں ہی ملیں۔ مضمون کا اختتام بمبئی اور لاہور میں گزارے گئے حالات کے تناظر میں کچھ یوں کرتے ہیں:

> ”یہ تہی دست افسانہ نگار جب بمبئی گیا تو نوجوان تھا، نووارد تھا، جب وہ تقسیم کے بعد بمبئی سے لاہور آیا تو مشہور تھا۔۔۔
> شہرت، مقبولیت، اور گہما گہمی کی تیز دھوپ میں زندگی گزارنے والے اس عظیم لیکھک کا آخری دور انتہائی کسمپرسی میں گزرا۔ پاکستان میں جیسے وہ زندگی بسر کرنے نہیں، زندگی جھیلنے آیا تھا۔“[۱۴۵]

ڈاکٹر امجد طفیل کے مضمون ”سعادت حسن منٹو کے افسانے، تکنیکی و موضوعاتی تنوع“ میں منٹو کے افسانوں میں اختیار کی گئی تکنیک اور موضوعات کے حوالے سے مختلف پہلوؤں کا جائزہ ملتا ہے۔ مضمون نگار کے بقول منٹو کے افسانوں پر اگر تکنیکی اعتبار سے نظر ڈالی جائے تو اپنی تخلیقی زندگی کی ابتدا ہی سے وہ سماجی حقیقت نگاری، نفسیاتی حقیقت نگاری اور سادہ بیانیہ کے ساتھ ساتھ تاثراتی، تمثیلی اور ایک سے زیادہ راویوں کی مدد سے بیانیہ تشکیل دینے کی تکنیک بخوبی استعمال کرتے ہیں۔ کردار نگاری، حقیقت نگاری، تجریدیت، طنز و مزاح، جرم و سزا، سیاسی موضوعات، فسادات، جنس اور طوائف، گویا موضوعات اور تکنیک کا ایک تنوع ہے۔ منٹو کی فنی و فکری دنیا کو محدود سمجھنا غلطی ہو گی۔

اعتزاز احسن کا مضمون ''ہمارا موجودہ معاشرہ: منٹو کی تحریروں کے آئینے میں''، منٹو کی تحریروں کے عہد حاضر پر اطلاق کی عمدہ کوشش ہے۔

ڈاکٹر اسد فیض نے ''منٹو کا ایک گمشدہ افسانہ'' بارہ روپے، اپنے اصل متن کے ساتھ شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ منٹو کا یہ افسانہ ماہنامہ، ''ادب'' کراچی، جولائی اگست، ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا بقول مضمون نگار، منٹو کا یہ افسانہ ان کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں۔

سعادت حسن منٹو کے اس خصوصی گوشے میں شامل آخری مضمون ''منٹو پر چند نئی کتب ''ایک جائزہ'' مدیر رسالہ، ایم خالد فیاض نے تحریر کیا ہے۔ اپنے اس مضمون میں ایم۔ خالد فیاض نے منٹو صدی کی مناسبت سے شائع ہونے والی کتب کا تعارف و تجزیہ پیش کیا ہے۔ منٹو صدی کے موقع پر شائع ہونے والی جن کتابوں کا مضمون نگار نے تعارفی نوٹ لکھا ہے ان کی فہرست درج ذیل ہے۔

منٹو حقیقت سے افسانے تک، از شمیم حنفی، منٹو کا آدمی نامہ، مرتب، آصف فرخی، منٹو غالب کا پرستار، مرتب، پرویز انجم، فسانے منٹو کے اور پھر بیان اپنا، از ڈاکٹر خالد اشرف، منٹو کا اسلوب، طاہرہ اقبال، منٹو ہمارے عہد کا تخلیقی ضمیر، از احمد سلیم، منٹو میرا دوست میرا دشمن، مرتب، احمد سلیم، ان کتب کے علاوہ تین ایسے رسائل جنھوں نے منٹو صدی کی مناسبت سے خصوصی شمارے شائع کیے، کا تعارف و تجزیہ بھی ان کے مضمون کا حصہ ہے۔ ان رسائل میں زیست، کراچی، روشنائی کراچی اور ایوان اُردو، دہلی شامل ہیں۔

''نیاورق''، بمبئی:

''نیاورق''، بمبئی نے اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء میں منٹو صدی کی مناسبت سے منٹو پر خصوصی شمارہ شائع کرنے کی بجائے خصوصی گوشہ'' قائم کرنے پر اکتفا کیا۔ شاداب رشید کی ادارت میں نکلنے والے اس خصوصی حصے میں آٹھ مضامین اور سعادت حسن منٹو پر لکھی گئی دو نظمیں شامل ہیں۔ شامل مضامین اور مضمون نگاروں کی فہرست حسب ذیل ہے۔ ''موج سراب'' از نصیر انور، منٹو ادب: خلق اللہ کا فہیم، از شمس الحق عثمانی۔ منٹو اور اردو تنقید از اجمل کمال، منٹو ترقی پسندوں کی نظر میں، از علی احمد فاطمی، نیشن بطور بیانیہ اور منٹو کا افسانوی متن، از شافع قدوائی، منٹو کی حد بندیاں، از ارجمند آرا، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ ایک نئی تعبیر، از فتح محمد ملک اور ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ ایک نئی تعبیر (ایک محاکمہ) از ایم۔ خالد فیاض۔ ان مضامین کے علاوہ جینت کمار کی نظم ''منٹو کی تصویر'' اور گلزار کی نظم ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' بھی اس خصوصی گوشے کا حصہ بنی ہیں۔

نصیر انور کا مضمون ''موج سراب'' سب سے پہلے کراچی سے شائع ہونے والے جریدے ''سویرا'' کے شمارہ ۱۹، ۲۰، ۲۱، میں شائع ہوا۔ مضمون کے آخر میں مضمون نگار نے اسے زیر طبع کتاب کا ایک باب قرار دیا تھا۔ مگر یہ کتاب آج تک زیر طبع ہی ہے۔ گویا تکمیل کی منزلوں کو نہ پا سکی۔ نصیر انور منٹو کے بہترین دوستوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کے اس طویل اور سوانحی نوعیت کے مضمون میں منٹو کی شخصیت کے بہت سے پوشیدہ گوشوں سے دوستانہ اور ہمدردانہ انداز میں پردہ ہٹایا گیا ہے۔ منٹو اور نصیر انور کے مشترکہ ''دوست''، شیخ سلیم احمد کی موت کے ذکر سے شروع ہونے والا یہ طویل مضمون ''شیخ سلیم'' ہی کے ذکر پر ختم ہوتا ہے۔ پورے مضمون میں شیخ سلیم بھی منٹو اور مضمون نگار کے پہلو بہ پہلو دکھائی دیتا ہے۔ بعض مقامات پر تو یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ نصیر انور

کا یہ مضمون منٹو کی بجائے شیخ سلیم کے لیے لکھا گیا ہے۔ بہر حال یہ ایک بہت عمدہ مضمون ہے۔ کاش خواجہ نصیر انور اپنی اس زیر طبع کتاب کو مکمل کر پاتے۔

''کلیات منٹو کے مدون اور ''غالب اور منٹو'' کے مصنف و مرتب شمس الحق عثمانی اپنے مضمون ''منٹو: خلق اللہ کا فہیم'' میں رقمطراز ہیں کہ منٹو نے ایسی کہانیاں اور کردار تخلیق کیے جو بظاہر اور سطحی نظر سے دیکھیں تو مخصوص ماحول کے باشندے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر یہ کردار اور باشندے دراصل منٹو کی مخلوق ہیں۔ منٹو کے مختلف کرداروں کی فہرست گنوانے کے بعد مضمون نگار لکھتے ہیں:

> ''یہ خلق اللہ ہیں۔ منٹو نے اُنھیں افسانہ افسانہ گود لیا، پالا، پوسا اور گلے لگا لگا کر ان میں وہ خواہشیں، احساس اور جذبے دیے جو اس نے ان ہی جیسوں میں دیکھ دیکھ کر سمجھ سمجھ کر، ضرب در ضرب در ضرب سے شدید، شدید تر اور شدید ترین بنائے تھے۔''[۱۴۶]

اجمل کمال ''منٹو اور اردو تنقید'' میں منٹو کے باب میں کی جانے والی تنقید اور ناقدین دونوں سے مایوس دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے مطابق ادبی تنقید نے مجموعی طور پر منٹو کے تخلیقی کارنامے کو درست تناظر میں سمجھنے میں پڑھنے والوں کی کوئی مدد نہیں کی۔ چاہے یہ ناقدین حسن عسکری اور ممتاز شیریں کی طرح دائیں بازو سے تعلق رکھتے ہوں یا پھر ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے بائیں بازو کے نقاد ہوں، سب نے منٹو کو اپنے اپنے لباس ہی پہنانے کی کوشش کی۔

''منٹو ترقی پسندوں کی نظر میں''، علی احمد فاطمی کا مضمون ہے۔ اس مضمون میں وہ منٹو کے متعلق اپنائے گئے ترقی پسند تحریک اور ناقدین کے رویے اور تحریروں کے متعلق صفائیاں دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ منٹو کے ساتھ ترقی پسندوں کے سخت رویے کو وہ محض معاصرانہ چشمک قرار دے کر پردہ پوشی کرنے کی کوشش ضرور کر رہے ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ ترقی پسند ناقدین نے منٹو کے فن کے ساتھ کبھی بھی مکمل انصاف نہ کیا۔ خاص طور پر منٹو کی زندگی میں۔ مضمون نگار نے مختلف ترقی پسند ناقدین کی تحریروں میں سے کچھ ایسے جملے منتخب کر کے، جن میں غیر شعوری طور پر منٹو کے فن کی تحسین کی گئی ہے۔ یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ دیکھئے، تمام تر اختلاف کے باوجود فلاں نقاد نے منٹو کی اس طرح تعریف کی اور فلاں نقاد نے یہ کہا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی تحریر سے کچھ جملے اٹھا کر اس اجتماعی تاثر کو رفع نہیں کیا جا سکتا جو پورا مضمون/ تخلیق پڑھنے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ یہی دلیل تو منٹو اور اُس کے حامی ان تحریروں کے خلاف دیا کرتے تھے جن کو چن چن کر فحاشی کے مقدمات بنائے جاتے تھے۔ کرشن چندر کے علاوہ باقی جتنے بھی ترقی پسند تھے، احمد ندیم قاسمی سمیت، سب نے نظریات کے پرچار کو مقدم جانا نہ کہ فن کی تفہیم کو۔

فتح محمد ملک کا مضمون، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ ایک نئی تعبیر'' ان کی کتاب سعادت حسن منٹو ایک نئی تعبیر ۲۰۰۵ء میں شائع ہو کر کافی ہلچل مچا چکا ہے۔ منٹو کے شہرہ آفاق افسانے کی جو تعبیر فتح محمد ملک نے کی اس کی حمایت میں کم اور مخالفت میں زیادہ آوازیں بلند ہوئیں۔ اپنے اس مضمون میں ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کی نئی تفہیم یا تعبیر فاضل مضمون نگار نے کچھ یوں کی ہے:

> ''زیر نظر کہانی کی فقط ایک ہی تعبیر ممکن ہے اور وہ یہ ہے کہ پاکستان کا تصور، پاکستان کی تحریک اور پاکستان کا قیام بشن سنگھ جیسے پاگلوں کی سمجھ میں ہر گز نہیں آ سکتا۔''[۱۴۷]

جہاں ہندوستان سے تعلق رکھنے والے ادیب اور نقاد فتح محمد ملک کی اس تعبیر پر سیخ پا ہوئے، وہیں پاکستانی نقاد بھی اس نئی تعبیر یا مفروضے کو ہضم نہ کر سکے۔ ایم۔ خالد فیاض کا مضمون دراصل جوابی بیانیہ ہے۔ اُنھوں نے بہت تفصیل سے فتح محمد ملک کے اس مضمون سے اخذ شدہ نتائج کو بحث کے بعد رد کر دیا۔

ایم۔ خالد فیاض کا یہ مضمون اس سے قبل ''انگارے'' منٹو سیمینار نمبر ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔ نیا ورق، بمبئی کا یہ خصوصی گوشہ سعادت حسن منٹو ۹۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

گزشتہ صفحات میں ادبی رسائل و جرائد کے اُن خاص نمبروں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا جنھوں نے منٹو پر خاص نمبر نکالے۔ اس مطالعہ کی روشنی میں ''افکار'' کو یہ تفوق حاصل ہے کہ اس نے سلیقے کے ساتھ منٹو کی شخصیت اور فن کے نمایاں نقوش کو سب سے پہلے اُجاگر کیا۔ منٹو کی وفات پر جو تعزیتی لے اور سوگ کا عالم ادبی و فلمی دنیا میں موجود تھا اس کے تحریری شواہد کو بھی اس رسالے نے محفوظ کر لیا۔ اگر منٹو پر بعد میں کوئی اور رسالہ کوئی خاص نمبر نہ بھی نکالتا تو بھی اس خاص نمبر میں شامل مضامین منٹو کے مستقبل کے ناقد کو متنوّع راہیں دکھانے میں پوری طرح کامیاب ہوتے۔ ''نقوش'' بھی اس سلسلہ میں ''افکار'' کا ہم مرتبہ دکھائی دیتا ہے۔ اس میں بھی منٹو کی شخصیت اور فن پر ہر دو حوالوں سے سیر حاصل مضامین شامل ہوئے۔ خصوصاً منٹو کی غیر مطبوعہ کہانیوں کی اشاعت خاصے کی چیز ہے۔ ''پگڈنڈی''، ''شاعر'' میں شامل مضامین زیادہ تر جذباتی رنگ لیے ہوئے ہیں جب کہ ''گل خنداں'' میں شامل زیادہ تر مضامین پہلے ہی ''افکار'' اور نقوش کا حصہ بن چکے ہیں۔ ''مزدور جدوجہد''، ''سپوتنک'' اور ''انگارے'' کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اُنھوں نے دو دو مرتبہ منٹو پر خاص نمبر شائع کیے۔ ''مزدور جدوجہد'' کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۹۹ء جب کہ دوسرا شمارہ جنوری ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔ ان رسائل میں شامل کیے گئے مضامین معروف ناقدین کی بجائے اُن غیر معروف ناقدین کے ہیں جنھوں نے منٹو اور اس کی تخلیقات کو اپنی زندگی کے قریب محسوس کرتے ہوئے ان تخلیقات کے نادر اور اچھوتے مفاہیم تلاش کیے۔ ایک لحاظ سے ان مضامین میں وہ روح موجود ہے جسے جدید تنقیدی دنیا قاری اساس تنقید کے نام سے موسوم کرتی ہے۔ یہ تو طے ہے کہ یہ مضامین اس نیت سے نہیں لکھے گئے کہ یہ قاری اساس تنقیدی رویے کے تابع ہوں، لیکن بعض چیزیں / بعض رویے بغیر نام کے بھی پنپ جاتے ہیں۔ یہ مضامین منٹو کو کسی نقاد کا خراجِ تحسین نہیں بلکہ منٹو کی تخلیقات کے آئینے میں اپنی زندگی کو نیا مفہوم عطا کرتے ہوئے اسے ایک خوبصورت اور طبع زاد نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

''انگارے'' کے دونوں شماروں میں یہ خوبی موجود ہے کہ ان میں منٹو پر پہلے سے لکھی گئی تنقید کو قند مکرر کے طور پر شائع کرنے کی بجائے نئے مضامین لکھوا کر شامل کرنے کی کامیاب سعی کی گئی ہے۔ یوں اکیسویں صدی کے آغاز پر منٹو کے لیے نئی تنقیدی روایت کی تشکیل میں ان دو شماروں کا کردار قابل ذکر ہے۔

دوسرے شمارے میں گوجراں والا میں منعقد کیے گئے سیمینار میں منٹو کے حوالے سے دو طرح کے تنقیدی رویے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک رویہ منٹو پر لکھی جانے والی ابتدائی تنقید کی ارتقاء یافتہ صورت ہے جس میں منٹو کو فحاشی یا مذہبی فتویٰ سازی کی بنیاد پر رد کرنے کی بجائے مخصوص فلسفیانہ ڈسکورس کی مدد سے مقہور اور مطعون ٹھہرانے کی کوشش کی گئی ہے جب کہ دوسرا رویہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ لکھنے والا محض اپنے زمانے کا رسیا نہیں ہوتا اور آنے والے وقت میں اس کی تخلیق کو نئے تناظرات میں سمجھنا

اور سمجھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اسی سیمینار میں پڑھے جانے والے نصف سے زائد مقالات میں منٹو کی نئی تفہیم کی ضرورت کو نہ صرف محسوس کیا گیا بلکہ اس میں منٹو کی از سرِ نو تفہیم کی کامیاب کوشش بھی کی گئی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شاہد احمد دہلوی: ''گنجینۂ گوہر''، مکتبہ نیا دور، کراچی، بار اول، ۱۹۶۲ء، ص ۱۴۴۔

۲۔ شاہد احمد دہلوی، منٹو، مشمولہ، نقش، کراچی، جلد ۶، شمارہ ۳، مارچ ۱۹۵۵ء، ص ۱۰۔

۳۔ دیکھئے: ابو سعید قریشی: ''منٹو''، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۵۵ء۔

۴۔ انتظار حسین: ''غیر افسانوی موت''، نقش (منٹو نمبر)، ص ۱۳۔

۵۔ ____ایضاً________ص ۱۳۔

۶۔ کرشن چندر: ''سعادت حسن منٹو''، نقش، منٹو نمبر۔ ص ۱۸۔

۷۔ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، ''نقش، منٹو نمبر، ص ۱۹۔

۸۔ ____ایضاً________ص ۱۹۔

۹۔ مہدی علی صدیقی کی خود نوشت سوانح عمری ''بلا کم و کاست''، مطبوعہ شعبہ تصنیف و تالیف، جامعہ کراچی میں یہ مضمون ''منٹو کا مقدمہ'' کے عنوان سے شائع کیا گیا۔

۱۰۔ وقار عظیم: ''بدنام منٹو''، مشمولہ افکار (منٹو نمبر)، کراچی، مارچ، اپریل ۱۹۵۵ء، ص ۵۰۔

۱۱۔ قرۃ العین حیدر: ''دیکھ کبیرا رویا''، افکار (منٹو نمبر)، ص ۵۲۔

۱۲۔ علی سردار جعفری: ''بدزبان''، افکار (منٹو نمبر)، ص ۵۳۔

۱۳۔ ____ایضاً________ص ۵۴۔

۱۴۔ ____ایضاً________ص ۵۵۔

۱۵۔ شورش کاشمیری: ''چند یادیں''، افکار (منٹو نمبر)، ص ۵۷۔

۱۶۔ ____ایضاً________ص ۵۸۔

۱۷۔ یہ خاطر غزنوی کی نظم کا مصرعہ ہے جو انھوں نے منٹو کی وفات پر لکھی تھی اور اسی رسالہ میں شامل ہے۔

۱۸۔ خاطر غزنوی کی نظم کا مصرعہ۔

۱۹۔ ہندوستان سے اس مہینے یعنی مارچ اپریل میں ماہنامہ ''شاعر''، بمبئی نے منٹو نمبر نکالا تھا۔

۲۰۔ مہندر ناتھ، معصوم افسانہ نگار، مشمولہ شاعر، بمبئی، منٹو نمبر، مارچ، اپریل، ۱۹۵۵ء، ص ۳۰۔

۲۱۔ ایضاً____________ص، ۳۰۔

۲۲۔ ممتاز مفتی، منٹو اور اس کا فن، مشمولہ، پگڈنڈی، امرتسر، ۱۹۵۵ء، ص ۲۱۔

۲۳۔ شاہد دہلوی، منٹو، مشمولہ، پگڈنڈی، امرتسر، منٹو نمبر، ص ۲۷۔

۲۴۔ آفاق صدیقی، منٹو اور مختصر افسانہ نگاری، مشمولہ، پگڈنڈی امرتسر، منٹو نمبر، ص ۳۳۔

۲۵۔ قاسمی، احمد ندیم، منٹو میرا یار، مشمولہ، پگڈنڈی، امرتسر منٹو، نمبر، ص ۴۸/۳۶۔

۲۶۔ ضیا عظیم آبادی، آؤ منٹو کی باتیں کریں، مشمولہ پگڈنڈی، امرتسر منٹو نمبر، ص ۳۸۔

۲۷۔ ایضاً____________ص ۳۹۔

۲۸۔ انتظار حسین، غیر افسانوی موت، مشمولہ، پگڈنڈی، امرتسر، منٹو نمبر، ص، ۵۷۔

۲۹۔ گورنامہ کھنہ، منٹو اور فلم، مشمولہ، پگڈنڈی، امرتسر منٹو نمبر، ص ۷۷۔
۳۰۔ کرشن چندر: ''سعادت حسن منٹو''، کتب پبلی شرز لمیٹیڈ، بمبئی، ۱۹۴۸ء۔ واضح رہے کہ یہ سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن پر پہلی باضابطہ کتابی صورت ہے. جس میں کرشن چندر کے مضمون کے علاوہ منٹو کی تین تحریریں بھی شامل ہیں۔
۳۱۔ شورش کاشمیری کا یہ مضمون ''افکار'' منٹو نمبر میں شائع ہوا تھا، تفصیلات کے لیے دیکھئے مقالہ ہذا کے صفحات ۱۷۱، ۱۷۲۔
۳۲۔ احمد شجاع پاشا: ''منٹو ایک انسان''، ''گل خنداں'' (منٹو نمبر)، ص ۵۲۔
۳۳۔ ____ایضاً________ ص ۵۴۔
۳۴۔ بلقیس عابد علی: ''منٹو مر گیا''، ''گل خنداں'' (منٹو نمبر)، ص ۶۵۔
۳۵۔ دیکھئے: ''افکار'' (منٹو نمبر)، ص ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۷۔
۳۶۔ دیکھئے: ممتاز شیریں: ''معیار''، نیا ادارہ، لاہور ۱۹۶۳ء، ص ۲۲۶ تا ۲۳۴۔
۳۷۔ دیکھئے: ''منٹو، نوری نہ ناری''، از ممتاز شیریں، مرتبہ: آصف فرخی، مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۵ء، ص ۱۲۱-۱۲۶۔
۳۸۔ وقار عظیم کی یہ کتاب ''منٹو کا فن'' کے نام سے شائع ہوئی۔ تفصیل کے لیے مقالہ ہذا کے درج ذیل صفحات ۶۹، ۷۰ دیکھیں۔
۳۹۔ محمد حسن عسکری: ''منٹو کا فن''، نقوش (منٹو نمبر)، ص ۲۷۲۔
۴۰۔ ____ایضاً________ ص ۲۷۳۔
۴۱۔ ____ایضاً________، ص ۲۷۴۔
۴۲۔ عبادت بریلوی: ''منٹو کی حقیقت نگاری''، نقوش (منٹو نمبر)، ص ۲۹۲۔
۴۳۔ ____ایضاً________ ص ۳۰۶۔
۴۴۔ عصمت چغتائی: میرا دوست میرا دشمن''، نقوش (منٹو نمبر)، ص ۳۲۷۔
۴۵۔ ____ایضاً________ ص ۳۳۹۔
۴۶۔ ____ایضاً________ ص ۳۴۱۔
۴۷۔ دیکھئے: شورش کاشمیری: ''چند یادیں'' افکار (منٹو نمبر)، ۱۹۵۵ء، ص ۵۸۔
۴۸۔ علی ثنا بخاری، ڈاکٹر: ''منٹو کے بارے میں چند غلط فہمیاں''، انگارے (منٹو نمبر)، جنوری ۲۰۰۵ء، ص ۲۶۔
۴۹۔ اوپندر ناتھ اشک کے مضمون پر بحث مقالہ ہذا کے صفحات ۶۳ تا ۶۶ پر دیکھیں۔
۵۰۔ دیکھئے: مقالہ ہذا کے صفحات ۵۳ تا ۵۵۔
۵۱۔ حامد جلال: ''منٹو ماموں کی موت''، نقوش (منٹو نمبر)، ص ۳۷۹۔
۵۲۔ ____ایضاً________ ص ۳۹۰۔
۵۳۔ علی ثناء بخاری، ڈاکٹر: ''منٹو کے بارے میں چند غلط فہمیاں''، انگارے (منٹو نمبر) ص ۲۷۔
۵۴۔ اس مضمون پر بحث کے لیے ملاحظہ کیجئے مقالہ ہذا کا صفحہ نمبر ۲۹۲، ۲۹۳۔
۵۵۔ سہ ماہی ''دانشور''، منٹو نمبر، ۱۹۸۹ء۔

۵۶۔ منٹو کی پیدائش ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء جب کہ وفات ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء ہے۔ یہ کتابت کی غلطی نہیں ہے انیس ناگی کا دعویٰ یہ ہے کہ منٹو نے ۱۷ جنوری کا انتقال کیا تھا۔ دیکھئے: ''سعادت حسن منٹو، ایک غیر مکمل سوانح'' از انیس ناگی، مشمولہ ''سعادت حسن منٹو''، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۲۳۔

۵۷۔ مضمون پر بحث مقالہ ہذا کے صفحات ۲۸۶، ۲۸۷ پر دیکھیں۔

۵۸۔ اس مضمون کی تفصیل کے لیے دیکھئے مقالہ کا ص نمبر ۷۵۔

۵۹۔ اس مضمون کی تفصیل کے لیے دیکھئے مقالہ کا ص نمبر ۸۸۔

۶۰۔ محمد علی صدیقی: ''منٹو کے تراجم''، دانشور، ص ۷۵۔

۶۱۔ قاضی جاوید: ''منٹو اور ممتاز شیریں''، دانشور (منٹو نمبر)، ص ۶۳۔

۶۲۔ ـــــ ایضاً ـــــ ص ۷۰۔

۶۳۔ باقر علی شاہ: ''منٹو موہوم سے معلوم تک''، دانشور (منٹو نمبر)، ص ۱۱۲۔

۶۴۔ اداریہ کا منٹو سے کوئی تعلق نہیں اور یہ حکومت کی پالیسیوں کے خلاف لکھا گیا ہے۔

۶۵۔ دیکھئے: ماہنامہ ''گل خنداں''، لاہور (منٹو نمبر)، شمارہ ۶، جلد ۶، جنوری ۱۹۵۵ء، ص ۷۰۔

۶۶۔ دیکھئے:

i. ماہنامہ ''سپوتنک''، لاہور، جلد ۵۔ شمارہ ۲، ۱۹۹۴ء، ص ۵۷۔

ii۔ ''سعادت حسن منٹو'' از انیس ناگی، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور ۱۹۸۹ء، ص ۳۷۔

۶۷۔ بلونت گارگی: ''یہاں منٹو دفن ہے''، ''مزدور جدوجہد'' (منٹو نمبر)، جنوری ۱۹۹۹ء، ص ۱۰۔

۶۸۔ ـــــ ایضاً ـــــ ص ۱۱۔

۶۹۔ دیکھئے: ابراہیم جلیس: ''اُٹھاؤ بوتل اور چلو منٹو کے پاس''، افکار (منٹو نمبر)، ۱۹۵۵ء، ص ۶۱-۶۴۔

۷۰۔ قمر یورش: ''گنجا فرشتہ''، الفاظ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء۔

۷۱۔ مجاہد علی سید: ''تاخ تڑاخ''، ''مزدور جدوجہد''، (منٹو نمبر)، لاہور، جنوری ۲۰۰۵ء، ص ۹۔

۷۲۔ شری لعل: ''منٹو نے ہمیشہ انسان دوستی کا پیغام دیا''، ''مزدور جدوجہد'' (منٹو نمبر)، ص ۱۱۔

۷۳۔ سعادت حسن منٹو کے بھانجے اور مشہور فلم ڈائریکٹر۔

۷۴۔ ''سعادت حسن منٹو کی فلمی دنیا سے وابستگی، جدوجہد رپورٹ''، مشمولہ ''مزدور جدوجہد'' (منٹو نمبر)، ص ۱۶۔

۷۵۔ رپورٹ میں یہ نہیں بتایا گیا کہ اس فلم کی کہانی منٹو کے کس افسانے سے ماخوذ ہے۔

۷۶۔ فاروق سلہریا: ''منٹو کا قلم شعلے اگلتا تھا''، مشمولہ ''مزدور جدوجہد'' (منٹو نمبر) ص ۳۰۔

۷۷۔ ''یہ مرید عورتیں''، منٹو کا ناول نہیں بلکہ مضمون نما افسانہ ہے۔

۷۸۔ انور سدید، ڈاکٹر: ''سعادت حسن منٹو خطوط کے آئینے میں''، مشمولہ انگارے، منٹو نمبر، جنوری ۲۰۰۵ء، ص ۸۔

۷۹۔ ـــــ ایضاً ـــــ ص ۷۔

۸۰۔ Sajjad Shaikh,"Manto and the Russian Writers" View Piont, Jan.20,1980.

۸۱۔ کراچی سے شائع ہونے والا ادبی رسالہ۔

۸۲۔ انوار احمد، ڈاکٹر: ''سعادت حسن منٹو کے اداس اور تنہا متخصص''، انگارے، منٹو نمبر، ص ۱۹۔
۸۳۔ انیس ناگی: ''سعادت حسن منٹو''، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۳۳۔
۸۴۔ علی ثنا بخاری، ڈاکٹر: منٹو کے بارے میں چند غلط فہمیاں''، ص ۲۲۔
۸۵۔ منٹو پر سب سے پہلا دستیاب مضمون جو کتابی صورت میں شائع ہوا ''سعادت حسن منٹو'' کرشن چندر کا ہے، کتب پبلی شرز لمیٹڈ نے نئے ''ادب کے معمار'' کے سلسلہ میں ۱۹۴۸ء میں اسے بمبئی سے شائع کیا۔
۸۶۔ ابنِ حسن: ''منٹو کا مسخ شدہ وژن''، انگارے، منٹو نمبر، ص ۶۰۔
۸۷۔ قاضی عابد، ڈاکٹر: ''منٹو پر چند ذہنی/ تنقیدی تحفظات، تحقیقی و تنقیدی جائزہ''، انگارے، منٹو نمبر، ص ۷۰۔
۸۸۔ دیکھئے: وزیر آغا، ''منٹو کے افسانوں میں عورت''، ''تمثال''، کراچی جلد ۱، شمارہ ۱، ۲، ۳، ۱۹۹۲ء، ص ۳۵ تا ۵۰۔
۸۹۔ قاضی عابد، ڈاکٹر: ''منٹو پر چند ذہنی/ تنقیدی تحفظات، تحقیقی و تنقیدی جائزہ''، ص ۷۰۔
۹۰۔ دیکھئے: مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر: ''رحمان مذنب کی خوشبودار عورتیں''، مشمولہ انگارے، اپریل ۲۰۰۴ء، ص ۱۰۔
۹۱۔ قاضی عابد، ڈاکٹر: ''منٹو پر چند ذہنی/ تنقیدی تحفظات، تحقیقی و تنقیدی جائزہ''، ص ۲۷۔
۹۲۔ ____ایضاً__________ص ۷۳۔
۹۳۔ روش ندیم: ''منٹو کی سوانح: تھوڑا نیا تھوڑا پرانا''، انگارے منٹو نمبر، ص ۷۸۔
۹۴۔ ____ایضاً__________ص ۷۸۔
۹۵۔ ____ایضاً__________ص ۷۹۔
۹۶۔ ____ایضاً__________ص ۸۰۔
۹۷۔ ____ایضاً__________ص ۸۱۔
۹۸۔ دیکھئے: اختر شیرانی سے چند ملاقاتیں، از سعادت حسن منٹو، مشمولہ، گنجے فرشتے، مکتبہ شعر و ادب، لاہور، س ن، ص ۵۱-۶۸۔
۹۹۔ دیکھئے: ابو سعید قریشی: ''منٹو''، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص ۴۶۔
۱۰۰۔ علی ثنا بخاری، ڈاکٹر: منٹو کے بارے میں چند غلط فہمیاں''، مشمولہ انگارے منٹو نمبر، ص ۲۴۔
۱۰۱۔ دیکھئے: انوار احمد، ڈاکٹر: ''اُردو افسانہ تحقیق و تنقید''، بیکن، ملتان، ۱۹۸۸ء، ص ۲۰۵ تا ۲۵۱۔
۱۰۲۔ دیکھئے: ''سعادت حسن منٹو پچاس برس بعد''، مرتبہ شمشیر حیدر شجر/ نوید الحسن، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۹۳ تا ۱۰۵۔
۱۰۳۔ مبارک، جعفر حسن، اداریہ، حرف جعفر، فیصل آباد، اپریل، مئی، ۲۰۱۲ء ص ۳۔
۱۰۴۔ دیکھئے، علی ثناء بخاری، ڈاکٹر، منٹو کے بارے میں چند غلط فہمیاں، مشمولہ انگارے، ص ۲۰ تا ۲۹۔
۱۰۵۔ قاسمی، احمد ندیم، اُردو افسانے میں جرات مندی کی مثال، منٹو، مشمولہ، حرف جعفر، فیصل آباد، اپریل، مئی ۲۰۱۲ء ص ۸۔
۱۰۶۔ اس مضمون پر بحث موجودہ باب میں شامل افکار کے منٹو نمبر کے ضمن میں ملاحظہ کریں۔
۱۰۷۔ تفصیل کے لیے مذکورہ رسائل اور کتب کے تجزیات ملاحظہ کریں۔
۱۰۸۔ خالد حسن، منٹو ایک اجنبی، مشمولہ حرف جعفر، ص، ۳۰۔
۱۰۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، کیا آج سعادت حسن منٹو کی ضرورت ہے، مشمولہ حرف جعفر، ص ۳۳۔

۱۱۰۔ ممتاز شیریں کے اس مضمون پر تفصیلی بحث کے لیے مقالہ ہذا کے باب دوم میں شامل ان کی کتاب منٹو۔ نوری نہ ناری کا تجزیہ ملاحظہ کریں۔

۱۱۱۔ پرویز انجم کے اس مضمون پر بحث باب دوم میں شامل ان کی کتاب، منٹو غالب کا پرستار، میں کی گئی ہے۔

۱۱۲۔ نزہت منٹو، منٹو آج، روزنامہ اردو ٹائمز، بمبئی، ۱۸ جنوری، ۲۰۰۰ء۔

۱۱۳۔ محمد سعید نے اس کتاب میں ہمایوں اور عالمگیر کے روسی و فرانسیسی ادب نمبر میں شامل منٹو کی تخلیقات اور تراجم کو از سرِ نو شائع کیا۔

۱۱۴۔ صغیر افراہیم، منٹو کے خلق کردہ جسم فروش کردار، مشمولہ، فکر و تحقیق، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۴۴۔

۱۱۵۔ صغیر افراہیم، منٹو کے خلق کردہ جسم فروش کردار، مشمولہ، فکر و تحقیق، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۵۵۔

۱۱۶۔ ذوقی، مشرف عالم، ''منٹو ایک کولاژ''، مشمولہ، فکر و تحقیق، نئی دہلی، ص ۶۲۔

۱۱۷۔ ہمایوں اشرف، ڈاکٹر، ایک اعلیٰ ظرافت نگار، منٹو، مشمولہ، فکر و تحقیق، نئی دہلی ص ۱۲۱۔

۱۱۸۔ اے رحمن، ''منٹو کی افسانوی تفہیم اور ان کا افسانہ بو''، مشمولہ، فکر و تحقیق، نئی دہلی، ص ۱۵۵۔

۱۱۹۔ شائستہ فاخری، ''منٹو! کاش تم نے ہم کو جانا ہوتا''، مشمولہ، فکر و تحقیق، نئی دہلی ص ۲۳۳۔

۱۲۰۔ شائستہ فاخری، ''منٹو! کاش تم نے ہم کو جانا ہوتا''، مشمولہ، فکر و تحقیق، نئی دہلی ص ۲۳۸۔

۱۲۱۔ اجمل کمال، منٹو اور اردو تنقید، مشمولہ، زیست، کراچی، منٹو صدی نمبر کتابی سلسلہ، ۴، ۲۰۱۲ء ص ۲۷۔

۱۲۲۔ طاہرہ اقبال، سعادت حسن منٹو امر ہے، مشمولہ، زیست کراچی، منٹو صدی نمبر کتابی سلسلہ، ۴، ۲۰۱۲ء ص ۱۱۱۔

۱۲۳۔ تشنہ بریلوی، سعادت حسن منٹو، عظیم افسانہ نگار، مشمولہ، زیست، کراچی، منٹو صدی نمبر کتابی سلسلہ، ۴، ص ۱۱۵۔

۱۲۴۔ ____ایضاً________ ص ۱۱۵۔

۱۲۵۔ ایم خالد فیاض، منٹو پر چند نئی کتب۔ ایک جائزہ، مشمولہ، تناظر، گجرات، کتابی سلسلہ، (۲)، جولائی تا دسمبر، ۲۰۱۲، ص ۴۰۸۔

۱۲۶۔ ____ایضاً________ ص ۲۰۸۔

۱۲۷۔ نغمی، سعادت حسن منٹو، ذاتی یادداشتوں پر مبنی اوراق، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۲، ص ۹۷۔

۱۲۸۔ فرید احمد، دائیں بائیں اوپر نیچے، المسلم پبلی شرز، کراچی، ۱۹۹۵ء۔ ص ۲۷۵ تا ۳۰۲۔

۱۲۹۔ راقمہ اقبال، کچھ منٹو کے بارے میں ''مشمولہ، نیرنگ خیال، راولپنڈی،، جلد ۶۲، شمارہ ۳۰۷، جون، ۱۹۸۶ء، ص ۱۶ تا ۱۹۔

۱۳۰۔ دلیر شیرانی، پروفیسر، بلبل ادب کہاں، مشمولہ، پگڈنڈی، امرتسر، ۱۹۵۵ء، ص، ۶۲۔

۱۳۱۔ امیر حسین، آغا، منٹو کی یاد میں، مشمولہ سپوتنک، لاہور جلد ۷، شمارہ ۱، جنوری ۲۰۱۶ء، ص ۲۔

۱۳۲۔ دیکھئے راقم کا مضمون ''سعادت حسن مر گیا، منٹو زندہ ہے'' کا بنیادی ماخذ، مشمولہ: ''کون ہے یہ گستاخ''، مرتبہ: ڈاکٹر عامر سہیل، ص ۴۰۴ تا ۴۰۹۔

۱۳۳۔ اے خیام، منٹو شناسی۔ ایک تقابلی مطالعہ، زیست، کراچی، کتابی سلسلہ ۱، جنوری ۲۰۱۰، ص ۱۸۹۔

۱۳۴۔ لیز لی فلیمنگ، منٹو اور زبان کا استعمال، زیست، کراچی، کتابی سلسلہ ۱، جنوری ۲۰۱۰، ص ۲۰۰۔

۱۳۵۔ نعیم کوثر، شمع لحد خاموش، زیست، کراچی کتابی سلسلہ ۲، جنوری ۲۰۱۰، ص ۲۵۵۔

۱۳۶۔ ____ایضاً________ ص ۲۵۷۔

۱۳۷۔ پرویز انجم، منٹو کا افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اور کیمرہ، زیست، کراچی کتابی سلسلہ ۲، اگست ۲۰۱۰ء، ص ۲۶۱۔

۱۳۸۔ ____ایضاً____ ص ۲۶۷۔

۱۳۹۔ پرویز انجم، علی گڑھ یونیورسٹی اور منٹو، زیست، کراچی کتابی سلسلہ ۸، مئی، جون ۲۰۱۵، ص ۳۷۷۔

۱۴۰۔ انتظار حسین، منٹو کی گمشدہ تحریریں، مشمولہ، روزنامہ ایکسپریس، ۲۱ نومبر، ۲۰۱۴ءً۔

۱۴۱۔ ایم خالد فیاض، منٹو کی گمشدہ تحریریں، مشمولہ، زیست، کراچی، کتابی سلسلہ ۸، مئی جون، ۲۰۱۵ء ص ۳۷۹۔

۱۴۲۔ پرویز انجم، منٹو اور ذکر غالب، ایک اجمالی جائزہ''، زیست، کراچی کتابی سلسلہ ۱۱، ۲۰۱۷، ص ۳۶۵۔

۱۴۳۔ کامران کاظمی، ڈاکٹر، منٹو کی اداکارائیں،، زیست، کراچی، کتابی سلسلہ ۱۱، ص ۳۸۱۔

۱۴۴۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، موذیل، مشمولہ تناظر، گجرات کتابیں سلسلہ (۲) جولائی تا دسمبر، ۲۰۱۲، ص ۳۰۰،

۱۴۵۔ پرویز انجم، منٹو بمبئی سے مراجعت، مشمولہ، تناظر، گجرات، کتابی سلسلہ، (۲)، ص ۳۶۳۔

۱۴۶۔ شمس الحق عثمانی، منٹو ادب: خلق اللہ کا فہیم، مشمولہ، نیاورق، بمبئی، جلد ۱۴، شمارہ، ۳۱، اپریل تا ستمبر، ۲۰۱۲ ص، ۸۸۔

۱۴۷۔ فتح محمد ملک، ٹوبہ ٹیک سنگھ، ایک نئی تعبیر، مشمولہ، نیاورق، بمبئی، جلد ۱۴، شمارہ، ۳۱، ص، ۱۴۰۔
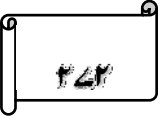
باب چہارم:

منٹو پر ہونے والی جامعاتی تحقیق کا جائزہ

بابِ چہارم:

منٹو پر ہونے والی جامعاتی تحقیق کا جائزہ

یہ ایک بدیہی امر ہے جس کی سچائی سے انکار کیا جانا کسی بھی طور ممکن نہیں کہ پاکستانی یا ہندوستانی یونیورسٹیوں میں اپنی وفات کے بیس برس بعد تک سعادت حسن منٹو (پی ایچ۔ڈی کی سطح پر) موضوع تحقیق نہیں بن سکا۔ اس کی جو بھی وجہ ہو یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اردو میں نام نہاد مذہب پسند محققین اور ادباء کا غلبہ یا پھر مجموعی طور پر اردو فکشن کی تحقیق اور تنقید سے محققین اور ناقدین کی بے اعتنائی یا پھر منٹو کے اندر کی وہ کڑواہٹ جسے برداشت کرنے کے لیے ایک خاص وضع کا ظرف درکار تھا۔ پاکستان میں منٹو کی وفات کے وقت تحقیق کی جو دنیا آباد تھی اس میں زیادہ تر شعری متون کی تدوین، مختلف قدیم شعرا اور اردو تنقید نگاروں کے احوال و آثار کی ترتیب کی طرف زیادہ توجہ دی گئی۔ اردو نثر کے اس خاص حصے کی طرف جسے ہم فکشن کے نام سے موسوم کرتے ہیں، توجہ کی بھی گئی تو یہاں بھی زیادہ سے زیادہ فورٹ ولیم کالج کے متون کی تدوین کی اِکا دُکا مثالیں ملتی ہیں۔ جامعات سے منسلک اردو کے اساتذہ نے اپنی زیادہ تر تحقیقی صلاحیتوں کو باغ و بہار اور فسانہ عجائب کے مباحث کی نذر کرنے میں عافیت محسوس کی۔ یہ بات اور زیادہ عجیب لگتی ہے کہ پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹر عبادت بریلوی اور سید وقار عظیم جیسے لوگوں کے منسلک رہنے کے باوجود جدید ناول افسانے اور ڈرامے پر کوئی قابلِ ذکر تحقیقی کام نہ کرایا جا سکا۔ منٹو پر ایم۔اے کی سطح کا سب سے پہلا مقالہ اجیت کمار بخشی نے ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کی نگرانی میں جموں کشمیر یونیورسٹی سری نگر سے ۱۹۶۰ء میں مکمل کیا جب کہ کسی بھی پاکستانی یونیورسٹی میں لکھا جانے والا پہلا مقالہ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ۱۹۶۱ء میں تحریر کیا گیا۔ ۱۹۶۰ء سے لے کر تا حال منٹو کی شخصیت اور فن پر پی ایچ۔ڈی کی سطح پر سات، ایم فل کے چھے جب کہ ایم اے کی سطح پر مختلف جامعات میں دس تحقیقی مقالہ جات لکھے گئے۔ ذیل میں ان تمام دستیاب مقالہ جات کا جائزہ زمانی ترتیب سے لیا جائے گا۔

''منٹو کے افسانے''، نصرت یاسین:

''منٹو کے افسانے'' سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن پر پاکستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں لکھا جانے والا سب سے پہلا تحقیقی مقالہ ہے۔ مقالہ ہذا کی منظوری مراسلہ نمبر ۱۶۳۳/جی ایم مورخہ ۲۵ جون ۱۹۶۰ء کو دی گئی جسے نصرت یاسین نے ۱۹۶۱ء میں مکمل کر کے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو کی ڈگری حاصل کی۔ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:۔

۱۔ مختصر افسانہ منٹو سے پہلے

۲۔ منٹو کی شخصیت

۳۔ منٹو کے موضوعات

۴۔ منٹو کا فن

۵۔ منٹو کا مقام

''مختصر افسانہ منٹو سے پہلے'' مقالہ ہذا کا پہلا باب ہے۔ اس میں مقالہ نگار نے اُردو افسانہ کے آغاز و ارتقاء اور عہد بہ عہد تبدیلیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس جائزے میں مندرجہ ذیل افسانہ نگاروں کے موضوعات، تکنیک، رجحانات اور اسلوب کے تناظر میں ان کے فکر و فن کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پریم چند، راشد الخیری، علی عباس حسینی، سلطان حیدر جوش، نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم، مجنوں گورکھ پوری، احمد علی، رشید جہاں، احمد ندیم قاسمی، سہیل عظیم آبادی، راجندر سنگھ بیدی، دیوندر ستیار تھی، کرشن چندر، ممتاز مفتی وغیرہ۔

دوسرا باب ''منٹو کی شخصیت'' میں مقالہ نگار نے پیدائش سے لے کر وفات تک مختلف واقعات کے ذریعے منٹو کی شخصیت کا عکس پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اُنھیں اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ مقالہ نگار واقعات کے بیان میں ربط نہیں لا سکیں۔ اُنھیں جو بات جہاں سے مل گئی اسے وہیں سے شروع کر دیا۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ منٹو کا شخصی خاکہ لکھ رہی ہیں نہ کہ تحقیقی مقالہ۔ کیوں کہ نہ تو واقعات کے بیان میں ربط ہے اور نہ ہی ان کا اسلوب تحقیقی ہے۔ پھر اُنھوں نے منٹو کی زندگی سے متعلق بعض بہت ہی ضروری معلومات درج نہیں کیں۔ مثلاً منٹو کے گھریلو حالات، نوکریاں، ذریعہ معاش، شراب نوشی وغیرہ۔ ان سب کا ذکر اُنھوں نے بہت ہی سرسری کیا ہے۔ منٹو کی تعلیمی زندگی سے متعلق پورے باب میں صرف ایک فقرہ ملتا ہے:

> ''پہلی مرتبہ میٹرک میں فیل ہو جانے پر بمبئی بھاگ گئے۔ اس فرار نے باپ بیٹے کے درمیان کشیدگی میں اضافہ کر دیا۔''[۱]

جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے تو وہ تحقیقی کے بجائے تخلیقی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے مقالہ نگار تحقیق کی بجائے تخلیق کے عمل سے گزر رہی ہوں۔ حوالہ جات کا نظام ناقص، نامکمل اور بے ربط ہے۔ کتب کے پبلشرز اور سن اشاعت درج نہیں کیے گئے۔ کسی حوالے میں مصنف کا نام آخر میں لگا دیا ہے اور کسی میں صفحہ نمبر۔ بعض مقامات پر مقالہ نگار نے اقتباس تو پیش کر دیا لیکن صاحب اقتباس کا نام/حوالہ دینے سے گریزاں رہیں۔ یوں ہمیں مقالہ کی مدد سے کہیں پتہ نہیں چلتا کہ منٹو نے یہ بات کب، کہاں اور کس کے ساتھ کی:

> ''وہ کئی مرتبہ کہتا تھا مجھے دوستی، محبت اور شفقت کسی پر اعتبار نہیں۔ ترقی پسندی سب بکواس ہے۔ میں کتوں سے محبت کر لوں گا لیکن انسانوں سے نہیں۔ میرا ایمان صرف شراب ہے۔''[۲]

یہ اقتباس کرشن چندر کے لکھے گئے اُس مضمون سے لیا گیا ہے جو اُنھوں نے ''نئے ادب کے معمار'' کے سلسلہ میں سعادت حسن منٹو کے عنوان سے لکھا تھا، جو اس طرح ہے:

> ''وہ ہزار بار کہتا ہے، مجھے انسانوں سے محبت نہیں ہے۔ میں ایک گلے سڑے کتے کے پلے سے محبت کر لوں گا مگر انسانوں سے نہیں۔ وہ کہنے لگا مجھے دوستی، عنایت، شفقت کسی پر اعتبار نہیں، میرا اعتقاد شراب ہے، یہ ترقی پسندی سب بکواس ہے۔''[۳]

مقالہ نگار نے نہ صرف ماخذ کی نشان دہی نہیں کی بلکہ متن میں بھی تحریف کی مرتکب ٹھہرتی ہیں اور یہ ارتکاب اُنھوں نے بیشتر مقامات پر کیا ہے۔ ضخامت بڑھانے کے لیے طویل اقتباسات کا سہارا لیا گیا ہے جن سے گریز کرنا چاہیے تھا۔ مثلاً کرشن چندر کے

مضمون سے لیے گئے اقتباس کی طوالت ڈیڑھ صفحے پر محیط ہے۔ اسی طرح منٹو کے مضمون ''جیب کفن'' سے ایک صفحے کا اقتباس درج ہے۔[۴] اتنے طویل اقتباسات کے باعث تحریر بوجھل پن کا شکار ہو گئی ہے۔ یہ باب منٹو کی شخصیت کا ایک ادھورا خاکہ ہے جس میں ان کی زندگی کے بعض بہت ہی اہم گوشے پوشیدہ رہ گئے ہیں۔

''منٹو کے موضوعات'' مقالہ کا تیسرا باب ہے۔ اس باب میں منٹو کے افسانوں کے موضوعات کا فنی و فکری جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ باب منٹو کے ابتدائی دور یعنی تراجم سے شروع ہو کر منٹو کے ہاں فسادات اور ہجرت کے موضوعات تک کا احاطہ کرتا ہے۔ اس باب میں منٹو کی شخصیت اور فن کی تعمیر میں باری علیگ اور ان مغربی افسانہ نگاروں کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے جن سے منٹو متاثر تھے۔ علاوہ ازیں منٹو کی روسی اور فرانسیسی ادب سے دلچسپی جو کہ تراجم کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے کا جائزہ بھی شامل ہے۔ منٹو کے افسانوں کے موضوعات کو تقسیم کرتے ہوئے رومان پسندی، طوائف، جنس، معاشی مسائل اور فسادات سے کے افسانوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

مقالہ نگار کے بقول منٹو مختلف ادوار میں ملکی اور بین الاقوامی سیاست پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہا ہے، اُس کا پہلا افسانہ 'تماشا' ہو یا آخری دور میں لکھے گئے افسانے اور مضامین، منٹو کے سیاسی شعور کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ نیا قانون ہندوستان کو لیڈروں سے بچاؤ۔ سیاسی حالات پر منٹو کے طنز اور نکتہ چینی کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ''بیگو''، ''موسم کی شرارت'' اور ''بانجھ'' کو منٹو کے رومانوی جب کہ ''شوشو''، ''پھاہا''، ''بلاؤز''، ''ٹھنڈا گوشت'' اور ''بُو'' ایسے افسانے ہیں جن کا موضوع جنس کو بنایا گیا ہے۔ لیکن اُنھوں نے کوئی مدلل تبصرہ کرنے کی بجائے ان افسانوں کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔

اُردو ادب میں جہاں جہاں جنس کا ذکر ہوا ہے وہاں طوائف کا ذکر ناگزیر ہے۔ منٹو کے ہاں یہ موضوع بار بار اور عام روایت سے ہٹ کر آیا ہے۔ مقالہ نگار جنس کو فطری جذبہ قرار دیتی ہیں لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب جنس اپنی تمام تر اہمیت کے باوجود روحانیت سے بہت پیچھے رہ جاتی ہے۔ منٹو کے جنس یا طوائف سے متعلق لکھے گئے افسانوں میں ''ہتک''، ''جان پہچان''، ''کالی شلوار''، ''سو کینڈل پاور کا بلب''، ''سوراج کے لیے'' اور ''سڑک کے کنارے'' کا تجزیہ پڑھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ طالب علمانہ نوعیت کے ہیں کیوں کہ زیادہ تر افسانوں خصوصاً ''ہتک''، کالی شلوار'' اور ''سو کینڈل کا پاور بلب'' کا محض خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ البتہ ''سڑک کے کنارے'' کا تجزیہ عمدہ ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''یوں تو سعادت حسن منٹو کا جنسی تصور بنیادی طور پر فطری ہے مگر اپنے ارتقا میں جب وہ ''سڑک کے کنارے'' تک پہنچتا ہے تو وسعت کے اعتبار سے جسمانی حدود کو پیچھے چھوڑ آیا ہے۔''[۵]

معاشی موضوع کا ذکر کرتے ہوئے مقالہ نگار نے منٹو کے افسانہ ''نعرہ'' کا خلاصہ نما تجزیہ کیا ہے حال آں کہ اسی موضوع سے متعلق منٹو نے اور بھی کئی افسانے لکھے ہیں مگر صاحب مقالہ نے ان کا ذکر تک نہیں کیا۔

آخر میں ایسے افسانوں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے جن میں منٹو نے فسادات کو موضوع بنایا ہے۔ ان میں ''کھول دو''، ''موذیل''، ''ٹھنڈا گوشت''، ''سہائے''، ''ڈارلنگ'' اور ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' شامل ہیں۔ مقالہ نگار نے ان افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ منٹو کا تصورِ انسان ہمیں اُس کے فسادات سے متعلق لکھے گئے افسانوں میں زیادہ واضح نظر آتا ہے۔ گو کہ دیگر موضوعات پر لکھتے ہوئے بھی ہم منٹو کے کرداروں اور اُن کی انسان دوستی سے آگاہ ہوتے ہیں لیکن فسادات ایسا موضوع ہے جس میں واضح طور پر محسوس

ہوتا ہے کہ منٹو کا انسان فطری ہے اور فطری انسان کسی بھی لمحے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ وہ اچھا بھی ہو سکتا ہے اور بُرا بھی۔ ''سیاہ حاشیے'' میں منٹو نے منفرد اور اچھوتے انداز میں سوسائٹی کا مذاق اُڑایا ہے اور اس بیان میں وہ بالکل غیر جانبدار رہا ہے۔ لکھتی ہیں:

''سیاہ حاشیے میں منٹو نے نہ ظالموں کو داد دی ہے اور نہ مظلوموں سے ہمدردی کی ہے بلکہ نیک و بد کا فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا ہے۔''[۶]

اس باب میں بھی حوالہ جاتی نظام ناقص و نامکمل ہے۔

''منٹو کا فن'' مقالے کا چوتھا باب ہے۔ اس باب میں منٹو کے افسانوں کی تکنیک، خصوصاً آغاز، وسط اور انجام پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ منٹو کے افسانوں کی دیگر خصوصیات مثلاً زبان و بیان، مشاہدہ کی گہرائی، جزئیات نگاری، تفحص الفاظ، کفایت لفظی، اُسلوب کی سادگی اور کردار نگاری پر بحث کی گئی ہے۔

''منٹو کا مقام'' مقالے کا پانچواں اور آخری باب ہے۔ اس میں مقالہ نگار نے دیگر افسانہ نگاروں (خصوصاً پریم چند) سے فنی و فکری تقابل کے بعد اُردو افسانہ نگاری میں منٹو کے مقام کا تعین کرتے ہوئے منٹو کی جدت پسندی، تکنیک، موضوعات، الفاظ کا انتخاب، حقیقت نگاری اور انسان دوستی کو منٹو کے افسانوں کی خصوصیات جب کہ انفرادیت اور جدت پسندی کے ساتھ ساتھ بے رحم اور بے خوف حقیقت نگاری کو اُن کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی قرار دیا۔

آخر میں کتابیات کی فہرست دی گئی ہے۔ مقالہ نگار کے ہاں حوالہ، حواشی اور کتابیات درج کرنے کا نظام انتہائی ناقص ہے۔ جس طرح حوالے اور حواشی نامکمل ہیں اسی طرح کتابیات و رسائل کی فہرست درج کرتے ہوئے بھی اُنھوں نے تحقیق کے اصولوں کو مدنظر نہیں رکھا۔ صرف کتاب کا نام اور مصنف کا نام درج کیا ہے حال آں کہ اس کے ساتھ ساتھ اُنھیں پبلشرز کا نام اور سن اشاعت بھی دینا چاہیے تھا۔ رسائل کی فہرست بھی نامکمل ہے، صرف رسالے کا نام اور نمبر (اگر وہ کوئی خاص شمارہ ہے) دے دیا گیا ہے، سال مہینہ، جلد اور شمارہ نمبر دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی جو کہ تحقیقی غلطی ہے۔

تحقیق کی رو سے مقالہ میں بہت کمزوریاں ہیں، مقالہ نگار نے منٹو کی تخلیقات کے علاوہ دیگر ذرائع سے مواد حاصل کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ محض دو ایک رسائل اور ابو سعید قریشی کی کتاب کے علاوہ شاذ ہی کوئی حوالہ ملتا ہے جو اُنھوں نے اپنے موقف کی تائید کے لیے بطور اقتباس پیش کیا ہو۔ حال آں کہ اس وقت تک منٹو پر مندرجہ ذیل کتابیں اور رسائل کے منٹو نمبر شائع ہو چکے تھے۔

''منٹو'' از ابو سعید قریشی، ''منٹو میرا دوست'' از محمد اسد اللہ، ''منٹو میرا دشمن''، از اوپندر ناتھ اشک، ''منٹو''، ''از کرشن چندر، ''شاعر'' منٹو نمبر، ''پگڈنڈی'' منٹو نمبر، ''نقوش'' منٹو نمبر''، ''افکار'' منٹو نمبر، ''گل خنداں'' منٹو نمبر اور، ''نقش'' منٹو نمبر۔

مقالہ منٹو کی وفات کے چھے برس بعد تکمیل کو پہنچا لہٰذا اُن اخبارات تک رسائی مشکل نہیں تھی جن میں منٹو سے متعلق بیسیوں مضامین، تاثرات، نظمیں، اخبارات کے اداریے اور کالم وغیرہ چھپتے رہے۔ لیکن اس سارے مواد کو نظر انداز کر دیا گیا۔ چونکہ منٹو پر لکھا جانے والے یہ پہلا تحقیقی مقالہ ہے اور جس دور میں یہ لکھا گیا اُس وقت تحقیق کے اصول بھی اتنے پختہ اور واضح نہیں تھے جتنے آج، اس لیے مقالہ نگار کی یہ کوشش سراہے جانے کے قابل ہے۔

''منٹو، غلام عباس اور احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں حقیقت نگاری''، فرحت وثیر:

فرحت وثیر نے یہ مقالہ سید سجاد باقر رضوی کی نگرانی میں مکمل کیا۔ پنجاب یونیورسٹی، لاہور میں منٹو پر لکھا جانے والا یہ دوسرا تحقیقی مقالہ ہے۔ مقالے کا سن تکمیل ۱۹۷۲ء درج ہے مگر پیش لفظ کے آخر میں ۱۵ جولائی ۱۹۷۳ء لکھا ہوا ہے۔ ایم اے کی سطح پر تحریر کیا گیا۔ یہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے جن کی تفصیل اس طرح ہے:

۱۔ حقیقت نگاری کیا ہے؟

۲۔ منٹو کے افسانوں میں حقیقت نگاری

۳۔ غلام عباس کے افسانوں میں حقیقت نگاری

۴۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں حقیقت نگاری

''حقیقت نگاری کیا ہے''، میں حقیقت نگاری کی وضاحت مشرقی و مغربی نقطۂ نظر کی روشنی میں کی گئی ہے۔ تیسرا اور چوتھا باب جو کہ غلام عباس اور احمد ندیم قاسمی کی حقیقت نگاری سے متعلق ہے اس میں مقالہ نگار نے ان دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں پائی جانے والی حقیقتوں کی نشان دہی کی ہے مگر چونکہ ان تینوں ابواب میں منٹو کی حقیقت نگاری کے ساتھ تقابل نہیں کیا گیا اس لیے ان ابواب پر بحث نہیں کی جا رہی۔

مقالہ کا دوسرا باب منٹو کی حقیقت نگاری سے متعلق ہے، اس میں مقالہ نگار نے منٹو کے افسانوں میں موجود سیاسی، سماجی، معاشی اور جنسی حوالوں سے منٹو کو بے رحم حقیقت نگار تسلیم کرتے ہوئے اس بے رحمی کی وجہ انسان دوستی کو قرار دیا۔ لکھتے ہیں:

> ''زندگی کی ترجمانی اور عکاسی میں دو چیزیں منٹو کا دامن کبھی نہیں چھوڑتیں ایک تو عقلی زاویہ نظر اور دوسرے عام انسانی ہمدردی۔ ان سب کی تان انسانی ہمدردی پر ٹوٹتی ہے اور یہی باتیں اُنھیں انسان دوست بناتی ہیں۔''[۷]

فرحت وثیر بھی دیگر ناقدین کی طرح اس بات پر مصر ہیں کہ منٹو کے افسانوں کے کردار زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھتے ہیں، خصوصاً متوسط طبقے کے مسائل خواہ وہ کسی بھی نوعیت کے ہوں، منٹو نے اُن کا باریک بینی سے مشاہدہ کر کے اُن کی پرتیں ایک ایک کر کے بہت ہی صفائی کے ساتھ کھولی ہیں۔ منٹو اپنے کرداروں کی مدد سے معاشرے میں موجود منافقتوں کی تہوں کو اپنے ناخن سے کرید کرید کر اسے اس کی اصلی حالت میں سامنے لے آتا ہے۔ معاشرہ چاہے اسے پسند کرے یا نہ کرے وہ اسے اس کا اصلی چہرہ دکھا کر رہتا ہے:

> ''منٹو کے افسانے اس کے گہرے مشاہدے، وسیع مطالعہ فکر، تخیل، تصور اور فن کا بہترین امتزاج ہیں۔ ان میں مجموعی حیثیت سے زندگی کا صحیح شعور، فن کا بھرپور احساس اور شخصیت کا پرتو اس طرح ہم آہنگ ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا اور ایک کے بغیر دوسرے کا تصور محال ہے۔''[۸]

''نیا قانون'' کو منٹو کی سیاسی بصیرت کا حامل افسانہ قرار دینے کے بعد ایک پیراگراف میں اس کا تجزیہ کچھ اس طرح کیا ہے:

> ''اس افسانے میں منٹو نے کمال مصوری اور فنکاری کے ساتھ کئی حقیقتوں کا انکشاف کیا ہے۔ مثلاً عوام کے مسائل، ان کی بیروزگاری، جہالت، انگریز حکمرانوں کے خلاف دلوں میں نفرت، آزادی حاصل کرنے کی ٹھاٹھیں مارتی خواہش،

معاشی ناہمواری، اشتراکی نظام کی خواہش جو اس دور میں پیدا ہو رہی تھی، ان سب کو ہی اس نے بڑے عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے۔''[۹]

اب دوسرا اقتباس دیکھیے جو الفاظ کے معمولی رد و بدل کے باوجود اسی مفہوم کو پیش کرتا ہے۔ توصیف اختر اپنے مقالے میں جو اسی سال یعنی ۱۹۷۳ء ہی کو لکھا گیا، اس موضوع پر یوں رقم طراز ہیں:

''منٹو کی یہ کہانی دراصل اس پورے عہد کی تاریخ ہے، انگریزوں سے نفرت، آزادی کی خواہش، معاشی بد حالی اور اشتراکی نظام کی خواہش جو اس دور میں پیدا ہو رہی تھی، اس افسانے میں بخوبی نظر آتی ہے۔''[۱۰]

دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں مقالہ نگاروں نے اس اقتباس کا ماخذ نہیں بتایا۔

مقالہ نگار کے مطابق ''موذیل'' اس حقیقت کا عکاس ہے کہ انسان کا ظاہر اور باطن مختلف ہوتا ہے۔ جو بظاہر بُرے نظر آتے ہیں ان کے اندر کس طرح انسانی عظمت موجود ہوتی ہے اور بظاہر نیکوکار کتنے پست ہو سکتے ہیں۔ اس بات کا احساس ہمیں ''موذیل'' کے ذریعے ہوتا ہے۔ جب کہ فسادات کے حوالے سے ''کھول دو'' کو منٹو کا سب سے زوردار اور جھنجھوڑ کر رکھ دینے والا افسانہ قرار دیا۔ جہاں تک اُسلوب کا تعلق ہے تو یہ ایک جیسا نہیں۔ کہیں بہت ہی زیادہ بھونڈا پن، بے ربطی اور غیر منطقی انداز کہ جملوں کی ساخت سے کوفت ہونے لگتی ہے اور کہیں اتنا پختہ اور رچا ہوا کہ بڑے بڑے ناقدین بھی پہلو مارتے دکھائی دیں۔ کمزور اسلوب کا حامل ایک جملہ دیکھیے:

''اس نے (منٹو نے) اپنی عورتوں میں اس ''طوائف'' کو اپنے لیے زیادہ منتخب کر لیا۔''[۱۱]

اب دوسری مثال ملاحظہ ہو جس میں مقالہ نگار کا اُسلوب حیران کن حد تک تجزیاتی اور پختہ ہے، ''بابو گوپی ناتھ'' کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بابو گوپی ناتھ میں آدمی کی ازلی شرافت کا عکس نظر آتا ہے۔ اس کی لغزش محض اس لیے لغزش ہے کہ وہ خطا کا پُتلا بھی ہے مگر اس کی روح آلودگی سے پاک ہے اور یوں بھی منٹو کے مذہب میں انسان اپنے بار عصیاں کے باوجود انسان ہے۔''[۱۲]

یہ صرف دو مثالیں ہیں ورنہ پورا مقالہ اُسلوب کے لحاظ سے اُنھیں مختلف رنگوں کا حامل ہے۔ اس تضاد کا ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ مقالہ نگار مختلف مضامین و مقالہ جات سے مطلوبہ مواد حاصل کر کے اُسے بغیر کسی حوالہ کے اپنے تصرف میں لے آئے ہیں۔ حوالہ دینے کا انداز بھی غیر تحقیقی ہے۔ ماخذات/کتابیات کے پبلشرز اور سن اشاعت بھی درج نہیں کیے۔ منٹو کے معروف افسانوں کو حقیقت نگاری کا چولا تو اُنھوں نے پہنایا مگر اس کے حق میں مضبوط دلائل دینے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

موضوع کے پیشِ نظر مقالہ نگار کو چاہیے تھا کہ تینوں افسانہ نگاروں کے ہاں حقیقت کے بیان میں جو تضاد اور اشتراک ہے اُن کی نشان دہی مثالوں کے ذریعے کی جاتی اور پھر ان میں سے ہر ایک کا مقام متعین کیا جاتا۔ لیکن مقالہ نگار نے ایسا نہیں کیا۔ وہ تمام افسانہ نگاروں کا علیحدہ علیحدہ جائزہ تو لیتے رہے لیکن ان کا تقابلی جائزہ نہیں کیا جو اس مقالے کا سب سے کمزور پہلو ہے۔ مجموعی طور پر یہ ایک ناکام تحقیقی مقالہ ہے جسے ہم طالب علمانہ کوشش بھی قرار نہیں دے سکتے۔

’’منٹو کے افسانوں میں معاشرتی مسائل‘‘، توصیف اختر:

زمانی اعتبار سے سعادت حسن منٹو پر لکھا گیا یہ تیسرا غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ ہے جسے توصیف اختر نے سید سجاد باقر رضوی کے زیر نگرانی ۱۹۷۳ء میں ایم اے اُردو کی ڈگری کے لیے پنجاب یونیورسٹی میں پیش کیا۔ چار ابواب پر مشتمل اس مقالہ کی ابواب بندی اس طرح کی گئی ہے:

۱۔ سعادت حسن منٹو کے سوانح حیات

۲۔ حقیقت پسندی کا مفہوم اور روایت

۳۔ منٹو کے چند معاصر افسانہ نگار

۴۔ منٹو کے افسانوں میں معاشرتی مسائل

جب کہ آخر میں صفحہ ۱۱۰ تا ۱۱۴ پر کتابیات کی فہرست دی گئی ہے۔ یوں یہ مقالہ ۱۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

پہلا باب، سعادت حسن منٹو کے سوانح حیات سے متعلق ہے اور یہ پندرہ صفحات پر مشتمل ہے۔ سعادت حسن منٹو جیسی دلچسپ اور متنازعہ شخصیت کے حالاتِ زندگی کا اتنے مختصر صفحات میں احاطہ کرنا ایک ناممکن سی بات ہے، چناں چہ مقالہ نگار کو منٹو کی زندگی کے تمام اہم اور کم اہم واقعات سے سرسری گزرنا پڑا۔ منٹو کی زندگی سے متعلق بہت کم واقعات درج کیے گئے ہیں۔ واقعات کی کمی کے باوجود ان میں ربط نام کی کوئی چیز نہیں۔ گو کہ اہم اہم واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے مقالہ نگار نے سنین بھی ساتھ ساتھ درج کیے ہیں لیکن منٹو کی تاریخ وفات کے متعلق ان سے ایک فاش غلطی سرزد ہوگئی ہے۔ اُنھوں نے منٹو کی تاریخ وفات ۱۸ جنوری ۱۹۴۸ء درج کی ہے جو کہ سراسر غلط ہے۔[۱۴]

سوانح کے باب میں صرف سات حوالہ جات دیے گئے ہیں۔ صفحہ نمبر ۳، ۴، ۵، ۶ اور ۱۲ پر ایک ایک حوالہ جب کہ صفحہ ۸ پر دو حوالے درج ہیں۔ حوالہ دینے کا انداز بھی بالکل غیر تحقیقی ہے۔ سوانح کے باب میں نصرت یاسین کے تحقیقی مقالہ سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے اور پورے کے پورے پیرا گراف مقالہ مذکورہ سے اُٹھا کر جوں کے توں درج کر دیے گئے ہیں اور کہیں بھی اس استفادہ کی نشان دہی نہیں کی گئی۔

دوسرے باب ’’حقیقت پسندی کا مفہوم اور روایت‘‘ میں حقیقت پسندی کے مفہوم کی توضیح و تشریح کے بعد افسانوی ادب میں حقیقت پسندی کی روایت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں پریم چند، سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم، علی عباس حسینی، مجنوں گورکھ پوری، انگارے گروپ، ترقی پسند تحریک سے وابستہ افسانہ نگار، ممتاز مفتی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، حیات اللہ انصاری اور غلام عباس کے افسانوی رویوں اور رجحانات کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ جائزہ اردو افسانے کے آغاز سے منٹو تک کے عہد کا احاطہ کرتا ہے۔

گویا مقالہ نگار نے حقیقت پسندی کی روایت کے بجائے اُردو افسانہ کی روایت پیش کر دی ہے کیوں کہ اُنھوں نے حقیقت پسندی کے ذیل میں جتنے بھی افسانہ نگاروں کا ذکر کیا ہے وہ مختلف نظریات اور رجحانات کے حامل رہے ہیں۔ اگر ان سب افسانہ نگاروں کو حقیقت پسند تسلیم کر بھی لیا جائے (کیوں کہ ادیب بہر حال کسی نہ کسی سطح پر اپنے معاشرے اور معاشرتی مسائل سے جڑا ہوتا ہے) تو

اس باب کا مقالے کے موضوع سے براہ راست تعلق بنتا نظر نہیں آتا۔ محقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ موضوع کے انتخاب کے بعد، اس کی ابواب بندی کرتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھے کہ ابواب موضوع کے ساتھ مربوط ہوں۔ مقالہ نگار کا موضوع ''منٹو کے افسانوں میں معاشرتی مسائل'' کا جائزہ لینا ہے نہ کہ منٹو کے افسانوں میں حقیقت نگاری کا۔ اُنھیں چاہیے تھا کہ اس باب کی بجائے وہ کوئی ایسا باب بناتے جس میں منٹو کے عہد کے معاشی، معاشرتی اور عمرانی مسائل کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا، اُس عہد کو سامنے رکھتے ہوئے منٹو کے افسانوں میں معاشرتی مسائل کا جائزہ وہ زیادہ بہتر انداز میں لے سکتے تھے۔ اس باب میں صرف چار حوالوں پر اکتفا کیا گیا ہے اور یہ حوالے تحقیق کی رُو سے نامکمل ہیں۔

''منٹو کے چند معاصر افسانہ نگار'' مقالہ ہذا کا تیسرا باب ہے۔ جس میں اُردو افسانہ نگاری کی روایت میں منٹو کے مقام اور مرتبہ کا تعین کرنے کے لیے سعادت حسن منٹو کے فن کا اُس کے دیگر ہم عصر افسانہ نگاروں کے ساتھ تقابل کیا گیا ہے۔ ان افسانہ نگاروں میں عصمت چغتائی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس، حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی اور محمد حسن عسکری شامل ہیں۔

اڑتالیس صفحات پر مشتمل یہ باب بلحاظ ضخامت مقالہ کا سب سے طویل باب ہے۔ جس میں سعادت حسن منٹو اور اُن کے معاصرین کا فنی و فکری تقابل کیا گیا ہے۔ اس تقابلی جائزے میں تمام افسانہ نگاروں (بشمول منٹو) کی فنی خوبیوں کو تو اُجاگر کیا گیا ہے لیکن منٹو کا اپنے معاصرین میں مقام متعین نہیں کیا گیا۔ جنس، سیاست، معیشت اور دیگر موضوعات کے تقابل کے بعد مقالہ نگار کو افسانہ نگاروں کی اس بھیڑ میں منٹو کی حیثیت کا تعین کرنا چاہیے تھا۔ اس باب میں بیس حوالے دیے گئے ہیں یہ تمام حوالے بھی گزشتہ حوالوں کی طرح صحت کے لحاظ سے ناقص ہیں۔

''منٹو کے افسانوں میں معاشرتی مسائل'' مقالہ ہذا کا چوتھا اور آخری باب ہے۔ سینتیس صفحات پر مشتمل اس باب کے آغاز میں منٹو کے عہد کی تصویر کشی کے بعد منٹو کے افسانوی کرداروں پر بحث کی گئی ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق سعادت حسن منٹو نے اپنے افسانوں کے تمام کردار اسی معاشرہ سے لیے ہیں جس کا وہ مکیں تھا۔ وہ تصورات کی پرچھائیوں کو علامتوں اور مقدس و محبوب اُسلوب کی دھند میں لپیٹنے کی بجائے حقیقتوں کو سیدھے سادے بیان میں عریاں کرنے کا قائل تھا۔ اُس کے کردار شہری زندگی سے تعلق رکھنے والے گوشت پوست کے انسان تھے جو کسی ایک شہر یا علاقے سے مخصوص نہیں۔ دلال، مولوی، بنیے، سیاست دان، طوائفیں، مزدور، الغرض متوسط طبقے کو درپیش مسائل خواہ وہ سیاسی ہوں، معاشی ہوں یا جنسی، منٹو ان موضوعات پر بغیر کسی لگی لپٹی کے اُس کو جوں کا توں پیش کر دیتا ہے۔

مقالہ نگار کو منٹو کے سیاسی نقطۂ نظر کے حامل افسانوں میں پیش کی جانے والی تصویروں میں بہت سی چیزیں نظر آتی ہیں مثلاً ہندوستان کا جذبہ آزادی، سیاسی تحریکوں کا زور شور، تقریریں، جیلیں، سیاسی جلسے، مسلح افواج، نئے قانون کی خواہش اور اس خواہش کو بیڑیاں پہنانے والی غلامی اور آگے بڑھ کر انقلاب۔ اُردو کے کسی بھی افسانہ نگار نے ان خونی مناظر کی تصویریں اپنے افسانوں میں نہیں کھینچیں سوائے منٹو کے۔

یہ بات تسلیم کرنے کے باوجود کہ فسادات کا اثر ہماری تاریخی، معاشی اور سماجی حیثیت پر بہت شدید ہوا، مقالہ نگار نے اس موضوع پر کوئی پُر مغز بحث نہیں کی۔ منٹو نے اس موضوع پر بہت اچھے اچھے افسانے لکھے مگر مقالہ نگار نے صرف دو افسانوں

''ٹھنڈا گوشت'' اور ''کھول دو'' کو ہی در خور اعتنا جانا۔ چناں چہ ان دونوں افسانوں کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے لیکن اس موضوع پر لکھے گئے دیگر افسانوں مثلاً ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، ''گورمکھ سنگھ کی وصیت''، ''موذیل'' وغیرہ کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔

جس طرح سیاست اور معاشرے کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس طرح جنس اور طوائف بھی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں (کم از کم ادب کی حد تک)۔ منٹو کے افسانوں میں جنس اور طوائف دونوں پر بہت عمدہ مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مقالہ نگار منٹو کے جنسی موضوعات پر لکھے گئے افسانوں کو کامیاب افسانے قرار دیتے ہوئے ان کے جنسی نظریات کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

> ''جنس کے بارے میں منٹو کا نظریہ صحت مندانہ رہا۔ منٹو کے کامیاب افسانے بھی وہی ہیں جن میں وہ ہمیں جنسی جذبہ کے رینگتے احساس اور طوائف کے ماحول میں گھومتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔'' [۱۴]

طوائف منٹو کے افسانوں میں بار بار نظر آتی ہے۔ یہ طوائف محفلیں سجانے والی یا تہذیب سکھانے والی اور پر تعیش زندگی گزارنے والی نہیں بلکہ مفلوک الحال اور غربت کی چکی میں پسی ہوئی طوائف ہے اور منٹو کو اپنے اس کردار سے خاص رغبت ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق: ''طوائفوں کا نفسیاتی مطالعہ منٹو کو خاص طور پر مرغوب تھا۔'' [۱۵] ان کے مطابق منٹو کے وہی افسانے سب سے اچھے ہیں جو اُنھوں نے طوائفوں سے متعلق لکھے۔ آخر میں تمام مباحث کا نتیجہ وہ یوں نکالتے ہیں:

> ''معاشرتی مسائل کا ادراک منٹو کے افسانوں میں ترقی پسندوں کی طرح جذباتی انداز میں نہیں ملتا۔ نہ ہی ان کا انداز اصلاحی ہے۔ منٹو ایک فنکار کی حیثیت سے ان کو دیکھتا ہے۔ اُنھیں وہ معاشرتی اقدار کی موٹی موٹی تہوں سے باہر نکالتا ہے اور یوں ننگی حقیقتوں کے بے باک اظہار سے معاشرے کے ٹھیکیداروں، اخلاقیات کے امانت داروں اور مصلحین قوم کے منہ پر طمانچہ مارتا ہے۔'' [۱۶]

''سعادت حسن منٹو، حیات اور کارنامے''، برج کیشن ایمہ

''سعادت حسن منٹو حیات اور کارنامے'' برج کیشن ایمہ (ڈاکٹر برج پریمی) کا مقالہ ہے۔ سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن پر لکھا گیا یہ پی ایچ۔ ڈی کی سطح کا پہلا تحقیقی مقالہ ہے۔ مقالہ نگار نے ڈاکٹر حامد کاشمیری کی نگرانی میں کشمیر یونیورسٹی، سری نگر سے اسے ۱۹۷۶ء میں پیش کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

چھے ابواب پر مشتمل اس مقالہ میں منٹو کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں کا پہلی مرتبہ تحقیقی انداز سے جائزہ لیا گیا ہے۔ ابواب کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے۔ پہلا باب (الف) حیات (ب) شخصیت کے ترکیبی عناصر، دوسرا باب، اُردو کا مختصر افسانہ منٹو تک، تیسرا باب، منٹو کی افسانہ نگاری، چوتھا باب، منٹو کے انشائیے، خاکے، پانچواں باب، مکتوبات جب کہ چھٹے باب بعنوان ''دوسرے ادبی کارنامے'' میں منٹو کے کیے گئے تراجم، ڈرامے، ناول اور صحافتی زندگی کی تفصیلات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ برج کیشن ایمہ کا یہ مقالہ ۱۹۸۶ء میں ان کے قلمی نام ڈاکٹر برج پریمی کے ساتھ دیپ پبلی کیشنز، سری نگر سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ برج کیشن ایمہ کے اس مقالہ پر تفصیل کے ساتھ بحث باب دوم میں شامل ان کی کتاب ''سعادت حسن منٹو حیات اور کارنامے'' کے ضمن میں کی گئی ہے۔

''سعادت حسن منٹو: شخصیت اور فن''، علمدار حسین بخاری:

''سعادت حسن منٹو۔ شخصیت اور فن''، علمدار حسین بخاری نے ڈاکٹر انوار احمد کے زیر نگرانی شعبہ اُردو، ملتان یونیورسٹی، ملتان (حالیہ بہاءالدین زکریا یونیورسٹی) سے ۱۹۷۹ء میں مکمل کیا، زیر نظر مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے:۔

۱۔ سعادت حسن منٹو، احوال و شخصیت

۲۔ منٹو کے ترجمے

۳۔ منٹو کی افسانہ نگاری

۴۔ منٹو کے خاکے

۵۔ منٹو کے ڈرامے

پہلا باب منٹو کے سوانحی حالات کا احاطہ کرتا ہے اس میں منٹو کے خاندان، والد کی سخت گیری، منٹو کی والدہ سے اہلِ خانہ کا سلوک، منٹو کی والدہ کس خاندان سے تھیں؟ سوتیلے بھائیوں کا رویہ، تعلیم کا ادھورا رہ جانا، علی گڑھ یونیورسٹی سے بیماری کے باعث اخراج، باری علیگ کی شاگردی، رسائل اور فلمی دنیا سے وابستگی، قیامِ پاکستان کے بعد لاہور آمد اور وفات، گویا منٹو کی پیدائش سے وفات کے درمیانی دور کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے منٹو کی جائے پیدائش ''سمرالہ''، ضلع لدھیانہ درج کی ہے۔[۱۷] ڈاکٹر علی ثنا بخاری اور دیگر محققین کے مطابق اصل لفظ ''سمبرالہ'' ہے۔[۱۸] منٹو کی تعلیمی زندگی کے متعلق مقالہ نگار کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا جس میں اُنھوں نے منٹو کو میٹرک کے امتحان میں دو بار ناکامی سے دوچار قرار دیا۔ لکھتے ہیں:

> ''والد کی خواہش تھی کہ وہ تعلیم حاصل کرے لیکن اسے تو والد کی خواہشوں کے خلاف چلنا تھا۔ اس لیے وہ میٹرک میں ایک نہیں دو بار فیل ہوا۔''[۱۹]

ڈاکٹر علی ثنا بخاری کی تحقیق کے مطابق منٹو میٹرک کے امتحان میں تین بار ناکامی کے بعد چوتھی کوشش میں کامیاب ہوئے۔[۲۰]

منٹو کی والدہ سردار بیگم کا تذکرہ کرتے ہوئے مقالہ نگار تذبذب کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ اُن پر یہ واضح نہیں کہ منٹو کی والدہ کس خاندان سے تھیں۔ منٹو خاندان کی سردار بیگم کے ساتھ بیگانہ روی اور پھر سوتیلے بھائیوں کی منٹو کے ساتھ ناروائی کی وجوہات، تلاش کے باوجود مقالہ نگار کو دستیاب نہ ہو سکیں۔ چناں چہ اس بارے وہ کوئی بھی حتمی رائے نہ دے سکے کہ خاندان نے منٹو اور اس کی والدہ کو کیوں قبول نہ کیا۔ مقالہ نگار کے مطابق:

> ''میں نے احمد ندیم قاسمی اور کئی دوسرے لوگوں سے یہ بات دریافت کرنے کی بڑی کوشش کی کہ منٹو کی والدہ اس کے اپنے خاندان سے تھی یا اس کا تعلق کسی اور گھرانے سے تھا لیکن مجھے حتمی بات کوئی بھی نہ بتا سکا۔ ورنہ شاید منٹو کے اہل خاندان کے اس رویئے کو سمجھنے میں مدد ملتی۔''[۲۱]

منٹو اور احمد ندیم قاسمی کے تعلقات کی نوعیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ احمد ندیم قاسمی منٹو کے گھریلو حالات سے واقف نہ ہوں۔ پھر منٹو کی بڑی بہن ناصرہ اقبال اور منٹو کی بیٹیاں بھی لاہور میں موجود تھیں۔ مقالہ نگار اگر اس مسئلہ کے

حل کے لیے اُن سے رجوع کرتے تو اُن کی یہ الجھن دُور ہو سکتی تھی۔ منٹو کی والدہ غیر خاندان سے تھیں اور محض یہی وجہ تھی کہ منٹو خاندان اُنھیں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔

منٹو کی بیگم صفیہ کے متعلق اُن کی رائے ہے کہ وہ منٹو کو اتنی محبت نہ دے سکیں جس کی منٹو کو ضرورت تھی۔ بہت سے لوگوں نے جن کا شمار منٹو کے انتہائی قریبی دوستوں میں ہوتا ہے، منٹو کی ازدواجی زندگی کو مثالی قرار دیا ہے۔ مقالہ نگار نے ان آرا کا تذکرہ کیے بغیر صرف محمد اسداللہ کی کتاب ''منٹو میرا دوست''میں درج آرا کو بنیاد بنایا ہے۔ اسداللہ نے، اگر ان کے استدلال کو درست بھی مان لیا جائے تو ایک مخصوص دور کے حوالے سے ان تعلقات کا جائزہ لیا ہے جسے ہم منٹو کی پوری ازدواجی زندگی پر محمول نہیں کر سکتے۔ اسداللہ کی کتاب غیر مستند اور منٹو کی کردار کشی پر مبنی ہے۔

''منٹو کے ترجمے'' زیرِ نظر مقالہ کا دوسرا باب ہے۔ روسی اور فرانسیسی نمبروں کی ترتیب اور افسانوں کے تراجم کے تذکرے کے بعد مقالہ نگار نے وکٹر ہیوگو کی "The Last Days of Condemned" اور آسکر وائلڈ کے ڈرامے ''ویرا'' کے اصل متون کے ساتھ ان تراجم کا تقابل اور مغربی افسانہ نگاروں کی فنی خصوصیات کے تناظر میں منٹو کے کیے گئے تراجم کا جائزہ لیا۔ ''سرگزشت اسیر'' اور ''ویرا'' کا تفصیلی جائزہ ہر دو متون کے اقتباسات کے تقابل سے کیا گیا ہے۔

''ویرا'' کا جائزہ لیتے ہوئے اُنھوں نے کہا کہ یہ ترجمہ منٹو اور اس کے دوست حسن عباس نے مل کر کیا تھا لیکن وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ حسن عباس کا اس میں کتنا حصہ تھا۔ مقالہ نگار کی آرا سے بخوبی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حسن عباس کی شراکت اس میں برائے نام ہی رہی ہو گی۔

> ''اتنی بات واضح ہے کہ ترجمہ پڑھ کر کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ زبان و بیان کا انداز بدل گیا ہے۔۔۔۔ حسن عباس نے کسی حد تک مدد تو ضرور کی ہو گی اور منٹو نے حق دوستی ادا کرنے کے لیے بطور مترجم اپنے نام کے ساتھ اس کا نام بھی دے دیا لیکن دراصل یہ ترجمہ منٹو ہی کا ہے۔''[۲۲]

مقالہ نگار ''ویرا'' میں موجود کمزوریوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ مترجمین نے جن مقامات پر اختصار برتنے کی کوشش کی ہے وہاں اصل ڈرامے سے وہی سلوک کیا ہے جو طالب علم کسی مضمون کا خلاصہ کرتے وقت اٹھا رکھتے ہیں۔ جہاں جہاں بھی اُنھوں نے ''ہاتھ دکھایا'' وہیں وہیں بے ربطی پیدا ہو گئی۔ اس کمزوری کی نشان دہی اور وجوہات پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس بے ربطی کی بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ تلخیص کرتے وقت مترجمین کا ''طریقہ واردات'' یہ رہا ہے کہ کچھ جملے حذف کر دیے جائیں لیکن ایک تو جملے حذف کرنا ہی ظلم ہے اور پھر وہ بھی آسکر وائلڈ جیسے مصنف کے جو نگوں کی طرح جڑے ہوتے ہیں۔ جہاں کہیں بھی کوئی جملہ چھوڑا گیا ہے قاری کا دل مترجمین کی عقل پر ماتم کرنے کو چاہتا ہے۔''[۲۳]

لیکن اس کمزوری کے باوجود مقالہ نگار اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ بہت سے مکالموں کا اصل شکوہ اور انداز برقرار رکھنے میں منٹو کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی ہے۔

''منٹو کی افسانہ نگاری'' زیر نظر مقالہ کا تیسرا باب ہے۔اس باب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں منٹو کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل کے حامل افسانوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مقالہ نگار منٹو کے تصور جنس کا جائزہ لیتے ہوئے باور کراتے ہیں کہ منٹو نے اپنی افسانہ نگاری کی ابتدا ان موضوعات سے نہیں کی جو اس کی شہرت یار سوائی کا باعث بنے۔ ''نیا قانون''، ''سوراج کے لیے''، ''۱۹۱۹ء کی ایک بات''، ''نعرہ''، ''یزید''، ''شہید ساز''، ''دیکھ کبیرا رویا''، ''بی زمانی بیگم''، ''دو گڑھے''، ''اللہ کا بڑا فضل ہے'' اور ''اوپر نیچے اور درمیان'' میں شامل افسانہ نما مضامین، معاشی، معاشرتی اور سیاسی جبر سے پیدا ہونے والی نفسیاتی اُلجھنوں کے بیان کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی اور ملکی سیاست پر منٹو کی گہری نظر کے غماز ہیں۔

ملکی سیاست سے براہ راست دلچسپی نہ ہونے کے باوجود منٹو نے تقسیم کا گہرا اثر لیا اور اس کی وجہ صرف اور صرف انسان دوستی ہے۔ تقسیم اور اس کے نتیجہ میں ہونے والے فسادات پر منٹو کے افسانوں ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، ''کھول دو''، ''شریفن''، ''عزت کے لیے'' اور ''گورمکھ سنگھ کی وصیت'' کے علاوہ ''سیاہ حاشیے'' میں شامل افسانچوں کی مدد سے منٹو کے فکر و فن کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

''سیاہ حاشیے'' کو وہ چھوٹے چھوٹے افسانچوں کا ایسا مجموعہ قرار دیتے ہیں جو الگ الگ عنوانات کے باوجود وحدت تاثر کا حامل ہے۔

مقالہ نگار نے منٹو کے جنسی رویوں کو صحت مندانہ رجحانات کا حامل قرار دیتے ہوئے اس موضوع پر چلنے والے مقدمات اور مختلف اخبارات کے ردِ عمل کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ منٹو کے افسانے ''بُو''، ''بلاؤز''، ''دھواں''، ''سودا بیچنے والی''، ''ٹھنڈا گوشت''، ''پڑھیے کلمہ''، اور ''سرکنڈوں کے پیچھے'' میں موجود نفسیاتی پیچیدگیوں کی نشاندہی کی۔

منٹو کے رومانی افسانوں ''بیگو''، ''مصری کی ڈلی''، ''موسم کی شرارت''، ''بلونت سنگھ مجیٹھا''، ''بانجھ''، ''شہ نشین پر'' اور ''میرا اور اس کا انتقام'' کو منٹو کے ناکام افسانے گردانتے ہیں۔

چوتھے باب میں منٹو کی خاکہ نگاری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ خاکہ نگاری کی روایت کا جائزہ لینے کے بعد ''گنجے فرشتے'' اور ''لاؤڈ اسپیکر'' میں شامل خاکوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ان خاکوں کی تکنیک کا منٹو کے افسانوں سے تقابل کرتے ہوئے ان عناصر کی نشان دہی کی گئی ہے جو منٹو کے خاکوں اور افسانوں میں قدر مشترک رکھتے ہیں۔

تجسس، تحیر، ڈرامائیت پسندی، مخصوص فضا پیدا کرنے کی کوشش اور افسانوی اندازِ بیان کو فن خاکہ نگاری میں منٹو کی انفرادیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ مقالہ نگار کے مطابق کسی بھی شخصیت سے مرعوب ہوئے بغیر انتہائی بے تکلفی سے اس کے باطن کا حقیقی اظہار منٹو کا اصل کمال ہے۔

پانچویں باب ''منٹو کے ڈرامے'' میں ڈراما، اُردو ڈراما اور ریڈیائی ڈراما کے آغاز و ارتقا کی بحث کے بعد منٹو کی ڈراما نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق منٹو نے ریڈیائی ڈرامے کے ابتدائی دور میں ہی فنی تقاضوں کو مد نظر رکھا۔ ''جرنلسٹ''، ''ہتک''، ''کبوتری''، ''کیا میں اندر آسکتا ہوں'' اور ''انتظار'' کا تجزیہ کرتے ہوئے مقالہ نگار اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ڈراما نگار منٹو، افسانہ نگار منٹو تلے دب کر رہ گیا ہے۔ لہٰذا اُنھوں نے منٹو کے ڈراموں پر تنقید نہ کیے جانے کا ذکر کرتے ہوئے اس کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی۔

آخری باب "اُردو ادب میں منٹو کا مقام" میں منٹو کی تحریروں کے اقتباسات کی مدد سے اس کے نظریہ فن کو واضح کیا گیا۔ مقالہ نگار نے منٹو کی حمایت اور مخالفت میں برتے جانے والے تعصب آمیز رویوں پر طنز کرتے ہوئے منٹو کی غیر جانبدارانہ تفہیم کی ضرورت پر زور دیا۔ منٹو کی مختلف فنی جہتوں کا ذکر کرتے ہوئے اُنھوں نے ان تراجم کو خامیوں کے باوجود ادبی شان کے حامل اور مصنف کی روح کے قریب تر ہونے کی کامیاب کوشش قرار دیا۔ اُن کے بقول، بطور ڈراما نویس منٹو کے ٹائپ رائٹر کی بے ترتیب ٹک ٹک نے اُردو ریڈیو ڈراما کی محدود کائنات میں وہ وہ تجربات کیے کہ اس کے دامن کی وسعتیں حال تک پھیلتی نظر آتی ہیں۔ جب کہ بطور خاکہ نگار وہ منٹو کا شمار تین چار بڑے ناموں میں کرتے ہیں۔

ایم اے کی سطح پر منٹو پر لکھا جانے والا یہ تحقیقی و تنقیدی مقالہ منٹو کی شخصیت اور فن کا ایک عمدہ جائزہ ہے جس میں منٹو کی سوانح کے ساتھ ساتھ اس کی تمام فنی جہتوں کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ مقالہ مربوط انداز میں لکھا گیا ہے جسے اسلوب کی پختگی نے روایتی مقالہ جات سے قدرے بہتر بنا دیا ہے۔ گو کہ حوالہ جات کا نظام یہاں بھی درست نہیں۔ خصوصاً کتابیات کے ذیل میں شامل بیشتر رسائل، کتب اور مقالہ جات کے سنین اور پبلشرز کے نام درج نہیں کیے گئے لیکن منٹو کی شخصیت اور فن کا ایسا باربط جائزہ ایم اے کی سطح پر پہلی بار دیکھنے میں آیا ہے۔

"سعادت حسن منٹو کے افسانوں کے چند اہم کردار"، زاہد رحیم:

ایم اے کی سطح پر لکھا جانے والا یہ تحقیقی مقالہ زاہد رحیم زاہد نے ڈاکٹر سہیل احمد خان کی نگرانی میں ۱۹۷۹ء میں مکمل کیا۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ایم اے کی سطح پر سعادت حسن منٹو پر لکھا جانے والا یہ چوتھا تحقیقی مقالہ ہے۔ ۲۴۰ صفحات پر مشتمل اس مقالے کو مندرجہ ذیل تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے:

پہلا باب: کردار کی اہمیت

دوسرا باب، منٹو کا فن

تیسرا باب: منٹو کے افسانوی کرداروں کا جائزہ

ضمیمہ: منٹو کے بارے میں چند نئے تنقیدی زاویے

اُردو افسانے کی تاریخ میں منٹو وہ واحد افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اُردو افسانے کو کئی ایک زندہ اور متحرک کردار فراہم کیے۔ اُنھیں کردار نگاری میں ملکہ حاصل تھا اور وہ چند ہی فقروں میں اپنے کردار کا ایسا تعارف کرا دیتے ہیں کہ یہ کردار ابدیت کے درجے پر فائز ہو جاتے ہیں۔ منگو، سوگندھی، ممی، موذیل، سکینہ، سلطانہ، شاردا، ممد بھائی، بابو گوپی ناتھ اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کا بشن ایسے کردار ہیں جن کا نام سنتے ہی ان کی پوری شخصیت اپنے تمام تر ماحول کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

شاعری، ناول، ڈراما، افسانہ یا ادب کی کوئی بھی صنف ہو، سب میں کسی نہ کسی سطح پر کردار نگاری ایک لازمی عنصر کے طور پر پائی جاتی ہے۔ مقالہ نگار نے منٹو کے افسانوی کرداروں کا جائزہ لینے کے لیے دیگر اصناف میں کرداروں کی اہمیت اور ضرورت کو واضح کرتے ہوئے مختلف مباحث کی وضاحت پہلے باب میں کی ہے۔

دوسرے باب ''منٹو کا فن'' میں اُردو افسانے کی روایت کا سرسری جائزہ پیش کرتے ہوئے اہم افسانہ نگاروں کے موضوعات اور اُردو افسانے میں ان کے مقام کا تعین کیا گیا ہے۔

منٹو کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے اُنھوں نے ان کے افسانوں کے آغاز، وسط اور انجام کو زیرِ بحث لاتے ہوئے منٹو کی اس خوبی کو سراہا۔ منٹو کے افسانوں کی دیگر خوبیوں مثلاً جزئیات نگاری، طنز نگاری، تشبیہات و استعارات کا استعمال، کردار، جنس، طوائف اور فسادات سے متعلق ان کے افسانوں کے موضوعات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

مقالہ نگار نے اس بات پر زور دیا کہ منٹو کے کرداروں کو اُردو افسانے کی روایت کے پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کے مقام و مرتبے کا بخوبی تعین کیا جا سکے۔ مزید یہ کہ ان کرداروں کے تجزیے سے منٹو کے تصورِ انسان کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ دیگر نقادوں کی طرح مقالہ نگار بھی اس بات پر متفق ہیں کہ منٹو کے کردار زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ منٹو نے زندگی کے چند پہلوؤں ہی کو اپنے کرداروں کے حوالے سے پیش کیا۔ یعنی طوائفوں، تماش بینوں، ایکٹریسوں، ایکسٹرا لڑکیوں اور دلالوں وغیرہ کے کردار۔ مقالہ نگار کے مطابق یہ رویہ منٹو کے افسانوں کو سرسری نظر سے دیکھنے کا نتیجہ ہے۔ منٹو کی کردار نگاری پر مختلف نقادوں کی آرا، سعادت حسن منٹو اور مرزا ہادی رسوا کی طوائف امراؤ جان ادا کا تقابلی جائزہ کرنے کے بعد ''ہتک'' کی سوگندھی کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''سوگندھی کا کردار طوائف کے گھناؤنے ماحول، اس کی مجبوریاں، اس کے حالات، سماج اور اس کی حیثیت، اس کی ڈھلتی عمر، وقت کے ساتھ ساتھ جسم کے ٹوٹنے کا احساس، کچھ اس قدر زندگی سے بھرپور نقشہ ہے کہ جس میں قدم قدم پر حقیقتوں کے پیکر اُبھرتے ہیں۔''[۲۴]

''کالی شلوار'' کی سلطانہ کی مدد سے منٹو نے طوائف کی زندگی کی زبوں حالی کو پیش کیا ہے جس سے زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے بقول: ''کالی شلوار کا بنیادی مسئلہ جنس نہیں بلکہ اقتصاد ہے۔''[۲۵]

''نیا قانون'' کا منگو کوچوان منٹو کے چند بڑے کرداروں میں سے ایک ہے۔ مقالہ نگار نے اس کردار کا جائزہ سطحی طور پر لیا ہے اور منگو کوچوان کی بجائے افسانے کا تجزیہ کر دیا ہے۔ سطحی تنقید کی ایک مثال دیکھیے:

> ''نیا قانون میں منٹو نے سیاست کو بے نقاب کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے اس لیے فنی لحاظ سے بھی نیا قانون منٹو کا بہت اہم افسانہ ہے۔''[۲۶]

''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کو اپنے وطن سے لگاؤ اور پنجاب کی مٹی سے محبت کی علامت قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ایک طرف تو منٹو نے ایک پاگل شخص کے کردار، اس کے لاشعوری ہیجانات اور اس کے طرزِ عمل کی عکاسی کی ہے اور دوسری طرف اسے اپنے عہد کے سیاسی رویوں کے حوالے سے ایک مکمل طنز بنا دیا ہے۔''[۲۷]

''خوشیا'' میں منٹو کی کردار نگاری کو سراہتے ہوئے مقالہ نگار نے کہا ہے کہ منٹو نے خوشیا کی نفسیاتی کشمکش کا بہت خوبصورت نقشہ کھینچا ہے۔ خوشیا اور سوگندھی کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سوگندھی کی نسوانیت مجروح ہوتی ہے جب کہ خوشیا کی مردانگی کو ٹھیس پہنچتی ہے اور دونوں اپنے اپنے انداز میں اس ہتک کے بعد نفسیاتی کشمکش سے گزرتے ہیں۔

ایشر سنگھ کو منٹو کا فطری انسان قرار دینے کے بعد کہتے ہیں کہ اس افسانے میں انسانیت اور حیوانیت کا تضاد ہے۔ انسان حیوان کیسے بنتا ہے؟ کیا حیوان بن کر انسانیت ختم ہو جاتی ہے؟ یہ منٹو کے بنیادی سوال ہیں۔ اُن کے بقول:

''منٹو نے ایشر سنگھ کے کردار کی مدد سے بار بار اس کا یقین دلایا ہے کہ انسان حیوان بن کر بھی اپنی انسانیت کھو نہیں سکتا۔''[۲۸]

ضمیمہ میں منٹو سے متعلق مواد کی کمیابی کا شکوہ کیا گیا ہے، ساتھ ہی منٹو سے متعلق لکھی گئی مختلف نقادوں کی تحریروں کی نشان دہی بھی کی گئی ہے جو منٹو شناسی کی روایت میں مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ مقالہ نگار نے مواد کی کمی کی جو شکایت کی ہے وہ بے جا معلوم ہوتی ہے کیوں کہ منٹو سے متعلق مواد بیشتر لائبریریوں میں مقالہ کی تسوید کے وقت موجود تھا۔[۲۹] منٹو پر اس کی وفات کے بعد بہت زیادہ لکھا گیا اور مقالہ نگار کا یہ کہنا کہ یہ تحریریں کم یاب ہیں قرین از قیاس نہیں۔ کتابیات میں مقالہ نگار نے بہت سی کتابوں کے پبلشرز کے نام اور سن اشاعت درج نہیں کیے۔

''سعادت حسن منٹو (سوانح اور ادبی کارنامے)''، علی ثناء بخاری:

پاکستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن پر پی۔ ایچ ڈی کی سطح پر لکھا جانے والا یہ پہلا تحقیقی مقالہ ہے جسے علی ثنا بخاری نے ۱۹۸۴ء میں ڈاکٹر وحید قریشی کے زیر نگرانی مکمل کر کے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ مقالہ کو چھے ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن کی ترتیب اس طرح ہے:

باب اول: حالاتِ زندگی

باب دوم: افسانہ

باب سوم: ریڈیو ڈراما

باب چہارم: مضمون نگاری

باب پنجم: خاکہ نگاری

باب ششم: مجموعی جائزہ

پہلا باب منٹو کے سوانحی حالات سے متعلق ہے جو سعادت حسن منٹو کے آباء واجداد سے شروع ہو کر منٹو کی تمام زندگی کے حالات کا احاطہ کرتا ہے۔ منٹو کی سوانح سے متعلق تحقیقی اعتبار سے یہ مقالہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ تمام معلومات معتبر ذرائع سے حاصل کی گئی ہیں جنھیں بیان کرتے وقت مقالہ نگار نے ماخذات کی مکمل نشان دہی کی ہے۔ نیز بہت سی غلط فہمیوں کو جو منٹو سے منسوب ہیں تاریخی حقائق کی مدد سے رد کیا گیا ہے۔

لفظ 'منٹو' کی ماہیت پر بحث کرتے ہوئے اُنھوں نے اس بات پر زور دیا کہ اسے ''منٹُو'' بروزن ''ون ٹو'' (ONE,TWO) پڑھا جائے۔ لکھتے ہیں:

''اپنی منجھلی بیٹی نزہت کی رہنمائی کے لیے منٹو نے منٹو کے تلفظ کی وضاحت کرتے ہوئے اسے 'ون ٹو (one two)' کے وزن پر ادا کرنے کو کہا تھا اور وہ اپنا نام اسی تلفظ میں بیان کرتے تھے۔''[۳۰]

واضح رہے کہ مقالہ نگار نے اس اطلاع کا ماخذ منٹو کی بڑی بہن ناصرہ اقبال اور ان کے دوست نصیر انور کے انٹرویو کو قرار دیا ہے جن کا ریکارڈ مقالہ نگار کے پاس موجود ہے۔

منٹو کے والد کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ محکمہ انصاف میں سب جج کی حیثیت سے فرائض سر انجام دیتے رہے۔ ڈاکٹر لیزلی فلیمنگ نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ ص ۷ پر ان کا منصب سیشن جج لکھا ہے لیکن محمد دین فوق (تاریخ اقوام کشمیر ص ۸۶) اور ناصرہ اقبال (ذاتی انٹرویو ۹۷۔۷۔۲۱) انھیں سب جج قرار دیتے ہیں۔

منٹو کی تعلیمی زندگی کے حوالے سے مقالہ نگار نے جو ریکارڈ فراہم کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ خصوصاً میٹرک کے امتحان میں ان کی چار بار شرکت کو دستاویزات کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک طویل اقتباس ملاحظہ کریں:

> "۱۹۲۸ء میں پنجاب یونیورسٹی کے میٹرک کے امتحان میں منٹو پہلی مرتبہ سائنس، فزکس، ہائی جین اور فزیالوجی کے اختیاری مضامین کے ساتھ شامل ہوئے۔ اس بات کی تصدیق کے لیے دیکھئے پنجاب یونیورسٹی کے ۱۹۲۸ء میں میٹرک میں شامل طلبہ کے کوائف کی فہرست، جس میں سعادت حسن منٹو کے مکمل کوائف صفحہ ۳۴۹ پر رول نمبر ۸۳۴۳ کے تحت درج ہیں۔ ۱۹۲۸ء میں فیل ہونے کے بعد ایم۔اے۔او ہائی اسکول امرتسر میں داخل ہوئے اور وہاں سے ۱۹۲۹ء میں دوسری مرتبہ رول نمبر ۷۹۵۹ کے تحت فزکس، ہائی جین اور فزیالوجی کے اختیاری مضامین کے ساتھ شامل ہوئے اور فیل ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں اسی سکول سے ہی تیسری بار رول نمبر ۸۳۹۷ کے تحت سابقہ سائنس مضامین کے ساتھ شامل ہوئے، تیسری بار بھی ناکام رہے۔ ۱۰ مارچ ۱۹۳۱ کو آخری دفعہ منٹو رول نمبر ۲۶۲۵ کے تحت مسلم ہائی اسکول امرتسر کے طالب علم کی حیثیت سے اُردو اور فارسی کے اختیاری مضامین کے ساتھ شریک ہوئے۔ منٹو نے یہ امتحان چوتھی کوشش میں ۲۳ مئی ۱۹۳۱ء کو شائع شدہ نتیجہ کے مطابق ۲۹۳ نمبر لے کر درجہ سوم میں پاس کیا۔ اس دفعہ وہ اُردو میں فیل تھے۔" [۳۱]

منٹو کی ادبی زندگی کے آغاز سے متعلق علی ثنا بخاری بھی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ باری علیگ نے منٹو کو تحریر و تصنیف کی طرف راغب کیا لیکن وہ یہ بات تسلیم نہیں کرتے جو لیز لی فلیمنگ نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں لکھی ہے۔ لیز لی فلیمنگ نے اپنے مقالہ میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ "منٹو، باری علیگ کے ذریعہ وکٹر ہیوگو سے متعارف ہوئے تھے۔" [۳۲] ڈاکٹر علی ثنا بخاری کے مطابق:

> "حقیقت یہ ہے کہ منٹو باری علیگ سے ملاقات سے قبل ہی وکٹر ہیوگو سے متعارف تھے اور اس کی مشہور تصنیف "The Last Days of the Condemned" دار الاحمر میں ان کی الماری میں موجود تھی۔" [۳۳]

وکٹر ہیوگو کی اس کتاب کو مقالہ نگار منٹو کا پہلا ترجمہ اور پہلی کتاب قرار دیتے ہیں۔

منٹو کی آل انڈیا ریڈیو دہلی سے وابستگی کی تفصیلات بتاتے ہوئے اس غلط فہمی کو داخلی شواہد سے رد کرتے ہیں جو لیز لی فلیمنگ کی تحریر سے پیدا ہوئی۔ لیز لی فلیمنگ لکھتی ہیں:

> "He finally applied through Qasmi to Krishan Chandar for a job with all India Radio in Delhi." [۳۴]

ڈاکٹر علی ثنا بخاری کا استدلال ہے کہ قاسمی اور کرشن چندر نے منٹو کو آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازمت دلوانے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ بلکہ منٹو نے یہ ملازمت اپنی ذاتی کوشش سے حاصل کی۔ اس سلسلہ میں وہ اس خط کا ذکر کرتے ہیں جو منٹو نے احمد ندیم قاسمی کو لکھا تھا اور جس میں اُنھوں نے از خود احمد ندیم قاسمی کو اطلاع دیتے ہوئے رقم کیا تھا:

''میں نے ریڈیو میں ملازمت کے لیے صرف اتنی کوشش کی ہے کہ ایک پوسٹ کے لیے عرضی بھیج رکھی ہے۔''[۳۵]

جہاں تک کرشن چندر کا تعلق ہے تو وہ آخر وقت تک اس بات سے بے خبر تھے کہ منٹو کی دہلی میں آمد کی غایت کیا ہے۔ کرشن چندر نے ''نئے ادب کے معمار'' کے سلسلے میں منٹو پر جو مضمون لکھا ہے اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ ڈاکٹر علی ثنا بخاری اپنے مقالے کے صفحہ ۱۰۰ پر یہ اقتباس پیش کرتے ہیں:

''میں نے منٹو کو جگایا، اُٹھو، وہ اُٹھتے ہی کہنے لگا اگر اس وقت بھی تھوڑی سی مل جائے تو شراب کا ذائقہ زبان سے دُور ہو جائے۔ تم جانتے ہو شراب کا ذائقہ دور کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ صبح اُٹھتے ہی آدمی پھر دو گھونٹ شراب کے پی لے۔ مجھے، شراب منگاؤ، پھر مجھے آل انڈیا ریڈیو جانا ہے۔ وہ کیوں، میں نے پوچھا۔ میں یہاں ڈراما لکھنے کے لیے بلایا گیا ہوں۔''[۳۶]

اسی ضمن میں لکھتے ہیں:

''اس بات کو مزید تقویت اس حقیقت سے بھی ملتی ہے کہ جب منٹو نے کرشن چندر کو دہلی میں آمد کی اطلاع دی تو خود کرشن چندر کو آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت اختیار کیے ایک ماہ بھی نہیں گزرا تھا۔ جب کہ منٹو کو بھی تقرری کا خط ۱۰ دسمبر ۱۹۴۰ء سے قبل مل چکا تھا۔ لٰہذا یہ امر یقینی ہے کہ دونوں کو تقرری کے خطوط بیک وقت ملے تھے۔''[۳۷]

مقالہ نگار حامد جلال کے اس بیان کی تردید کرتے ہیں:

''ایمبولینس جیسے ہی دروازے پر آکر کھڑی ہوئی اُنھوں نے شراب کا پھر مطالبہ کیا۔ ایک چمچہ وہسکی اُن کے منہ میں ڈال دی گئی، لیکن شاید ایک قطرہ مشکل سے اُن کے حلق سے نیچے اُتر سکا ہو گا باقی شراب اُن کے منہ سے گر گئی اور اُن پر غشی طاری ہو گئی۔''[۳۸]

علی ثنا بخاری کے بقول، جس وقت منٹو کا انتقال ہوا حامد جلال اُس وقت بہاولپور میں کرکٹ میچ کی کمنٹری میں مصروف تھا۔ اس ضمن میں جب اُنھوں نے ناصرہ اقبال سے پوچھا تو اُنھوں نے بھی حامد جلال کے بیان کو مسترد کر دیا۔ لکھتے ہیں:

''موت کے وقت منٹو کے شراب مانگنے کے واقعہ کی مذمت کرتے ہوئے ناصرہ اقبال، حامد جلال سے سخت ناراض ہوئی تھیں کہ ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔''[۳۹]

اسی باب میں مقالہ نگار نے انیس ناگی کے اس بیان کی بھی تردید کی ہے کہ سعادت حسن منٹو ۱۸/ جنوری کو دو بجے کے قریب گورنمنٹ کالج لاہور میں آئے تھے۔ لٰہذا انیس ناگی کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ سعادت حسن منٹو کے ساتھ آخری لمحات میں

ملے۔[۴۰]انیس ناگی کے استدلال کو غلط ثابت کرتے ہوئے مقالہ نگار کے مندرجہ ذیل تین اقتباس ملاحظہ ہوں جن سے منٹو کی موت کے وقت کا تعین بآسانی ہو جاتا ہے:

''منگل ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء کو صبح ساڑھے دس بجے سعادت حسن، صفیہ، نگہت، نزہت، نصرت اور منٹو کو تنہا چھوڑ گئے۔''[۴۱]

''ریڈیو اعلان کے مطابق ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء کو چار بجے سہ پہر سعادت حسن کا جنازہ اُٹھایا جانا تھا لیکن ان کی مخصوص بیماری سے واقع ہونے والی موت کے پیش نظر مقررہ وقت سے بیش تر ساڑھے تین بجے جنازہ ۳۱۔ لکشمی مینشن سے اُٹھایا گیا۔''[۴۲]

''منٹو سے ملاقات کا شرف حاصل ہونے کے ذکر میں انیس ناگی یہ بھول گئے کہ ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء کے جن لمحات میں وہ منٹو سے ملاقات کا تذکرہ کر رہے ہیں ان لمحات سے قبل سعادت حسن فوت ہو چکے تھے۔''[۴۳]

منٹو کی سوانح سے متعلق یہ باب ۱۶۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ صفحات اور حوالوں کی تعداد سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مقالہ نگار نے منٹو کی زندگی کے متعلق نہ صرف ڈھیروں معلومات دی ہیں بلکہ ان کی دی گئی معلومات تاریخی اعتبار سے بھی درست ہیں۔ مقالہ نگار نے منٹو کے متعلق پائی جانے والی بہت سی غلط فہمیوں کو دُور کیا ہے۔ بلاشبہ منٹو کی سوانح سے متعلق یہ باب بہت اہمیت کا حامل ہے۔

دوسرا باب ''منٹو کی افسانہ نگاری'' کو موضوعات کے لحاظ سے دو اور فن کے لحاظ سے تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے دور میں ''آتش پارے'' کو رکھا گیا ہے جسے وہ منٹو کا پہلا افسانوی مجموعہ قرار دیتے ہوئے محمد طفیل کے اس قول کو رد کرتے ہیں جس میں اُنھوں نے ''منٹو کے افسانے'' کو منٹو کا پہلا افسانوی مجموعہ قرار دیا تھا۔ افسانہ نگاری کے دوسرے دور میں منٹو کے پانچ افسانوی مجموعوں کو شامل کیا گیا ہے۔ ان میں ''، منٹو کے افسانے''، ''دھواں''، ''افسانے اور ڈرامے''، ''لذت سنگ'' اور ''چغد'' شامل ہیں۔ اس حصہ میں ان پانچ افسانوی مجموعوں کے پبلشرز، سن اشاعت شامل افسانوں کی تعداد اور ان کے نام درج کیے گئے ہیں۔ یہ مجموعے قیامِ پاکستان سے قبل اشاعت پذیر ہوئے۔

پاکستان میں ''سیاہ حاشیے'' کو منٹو کا سب سے پہلا افسانوی مجموعہ قرار دیتے ہیں۔ اس طرح پاکستان میں منٹو کی زندگی میں چھپنے والے دیگر افسانوی مجموعوں کا بھی مکمل تعارف کرایا گیا ہے۔ ان مجموعوں میں ''خالی بوتلیں خالی ڈبے''، ''ٹھنڈا گوشت''، ''نمرود کی خدائی''، ''بادشاہت کا خاتمہ''، ''سڑک کے کنارے''، ''سر کنڈوں کے پیچھے'' اور ''پھندنے'' شامل ہیں۔ منٹو کی موت کے بعد شائع ہونے والے افسانوی مجموعوں کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔

مقالہ نگار ''کبوتر اور کبوتری'' کو منٹو کا آخری مکمل افسانہ قرار دیتے ہیں لیکن اسے منٹو کی آخری تحریر نہیں سمجھتے۔ اُن کے مطابق منٹو کا آخری افسانہ وہ نامکمل تحریر ہے جسے پورا کرنے کی خواہش اُن کے دل میں رہی اور جسے اُنھوں نے ''ٹھرکی'' کا نام دیا تھا۔[۴۴]

منٹو کے افسانوی مجموعوں کی تفصیلات کے بعد فسادات خصوصاً ''سیاہ حاشیے'' میں شامل افسانوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ جہاں تک منٹو کے فن کا تعلق ہے مقالہ نگار نے اس کا سرسری جائزہ لیا ہے۔ اس حوالے سے خاصی تشنگی محسوس ہوتی ہے اور ہم اسے مقالے کا واحد کمزور پہلو قرار دے سکتے ہیں البتہ پچھلے باب کی طرح یہ باب بھی تحقیق کے تمام تقاضے پورا کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس میں تمام

افسانوی مجموعوں کے پبلشرز، سن اشاعت، افسانوں اور صفحات کی تعداد درج کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ کتابوں کا سائز بھی بتایا گیا ہے۔ جس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ مقالہ نگار کے پاس تمام مجموعوں کے اولین نسخے موجود تھے اور اُنھوں نے ان کو سامنے رکھ کر تمام کوائف درج کیے ہیں۔

تیسرے باب میں سعادت حسن منٹو کے ریڈیائی ڈراموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ شروع میں ریڈیو ڈرامے کے آغاز وارتقا کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کے بقول ۱۹۲۲ء میں بی بی سی لندن سے پہلا ریڈیائی ڈراما نشر کیا گیا۔ ہندوستان سے اس کا آغاز ۱۹۳۴ء میں ہوا۔ ہندوستان میں ریڈیو کے قیام سے قبل منٹو غیر ملکی ڈراموں کا اردو میں ترجمہ کر چکے تھے [۴۵] منٹو نے ریڈیائی ڈرامے لکھنے کا آغاز آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت اختیار کرنے سے پہلے ہی کر دیا تھا۔ علی ثنا بخاری لکھتے ہیں:

> ''یکم جنوری ۱۹۴۱ء کو جب وہ (منٹو) آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازمت اختیار کرنے کے لیے پہنچے تو راستے میں اپنے آبائی گھر امرتسر میں اُنھوں نے اپنے ریڈیائی ڈراموں کی پہلی طبع زاد کتاب ''آؤ'' کا دیباچہ لکھا۔'' [۴۶]

منٹو کی ڈراموں سے دلچسپی کے ذکر کے بعد مقالہ نگار نے منٹو کے ڈراموں کے مجموعوں کا تعارف کراتے ہوئے تمام مجموعوں میں شامل ڈراموں کی فہرست، ان مجموعوں کے پبلشرز اور سن اشاعت درج کیے ہیں۔ ساتھ ساتھ وہ ان پر تبصرہ بھی کرتے گئے ہیں۔ مقالہ نگار نے منٹو کو ہندوستان میں ریڈیائی ڈرامے کی روایت کا بانی قرار دیا۔ لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان میں منٹو سے پہلے ریڈیائی ڈرامے کی کوئی تاریخ نہیں بلکہ اُنھوں نے (منٹو نے) اس روایت کا آغاز کیا تھا۔'' [۴۷]

چوتھے باب میں منٹو کی مضمون نگاری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ منٹو کی مضمون نگاری کا نقطہ آغاز ۱۹۳۴ء کو قرار دیتے ہوئے مقالہ نگار لیزلی فلیمنگ کے اس دعوے کو غلط قرار دیتے ہیں کہ منٹو نے مضمون نویسی کا آغاز بمبئی میں کیا تھا اور ان کے اولین مضامین جن میں ''مجھے شکایت ہے''، ''ہندوستانی فلم صنعت سازی''، ''شریف عورتیں''، ''فلمی دنیا'' اور ''ایک اشک آلود اپیل'' شامل ہیں، ۱۹۳۶ء اور ۱۹۴۱ء کے درمیان لکھے گئے۔ [۴۸]

علی ثنا بخاری کی تحقیق کے مطابق منٹو کا پہلا مضمون ''میکسم گورکی۔ ملت احمریہ کا مایہ ناز مفکر'' رسالہ ہمایوں کے دسمبر ۱۹۳۴ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ یہی مضمون بعد میں ترمیم واضافے کے ساتھ منٹو نے اپنے مضامین کے پہلے مجموعے ''منٹو کے مضامین'' میں ''میکسم گورکی'' کے عنوان سے شائع کیا۔ منٹو کے مضامین مجموعی طور پر تین مجموعوں کی صورت میں سامنے آتے ہیں:

۱۔ منٹو کے مضامین ۲۔ تلخ ترش اور شیریں ۳۔ اوپر نیچے اور درمیان

مقالہ نگار نے ان تینوں مجموعوں کا زمانی ترتیب سے جائزہ لیتے ہوئے ان کے پبلشرز، سن اشاعت اور شامل مضامین کی فہرست درج کی ہے۔ ''منٹو کے مضامین'' ۱۹۴۲ء میں پہلی مرتبہ اُردو اکیڈمی لاہور سے شائع ہوئی جب کہ دیگر دو مجموعے ۱۹۵۴ء میں بالترتیب ادارۂ فروغ اُردو اور گوشۂ ادب لاہور نے شائع کیے۔ جہاں تک ''اوپر نیچے اور درمیان'' کا تعلق ہے ''اس کتاب میں کوئی افسانہ شامل نہیں۔ منٹو نے اس مجموعے کا نام اپنے ایک افسانے کے نام پر رکھا ہے۔ شاید نام ہی کی غلط فہمی کی بنا پر ممتاز منگلوری [۴۹] نے اس کتاب کو منٹو کے افسانوی مجموعوں میں شامل کیا ہے۔

مقالہ نگار نے منٹو کے مضامین کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور دسمبر ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۷ء تک جاری رہا۔ تنقیدی اور ادبی موضوعات کے علاوہ منٹو نے مضمون نگاری کے اوّلین دور میں اپنے گردوپیش کے حالات اور پیشہ ورانہ مسائل پر قلم اُٹھایا۔ منٹو کی مضمون نگاری کا دوسرا دور قیام پاکستان سے منٹو کی وفات تک کے درمیانی عرصہ پر محیط ہے۔

پانچویں باب میں منٹو کی خاکہ نگاری کا محاکمہ کیا گیا ہے۔ باب کے آغاز میں خاکہ کی تعریف، آغاز اور ارتقاء پر بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر علی ثنا بخاری اس دعویٰ سے اتفاق نہیں کرتے کہ ''دریائے لطافت'' اردو خاکوں کا بنیادی عکس ہے۔ ان کے خیال میں ''دریائے لطافت'' فارسی زبان میں لکھی گئی ہے۔ وہ اس امر پر بھی افسوس کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صابرہ سعید نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ ''اردو ادب میں خاکہ نگاری'' ص ۱۴۷۔۱۴۸ میں نثار احمد فاروقی کے اس بیان کا حوالہ دیے بغیر اس مفروضے کو اپنے مقالہ کی بنیاد بنایا ہے۔ مقالہ نگار ''عصمت چغتائی'' کو منٹو کا پہلا خاکہ قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صابرہ سعید نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ ''اردو ادب میں خاکہ نگاری'' ص ۴۲۱ پر پری چہرہ نسیم بانو کو منٹو کا پہلا خاکہ قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر علی ثنا بخاری کے مطابق:

''پری چہرہ نسیم بانو تب لکھا گیا تھا جب منٹو ٹھنڈا گوشت کے مقدمہ سے سیشن عدالت سے بری ہو چکے تھے۔'' [۵۰]

سیشن کورٹ سے منٹو کی بریت کا حکم ۱۰/جولائی ۱۹۵۰ کو صادر ہوا تھا۔ اس لحاظ سے ''پری چہرہ نسیم بانو'' ۱۰/جولائی ۱۹۵۰ کے بعد لکھا گیا جو روزنامہ آفاق لاہور میں شائع ہوا۔ جب کہ عصمت چغتائی ''نئے ادب کے معمار'' کے سلسلے میں ۱۹۴۸ء میں کتب پبلشرز بمبئی کے زیر اہتمام شائع ہو چکا تھا۔ البتہ پاکستان آنے کے بعد منٹو نے پہلا خاکہ ''پری چہرہ نسیم بانو'' ہی لکھا تھا۔ [۵۱]

علی ثنا بخاری نے ممتاز منگلوری کی ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہندوستان'' ص ۴۴۸ پر موجود اس غلطی کی نشان دہی بھی کی جس کے مطابق ''گنجے فرشتے'' کو منٹو کے افسانوں کے مجموعوں میں شامل کیا گیا ہے حال آں کہ اس کتاب میں ایک بھی افسانہ شامل نہیں۔ [۵۲]

منٹو کے دوسرے مجموعہ ''لاؤڈ اسپیکر'' کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کا اصل نام ''گنجے فرشتے (حصہ دوم)'' تھا۔ معاہدے کے مطابق یہ کتاب مکتبہ جدید، لاہور نے شائع کرنا تھی لیکن منٹو کی وفات کے بعد گوشہ ادب، لاہور نے اسے ''لاؤڈ اسپیکر'' کے نام سے شائع کر دیا۔ ''تپش کاشمیری'' کو منٹو کا آخری خاکہ قرار دیتے ہیں۔ یہ خاکہ ۱۱/ جنوری ۱۹۵۵ء کو لکھا گیا جو منٹو کی وفات کے بعد ''بغیر اجازت'' میں شائع ہوا۔ [۵۳] اس طرح منٹو نے کل ۲۳ خاکے لکھے۔

منٹو نے جن جن شخصیات کے بھی خاکے لکھے وہ ان سے ذاتی طور پر واقف تھے، ان کی خوبیاں اور خامیاں منٹو سے پوشیدہ نہ تھیں۔ سوائے قائدِ اعظم محمد علی جناح کے دیگر ۲۲ شخصیات کے ساتھ منٹو کا اُٹھنا بیٹھنا رہا تھا۔ بیشتر خاکوں میں تو منٹو خود بھی صاحب خاکہ کے ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ خاکہ لکھتے وقت ان شخصیات سے لاتعلق نظر آتے ہیں اور غیر جانبداری سے اُن کا عکس کھینچتے ہیں۔ منٹو نے نہ تو جذبات اور تعلق سے مجبور ہو کر خاکے کو قصیدہ بننے دیا اور نہ ہی احساس کا دامن یکسر چھوڑ کر کیری کیچر تخلیق کیے۔ اس باب میں منٹو کی خاکہ نگاری کے تحقیقی حصے کے ساتھ ساتھ تنقیدی حصہ بھی مکمل اور بصیرت افروز ہے۔

چھٹے باب میں منٹو کی شخصیت اور ادبی کارناموں کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ بہت ہی مختصر باب ہے۔ اپنی تخلیقات کی روشنی میں منٹو کا ادب میں کیا مقام بنتا ہے؟ یہ ایک تفصیل طلب بحث تھی لیکن اُنھوں نے ان مباحث کو نہیں چھیڑا۔

ضمیمہ جات میں منٹو کے خاندان کا شجرہ، میٹرک کی سند کی نقل، پنجاب یونیورسٹی گزٹ کی کاپیاں، کرشن چندر کی طرف سے منٹو کو دی گئی تعریفی سند کی نقول جو اُنھوں نے بطور پروگرام اسسٹنٹ آل انڈیا ریڈیو دہلی اُنھیں دی تھی، رشید احمد چودھری اور محمد طفیل کے لکھے گئے خطوط کی عکسی کاپی، مکتبہ منٹو کا مونو گرام، پبلشرز سے معاہدے کی عکسی کاپیاں اور منٹو کے لکھے ہوئے کتبے کی عکسی نقل، سول اور ملٹری گزٹ میں منٹو کی وفات کی خبر کی نقل، روزنامہ ''احسان'' لاہور میں شائع ہونے والی وفات کی خبر کا عکس، ''کوئی چارہ ساز ہوتا'' مضمون کی عکسی کاپی، پبلشرز کے خطوط، تپش کاشمیری کے خاکے کی منٹو کی املا میں نقل شامل ہیں۔ جب کہ آخر میں کتابیات، انٹرویوز اور ایسے اخبارات کی فہرست دی گئی ہے جن سے مقالہ نگار نے استفادہ کیا۔

سعادت حسن منٹو پر لکھا جانے والا تحقیقی نوعیت کا یہ پہلا مقالہ ہے جس میں تحقیق اور تنقید کا معیار عمدہ ہے۔ شخصیت کا حصہ بھرپور ہے البتہ افسانے کے باب میں تنقیدی حصہ کمزور ہے۔ مقالہ نگار نے منٹو کے افسانوی مجموعوں کے سن اشاعت، پبلشرز اور افسانوں کی فہرست پیش کرنے میں زیادہ محنت صرف کی ہے لیکن ڈراما، خاکہ اور مضمون نگاری کے باب میں وہ اعلیٰ پائے کی تحقیق کے ساتھ ساتھ اچھے نقاد کے طور پر بھی سامنے آئے ہیں۔ ان ابواب میں نہ صرف منٹو کا بطور مضمون نگار، خاکہ نگار اور ڈراما نگار جائزہ لیا گیا ہے بلکہ ان اصناف کی روایت سے بھی آگاہی دی گئی ہے۔ مقالہ نگار نے کوئی بھی مفروضہ قائم یا رد کرتے ہوئے مکمل دلائل اور شواہد پیش کیے ہیں۔ مقالہ ۳۹۴صفحات پر مشتمل ہے۔

''منٹو اور غلام عباس کے فنی وسائل کا تقابل''، نبیلہ عصمت:

''منٹو اور غلام عباس کے فنی وسائل کا تقابل'' بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، کے شعبہ اردو میں منٹو پر ایم اے کی سطح پر لکھا جانے والا یہ دوسرا تحقیقی مقالہ نبیلہ عصمت نے سید علمدار حسین بخاری کی نگرانی میں ۱۹۹۰ء میں مکمل کیا۔ مقالہ مندرجہ ذیل چار ابواب میں منقسم ہے:

۱۔ افسانے کا فن اور اردو افسانہ

۲۔ سعادت حسن منٹو کا افسانہ اور اس کے فنی وسائل

۳۔ غلام عباس کا افسانہ اور اس کے فنی وسائل

۴۔ منٹو اور غلام عباس کے فنی وسائل کا موازنہ

پہلا باب، افسانے کا فن اور اردو افسانہ، کے ارتقائی جائزہ میں مقالہ نگار نے پریم چند سے لے کر منٹو کے عہد تک اردو افسانے میں ہونے والی موضوعاتی تبدیلیوں کا عہد بہ عہد جائزہ لیا ہے۔

دوسرے باب ''سعادت حسن منٹو کا افسانہ اور اس کے فنی وسائل'' میں منٹو کا فنی و فکری جائزہ لیا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے انسان کو منٹو کا بنیادی موضوع قرار دیا۔ موضوعاتی اعتبار سے منٹو کے افسانوں کو چار بڑے موضوعات، انسانیت، سیاسی شعور، فسادات، جنس اور اس کے متعلقات میں تقسیم کرتے ہوئے اس کے فکری رجحانات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ مباحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ منٹو نے لیڈروں، سرمایہ داروں، طالب علموں، مہاجنوں، بیروزگاروں، مظلوم، جاہل، بے بس عوام کے دلوں میں بدیشی حکمرانوں کے خلاف نفرت کے ابلتے لاوے کو بڑی خوبصورتی سے مصور کیا ہے۔

فسادات، طوائف اور جنس یا سیاست، منٹو نے جن موضوعات پر بھی قلم اٹھایا اس کا بنیادی موضوع انسان ہی تھا۔ فسادات کے نتیجہ میں مظلوم یا بپھرے ہوئے انسان ہوں یا کوٹھیوں / کھولیوں میں جسموں کے کاروبار کرتی پیشہ ور طوائفیں، منٹو کو نہ تو ان کے پیشوں سے غرض ہے اور نہ ہی ان کے مذاہب سے، منٹو کے نزدیک انسان اہم ہے، چناں چہ مقالہ نگار نے منٹو کے موضوعات کی تہہ میں پوشیدہ انسان دوستی کو اس کی فکر کا بنیادی دھارا قرار دیا۔ جہاں تک کہانی کے فن اور تکنیک کا تعلق ہے تو مقالہ نگار نے منٹو کی کہانیوں کے آغاز، وسط اور انجام پر گفتگو کرتے ہوئے منٹو کی اس تکنیک کو سراہا ہے اور مختلف افسانوں کے ابتدائی اور اختتامی حصے بطور اقتباس پیش کر کے اپنی رائے کو استناد بخشا۔

جزئیات نگاری، کردار نگاری، کفایت لفظی اور تشبیہات و استعارات کے عمدہ استعمال کے علاوہ اُنھوں نے ''پھندنے'' اور ''فرشتہ'' کو علامتی افسانوں کے اولین نمونے قرار دیا۔ تیسرے باب میں غلام عباس کا فسانہ اور اس کے فنی وسائل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جب کہ چوتھا باب ان دونوں افسانہ نگاروں کے فنی وسائل کے تقابلی جائزہ پر مشتمل ہے۔ اس باب میں دونوں افسانہ نگاروں میں پائی جانے والی مماثلتوں اور اختلافات / انفرادیت کی نشاندہی کی گئی ہے۔

دونوں کے موضوعات کے اشتراک کے حوالے سے مقالہ نگار کا موقف ہے کہ دونوں ایک ہی طرح کے عام گرے پڑے لوگوں کو اپنے افسانوں کے کردار بناتے ہیں۔ اپنے سماج اور اس میں بسنے والے لوگوں کے ساتھ ان کی وابستگی بڑی واضح اور اٹل ہے لیکن یہ ترقی پسندوں کی معروف سماجی وابستگی سے خود کو الگ رکھتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ ان دونوں افسانہ نگاروں کا بنیادی موضوع انسان ہے اور یہ تلخ اور ترش حقیقتوں کے عکاس اور مصور ہیں لیکن ترقی پسندوں کی مانند معاشرے میں تبدیلی اور انقلاب کا کوئی سندیسہ یا پیغام نہیں دیتے۔[۵۴]

دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں پائی جانے والی طوائف کا تقابل کرتے ہوئے مقالہ نگار نے یہ رائے دی ہے کہ :

> ''منٹو کے ہاں طوائف ایک مردود مخلوق ہے، بے حسی، محرومی اور اذیت میں گھری ہوئی مخلوق۔۔۔ منٹو اس کے ماحول کی اذیتوں کے ساتھ ساتھ اس کی نفسی کیفیتوں کو بھی اپنے افسانوں میں نہایت کامیابی سے پیش کرتا ہے۔ وہ اس کی مسرتوں اور اذیتوں کو اُجاگر کر کے اسے بازار کی ایک جنس کی بجائے ایک فرد ثابت کرتا ہے۔''[۵۵]

لیکن غلام عباس کو طوائف کے مسائل اور نفسیاتی پیچیدگیوں سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ طوائف کو معاشرے کا ایک لازمی ادارہ اور انسانی تہذیب کے ارتقا کی بنیاد تو سمجھتا ہے لیکن منٹو کی طرح اس کی محرومیوں اور ماحول کی پیدا کردہ اذیتوں سے اسے کوئی سروکار نہیں۔

غلام عباس کے ہاں ''اوتار''، ''لچک'' اور ''رینگنے والے'' کے باوجود سیاسی حوالے بہت کم آتے ہیں لیکن ''اوتار'' اور ''لچک''، میں بھی غلام عباس منٹو کی سی فنی غیر جانبداری نہیں برت سکا۔ منٹو کی طرح غلام عباس کے افسانوں کے آغاز بھی دلچسپ اور توجہ طلب ہوتے ہیں لیکن افسانے کے انجام میں جو انداز منٹو کا ہے غلام عباس کے ہاں ایسا نہیں۔ منٹو کے افسانے پڑھ کر ہمیں ایک جھٹکا سا محسوس ہوتا ہے گویا وہ ہمیں چونکا دیتے ہیں لیکن غلام عباس کے افسانوں کے انجام چونکاتے نہیں بلکہ فکر انگیز اور دھیمے ہوتے ہیں۔ مقالہ نگار نے دونوں کو اپنی اپنی جگہ اردو افسانہ کی روایت میں اہمیت اور وسعت کا حامل قرار دیتے ہوئے رجحان ساز افسانہ نگار قرار دیا۔

''اُردو کے تین خاکہ نگار: 'شاہد احمد دہلوی'، 'سعادت حسن منٹو'، عبدالسلام خورشید''، عمارہ شمشاد:

اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور میں ۱۹۹۱ء میں ڈاکٹر روشن آرا راؤ کے زیر نگرانی اُردو کے تین خاکہ نگاروں شاہد احمد دہلوی، سعادت حسن منٹو اور عبدالسلام خورشید کے سوانحی حالات کے علاوہ خاکوں کی ایک ایک کتاب ''گنجینۂ گوہر''، ''گنجے فرشتے'' اور ''وے صورتیں الٰہی'' کے حوالے سے فنی و فکری جائزہ لیا گیا ہے۔ زیر نظر مقالہ ایم اے اردو کی طالبہ عمارہ شمشاد نے لکھا جو سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں خاکہ نگاری کی روایت کا جائزہ لینے کے بعد ہر خاکہ نگار کے لیے بالترتیب دو دو ابواب مختص کیے گئے ہیں۔ایک باب میں شخصیت جب کہ دوسرے میں مذکورہ کتب کے حوالے سے ہر ایک کے فن خاکہ نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

''سعادت حسن منٹو کے حالات و واقعات'' باب چہارم کا حصہ بنائے گئے ہیں۔اس باب میں سعادت حسن منٹو کے خاندانی پس منظر کے بعد ان کی پیدائش، تعلیم و تربیت، ادبی زندگی کی ابتدا، باری علیگ سے ملاقات، روسی و فرانسیسی ادب کے تراجم، فری تھنکر کا قیام، شادی، گھریلو زندگی، بیٹے کی پیدائش و وفات، دہلی میں قیام، فلمی دنیا سے وابستگی، بمبئی کا دور، منٹو کی پاکستان آمد اور پاکستان میں گزاری گئی زندگی کا عہد بہ عہد جائزہ لیا گیا ہے۔ سعادت حسن منٹو کی تعلیمی زندگی پر بحث کرتے ہوئے مقالہ نگار اُنھیں ایف اے پاس قرار دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''۱۹۳۱ء میں سعادت حسن منٹو نے میٹرک پاس کر ہی لیا مگر اب انٹرنس پاس کرنے کا مسئلہ تھا۔ دو مرتبہ انٹرنس میں بھی فیل ہوئے اور ۱۹۳۵ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔''[۵۶]

ڈاکٹر علی ثنا بخاری کی تحقیق کے مطابق منٹو نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی اور دو مرتبہ انٹرنس کے امتحان میں ناکامی کے بعد اُنھوں نے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا تھا۔[۵۷]

منٹو کے ادبی گرو باری علیگ ''مساوات'' اخبار میں ملازمت کی غرض سے ۱۹۳۳ء میں امر تسر آئے تھے جہاں منٹو کے ساتھ ان کی ملاقات دوستی میں تبدیل ہوئی۔ ۱۹۳۴ء تک منٹو وکٹر ہیوگو کی تصنیف "The Last days of the Condemned" اور آسکر وائلڈ کے چار ایکٹ کے ڈرامے ''ویرا'' کے علاوہ کئی روسی اور فرانسیسی افسانوں کے تراجم کر چکے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں منٹو علی گڑھ یونیورسٹی سے تپ دق کے جراثیم کی نشان دہی کے باعث نکال دیے گئے تھے۔ مقالہ نگار نے باری علیگ سے منٹو کی ملاقات کے زمانے کا تعین کرتے ہوئے اسے ۱۹۳۵ء یعنی منٹو کے علی گڑھ یونیورسٹی سے اخراج کے بعد کا واقعہ قرار دیا ہے جو تحقیقی اعتبار سے غلط ہے۔ لکھتی ہیں:

> ''جب تعلیم حاصل کرنے کا خواب ادھورا رہ گیا تو منٹو یونیورسٹی سے امر تسر پہنچے جہاں ان کی ملاقات باری علیگ سے ہوئی۔''[۵۸]

اسی طرح ہفت روزہ ''سماج''، بمبئی سے وابستگی کا سال بھی ۱۹۳۷ء درج کیا گیا ہے جو درست نہیں۔ منٹو ۱۹۳۸ء میں ہفت روزہ سماج سے وابستہ ہوئے۔

اسی باب میں ہی مقالہ نگار نے ۱۹۴۷ء سے پہلے اور اس کے بعد منٹو کی شائع شدہ تصنیفات کی سنین کے اعتبار سے جو فہرست شائع کی ہے اس میں بہت سے مجموعوں کے سن اشاعت درست نہیں مثلاً 'ایک اسیر کی سر گزشت' کا سن اشاعت ۱۹۳۲ء، 'روسی

افسانے' ۱۹۳۶ء، 'دھواں' ۱۹۳۸ء، ''منٹو کے افسانے'' ۱۹۴۰ء، ''تین عورتیں'' ۱۹۵۳ء، ''پھندنے'' ۱۹۵۴ء، ''شکاری عورتیں'' ۱۹۵۶ء جب کہ لاؤڈ اسپیکر کا سن اشاعت ۱۹۵۶ء درج کیا ہے۔ حال آں کہ ''سر گزشت اسیر'' ۱۹۴۳ء، ''روسی افسانے'' ۱۹۳۴ء، ''دھواں'' ۱۹۴۱ء اور ''تین عورتیں'' ۱۹۴۶ء میں جب کہ ''پھندنے''، ''شکاری عورتیں'' اور ''لاؤڈ اسپیکر'' ۱۹۵۵ء میں اشاعت پذیر ہوئے۔

مقالے کا پانچواں، جب کہ منٹو پر اس مقالے میں شامل دوسرا باب ''گنجے فرشتے فکری و فنی جائزہ'' میں منٹو کے فن خاکہ نگاری کا ان کی کتاب ''گنجے فرشتے'' کے تناظر میں محاکمہ کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے منٹو کو فطری خاکہ نگار قرار دیتے ہوئے ''گنجے فرشتے'' میں شامل بارہ خاکوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ وہ ان خاکوں کو دلکش اُسلوب اور ان میں موجود کہانی پن کی وجہ سے کرداری افسانوں کا حامل قرار دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''اُنھوں نے خاکوں میں بھی ایک مخصوص زاویہ نظر اپنایا۔ اندازِ بیان، کہانی نویسی، واقعات کی ترتیب اور مکالموں کے اعتبار سے ان کے خاکے بالکل کرداری افسانوں کی نوعیت کے ہیں۔''[۵۹]

مقالہ نگار نے ''میرا صاحب''، ''آغا حشر سے دو ملاقاتیں''، ''میرا جی''، ''اشوک کمار'' اور ''نرگس'' کے خاکوں کا حوالہ دیتے ہوئے تجسس کو منٹو کے خاکوں کی اہم خصوصیت قرار دیا ہے۔ تجسس، ڈرامائیت، مکالمہ نویسی، افسانوی رنگ اور مجموعی تاثر کی بنیاد پر منٹو کو کامیاب خاکہ نگار قرار دیتی ہیں۔ البتہ منٹو کے خاکے ''آغا حشر سے دو ملاقاتیں''، ''پری چہرہ نسیم بانو'' کے تمہیدی حصے کو غیر ضروری، ''عصمت چغتائی'' کے خاکے کو تنقیدی مزاج کا حامل جب کہ ''بابو راؤ پٹیل'' کو بے جا تفصیلات پر مبنی خاکہ گردانتی ہیں۔

''سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے افسانوں کے موضوعات کا تقابلی جائزہ''، رضا احمد:

رضا احمد کا تحقیقی مقالہ پروفیسر شبیہ الحسن کی نگرانی میں گورنمنٹ ایف سی کالج لاہور سے ۱۹۹۳ء میں تکمیل کو پہنچا۔ مقالے کو مندرجہ ذیل پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ افسانہ: تاریخ وارتقاء
۲۔ منٹو کی افسانہ نگاری
۳۔ عصمت کی افسانہ نگاری
۴۔ منٹو اور عصمت کے افسانوں کے موضوعات کا تقابلی جائزہ
۵۔ جدید افسانوی ادب پر منٹو اور عصمت کے اثرات

پہلے باب میں اردو افسانے کی تعریف، مغربی و مشرقی نقادوں کی افسانہ کے بارے میں تنقیدی آرا، افسانے کی ہیئت، اردو افسانے کے آغاز، ابتدائی افسانہ نگاروں کے موضوعات، افسانوں میں داستانویت، رومانویت کی لہر، رومانیت سے حقیقت پسندی اور حقیقت پسندی سے ترقی پسندی تک اردو افسانے میں ہونے والی موضوعاتی تبدیلیوں، جب کہ دوسرے باب میں منٹو کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آغاز میں منٹو کے سوانحی حالات، آباؤ اجداد، تعلیمی زندگی خصوصاً میٹرک میں بار بار فیل ہونا اور علی گڑھ یونیورسٹی سے

منٹو کے اخراج پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد منٹو کی ادب سے دلچسپی میں باری علیگ کا کردار، آل انڈیا ریڈیو دہلی سے وابستگی اور منٹو کے افسانوں پر چلنے والے مقدمات کی تفصیل ملتی ہے۔

مقالہ نگار کے مطابق، بیسویں صدی کا بحرانی دور جو نہ صرف سیاست کو متاثر کر رہا تھا بلکہ معاشرت، مذہب اور ادب تک پھیلا ہوا تھا، انگریز حکومت کا استحصالی رویہ، منٹو کی والدہ کی جلد وفات، والد کی وفات اور معاشی مصائب و آلام، امتحانات میں بار بار فیل ہونا، باری علیگ سے ملاقات، آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت، افسانوں پر مقدمات، بیٹے کی موت، روسی مصنفین کے اثرات، ہندوستان کی ادبی و سیاسی تحریکیں، ۱۹۴۷ کے فسادات، شراب، اخراجات اور آمدن میں عدم توازن، ایسے ادبی، فکری اور فنی محرکات ہیں جنہوں نے افسانہ نگار منٹو کی تشکیل کی۔ منٹو کے افسانوں کے ادبی، فنی اور فکری محرکات اور موضوعات کا جائزہ لیتے ہوئے اُنھوں نے منٹو کے افسانوں کو مندرجہ ذیل موضوعات میں تقسیم کیا ہے۔

سیاسی و سماجی نقطہ نظر کے حامل افسانے، عورت، خصوصاً طوائف پر لکھے گئے افسانے، فسادات کے پس منظر میں لکھے گئے افسانے، جنسی افسانے، انسانی نفسیاتی مسائل پر لکھے گئے افسانے، مرد اور عورت، محبت اور رومانی طرز ادا پر مبنی تحریریں۔ موضوعات کی اس تقسیم کے بعد مقالہ نگار نے منٹو کے ان موضوعات پر لکھے گئے مختلف افسانوں کا تجزیہ کیا ہے۔ ''تیسرے باب میں عصمت چغتائی کے مختصر سوانحی حالات کے بعد ان کی ادب میں دلچسپی، ابتدائی۔ تحریریں، ادبی، فکری و فنی محرکات، اہم موضوعات کا تعین، چند افسانوں کا تجزیہ اور اُسلوب بیان کا جائزہ لیا گیا ہے۔

چوتھے باب ''منٹو اور عصمت کے موضوعات کا تقابلی جائزہ'' میں سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے مشترکہ موضوعات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دونوں افسانہ نگار موضوعاتی حوالے سے ایک دوسرے کے قریب ہونے کے باوجود جدا جدا اُسلوب رکھتے ہیں۔ چناں چہ بنیادی موضوع جنس اور سماجیات کے مطالعہ کو اُنھوں نے مزید ذیلی شاخوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس کی ضرورت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کچھ موضوعات جنھیں منٹو نے اپنایا ہے اُنھیں عصمت نے چھوا تو ضرور ہے لیکن پوری طرح محاکمہ نہیں کیا۔ یہی صورت حال بعض اوقات منٹو کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً عصمت نے بچوں کو بنیاد بنا کر کئی افسانے لکھے ہیں جب کہ منٹو کے ہاں بچے کم ہی موضوع بنے ہیں۔ فسادات منٹو کے ہاں کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں، عصمت کے ہاں تقسیم کے موضوع پر تو افسانے ملتے ہیں لیکن تقسیم کی قتل و غارت کو اُنھوں نے موضوع نہیں بنایا۔ اسی طرح کشمیر کا موضوع بھی صرف منٹو کے ہاں ملتا ہے۔ ان تمام محرکات کو مد نظر رکھتے ہوئے دونوں کے مشترکہ موضوعات کا تعین مقالہ نگار کے پیش نظر رہا ہے۔ ان موضوعات میں جنس، سماجیات، انسانی نفسیات، مذہب، تقسیم ہندوستان، محبت، عورت، طوائف اور علامتی افسانے وغیرہ شامل ہیں۔ جنسی نفسیاتی اصولوں کے تحت منٹو کے افسانوں ''چغد''، ''پڑھیے کلمہ'' اور ''برمی لڑکی'' جب کہ عصمت کے ''لحاف''، ''کنواری''، ''خریدار'' اور ''پہلی لڑکی'' کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''عصمت کے یہاں عورتوں کی جنسی نفسیات کی عکاسی نسائی انداز میں زیادہ ہوئی ہے اگرچہ عصمت کے یہاں منٹو جیسی بے باکی کم ہے لیکن ان کی تحریر میں لفظ سے زیادہ معنوی سطح پر عورت کی جنسی ضرورت اور نفسیات کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عصمت کی عورت جنسی ضروریات کا اظہار منٹو کی نسبت دھیمے لہجے میں کرتی ہے۔''[۶۰]

جہاں تک طوائف کا تعلق ہے، دونوں افسانہ نگاروں نے اسے موضوع بنایا ہے۔ دونوں کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''منٹو کے یہاں طوائف کا کردار وسیع تناظر میں بکھرا ہوا ہے لیکن ہر جگہ کسی نہ کسی حوالے سے منٹو نے اپنی طوائفوں کو مظلومیت کے پردے میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔''[۶۱]

ان کے مطابق عصمت کی طوائفوں یا جسم فروش عورتوں میں گھریلو پن کی جھلک زیادہ ہے۔ طوائف کی طرح ہم جنس پرستی بھی دونوں افسانہ نگاروں کا مشترکہ موضوع ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق عصمت کے ہاں یہ موضوع منٹو کی نسبت زیادہ وسعت رکھتا ہے۔ اس سلسلہ میں ''لحاف'' کو مرکزی اہمیت دیتے ہیں، منٹو ہم جنس پرستی کے ظاہری اور معاشرتی محرکات کو سامنے رکھتے ہیں، جب کہ عصمت ہم جنس پرستی کو جذباتی تناظر میں دیکھنے کی قائل ہیں۔ البتہ ایک چیز جو دونوں میں مشترک ہے وہ یہ کہ:

> ''دونوں کے ہاں اس موضوع کو ذہنی تلذذ کی بجائے ایک معاشرتی گھٹن اور نفسیاتی دباؤ یا پیچیدگی کے پس منظر میں بیان کیا گیا ہے۔''[۶۲]

منٹو کے افسانوں ''پھاہا''، ''بلاؤز'' اور ''دھواں'' جب کہ عصمت کے ہاں ''کیلنڈر''، ''بھول بھلیاں'' اور ''ماں'' میں سن بلوغت کے ابتدائی جنسی ہیجان کو موضوع بنایا گیا ہے۔

مقالہ نگار نے کہا کہ ''دیوانہ شاعر''، ''تماشا''، ''نیا قانون''، ''۱۹۱۹ء کی ایک بات''، ''خونی تھوک'' اور ''انقلاب پسند'' منٹو کے سیاسی موضوعات پر لکھے گئے افسانے ہیں۔ منٹو کے ابتدائی دور میں یہ رنگ غالب ہے۔ عصمت کے یہاں اس پس منظر میں کوئی بڑی کہانی نظر نہیں آتی جو انگریز حکومت کے خلاف لکھی گئی ہو۔ صرف ''ہندوستان چھوڑ دو'' اس حوالے سے سامنے آتا ہے لیکن اس کا مزاج منٹو سے یکسر مختلف ہے۔

''منٹو اور عصمت کے اردو افسانے پر اثرات'' مقالے کا پانچواں اور آخری باب ہے۔ اس باب میں ان دونوں افسانہ نگاروں کے اردو افسانہ پر اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے رائے ظاہر کی کہ منٹو اور عصمت سے پہلے سوائے ''انگارے'' کے کوئی مضبوط آواز سنائی نہیں دیتی۔ مقالہ نگار کی اس رائے سے اتفاق ممکن نہیں۔ نیاز فتح پوری اور سجاد حیدر یلدرم کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی پریم چند کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

منٹو اور عصمت اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان کی بدولت اُردو کا افسانوی ادب دو سطح پر تبدیلیوں سے ہم کنار ہوا۔ پہلی سطح پر تو اُنھوں نے موضوعاتی تنوع سے زندگی اور معاشرت کے عمیق اور غیر مادی عناصر تک رسائی حاصل کی۔ اس سے زندگی کا کوئی شعبہ خواہ وہ مذہب، سیاست، عورت، مرد، بچے، معاشرت،، نفسیات یا جنس سے تعلق رکھتا تھا، ان کے افسانوں میں آ گیا۔ دوسری سطح پر اُنھوں نے اسلوبیاتی میدان میں اُردو افسانے کو نئی سمتوں سے روشناس کرایا۔

مجموعی طور پر یہ ایک عمدہ مقالہ ہے، جس میں مربوط طریقے سے منٹو اور عصمت کے موضوعات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مقالہ نگار بذاتِ خود عمدہ اُسلوب کے مالک ہیں۔ ایم اے کی سطح پر منٹو کے باب میں اس سے بہتر تحقیقی مقالہ اس سے پہلے نہیں لکھا گیا۔ سوائے اس ایک غلطی کے جہاں وہ منٹو کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''منٹو نے اپنی ۴۷ سال کی مختصر سی مدت میں ہتک، موذیل۔۔۔ افسانے دیے ہیں۔''[۶۳]

منٹو ۱۹۱۲ء میں پیدا ہو کر ۱۹۵۵ء میں وفات پا گئے اور تقریباً ۴۳ برس کے تھے، اس ایک غلطی کے علاوہ پورے مقالے میں کسی قسم کی کوئی تحقیقی غلطی سامنے نہیں آئی۔ قیاس اغلب ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہے۔

"منٹو اور روس کا افسانوی ادب"، روبینہ گلزار احمد:

"منٹو اور روس کا افسانوی ادب" ایم اے اُردو کا غیر مطبوعہ مقالہ ہے۔ اسے روبینہ گلزار احمد نے پروفیسر اشفاق بخاری کی نگرانی میں گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد سے مکمل کر کے ۲۰۰۴ء میں پیش کیا۔ چار ابواب پر مشتمل اس مقالہ کی ابواب بندی اس طرح کی گئی ہے:

۱۔ سعادت حسن منٹو: سوانحی حالات

۲۔ (الف) منٹو اور روسی ادب (ب) منٹو اور روسی ادیب

۳۔ (الف) چیخوف / گورکی کے اثرات "ب" دیگر اہم ادیبوں کے اثرات

۴۔ (الف) منٹو بحیثیت مترجم (ب) روسی ادب کے چند تراجم کا خلاصہ

ضمیمہ: منٹو اور انسان دوستی

مقالہ کے پہلے باب "سعادت حسن منٹو: سوانحی حالات" کی ابتدا میں مقالہ نگار منٹو کی جائے پیدائش کی ذیل میں لکھتی ہیں:

"سعادت حسن منٹو ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء کو سمرالہ (شمس پور) ضلع لدھیانہ پنجاب میں پیدا ہوئے۔"[۶۴]

جہاں تک منٹو کی جائے پیدائش کا تعلق ہے پہلی بار مقالہ نگار نے سمرالہ (شمس پور) کی نشان دہی کی ہے لیکن اُنھوں نے شمس پور کی وضاحت نہیں کی۔ مقالہ نگار سے پہلے منٹو کے کسی نقاد یا محقق نے شمس پور کا حوالہ نہیں دیا۔ اسی طرح "سمرالہ" بھی اختلافی لفظ ہے۔

سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن پر پی ایچ ڈی کرنے والے ڈاکٹر علی ثنا بخاری اور لیزلی فلیمنگ "سمرالہ" کی بجائے "سمبرالہ" لکھتے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر برج پریمی اور محمد اسد اللہ نے بھی اس کا تلفظ "سمبرالہ" لکھا ہے ان کے برعکس ڈاکٹر کہکشاں پروین اور پروفیسر محمد محسن نے اسے "سمیرالہ" لکھا ہے جب کہ جگدیش چندر ودھاون، وارث علوی، ڈاکٹر اورنگزیب عالمگیر اور انیس ناگی نے اسے "سمرالہ" لکھا ہے۔[۶۵]

مقالہ نگار نے منٹو کے والد کی تاریخ وفات ۳ فروری ۱۹۳۳ء درج کی ہے جو کہ تحقیقی اعتبار سے درست نہیں ان سے قبل ہندوستانی مصنف جگدیش چندر ودھاون نے بھی منٹو کے والد کی تاریخ وفات یہی درج کی ہے۔[۶۶]

انیس ناگی ان کے انتقال کا سال ۱۹۳۰ء بتاتے ہیں[۶۷] جب کہ لیزلی فلیمنگ کے مطابق:

"Manto's father died on February 25, 1932, when Manto was ninteen."[۶۸]

ڈاکٹر علی ثنا بخاری اور ڈاکٹر برج پریمی مندرجہ بالا آرا سے اختلاف کرتے ہیں۔ ڈاکٹر علی ثنا بخاری تاریخ اقوام کشمیر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''تاریخ اقوام کشمیر کے مرتبین نے غلام حسن سب جج کی تاریخ وفات ۳فروری ۱۹۳۲ء درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اُنھوں نے تقریباً ۷۷ سال کی عمر میں وفات پائی۔اس لحاظ سے غلام حسن کا سن ولادت ۱۸۵۵ء طے پایا ہے۔''[۶۹]

جب کہ ڈاکٹر برج پریمی ایک اور مستند ذریعے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انیس ناگی، مولوی غلام حسن کی تاریخ وفات ۱۹۳۰ قرار دیتے ہیں،ان کے مطابق مولوی صاحب کی عمر اس وقت ۷۶ برس تھی۔ لیزلی فلیمنگ اپنے مقالہ میں یہ تاریخ ۲۵ فروری ۱۹۳۲ء قرار دیتی ہیں۔ جب ان کے مطابق سعادت حسن منٹو ۱۹ برس کے تھے۔ یہ دونوں بیانات محل نظر ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مولوی صاحب کا انتقال ۳فروری ۱۹۳۲ء کو ہوا جب وہ لگ بھگ ۷۰ برس کے تھے۔ اس کی تصدیق مولوی صاحب کے صاحبزادے اور سعادت حسن منٹو کے بھائی میاں سلیم حسن منٹو کے بیان سے ہوتی ہے جو ان کے مرتب کیے ہوئے شجرۂ نسب میں درج ہے اور اس مادۂ تاریخ وفات سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے جو سعادت حسن منٹو کے مربی اور دوست آغا خلش کاشمیری نے کہی تھی: غلامِ باحسن منسوب گشتہ۔ مقیم جنت فردوس باشد۔ ۱۳۵۰ھ۔''[۷۰]

تاریخ وفات کی حد تک ڈاکٹر علی ثنا بخاری اور ڈاکٹر برج پریمی میں اتفاق رائے پایا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر برج پریمی مولوی غلام حسن کی عمر ۷۰ سال بتاتے ہیں۔ اُنھوں نے ان کی تاریخ پیدائش کے متعلق کچھ نہیں بتایا جب کہ ڈاکٹر علی ثنا بخاری نے ان کی عمر ۷۷ برس درج کرتے ہوئے ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۵۵ درج کی ہے۔ لفظ ''منٹو'' پر بحث کرتے ہوئے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ:

''خود منٹو ماسوائے کہ منٹو کشمیری پنڈتوں کی ایک ذات ہے خود اس کے صحیح تلفظ کو نہیں جانتے تھے کہ 'منٹو'، 'منٹو' یا منٹوِ' میں سے کون سا درست ہے۔ منٹو نے جب ادبی دنیا میں قدم رکھا تو ادب و سخن جاننے والوں میں ان کے نام کا ڈنکا بجنے لگا اور لوگوں میں تجسس پیدا ہوا کہ منٹو کے کیا معنی ہیں۔ منٹو اس کے صحیح معنی سے واقف نہ تھے۔''[۷۱]

لفظ ''منٹو'' کے تلفظ کی طرف سے سب سے پہلے کرشن چندر نے توجہ مبذول کرائی تھی۔ کرشن چندر نئے ادب کے معمار کے سلسلے میں لکھے گئے منٹو کے خاکے میں اس لفظ سے متعلق منٹو سے یوں بحث کرتے ہیں:

''تم یہ بتاؤ تم کون ہو؟ منٹو ہو یا منٹو ہو یا منٹوِ ہو۔ یہ منٹو کیا بلا ہے۔ منٹو، منٹو، منٹوِ، منٹو۔''[۷۲]

ڈاکٹر علی ثنا بخاری اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ ''سعادت حسن منٹو۔ سوانح اور ادبی کارنامے'' میں اس کے صحیح تلفظ کی بحث میں لکھتے ہیں:

''اپنی منجھلی بیٹی نزہت کی رہنمائی کے لیے منٹو نے ''منٹو'' کے تلفظ کی وضاحت کرتے ہوئے اسے ون ٹو (one two) کے وزن پر ادا کرنے کو کہا تھا اور وہ اپنا نام اسی تلفظ میں بیان کرتے تھے۔''[۷۳]

علی ثنا بخاری کے اس بیان کا ماخذ ناصرہ اقبال اور نصیر انور کا انٹرویو ہے جو اُنھوں نے ذاتی طور پر دونوں سے مختلف اوقات میں لیا تھا۔ ابو سعید قریشی لفظ منٹو کے متعلق کہتے ہیں:

''سعادت کہا کرتا کہ منٹ، کشمیری زبان میں ترازو کو کہتے ہیں، کشمیر میں ہمارے اب وجد کے یہاں دولت ترازو سے تلتی تھی، اسی رعایت سے ہم منٹو کہلائے۔'' [۷۴]

ان اقتباسات کی روشنی میں مقالہ نگار کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ سعادت حسن منٹو اس لفظ کے درست تلفظ سے نا آشنا تھے۔

منٹو کے تعلیمی کوائف کا جائزہ لیتے ہوئے بھی مقالہ نگار سے غلطی سرزد ہوئی ہے۔ اُنھوں نے منٹو کی تعلیمی قابلیت انٹرنس بتائی ہے اور وہ بھی تیسری کوشش میں حال آں کہ منٹو نے میٹرک تھرڈ ڈویژن میں چوتھی بار امتحان دے کر پاس کیا تھا اور دو بار انٹرنس کے امتحان میں ناکامی کے بعد اسے ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ ڈاکٹر علی ثنا بخاری اس بارے میں شواہد فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انگریزی، فلسفہ اور اکنامکس کے مضامین کے ساتھ منٹو ۱۹۳۳ء میں پنجاب یونیورسٹی کے امتحان میں پہلی بار شریک ہوئے اور فیل ہو گئے۔ ایم اے او کالج سے ۱۹۳۴ء میں سعادت حسن منٹو اور اُن کے دیگر دوستوں ابو سعید قریشی اور حسن عباس نے پنجاب یونیورسٹی کے ایف اے کے امتحان میں دوبارہ شرکت کی۔ سعادت حسن منٹو اور ابو سعید قریشی اس بار بھی ایف اے پاس نہ کر سکے۔'' [۷۵]

ہندوستانی مصنف جگدیش چندر ودھاون نے بھی بغیر کوئی شہادت دیے منٹو کی تعلیم انٹرنس، تھرڈ ڈویژن بتائی ہے اور وہ بھی تیسرے چانس میں [۷۶] منٹو کے تراجم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ منٹو نے وکٹر ہیوگو کی تصنیف ''لاسٹ ڈیز آف کنڈ مڈ'' کے ترجمے کو ڈکشنری کی مدد سے اُردو کے قالب میں ڈھالا اور یہ ترجمہ ''اسیر سر گزشت'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ [۷۷] ''اسیر سر گزشت'' کے عنوان سے منٹو نے کوئی ترجمہ نہیں کیا۔ اصل عنوان ''سر گزشتِ اسیر'' ہے۔ منٹو کے بمبئی سے دہلی آمد کی تاریخ میں بھی مقالہ نگار سے غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ لکھتی ہیں: ''منٹو جنوری ۱۹۶۱ء میں بمبئی سے دہلی چلے گئے۔'' [۷۸]

منٹو یکم جنوری ۱۹۴۱ء میں آل انڈیا ریڈیو کے ساتھ بطور فیچر نگار اور ڈراما نویس منسلک ہوئے تھے۔ ۱۹۶۱ء میں منٹو کو مرے ہوئے چھے سال ہو گئے تھے [۷۹] اسی طرح کی ایک اور غلطی ملاحظہ ہو جس میں احمد ندیم قاسمی کے بیان کا حوالہ دیتے ہوئے مقالہ نگار لکھتی ہیں:

''وہ (منٹو) ایک دن میرے یہاں آیا۔ مجھے اپنے گھر لے گیا اور اندھا دھند پی کر ۱۹۳۷ء سے ۱۹۵۷ء تک کی تمام باتوں کو اتنی تفصیل سے دہراتا رہا کہ میں اس کی یادداشت پر حیران رہ گیا۔'' [۸۰]

ظاہر ہے کہ یہ پروف کی غلطی ہے وگرنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ منٹو وفات کے دو سال بعد آ کر ساری باتیں دہرا گئے۔ منٹو کی موت کے بیان میں بھی اُن سے ایک تاریخی غلطی واقع ہو گئی ہے اور جسے ہم پروف کی غلطی بھی نہیں کہہ سکتے۔ لکھتی ہیں:

''اُن کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی، ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ ان کو ہسپتال لے جایا جائے۔ منٹو نے کہا اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ منٹو کو معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا آخری وقت آپہنچا ہے۔ ان کے بھانجے حامد جلال ان کے پاس تھے۔ حامد جلال لکھتے ہیں۔۔۔۔'' [۸۱]

منٹو کی وفات کے وقت حامد جلال منٹو کے پاس نہیں تھے بلکہ بہاولپور میں کرکٹ میچ کی کمنٹری میں مصروف تھے جب اُنھیں منٹو کی موت کی اطلاع بذریعہ ٹیلیفون پہنچی۔ وہ خود لکھتے ہیں:

> ''بہاولپور میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کرکٹ کا دوسرا ٹیسٹ میچ ہو رہا تھا اور میں ڈرنگ سٹیڈیم میں بیٹھا طالع یار خان کو میچ کا چشم دید حال نشر کرنے میں مدد دے رہا تھا کہ لاہور سے میرے نام ایک ٹرنک کال آئی اور مجھے بتایا گیا کہ آج صبح سعادت حسن منٹو کا انتقال ہو گیا۔'' [۸۲]

تنقیدی و تحقیقی اعتبار سے یہ باب بہت ہی ناقص ہے۔ سوانح کے باب میں جہاں بہت سی تحقیقی غلطیاں پائی جاتی ہیں وہاں تنقیدی حصہ بھی خاصا کمزور اور بے ربط ہے۔ مقالہ نگار نے اپنی معلومات کی بنیاد جگدیش چندر ودھاون کی کتاب ''منٹو نامہ'' پر رکھی ہے اور باب میں شامل ۵۸ حوالوں میں سے ۳۹ حوالے اس کتاب سے لیے ہیں۔ پروف کی اغلاط بھی بہت زیادہ ہیں۔

دوسرا باب جو کہ منٹو کی روسی ادب سے دلچسپی کے متعلق ہے، مقالہ نگار نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ ''منٹو اور روسی ادب'' جب کہ دوسرا ''منٹو اور روسی ادیب'' کے عنوان سے شامل ہے۔ پہلے حصے میں اُنھوں نے منٹو کے روسی ادب کے تراجم پر بحث کی ہے۔ وکٹر ہیوگو کی "The Last Days of Condemned" کے علاوہ اُن روسی افسانوں کی فہرست بھی درج کی گئی ہے جنھیں منٹو نے ترجمہ کیا۔ یہ فہرست آٹھ افسانوں پر مشتمل ہے۔ مقالہ نگار کا نقطہ نظر یہ ہے کہ منٹو نے محض لغت کی مدد سے یہ تراجم نہیں کیے بلکہ مصنف کی تخلیق میں اُتر کر اس کی روح، مقصد اور خوبصورتی کو بھی برقرار رکھا ہے۔ گورکی کے حالات زندگی اور فن کا جائزہ لیتے ہوئے گورکی کی تصانیف کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ [۸۳]

''منٹو اور روسی ادیب'' اس باب کا دوسرا حصہ ہے اس میں مقالہ نگار نے مندرجہ ذیل روسی ادیبوں کے منٹو پر اثرات کا جائزہ لیا ہے:

۱۔ گوگول ۲۔ طالسطائی ۳۔ دوستوفسکی ۴۔ چیخوف ۵۔ گورکی

تیسرے باب میں چیخوف اور گورکی کے منٹو پر اثرات کا جائزہ تکرار محض ہے۔ چیخوف کے حالات زندگی اور فن کے تذکرے کے بعد منٹو اور چیخوف کا تقابلی جائزہ کرتے ہوئے مقالہ نگار نے دونوں کے معاشی حالات کو یکساں قرار دیا۔ اُن کے مطابق دونوں معاشی طور پر پریشان رہے۔ دونوں نے مزدور اور غریب طبقے کی نمائندگی کی، دونوں نے ادبی زندگی کا آغاز اخبار کے ذریعے کیا اور دونوں حقیقت نگاری اور فطرت نگاری کے میدان میں یکساں دکھائی دیتے ہیں۔

چوتھے باب میں منٹو کے بحیثیت مترجم مقام و مرتبے کا تعین کیا گیا ہے۔ اس باب میں مقالہ نگار نے ترجمہ نگاری اور مترجم کی خصوصیات، اہمیت اور ضرورت پر بحث کی ہے۔ اُنھوں نے منٹو کو کامیاب مترجم قرار دیا۔ جس نے نہ صرف روسی نثر پاروں کا ترجمہ کیا بلکہ روسی شاعری کے تراجم بھی کیے۔ آخر میں اُنھوں نے ۱۹۳۳ء کے ہمایوں، میں شائع ہونے والے تراجم کی تفصیل فراہم کرنے کے علاوہ 'ہمایوں' اور 'عالمگیر' کے روسی ادب نمبر میں شامل منٹو کے تراجم کا اشاریہ بھی مرتب کیا ہے۔ جب کہ باب کے دوسرے حصے میں روسی ادب کے چند تراجم کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے جن میں ''شراب اور شیطان''، ''سپاہی اور موت''، ''تین سوال''، ''خادمہ''، ''ایثار''، ''پتھر کی سرگزشت''، ''جادوگر''، اور ''ویرا'' شامل ہیں جب کہ ضمیمے میں منٹو کی انسان دوستی پر بحث کی گئی ہے۔

’’منٹو شناسی کی روایت کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ‘‘، محمد نوید:

’’منٹو شناسی کی روایت کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ‘‘ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور میں منٹو پر پہلا تحقیقی مقالہ ہے۔ جسے ایم اے کے طالب علم محمد نوید نے اصغر ندیم سید کی نگرانی میں اگست ۲۰۰۵ء میں مکمل کیا۔ زیر نظر مقالہ مندرجہ ذیل چار ابواب پر مشتمل ہے:۔

۱۔ منٹو خود شناسی

۲۔ منٹو پر تحریر کی جانے والی مطبوعہ تصانیف

۳۔ منٹو سے متعلق مرتبہ تصانیف

۴۔ مجموعی جائزہ

مقالہ کے آغاز سے پہلے محمد نوید کی ’’بیتے دنوں کی یادیں‘‘ بطور دیباچہ / پیش لفظ جب کہ آخر میں کتابیات دی گئی ہیں۔ مجموعی طور پر یہ مقالہ ۱۴۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلے باب ’’منٹو خود شناسی‘‘ میں سعادت حسن منٹو کی تحریروں کی روشنی میں ان کی شخصیت، فن اور فکر کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مقالہ نگار کے مطابق کسی بھی تخلیق کار کے لیے تحقیق و تنقید کے سلسلہ میں یہ بات بہت ضروری ہوتی ہے کہ تخلیق کار نے اپنی شخصیت اور فن کے بارے میں جو رائے دی ہے اس کا بھی جائزہ لیا جائے۔ چناں چہ اُنھوں نے منٹو کے خاکوں، مضامین اور دیباچوں کو مد نظر رکھتے ہوئے منٹو کی شخصیت اور فن کا جائزہ لیا اور اسے ’’منٹو خود شناسی‘‘ کا نام دیا جس میں منٹو اپنی شخصی اور ادبی زندگی کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان میں منٹو کی تعلیم، مقدمات، باری علیگ کی صحبت، بیماری اور بٹوٹ میں قیام، مصور کی ادارت، بمبئی فلم انڈسٹری میں ملازمت، مصور سے علیحدگی پر منٹو کا ردِ عمل، شادی، آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازمت، پاکستان آمد اور ذہنی کشمکش، معاشی پس ماندگی شراب نوشی، افسانہ فروشی اور افسانوں پر لگائے گئے فحاشی کے الزامات اور اس ضمن میں منٹو کے نظریات۔ المختصر، مقالے کے اس باب میں منٹو ایک ماہر نقاد کی طرح اپنے سوانحی حالات اور فکری نظریات کا پرچار اور دفاع کرتا دکھائی دیتا ہے۔

مقالے کا دوسرا باب ’’منٹو پر تحریر کی جانے والی مطبوعہ تصانیف‘‘ منٹو کی شخصیت اور فن پر تصنیف کی جانے والی کتابوں کے جائزہ پر مشتمل ہے جن کی تعداد بارہ (۱۲) ہے۔ ان میں ’’منٹو‘‘ از ابو سعید قریشی، ’’منٹو میرا دشمن‘‘ از اوپندر ناتھ اشک، ’’منٹو میرا دوست‘‘ از محمد اسد اللہ، ’’سعادت حسن منٹو اپنی تخلیقات کی روشنی میں، ایک نفسیاتی جائزہ‘‘ از پروفیسر محمد محسن، ’’سعادت حسن منٹو‘‘ از انیس ناگی، ’’منٹو نوری نہ ناری‘‘ از ممتاز شیریں، سعادت حسن منٹو ’’کتابیات‘‘ از ڈاکٹر علی ثنا بخاری، ’’منٹو نامہ‘‘ از جگدیش چندر ودھاون، ’’معمار افسانہ نگار، سعادت حسن منٹو‘‘ از ڈاکٹر انیس ناگی، ’’منٹو ایک مطالعہ‘‘ از وارث علوی، ’’منٹو اور بیدی کا تقابلی مطالعہ‘‘ از ڈاکٹر کہکشاں پروین اور ’’سعادت حسن منٹو، ایک نئی تعبیر‘‘ از پروفیسر فتح محمد ملک شامل ہیں۔

تمام کتب کے جائزے میں زمانی ترتیب کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ چناں چہ منٹو پر پاکستان میں سب سے پہلے شائع ہونے والی ابو سعید قریشی کی کتاب ’’منٹو کا جائزہ‘‘ سے اس باب کا آغاز کیا گیا ہے۔ ان کے جائزہ لینے کا طریقہ کار کچھ اس طرح ہے کہ ہر کتاب کے

مصنف کے سرسری تعارف کے بعد کتاب کا سن اشاعت، پبلشر اور مضامین یا موضوع سے تعارف کرایا جاتا ہے، پھر بالترتیب موضوعات / مضامین کا خلاصہ بذریعہ اقتباسات بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ مقدور بھر تنقیدی اور تحقیقی غلطیوں کی نشان دہی بھی کر دی گئی ہے۔

ابو سعید قریشی کی کتاب ''منٹو'' کو مقالہ نگار تاثراتی تنقید کا عمدہ نمونہ قرار دیتے ہیں جب کہ محمد اسد اللہ کی کتاب ''منٹو میرا دوست'' میں شامل واقعات اور اندازِ بیان کو مد نظر رکھتے ہوئے لکھتے ہیں: اسد اللہ محض خامیوں کو بیان کرتے ہوئے منٹو کی شخصیت اور فن کا کوئی خاص پہلو اُجاگر نہیں کر سکے۔

بقول مقالہ نگار جگدیش چندر ودھاون کی کتاب ''منٹو نامہ'' کا تمام مواد کتب اور رسائل میں چھپنے والے مضامین سے اخذ کیا گیا ہے۔اس حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''جگدیش کی کتاب میں صرف ایک خوبی ہے منٹو پر لکھے جانے والے شخصی نوعیت کے وہ تمام مضامین جو ۱۹۸۹ء تک شائع ہو چکے تھے اُنھوں نے سب کو ملا دیا ہے اور ان سے منٹو کی شخصیت، حالاتِ زندگی وغیرہ کے بارے میں تمام معلومات ایک جگہ اکٹھی کر دی ہیں۔''[۸۴]

ڈاکٹر انیس ناگی کی کتاب ''معمار افسانہ نگار سعادت حسن منٹو'' میں موجود تحقیقی اغلاط کی نشان دہی شمشیر حیدر شجر کے تحقیقی مضمون سے تقابل کرتے ہوئے کی گئی ہے۔ شمشیر حیدر شجر نے یہ مضمون ڈاکٹر علی ثنا بخاری کے پی ایچ ڈی کے مقالہ سے مستعار لیا ہے جس کی اُنھوں نے نشان دہی نہیں کی۔[۸۵]

اس باب میں منٹو پر تصنیف کی گئی بارہ (۱۲) کتب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تعداد سے ظاہر ہے کہ یہ جائزہ مکمل نہیں اور بہت سی طبع زاد کتب شامل ہونے سے رہ گئی ہیں۔[۸۶] کتابت کی سیکڑوں اغلاط کی وجہ سے جملوں میں پائی جانے والی بے ربطی قاری کو نہ صرف الجھن میں ڈالتی ہے بلکہ بعض اوقات یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہے یا تحقیق کی۔ مثال کے طور پر مقالہ نگار نے انیس ناگی کی کتاب ''معمار افسانہ نگار سعادت حسن منٹو'' کا جائزہ لیتے ہوئے اس کتاب کا نام ''افسانہ نگار سعادت حسن منٹو'' لکھا ہے۔[۸۷]

سعادت حسن منٹو اپنی تخلیقات کی روشنی میں (ایک نفسیاتی جائزہ) میں لکھتے ہیں: ''اسی طرح فساد پر منٹو کے مختصر افسانے ''سیاہ حاشیے'' کے نام سے حسن عسکری نے مرتب کیے۔''[۸۸] جب کہ ایک اور مقام پر ممتاز شیریں کی کتاب ''منٹو: نوری نہ ناری'' کے مضمون ''منٹو کا تغیر اور ارتقا'' کو ''منٹو کے ذہنی ارتقا'' لکھا گیا ہے۔ یہ محض چند مثالیں تھیں ورنہ ہر صفحے پر اسی قسم کے شگوفے پھوٹتے نظر آتے ہیں۔

تیسرے باب میں ''منٹو سے متعلق مرتبہ تصانیف'' کا جائزہ لیا گیا ہے۔ان کتب کی تعداد سات ۷ ہے جن کے نام اور ترتیب درج ذیل ہے:

۱۔ ''سعادت حسن منٹو''، مرتبہ: ضیا ساجد۔
۲۔ ''سعادت حسن منٹو کے مقدمات''، مرتبہ: ڈاکٹر انیس ناگی۔

۳۔ ''سعادت حسن منٹو ایک مطالعہ''، مرتبہ: ڈاکٹر انیس ناگی۔

۴۔ ''دائیں بائیں اوپر نیچے''، مرتبہ: فرید احمد۔

۵۔ ''منٹو ایک کتاب''، مرتبہ: صہبا لکھنوی۔

۶۔ ''منٹو کیا تھا''، مؤلفہ: غلام زہرہ۔

۷۔) ''سعادت حسن منٹو۔ پچاس برس بعد'' مرتبہ شمشیر حیدر/نوید الحسن۔

اس باب میں گزشتہ باب کے بر خلاف زمانی ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا۔ مقالہ نگار نے ان کتب میں شامل مضامین کی محض تلخیص کر دی ہے۔ کتابت کی اغلاط جن کی بھر مار گزشتہ ابواب میں تھی جوں کی توں موجود ہیں جن کی وجہ سے جملوں کی ساخت بھونڈی، بے ربط اور بے معنی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ کتابت کی انہی اغلاط کی وجہ سے مقالہ نگار کا اُسلوب بیان ملاحظہ ہو۔ صہبا لکھنوی کی مرتبہ ''منٹو ایک کتاب'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب میں شامل مضمون اُنھوں نے ''افکار'' کے منٹو نمبر سے لیتے ہیں۔ منٹو کے حالات زندگی صہبا لکھنوی نے بیان کیے ہیں یہ تمام مضمون منٹو کے فن اور شخصیت کے حوالے سے بڑی اہمیت کے حوالے سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ مضامین کے علاوہ منٹو کی وفات مختلف شعرا کے اشعار بھی شامل ہیں۔''[۸۹]

ڈاکٹر انیس ناگی کی مرتبہ کتاب ''سعادت حسن منٹو ایک مطالعہ'' میں شامل ڈاکٹر سعادت سعید کے مضمون ''منٹو پر ایک تحقیقی مقالہ'' کا جائزہ لیتے ہوئے سعادت سعید کی ترجمانی اس طرح کی گئی ہے:

> ''اس کتاب کا آخری مضمون منٹو پر ایک تحقیقی مقالہ ''ڈاکٹر سعادت سعید کا ہے۔ اس مقالے میں اُنھوں نے برج پریمی کے پی ایچ ڈی کے مقالے پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور ان کی تحقیق و تنقید کے مطابق یہ ایک صحافی مقالہ ہے اور اس کا تمام مورد اُنھوں نے نقوش (منٹو پر) ابو سعید قریشی، اسد اللہ، ممتاز شیریں کے مضامین اور کرشن چندر وغیرہ کے مضامین سے اُٹھایا ہے اور اس طرح منٹو افسانوں، خاکوں، یا حقوق کی صحیح جامع انداز میں تقسیم بھی نہیں کر سکتے۔ نہ اُنھوں نے تنقیدی بصیرت سے کام لے کر منٹو کو کوئی نیا پہلو سامنے لا سکے ہیں۔''[۹۰]

ان اقتباسات سے مقالہ نگار کے جملوں کی بُنت، بے ربطی اور کتابت کی اغلاط کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ تمام مقالہ اسی اسلوبِ بیان کا حامل ہے۔

غلام زہرہ کی کتاب ''منٹو کیا تھا'' کے بارے میں ان کی رائے درست ہے کہ اس کی اشاعت محض شہرت کی خاطر کی گئی ہے اور مؤلفہ نے اس کی ترتیب میں تحقیقی بصیرت سے کام نہیں لیا۔

سات کتب کے جائزے پر مشتمل اس باب میں تمام کتب کے بارے میں ضروری معلومات مثلاً پبلشرز کے نام، سن اشاعت اور شامل مضامین پر خلاصہ نما تبصرہ اور بعض امور پر اختلافی نقطہ نظر اس باب میں دیکھنے کو ملتا ہے لیکن اسلوبِ بیان، سطحی نقطہ نظر اور کتابت کی سیکڑوں اغلاط نے اچھے خاصے موضوع کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا۔

مقالے کے چوتھے اور آخری باب "مجموعی جائزہ" میں گزشتہ تین ابواب میں کیے گئے مباحث کے خلاصہ کے بعد مقالہ نگار نے تمام طبع زاد اور مرتبہ کتب کی اپنے اپنے طور پر معنویت اور اہمیت کو اجاگر کیا۔ ممتاز شیریں اور وارث علوی کی تصنیفات کو مقالہ نگار منٹو پر اہم تنقیدی کتب قرار دیتے ہیں۔ مقالے کا اختتام وہ اس نتیجہ پر پہنچ کر کرتے ہیں:

"ہم نے پچاس برس میں صرف منٹو کا ٹکٹ جاری کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ منٹو کی پچاسویں برسی بھی گزری جارہی ہے لیکن منٹو شناسی تو ایک طرف خود منٹو کی تحریریں بھی صحت متین کے ساتھ شائع نہیں ہو سکیں۔" [۹۱]

"بیسویں صدی کے سیاسی و سماجی تناظر میں منٹو کے افسانوں میں عورت کا کردار"، محمد ندیم اسلم:

محمد ندیم اسلم نے ۲۰۰۶ء میں "بیسویں صدی کے سیاسی و سماجی تناظر میں منٹو کے افسانوں میں عورت کا کردار"، کے موضوع پر نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لنگویجز، اسلام آباد سے ڈاکٹر رشید امجد کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ان کا یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلا باب بعنوان "تاریخی پس منظر" دو ذیلی حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ "پانچ ہزار سالہ ہندوستانی ناری" دراصل بر صغیر پاک و ہند کی نسوانی زندگی کی پانچ ہزار سالہ قدیم تاریخ ہے۔ اس تاریخی تناظر اور مختلف تہذیبوں میں عورت کے سماج میں متعین مختلف مقامات کی تفصیل کے بعد باب کے دوسرے حصے "بیسویں صدی اور عورت کا نیا جنم" میں گزشتہ صدی میں عورت کے تصور اور عملی کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے باب "منٹو کا شعور اور اس کی عورتیں" میں منٹو کی تحریروں میں پیش کی گئی عورتوں کے کردار اور منٹو کے تصور عورت سے بحث کی گئی ہے۔ "منٹو کی عورتوں کا ارتقاء" مقالے کا تیسرا باب ہے۔ اس باب میں مقالہ نگار نے منٹو کی فنی روایت کی روشنی میں ان کے فن کا نسوانی کرداروں کے حوالے سے جائزہ لیا ہے۔

"منٹو کا تصور عورت" مقالے کا چوتھا باب ہے اس باب میں مقالہ نگار نے سعادت حسن منٹو کے تصور عورت کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے منٹو کے فن کی اس جہت کا مطالعہ جب کہ مقالے کے آخری باب بعنوان "منٹو کی عورتیں ارفاشی و عریانی کا مسئلہ" میں مقالہ نگار نے جامع انداز میں منٹو کی ایسی کہانیاں جنھیں فحش قرار دے کر مقدمات قائم کیے گئے، کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔

محمد ندیم اسلم کا یہ مقالہ ۲۰۰۹ء، میں "منٹو کی عورتیں" کے عنوان سے، پورب اکادمی، اسلام آباد نے مقالہ نگار کے قلمی نام ڈاکٹر روش ندیم کے ساتھ شائع کیا۔ [۹۲]

"سعادت حسن منٹو بطور مضمون نگار اور خاکہ نگار، تحقیقی و تنقیدی جائزہ"، کامران حسین کاظمی:

اردو کی جامعاتی تحقیق میں بالعموم منٹو کو بطور افسانہ نگار کے ہی جانچا اور پرکھا گیا ہے اور منٹو کی افسانہ نگاری کے مختلف گوشوں اور زاویوں کو سامنے لانے کی سعی کی گئی ہے۔ گو کہ بہت سے محققین نے منٹو کی افسانہ نگاری کے حوالے سے چبائے ہوئے لقمے ہی دوبارہ چبائے ہیں تاہم پھر بھی چند عمدہ تحقیقی مقالہ جات بھی موجود ہیں۔ منٹو کی غیر افسانوی نثر پر تاہم جامعات کی سطح پر بہت کم تحقیقاتی کام ہوا ہے۔ منٹو کی غیر افسانوی نثر کے حوالے سے کامران حسین کاظمی کا ایم فل کا مقالہ بعنوان "سعادت حسن منٹو بطور مضمون نگار اور خاکہ نگار" (تحقیقی و تنقیدی جائزہ) ۲۰۰۷ء میں شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لنگویجز، اسلام آباد میں ایم فل کی ڈگری کے لیے پیش کیا گیا۔ منٹو کے مضامین اور خاکے اس مقالے کا موضوع ہیں۔

کامران کاظمی نے اس موضوع کو سات (۷) ابواب میں تقسیم کیا ہے پہلے تین ابواب مضمون نگاری اور منٹو کے مضامین سے متعلق ہیں جب کہ اگلے تین ابواب خاکہ نگاری اور منٹو کی خاکہ نگاری سے متعلق ہیں جب کہ آخری باب مجموعی جائزے پر مشتمل ہے۔اس مقالے کی ابواب بندی اور ہر باب کی ذیلی تقسیم درج ذیل ہے:

باب اول: اردو میں مضمون نگاری کی روایت ا۔ مضمون نگاری(Essay) کا آغاز وارتقا: تحقیقی پس منظر، ب۔ مضمون اور مضمون نگاری کی فنی ضروریات، ج۔اردو میں مضمون نگاری کی روایت: اوّلین صورتیں اور ابتدائی مضمون نگار۔

باب دوم: سعادت حسن منٹو کے مضامین۔ اادبی و شخصی موضوعات ب۔ انشائی و فکاہی مضامین ج۔ سماجی و سیاسی موضوعات د۔ فلمی موضوعات

باب سوم: منٹو کی اہمیت بطور مضمون نگار ا۔ منٹو کے مضامین کا اسلوب ب۔ منٹو: عصر کا ترجمان ج۔ منٹو کی اہمیت بطور مضمون نگار۔

باب چہارم: اردو میں خاکہ نگاری کی روایت اور فن خاکہ نگاری ا۔ خاکہ نگاری کا فن ب۔اردو میں خاکہ نگاری کا تاریخی پس منظر

باب پنجم: منٹو کی خاکہ نگاری ا۔ سیاسی شخصیات کے خاکے ب۔ادبی و صحافتی شخصیات کے خاکے ج۔ فلم سے وابستہ شخصیات کے خاکے

باب ششم: فن خاکہ نگاری میں منٹو کا مقام ا۔ منٹو کا اسلوب خاکہ نگاری ب۔ منٹو اور ان کے ہم عصر خاکہ نگار: تقابلی مطالعہ ج۔ خاکہ نگاری میں منٹو کا مقام

باب ہفتم: مجموعی جائزہ

ہر باب کے آخر میں باب میں استفادہ کی گئی کتب کے حوالہ جات موجود ہیں۔جب کہ تمام ماخذات کی فہرست الف بائی ترتیب کے ساتھ مقالہ کے آخر میں دی گئی ہے۔ پہلے باب کا عنوان ''اردو میں مضمون نگاری کی روایت'' ہے۔اس باب میں مضمون نگاری کے آغاز وارتقا کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ بقول مقالہ نگار ''مضمون نگاری(Essay) کا بانی ایک فرانسیسی ادیب مائیکل ایکوم ڈی مونٹین کو قرار دیا جاسکتا ہے۔۔اس نے مضمون نگاری کا ۱۵۷۱ء میں آغاز کیا۔'' [۹۳]

اسی باب میں چند انگریزی مضمون نگاروں کی خدمات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اردو میں باقاعدہ مضمون نگاری کا آغاز انگریزی مضمون نگاری کے تتبع میں ہوا ہے۔اس باب کا دوسرا جز ''مضمون اور مضمون نگاری کی فنی ضروریات'' کا احاطہ کرتا ہے۔اس حصے میں مضمون نگاری کے فن اور تیکنیک کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مضمون کی مختلف تعریفوں اور اس کے مختلف حصے بھی اس جز میں زیر بحث لائے گئے ہیں۔اس باب کے تیسرے حصے میں اردو میں مضمون نگاری کی روایت اور اس کی اوّلین صورتوں کی کھوج اور جانچ کی گئی ہے۔ مقالہ نگار نے اردو نثر کی اوّلین صورتوں اور اس کے ارتقائی عمل کو زیر بحث لاتے ہوئے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ مضمون نگاری کی ایک صورت بہر حال انگریزی اثرات کے بغیر بھی ترویج پا رہی تھی تاہم ''اردو میں مضمون نگاری کا باقاعدہ آغاز دلی کالج سے ہوتا ہے۔'' [۹۴]

اس حصے میں اردو کے مختلف ابتدائی مضمون نگاروں کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے اور ان کے ابتدائی مضامین کے موضوعات کا احاطہ کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ اردو مضمون نگاری کی ترویج میں دلی کالج کی خدمات کا بھی محاکمہ کیا گیا ہے۔ اس امر کی بھی صراحت کی گئی ہے کہ اردو کے پہلے مضمون نگار سرسید نہیں بلکہ ''اردو مضمون نگاری جس کا آغاز دلی کالج سے ہوتا ہے اس کے اولین مضمون نگار ماسٹر رام چندر داس تھے۔'' [۹۵]

سرسید اور محمد حسین آزاد کے علاوہ سرسید تحریک کے دیگر زعما کہ نثری تحریروں کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ اردو مضمون نگاری کی روایت میں جہاں صحافت کا کردار اہم ہے وہیں ادبی مضمون نگاری نے مضامین کے موضوعات میں کئی جہات کا اضافہ کیا ہے، جن کا ذکر فاضل مقالہ نگار نے صراحت سے کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے بھی اردو مضامین کے موضوعات اور اسالیب میں متنوّع تجربات اور اضافے کیے ہیں۔ ترقی پسند مصنفین کے ذکر کے ساتھ مقالہ نگار منٹو کے عمومی ذکر پر اس باب کو ختم کرتے ہیں۔

دوسرا باب کا ''سعادت حسن منٹو کے مضامین''۔ چار ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے۔ جز الف میں منٹو کے ادبی موضوعات اور مختلف شخصیات پر لکھے گئے مضامین کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس حصے میں منٹو کے وسیع مطالعے نیز منٹو کی مختلف شخصیات سے وابستگی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ میکسم گورکی اور غالب وہ ادبی شخصیات ہیں جن سے مقالہ نگار کے مطابق، منٹو کو بہت دلچسپی تھی۔ مقالے کے اس حصہ میں مضامین منٹو کے ذریعے منٹو کے نظریہ فن کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً منٹو پر فحاشی کے کئی الزامات لگے اور بعض افسانوں پر تو باقاعدہ مقدمے قائم ہوئے۔ مقالہ نگار نے منٹو کے ایک مضمون ''افسانہ نگار اور جنسی مسائل'' کو زیر بحث لا کر منٹو پر چلنے والے فحاشی کے مقدمات کا جائزہ لینے کے علاوہ منٹو کے فحاشی سے متعلق نظریات کا محاکمہ بھی کیا ہے۔

انشائی اور فکاہی مضامین کے ذیل میں مقالہ نگار نے منٹو کے مضامین میں موجود طنز و مزاح کو موضوع بنایا ہے۔ ان مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ منٹو جتنا تلخ حقیقت نگار ہے اتنا ہی تند طنز کا نشتر بھی استعمال کرتا ہے۔ اس باب کا تیسرا جز مضامین منٹو کے سیاسی سماجی موضوعات پر مشتمل ہے۔ مذہب کی غلط تعبیر، سیاسی مفادات، عورتوں کی بے بسی اور لاچاری، مظلوموں کی مقتدر طبقات کی طرف سے حق تلفی وغیرہ جیسے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ گویا اس باب میں انشائی، فکاہی، ادبی، شخصی، سیاسی و سماجی اور فلمی موضوعات پر مبنی مضامین کے حوالے سے منٹو کے ادبی، سیاسی اور سماجی نظریات سے بحث کی گئی ہے، جس سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ منٹو کے سیاسی و سماجی اور ادبی نظریات ان کے عہد سے ہم آہنگ تھے۔ نیز منٹو کو اپنے عہد کے ایک اہم ابلاغی ذریعے یعنی فلم کی تیکنیک، مکالمہ نگاری، کہانی، ڈرامائیت اور فلم کی اہمیت کا بھی مکمل شعور تھا۔ ''منٹو جب فلمی صنعت سے وابستہ ہوئے تو (اس وقت) متکلم فلمیں بن رہی تھیں۔ (اور) ہندوستانی فلموں کا مرکز بمبئی تھا۔''[۹۶]

مقالہ نگار نے فلم کے حوالے سے منٹو کی جانکاری کو عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے۔

''منٹو کی اہمیت بطور مضمون نگار'' اس مقالے کا تیسرا باب ہے۔ اس باب کے جز الف میں مقالہ نگار نے منٹو کے مضامین کے اسلوب کا جائزہ لیا ہے۔ مقالہ نگار کا خیال ہے کہ منٹو کے بعض مضامین کا انداز تمثیلی اور بعض کا بیانیہ ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جو منٹو نے اپنے فن افسانہ نگاری سے اپنی دیگر نثری تحریروں میں مستعار لی ہیں۔ خود منٹو کا تنقیدی شعور بھی ان کے اسلوب کو نکھارنے میں معاون رہا ہے۔ ''منٹو: عصر کا ترجمان'' کے ذیل میں اس امر کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ نہ صرف اپنے افسانوں میں منٹو اپنے عصر کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ ان کے مضامین بھی اپنے اندر عصری آگہی رکھتے ہیں۔ مثلاً فسادات پر منٹو کا رویہ دیگر ترقی پسندوں کے بالکل برعکس رہا ہے۔ منٹو کا خیال ہے کہ فسادات کے دوران انسان پر کچھ وقت کے لیے پاگل پن سوار ہو گیا تھا اور اس کی جون بدل گئی تھی۔ تاہم منٹو فسادات کے بعد کی صورتحال کو بھی گرفت میں لاتا ہے اور انسانوں کی بحالی کے عمل پر زور دیتا ہے۔

مقالے کا چوتھا باب ''اردو میں خاکہ نگاری کی روایت اور فن خاکہ نگاری'' سے متعلق ہے۔ ابتدا میں فن خاکہ نگاری کے مغربی اور مشرقی تصورات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ لفظ ''خاکہ'' کے مختلف معانی کو بھی پرکھا گیا ہے اور بعد ازاں خاکہ کی متنوّع تعریفات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ خاکہ نگاری کے لوازمات کا درک بھی مقالہ نگار نے بخوبی کیا ہے۔ تاہم مغربی خاکے سے مثالیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ مقالہ نگار نے خاکہ نگاری کو دو اقسام میں منقسم کیا ہے۔ مقالہ نگار نے اسی باب میں اردو خاکہ نگاری کی روایت اور ارتقا پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ''اردو میں خاکہ نگاری کا تاریخی پس منظر'' اسی باب کا دوسرا حصہ ہے۔ ان کا یہ کہنا درست ہے کہ اردو خاکوں کی ابتدائی صورتیں مختلف تذکروں میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔

دیگر تمام ناقدین ادب کی طرح مقالہ نگار نے بھی مرزا فرحت اللہ بیگ کو اردو کا پہلا باقاعدہ خاکہ نگار اور ان کے خاکے ''نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' کو ہی اردو کا پہلا خاکہ قرار دیا ہے۔

مقالہ نگار نے منٹو کو اردو خاکے کے پاکستانی دور کا پہلا خاکہ نگار قرار دیا ہے۔ باب پنجم ''منٹو کی خاکہ نگاری'' کے ذیل میں منٹو کے خاکوں کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ابتدائی سطور میں منٹو کی خاکوں کی کتب ''گنجے فرشتے'' اور ''لاؤڈ سپیکر'' کے حوالے سے ڈاکٹر علی ثنا بخاری کا اقتباس دیا گیا ہے، جس میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ دراصل ''لاؤڈا سپیکر'' کا اصل نام ''گنجے فرشتے حصہ دوم'' تھا لیکن ناشر نے یہ نام بدل دیا۔[۹۷]

مقالہ نگار نے قائدِ اعظم اور ان کے ڈرائیور آزاد کے خاکے کو اردو خاکہ نگاری میں ایک منفرد تجربہ قرار دیا ہے۔ دیگر خاکوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک جزو ادبی اور صحافتی خاکوں پر مشتمل ہے اور دوسرا حصہ فلم سے منسلک شخصیات کے خاکوں پر مشتمل ہے۔ اُنھوں نے منٹو کے اس وصف کو سراہا ہے کہ وہ شخصیت کی تمام پوشیدہ پرتوں کو نمایاں کرنے کا فن جانتا ہے۔ ادبی شخصیات کی ادبی حیثیت کو بھی منٹو نے ایک ماہر نقاد کی طرح جانچا ہے۔ منٹو کیسی شخصیات کو اپنے خاکوں کا موضوع بنانا چاہتا ہے؟ اس کا جائزہ مقالہ نگار نے یوں لیا ہے:

> ''اپنے بہت سے دوستوں میں سے منٹو نے چند کو ہی خاکہ نگاری کے لیے منتخب کیا اور اکثر ایسے افراد کو چنا ہے جن کی طبع Eccentric یعنی معمول سے ہٹی ہوئی ہے۔ ان میں کوئی خاص کجی ہے جس نے افسانہ نگار منٹو کو متوجہ کیا اور وہ ایسی شخصیات کے ذہنی تجزیے پر آمادہ ہوئے، یہ دیکھنے کے لیے کہ موضوع شخص اپنے اس غیر معمولی پن کا شکار کیسے ہوا۔''[۹۸]

گویا منٹو کی نظر کسی فنکار کی کجیوں پر نہیں ہوتی بلکہ وہ شخصیت کے ٹیڑھ پن کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسی طرح فلم سے وابستہ اداکاروں اور اداکاراوں و دیگر کے خاکوں میں منٹو نے فلمی دنیا کی زندگی کے خفیہ گوشوں کو بھی بے نقاب کیا ہے اور ان فنکاروں کے اندر اتر کر ان کی زندگی کے تمام زاویوں کو پرکھا ہے۔ منٹو کیسے ان فنکاروں کی زندگی کی تہہ میں اترتا ہے اور شخصیت کی پرتیں اتارتا ہے اس کا اظہار مقالہ نگار نے بخوبی کیا ہے۔

مقالے کا چھٹا باب ''فن خاکہ نگاری میں منٹو کا مقام'' ہے۔ اس باب کے پہلے جزو میں مقالہ نگار نے منٹو کی خاکہ نگاری کے اسلوب سے بحث کی ہے۔ مقالہ نگار نے خود منٹو کے تصور خاکہ نگاری سے منٹو کے خاکوں کے اسلوب کو پرکھنے کی کلید وضع کی ہے۔

منٹو کے اسلوب میں بنیادی یا اساسی حیثیت خاکہ کے لیے شخصیت کے انتخاب کی ہے۔ منٹو ایسی شخصیت کو موضوع نہیں بناتے تھے جس میں اُسے نئے سرے سے دریافت کرنے کی گنجائش نہ ہو۔۔۔انہوں نے اپنی مخصوص اُفتادِ طبع کے باعث جستجو انگیز واقعات پر زیادہ توجہ دی ہے اور کسی شخص کی زندگی کے واقعات پیش کرتے ہوئے منٹو کی نظر زیادہ تر ڈرامائی واقعات پر ہی مرکوز رہتی ہے۔ لہٰذا ان کے خاکوں میں موجود تحیر کا عنصر اسی جستجو انگیزی اور ڈرامائیت سے ہی جنم لیتا ہے۔[۹۹]

اسی باب کے جزو 'ب' کا موضوع ''منٹو اور ان کے ہم عصر خاکہ نگار۔ تقابلی مطالعہ'' ہے۔ اس میں مقالہ نگار نے منٹو کا ایک عمومی تقابلی مطالعہ رشید احمد صدیقی، شاہد احمد دہلوی، محمد طفیل، چراغ حسن حسرت و دیگر سے خاکہ نگاروں کی امتیازی حیثیت کا مطالعہ بھی کیا ہے اور منٹو کے ان سے اشتراکات بھی تلاش کیے ہیں۔

آخری باب مجموعی جائزے پر مشتمل ہے۔ اس میں مقالہ نگار نے مقالے کے خلاصے کے علاوہ چند نتائج سے بھی بحث کی ہے۔ تاہم بہتر ہوتا کہ مقالہ نگار ان نتائج کو الگ سے مرتب کرتے اور کچھ سفارشات بھی تجویز کرتے۔ تاہم بطور مجموعی یہ مقالہ منٹو کی دو ایسی جہات کے تحقیقی اور تنقیدی جائزے پر مشتمل ہے، جس کی طرف بالعموم ناقدین نے کم توجہ دی ہے۔

''سعادت حسن منٹو اور سماجی حقیقت نگاری (معاصر افسانہ نگاروں کے فنی تناظر میں)''، انصار احمد:

انصار احمد کا یہ مقالہ ۲۰۰۹ء میں جامعہ کراچی سے ڈاکٹر یونس حسنی کی نگرانی میں مکمل ہوا۔ سات ابواب پر مشتمل اس مقالہ کی ابواب بندی اس طرح کی گئی ہے:۔

باب اول: حقیقت نگاری

باب دوم: اُردو نثر میں حقیقت نگاری

باب سوم: منٹو کے حالات زندگی

باب چہارم: منٹو کا عہد

باب پنجم: منٹو کی حقیقت نگاری اور معاصر افسانہ نگار

باب ششم: منٹو اور فحاشی

باب ہفتم: حقیقت نگاری کے حوالے سے اردو ادب میں منٹو کا مقام

۴۸ صفحات پر مشتمل پہلے باب ''حقیقت نگاری'' میں اردو کے علاوہ انگریزی اور دیگر زبانوں میں چلنے والی حقیقت نگاری کی تحریکوں اور نظریات کی روشنی میں حقیقت نگاری کا مفہوم متعین کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ادب کا حقیقت نگاری سے رشتہ، حقیقت نگاری کے مختلف تصورات، مغربی ادب میں حقیقت نگاری کے تصورات خصوصاً امریکہ اور برطانیہ میں، اردو میں حقیقت نگاری کی روایت، فورٹ ولیم کالج اور اس سے وابستہ ادیبوں اور مترجمین کی تصنیفات و تراجم کی تفصیلات کے علاوہ اردو شاعری اور ناول میں حقیقت نگاری کے مختلف پہلوؤں کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔
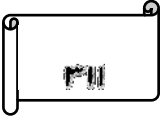
دوسرے باب بعنوان ''اردو نثر میں حقیقت نگاری'' کے تحت اردو نثر میں حقیقت نگاری کی اولین روایت کو سر سید اور ان کے رفقائے کار کی تحریروں سے جوڑتے ہوئے، ادب اور معاشرے پر اس تحریک کے اثرات، کے ساتھ ساتھ اردو افسانے کا آغاز اور ابتدائی رجحانات کے علاوہ پریم چند اور ان کے معاصر ادیبوں کی حقیقت نگاری اور اس کے اثرات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

تیسرے اور چوتھے ابواب میں منٹو کے حالات زندگی کے علاوہ منٹو کے عہد کا سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشی پس منظر، تقسیم ہند اور فسادات نیز منٹو کے متنوّع جنسی اور غیر جنسی رجحانات اور ادیبوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پانچویں باب میں جدید ادبی رویوں خصوصاً ترقی پسند تحریک اور اُس کے ادب پر اثرات کے نتیجے میں حقیقت نگاری کے رجحان اور فروغ کا جائزہ سعادت حسن منٹو اور ان کے معاصرین، احمد علی، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، کرشن چندر، حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی، اور اوپندر ناتھ اشک کی تخلیقات میں موجود حقیقت نگاری کے تناظر میں لیا گیا۔

''چھٹے باب'' بعنوان ''منٹو اور فحاشی'' منٹو کی ان تخلیقات میں موجود حقیقت نگارانہ پہلوؤں کو سامنے لاتی ہے۔ جنہیں ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں نے فحش تصور کر کے تعزیرات ہند اور پاکستان کے تحت مقدمے قائم کیے۔ گویا منٹو کی جنسی حقیقت نگاری اس باب کا اصل موضوع ہے۔ جب کہ ساتویں اور آخری باب میں ''حقیقت نگاری کے تناظر میں سعادت حسن منٹو کا اردو ادب میں مقام اور مرتبہ متعین کیا گیا ہے۔

پہلے باب ''حقیقت نگاری اور دوسرے باب ''اردو نثر میں حقیقت نگاری کو الگ الگ باب کی بجائے اگر ایک ہی باب بنا دیا جاتا تو زیادہ بہتر تھا۔ اسی طرح تیسرا باب ''منٹو کے حالات زندگی'' چوتھا باب ''منٹو کا عہد'' بھی علیحدگی کی بجائے یکجائی کا متقاضی ہے۔ چھٹے باب کا عنوان ''منٹو اور فحاشی'' کے بجائے اگر منٹو کی جنسی حقیقت نگار تجویز کر دیا جاتا تو موضوع کے ساتھ مطابقت پیدا کی جاسکتی تھی۔ مقالہ نگار کی ابواب بندی اور اس کے نتیجے میں کیے گئے مباحث کے بعد یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ انصار احمد نے اصل موضوع یعنی سعادت حسن منٹو کی حقیقت نگاری کی بجائے حقیقت نگاری کی روایت کو اپنے مقالے کا موضوع تصور کر لیا ہے۔ منٹو کے حالات زندگی اور تصنیفات کی تفصیلات کے لیے پورا ایک باب مختص کیا جانا بھی غیر ضروری اور موضوع سے مطابقت نہیں رکھتا۔ جب کہ مقالہ نگار نے پیش لفظ میں یہ دعویٰ بھی کیا کہ :

> ''منٹو پر اب تک جو تحقیقی کام ہوئے ہیں، ان میں روایتی انداز اختیار کرتے ہوئے منٹو کے حالات زندگی اور ان کی تحریروں کے محض سرسری جائزوں پر اکتفا کیا گیا ہے۔'' [۱۰۰]

برج کیش ایمہ اور علی ثناء بخاری کے مقالہ جات میں شامل منٹو کی سوانح کے متعلق لکھے گئے تفصیلی ابواب، جواب منٹو کے سوانحی ریفرنس بن چکے ہیں، مقالہ نگار کے دعویٰ کی نفی کرتے ہیں۔ ان مقالہ جات کے علاوہ بیشتر مقالہ جات میں منٹو کی سوانح حیات کا جائزہ لازمی عنصر کے طور پر موجود ہے۔ منٹو کی سوانح حیات کی اہمیت اپنی جگہ لیکن ہر اہم چیز کو ایک ہی مضمون یا مقالے میں نہیں ٹھونسا جا سکتا۔ وہ تخصیص جو مقالے کی تسوید کی اصل وجہ ہے، اس کے مطابق ہی خاکہ ترتیب دیا جانا چاہیے۔

دوسرے باب ''اردو ادب میں حقیقت نگاری'' کی ذیل میں دراصل اردو کی پوری نثری روایت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ ملا وجہی کی سب رس پہلی ادبی تصنیف یا ترجمہ ہے مگر اس کے مترجم کو پہلا حقیقت نگار قرار دینا تعجب خیز ہے۔ اس ضمن میں مقالہ نگار لکھتے ہیں:

> ''داستانی اردو ادب میں حقیقت نگاری کے اس اولین دیے کو روشن کرنے والا اردو کا سب سے پہلا حقیقت نگار دکن کا مشہور شاعر ملا وجہی ہے۔'' [۱۰۱]

یعنی اردو کی پہلی ادبی نثری تصنیف سے لیکر فورٹ ولیم کالج کے مترجمین / مصنفین سر سید اور ان کے رفقائے کار کی نثر، اردو افسانے کے ابتدائی اور وسطی رجحانات اور ان مختلف الموضوع رجحانات کے حامل نثر نگاروں کے فکر و فن کا جائزہ ہی لینا تھا تو پھر باب کا عنوان تبدیل کر کے ''اردو نثر کی روایت'' رکھ لیا جاتا تو زیادہ بہتر تھا۔

مقالے کے پانچویں باب ''منٹو کی حقیقت نگاری اور معاصر افسانہ نگار'' میں ایک بار پھر بنیادی کی بجائے ثانوی موضوع پر بحث تفصیل سے ملتی ہے۔ علامہ اقبال، پریم چند اور حسرت موہانی کے ترقی پسندانہ افکار سے ہوتے ہوئے مقالہ نگار ترقی پسند تحریک کے قیام سعادت حسن منٹو کے ترقی پسندانہ رجحانات اور ترقی پسندوں کے ساتھ منٹو کے نظریاتی اختلافات اور پھر معاصر افسانہ نگاروں، احمد علی، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، کرشن چندر، حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی، اور اوپندر ناتھ اشک کی حقیقت نگاری کی بحث باب ہذا کے ساٹھ صفحات پر محیط ہے۔ جب کہ اسی باب کے اگلے بائیس صفحات سعادت حسن منٹو کی افسانوی تکنیک پر صرف کر دیے گئے۔ باب پنجم ہی میں شامل ضمنی عنوان ''منٹو کی حقیقت نگاری کی خصوصیت جس پر مقالے کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ مقالے کا سب سے اہم حصہ ہے اور موضوع کے ساتھ عین مطابقت رکھتا ہے، کے لیے تینتیس صفحات مختص کیے گئے ہیں۔ گویا ۱۲۳ صفحات پر مشتمل اس باب میں اصل موضوع پر ایک چوتھائی صفحات ہی تحریر کیے گئے ہیں۔ منٹو کی حقیقت نگاری کو مقالہ نگار ان کے تجربے، مشاہدے اور مطالعے کی دین قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''منٹو کی حقیقت نگاری کی عطا یہ ہے کہ ان کے افسانوں کے موضوعات جو زندگی سے کشید کیے ہوئے ہیں۔ بعض اوقات پڑھنے والے پر زندگی کی نت نئی اور گہری حقیقتوں کا انکشاف کرتے ہیں۔'' [۱۰۲]

مقالہ نگار کے مطابق منٹو واحد افسانہ نگار ہیں جنہوں نے نچلے اور متوسط طبقے کی ملمع چڑھی ہوئی زندگی کو جب انتہائی قریب سے دیکھا تو اپنے تیز ناخنوں کی مدد سے اُس ملمع کو کھرچ ڈالا اور اس کے باطن سے تصنع سے پاک جو زندگی بر آمد کی وہ ان کے افسانوں کی روح بھی ہے اور حقیقت نگاری کی نمایاں خصوصیت بھی۔ مخصوص قسم کی حقیقت نگاری کی بجائے ادب میں موجود حقیقت نگاری کی کم و بیش سبھی اقسام کو اُنھوں نے اپنی کہانیوں میں پیش کیا۔ لہذا مقالہ نگار نے منٹو کی مختلف کہانیوں کے جائزے کے بعد منٹو کو اشتراکی نفسیاتی، کرداری، باطنی، سیاسی، سماجی اور جنسی حقیقت نگار قرار دیتے ہوئے اپنے معاصرین سے منفرد اور ممتاز افسانہ نگار ثابت کیا۔ چھٹے باب ''منٹو اور فحاشی'' میں فحاشی کا مفہوم، فحاشی اور عریانی کے مابین فرق، قدیم شعرا کے ہاں موجود فحش عناصر، مذہبی کتابوں کے قابل اعتراض حصوں کے علاوہ منٹو اور حقیقت نگاری کے تقاضے اور سعادت حسن منٹو کی کہانیوں پر لگنے والے فحاشی کے الزامات کے تحت قائم مقدمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''منٹو اُردو کے وہ یکتا افسانہ نگار ہیں جن کے پاس کئی موضوعات کے علاوہ جنسی موضوعات پر بھی کثیر سرمایہ موجود ہے۔ جس میں ان کا تنقیدی شعور حیرت انگیز طور پر گہرائی و گیرائی لیے ہوئے ہے۔''[۱۰۳]

مقالہ نگار کے مطابق منٹو کی حقیقت نگاری میں جنسی کیفیات کا جو مفصل بیان ملتا ہے اس میں اعتدال اور توازن کی مناسب صورت نظر آتی ہے۔ جنسی موضوعات پر لکھتے ہوئے اُنھوں نے طوفانی بغاوت کی بجائے انسانیت کی بہترین اقدار اور اخلاقی احساسات کو مد نظر رکھا۔ منٹو پر لگائے جانے والے فحاشی کے الزامات کو مقالہ نگار تعصب اور تنگ نظری کی دین قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''منٹو پر فحاشی، عریانی اور ماضی پرستی کے الزامات لگانے والے یہ بات کیوں فراموش کر دیتے ہیں کہ اُن کے مقلدین اور پیروکار خود ان نظریات و عقائد کی پاسداری کرتے رہے ہیں۔''[۱۰۴]

مقالے کے آخری باب میں اُنھوں نے سعادت حسن منٹو کا اردو افسانے میں حقیقت نگاری کے حوالے سے مقام و مرتبہ اور انفرادیت کا تعین کرتے ہوئے اُنھیں واحد حقیقت نگار ثابت کیا جن کی تحریریں ان کے معاصرین کی طرح یک رخی یا یک رنگی نہیں بلکہ متنوّع رنگ کی حامل ہے۔ ۵۰۵ صفحات پر مشتمل انصار احمد کا یہ مقالہ کمزور ابواب بندی غیر متعلق مباحث کی افراط اور منٹو کی حقیقت نگاری کی بجائے ''حقیقت نگاری'' کی روایت کا احاطہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔

''منٹو کے سیاسی شعور کا تحقیقی مطالعہ''، روبینہ یاسمین:

روبینہ یاسمین نے یہ مقالہ ڈاکٹر علی ثناء بخاری کی نگرانی میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم۔ فل کی ڈگری کے حصول کے لیے ۲۰۱۰ء میں تحریر کیا۔ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے جن کی ترتیب حسب ذیل ہے:

باب اول: بیسویں صدی کا سیاسی منظر نامہ

باب دوم: منٹو کے افسانے

باب سوم: خاکے اور ڈرامے

باب چہارم: مضامین اور دیگر تحریریں

باب پنجم: مجموعی جائزہ

تکمیل کے دو سال بعد منٹو صدی ۲۰۱۲ کے موقع پر مقالہ نگار نے یونیورسٹی کی باقاعدہ اجازت کے بعد اس مقالے کو مثال پبلشرز، فیصل آباد سے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔[۱۰۵]

''منٹو کے افسانوی ادب پر موپاساں کے اثرات''، ریاض قدیر:

منٹو کے افسانوی ادب پر موپاساں کے اثرات'' ریاض قدیر کے تحقیقی مقالہ کا عنوان ہے۔ اُنھوں نے یہ مقالہ ڈاکٹر عقیلہ شاہین کی نگرانی میں دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاول پور سے ۲۰۱۲ء میں مکمل کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ پانچ ابواب پر مشتمل مقالہ کی ابواب بندی اس طرح کی گئی ہے:۔

پہلا باب: فرانسیسی اور اُردو افسانے کی روایت

دوسرا باب: منٹو اور موپاساں کے افسانوی ادب کے موضوعات

تیسرا باب: منٹو پر موپاساں کے اثرات، اشتراک اور اختلاف

چوتھا باب: منٹو اور موپاساں کے تقابلی مباحث

پانچواں باب: منٹو پر موپاساں کے افسانوی ادب کے اثرات کا تقابلی مطالعہ۔۔۔ نتائج

پہلے باب ''فرانسیسی اور اُردو افسانے کی روایت کو دو اجزاء میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں اردو افسانہ منٹو کے عہد تک جب کہ دوسرے حصے میں فرانسیسی افسانے کی روایت کا جائزہ موپاساں کے عہد تک لیا گیا ہے۔ ۳۹ صفحات پر مشتمل اس باب میں فرانس کے سیاسی حالات اور دو چار ناول نگاروں کے تذکرے کے بعد موپاساں کے حالات زندگی اور تخلیقات کی فہرست درج کر دی گئی ہے۔ اور اسے ہی مقالہ نگار نے فرانسیسی افسانے کی روایت سے تعبیر کر لیا ہے۔ اسی طرح باب کے دوسرے حصے یعنی اُردو افسانے کا ارتقاء کے ضمن میں بھی ڈھائی صفحات پر مبنی اُردو افسانے کی نامکمل روایت کے بعد سعادت حسن منٹو کے حالات زندگی، مختلف اداروں سے وابستگی اور منٹو کے ڈراموں کے موضوعات کا ۱۲ صفحات پر مشتمل موضوع سے ہٹ کر طویل جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں فرانسیسی اور اُردو افسانے کی روایت پر خاطر خواہ بحث کی بجائے ادھر اُدھر کی باتیں کر کے محض صفحات کا پیٹ بھرا گیا ہے۔

مختصر اور عجلت میں لکھے گئے اس باب کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ پی ایچ ڈی کی سطح پر لکھے جانے والے مقالہ جات میں اس طرح کی فحش غلطیوں سے صرف نظر کیوں کر کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً

> ''منٹو کی پیدائش ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء کو سمبرانہ ضلع لدھیانہ میں میاں غلام حسین کے ہاں ہوئی۔'' [۱۰۶]

اسی طرح منٹو کی وفات کے متعلق اُنھوں نے جو تواریخ درج کی ہیں ان کو دیکھ کر سر پیٹنے کو جی کرتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''سعادت حسن منٹو ۱۸ اگست، ۱۹۵۴ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔'' [۱۰۷]

نہ ہی منٹو کے والد کا نام میاں غلام حسین تھا اور نہ ہی منٹو ان تواریخ میں اپنے خالق حقیقی سے جا کر ملے۔

دوسرے باب ''منٹو ار موپاساں کے افسانوی ادب کے موضوعات'' میں ہر دو تخلیق کاروں کے موضوعات کا یکے بعد دیگرے جائزہ لیا گیا ہے۔ موپاساں کے موضوعات کو درج ذیل چار موضوعات کا حامل قرار دیا، شہروں کی بورژوا زندگی، نارمن مزدور، فرانس اور پروشیا (جرمنی) کی جنگ سے پیدا ہونے والے مسائل اور پیرس کی فیشن ایبل زندگی۔ منٹو کی طرح موپاساں نے بھی بہت کم عمر پائی۔ ۱۸۸۰ء سے ۱۸۹۰ء کے درمیانی دس سالوں میں اُنھوں نے تقریباً تین سو افسانے تحریر کیے۔ بقول مقالہ نگار:

> ''ان دس برس میں زندگی کی غیر یقینی فضا اور پھر بدلتے تناظر میں موپاساں نے ایک تخلیقی فنکار کی آنکھ سے جو کچھ دیکھا، دل سے محسوس کیا اور دماغ سے جو کچھ سوچا اسے اپنے افسانوں میں پیش کر دیا۔'' [۱۰۸]

مقالہ نگار کے نزدیک موپاساں نے اپنے افسانوں میں جنگ سے نفرت، فرانس کے سیاسی حالات، دنیا کی بے ثباتی، تنہائی، جذبہ حب الوطنی، قومی ہیروز کی عظمت کا اعتراف، قوم پرستی، اخلاقیات، مجوزہ معاشی اقدار و قوانین غربت، انسانی عظمت، کا مذاق، مذہبی طبقے کی ریاکاری، فرانسیسی معاشرے میں عورت کے مختلف روپ کے علاوہ معاشی اور معاشرتی استحصال کو موضوع بنایا۔

موپاساں کے اشتعالی اور استحصالی رویوں کے حامل کرداروں کی فہرست کے بعد سعادت حسن منٹو کے افسانوی ادب کے موضوعات کو پانچ بڑے اور چھے ضمنی موضوعات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ فسادات و ہجرت، سیاسی حالات کے معاشرتی و سماجی تضادات، جنسی نفسیات اور عورت کے جنسی استحصال کو منٹو کے بڑے موضوعات جب کہ متوسط طبقے کی بے رحمی، ریاکاری کا غلبہ، عزت نفس کی پامالی، انسان دوستی، غربت اور بد حالی، خاندانی نظام اور ان کے مابین جھگڑوں کو ضمنی موضوعات قرار دیا گیا ہے۔ ان تمام موضوعات پر لکھے گئے منٹو کے چیدہ چیدہ افسانوں کی فہرست کے بعد ان افسانوں کا خلاصہ نما تجزیہ اقتباسات کی بھرمار کے ساتھ کیا گیا ہے۔ دوسرے باب کو بغیر کوئی منطقی نتیجہ نکالے ختم کر دیا گیا ہے۔ تیسرا باب، منٹو پر موپاساں کے اثرات، اشتراک اور اختلاف'' میں ہر دو افسانہ نگاروں کی تحریروں میں موجود اشتراک اور اختلاف کے علاوہ منٹو پر موپاساں کے اثرات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس باب کا آغاز منٹو اور موپاساں کے افسانوں میں پلاٹ کی تشکیل اور دونوں تخلیق کاروں کی تحریروں میں موجود پلاٹ کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق:

> ''منٹو اور موپاساں دونوں کے ہاں افسانے کا آغاز حیرت، انفرادیت، جذباتیت اور تنوع کا حامل ہے۔ جس میں منظر کشی، کرداروں کا تعارف، واقعات، مکالماتی انداز و گفتگو، فضا اور صورت حال کی عکاسی اور جذباتی اتار چڑھاؤ سبھی کچھ شامل ہے۔''[۱۰۹]

دونوں افسانہ نگاروں کے پلاٹ کا تجزیہ کرتے ہوئے مقالہ نگار یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ منٹو اور موپاساں کے افسانوں کے پلاٹ کے اجزائے ترکیبی میں کہیں کہیں مماثلت دکھائی دیتی ہے۔ مگر منٹو کی فنی عظمت اس کے افسانوں کے پلاٹ کی تعمیر میں اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ موپاساں کے مقابلے میں منٹو کے تشکیل کردہ پلاٹ زیادہ مربوط ہیں۔ پلاٹ کے ساتھ ساتھ دونوں افسانہ نگاروں کے تخلیق کردہ کرداروں، صورت واقعہ، نسوانی کرداروں کی تذلیل کے اسباب، نفسیاتی پہلوؤں میں موجود مماثلت کا جائزہ لیا گیا ہے۔

چوتھے باب ''منٹو اور موپاساں کے تقابلی مباحث'' میں مقالہ نگار دونوں افسانہ نگاروں کا لسانی تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ منٹو کے افسانوں کی زبان اُردو نہ تو فرانسیسی زبان کی طرح بہت قدیم تھی اور نہ ہی اسے ابتدا میں فرانسیسی مصنفین کی طرح بڑے ادیب میسر آئے تھے بلکہ منٹو کی زبان تو اپنا علاقائی تاثر بھی ساتھ لیے ہوئے ہے۔ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''موپاساں کو ایک ترقی یافتہ اور فصیح و بلیغ زبان کا تحفہ ورثے میں ملا جسے اس نے فنی چابک دستی سے اظہار کے لیے استعمال کیا۔ مگر منٹو نے نسبتاً محدود ذخیرہ الفاظ اور مختصر تاریخ و روایت کی حامل زبان میں اسلوب کے کئی رنگ پیدا کیے۔''[۱۱۰]

پلاٹ، کرداروں اور موضوعات کی طرح منٹو اور موپاساں کے اسلوب میں موجود مشترک اور متضاد عوامل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

مقالے کے آخری باب ''منٹو پر موپاساں کے افسانوی ادب کے اثرات کا تقابلی مطالعہ ۔۔۔ نتائج'' میں گزشتہ ابواب میں کی گئی بحث کا نتیجہ نکالا گیا ہے۔ بقول مقالہ نگار منٹو اور موپاساں کے افسانوی ادب میں پائی جانے والی مماثلت محض، موضوعات، کردار، کسی حد تک تکنیک اور سوانحی حالات تک ہی محدود ہے جب کہ ان کے سماج، معاش، معاشرت، تہذیب، ثقافت، مذہبی شعار، اخلاقی

اقدار، ذاتی کردار، افکار، کرداروں کی رنگارنگی، پلاٹ کی تعمیر اور اسلوب میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ موضوعات، تصور عورت، بچوں کی جنسی نفسیات، پلاٹ کی تعمیر، حقیقت نگاری کے تناظر میں صاحب مقالہ منٹو کو موپاساں سے بڑا افسانہ نگار قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگرچہ منٹو اور موپاساں میں مماثلت ضرور ہے لیکن مذکورہ دلائل منٹو کو موپاساں سے کہیں بڑا اور بلند فکر افسانہ نگار ثابت کرتے ہیں۔''[۱۱۱]

آخری باب میں اخذ شدہ نتائج کے مطابق موپاساں کے مقابلے میں منٹو کو قدرے بڑا افسانہ نگار قرار دیا گیا ہے۔ ہر دو افسانہ نگاروں میں مماثلت کم اور انفرادیت کے پہلو زیادہ سامنے آئے ہیں۔ مقالہ نگار کے نتائج کو تسلیم کر لیا جائے تو مقالے کی بنیاد جس ستون پر کھڑی کی گئی ہے وہ دھڑام سے زمین بوس ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ کیوں کہ ان نتائج سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ منٹو پر موپاساں کے اثرات نہ ہونے کے برابر ہیں اور یہ کہ موپاساں کی نسبت منٹو زیادہ بڑے تخلیق کار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ گویا وہ ساری تنقیدی تھیوری غلط ثابت ہوتی ہے جو ممتاز شیریں کے علاوہ دیگر ناقدین نے پیش کی ہے جس میں اُنھوں نے منٹو کو اُردو کا موپاساں قرار دے رکھا ہے۔ ۳۱۳صفحات پر مشتمل اس تحقیقی و تنقیدی مقالے کے ہر صفحے پر موٹے حروف پر مشتمل ۱۶ سطور درج کرنے کا مقصد محض صفحات کی تعداد بڑھانے کے علاوہ کچھ نہیں۔ مجموعی طور پر یہ ایک اوسط درجے کا مقالہ ہے۔ جس پر مقالہ نگار کی گرفت بہت ڈھیلی ہے۔

ایم اے، ایم فل اور پی ایچ۔ ڈی کی سطح پر لکھے گئے ان تحقیقی مقالہ جات کے علاوہ ایسے مقالہ جات جس میں سعادت حسن منٹو کے فن پر خصوصی ابواب لکھے گئے کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:۔

پی۔ ایچ ڈی کی سطح پر لکھے گئے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مقالہ جات میں، آغاز مسعود رضا خاکی ''اردو افسانے کا ارتقاء''، غلام حسین ''اردو افسانے کا نفسیاتی مطالعہ'' محمد انور الدین سدید، ''اردو ادب کی تحریکیں'' انوار احمد، اردو افسانہ، اپنے سیاسی و سماجی تناظر میں، فردوس انوار قاضی ''اردو افسانہ نگاری کے رجحانات'' خالد محمود سنجرانی ''اردو افسانے کے ابنارمل کردار'' جب کہ ایم اے اردو کے لیے مختلف موضوعات پر لکھے گئے ایسے مقالے جن میں منٹو کا ابواب کی صورت میں جائزہ لیا گیا مندرجہ ذیل ہیں: تقسیم کے بعد اردو افسانہ'' از جی۔ ایم خلجی، ''اردو ادب میں شخصیت نگاری'' از نگہت افزا بخاری، ''غلام عباس'' از ثاقب عبدالرحیم، ''اردو افسانے میں مزاح نگاری'' از تسنیم کوثر، ''ترقی پسند افسانہ نگاروں میں رومانوی عناصر'' از افروز اسماعیل، ''اردو افسانے میں حقیقت پسندی کی روایت'' از رشیدہ خواجہ مظہر، ''اردو میں مضمون نگاری کا ارتقاء'' از اکمل علیمی، ''اردو افسانے میں علامت نگاری'' از اعجاز حسین، ''اردو فکشن پر تقسیم ہند کے اثرات'' از سمیر البشیر، ''اردو افسانہ اور فسادات ۱۹۴۷ء'' از شعیب عتیق خان، ''اردو افسانے میں مزاح نگاری'' از تسنیم کوثر، ''اردو میں ترقی پسند افسانہ'' از افضل الٰہی زکریا، ''اردو ناول اور افسانے میں طوائف کا کردار'' از فہیم ثناءاللہ عامر، ''ترقی پسند افسانہ نگاروں میں رومانوی عناصر'' از افروز اسماعیل، ''اردو افسانہ اور فسادات'' از ظفر اقبال، ''پاکستانی اردو افسانہ اور معاشرتی مسائل'' از علی اطہر زیدی، ''جدید اردو افسانہ اور نفسیات'' از نسرین کوثر جب کہ ایم فل کی سطح پر شازیہ طارق پنہاںؔ کے مقالے ''اردو افسانے میں فطرت نگاری'' میں ''منٹو کی فطرت نگاری'' پر مکمل باب لکھا گیا ہے۔[۱۱۲]

منٹو کی شخصیت اور فن پر لکھے گئے ان تحقیقی تنقیدی مقالہ جات کے مطالعہ سے یہ نتیجہ بآسانی نکالا جا سکتا ہے کہ اردو کے عظیم افسانہ نگار پر جامعاتی سطح پر کی جانے والی تحقیق اور تنقید صحیح معنوں میں منٹو کی شخصیت اور فن کا احاطہ نہیں کر پائی۔ ایم اے کی سطح پر سوائے دو ایک مقالہ جات کے دیگر تمام مقالہ جات ناقص تحقیق اور بودی تنقید کا نمونہ قرار دی جا سکتی ہیں۔ بیشتر محققین نے دیگر مقالہ جات اور رسائل و مضامین سے صفحات جوں کے توں اُٹھا لیے ہیں۔ اس کے علاوہ تحقیقی طور پر بھی ان میں بہت سی خامیاں موجود ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ تمام مقالہ جات ادنیٰ قسم کی طالب علمانہ کوششیں ہیں اور ان سے منٹو کے باب میں تفہیم کی بجائے بہت سی غلطیوں نے جنم لیا ہے۔ سوائے برج کیش ایمہ، علی ثناء بخاری اور محمد ندیم اسلم کے کسی بھی مقالہ نگار نے تحقیق اور تنقید کے اصولوں کو مد نظر نہیں رکھا۔ چناں چہ منٹو جیسے متنوّع موضوعات کے حامل ادیب پر از سر نو تحقیق کے اشد ضرورت ہے تاکہ اردو کے بہت بڑے افسانہ نگار کا اصل چہرہ ہمارے سامنے آ سکے۔

حوالہ جات

۱۔ نصرت یاسین: ''منٹو کے افسانے''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۱ء، ص ۴۵۱۔
۲۔ نصرت یاسین: ''منٹوا کے فسانے''، ص ۵۲، ۵۳۔
۳۔ کرشن چندر: ''منٹو (نئے ادب کے معمار)''، کتب پبلشرز لمیٹڈ، بمبئی، ۱۹۴۸ء، ص ۹۔
۴۔ نصرت یاسین: ''منٹو کے افسانے''، ص ۵۸۔۵۹۔
۵۔ ______ ایضاً ______ ص ۱۴۶۔
۶۔ ______ ایضاً ______ ص ۱۴۹۔
۷۔ فرحت وشیر: ''منٹو، غلام عباس اور احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں حقیقت نگاری''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۳۰۔
۸۔ ______ ایضاً ______ ص ۳۵۔
۹۔ ______ ایضاً ______ ص ۴۳۔
۱۰۔ توصیف اختر: ''منٹو کے افسانوں میں معاشرتی مسائل''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۸۳۔
۱۱۔ فرحت وشیر: ''منٹو، غلام عباس اور احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں حقیقت نگاری''، ص ۵۳۔
۱۲۔ ______ ایضاً ______ ص ۹۹۔
۱۳۔ توصیف اختر: ''منٹو کے افسانوں میں معاشرتی مسائل''، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے ایم اے، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۲۔
۱۴۔ توصیف اختر: ''منٹو کے افسانوں میں معاشرتی مسائل''، ص ۷۱۔
۱۵۔ ______ ایضاً ______ ص ۸۶۔
۱۶۔ ______ ایضاً ______ ص ۱۰۸۔۱۰۹۔
۱۷۔ بخاری، علمدار حسین: ''سعادت حسن منٹو۔ شخصیت اور فن''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے اردو، ملتان یونیورسٹی، ملتان ۱۹۷۹ء، ص ۲۔
۱۸۔ محمد محسن اور ڈاکٹر کہکشاں پروین نے اس کا تلفظ ''سمرالہ'' درج کیا ہے۔
۱۹۔ بخاری، علمدار حسین: ''سعادت حسن منٹو۔ شخصیت اور فن''، ص ۳۔
۲۰۔ دیکھئے: علی ثنا بخاری: ''سعادت حسن منٹو (سوانح اور ادبی کارنامے)''، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۷۔۲۴۔
۲۱۔ بخاری، علمدار حسین: ''سعادت حسن منٹو۔ شخصیت اور فن''، ص ۳۔
۲۲۔ ______ ایضاً ______ ص ۴۸۔
۲۳۔ ______ ایضاً ______ ص ۵۰۔

۲۴۔ زاہد رحیم زاہد: ''سعادت حسن منٹو کے افسانوں کے چند اہم کردار''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۹، ص ۵۳۔

۲۵۔ ______ایضاً______ ص ۹۷۔

۲۶۔ ______ایضاً______ ص ۱۲۸۔

۲۷۔ ______ایضاً______ ص ۱۲۹۔

۲۸۔ ______ایضاً______ ص ۱۵۳۔

۲۹۔ بہت سے رسائل کے منٹو نمبر اور اخبارات میں چھپنے والے مضامین کے علاوہ تحقیقی مقالہ جات اور کتابیں اور درجنوں مضامین ۹۷ءتک شائع ہو چکے تھے۔

۳۰۔ علی ثنا بخاری: ''سعادت حسن منٹو (سوانح اور ادبی کارنامے)''، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۲۔

۳۱۔ ______ایضاً______ ص ۲۴۔

۳۲۔ Fleming Liesli,"The Life and Works of Saadat Hassan Manto", P.21, Univiersity of Wisconsin, 1973

۳۳۔ علی ثنا بخاری: ''سعادت حسن منٹو (سوانح اور ادبی کارنامے)''، ص ۵۳۔ ۵۴۔

۳۴۔ Fleming Liesli,"The Life and Works of Saadat Hassan Manto", P.34

۳۵۔ ''منٹو کے خطوط قاسمی کے نام''، کتاب نماز، راولپنڈی، ۱۹۶۶ء، ص ۱۲۵۔

۳۶۔ کرشن چندر: ''منٹو''، کتب پبلشرز، بمبئی، ۱۹۴۸ء، ص ۱۴۔

۳۷۔ علی ثنا بخاری: ''سعادت حسن منٹو (سوانح اور ادبی کارنامے)''، ص ۱۰۰۔

۳۸۔ حامد جلال: ''منٹو ماموں کی موت''، ''نقوش''، منٹو نمبر، ۱۹۵۵ء، ص ۳۹۰۔

۳۹۔ علی ثنا بخاری نے اپنے دعویٰ کی بنیاد منٹو کی بڑی بہن ناصرہ اقبال کے ذاتی انٹرویو پر رکھی ہے جو اُنھوں نے ۱۳ نومبر ۱۹۸۳ء کو مقالہ نگار کو دیا تھا۔

۴۰۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: ''سعات حسن منٹو'' از انیس ناگی، فیروز سنز، لاہور ۱۹۸۴ء، ص ۳۱۔ ۳۲۔

۴۱۔ علی ثنا بخاری: ''سعادت حسن منٹو (سوانح اور ادبی کارنامے)''، ص ۱۶۷۔

۴۲۔ ______ایضاً______ ص ۱۶۸۔

۴۳۔ ______ایضاً______ ص ۱۶۷۔

۴۴۔ منٹو یہ افسانہ اخبار کی ایک خبر پڑھنے کے بعد لکھ رہے تھے جس میں ایک عورت کو اغوا کر کے اس کے ساتھ زیادتی کی گئی تھی۔ بعد میں عورت سردی سے مر گئی۔

۴۵۔ فرانسیسی مصنف آسکر وائلڈ کا ڈراما 'ویرا' جسے منٹو نے ۱۹۳۴ء میں ترجمہ کیا تھا۔

۴۶۔ علی ثنا بخاری، سعادت حسن منٹو (سوانح اور ادبی کارنامے)، ص ۲۳۲۔

۴۷۔ ______ایضاً______ ص ۲۷۷۔

۴۸۔ Fleming Liesli,"The Life and Works of Saadat Hassan Manto", P.233

۴۹۔ ممتاز منگلوری: ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند''، جلد ۱۰، اردو ادب پنجم، ص ۲۴۸۔
۵۰۔ علی ثنا بخاری: ''سعادت حسن منٹو (سوانح اور ادبی کارنامے)''، ص ۲۹۱۔
۵۱۔ علی ثنا بخاری: ''سعادت حسن منٹو (سوانح اور ادبی کارنامے)''، ص ۳۲۷—۳۲۸۔
۵۲۔ ______ ایضاً ______ ص ۳۳۰۔
۵۳۔ ______ ایضاً ______ ص ۳۳۴۔
۵۴۔ نبیلہ عصمت: ''منٹو اور غلام عباس کے فنی وسائل کا تقابل''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان ۱۹۹۰، ص ۹۷۔
۵۵۔ ______ ایضاً ______ ص ۱۰۰۔
۵۶۔ عمارہ شمشاد: ''اردو کے تین خاکہ نگار: شاہد احمد دہلوی، سعادت حسن منٹو، عبدالسلام خورشید (بحوالہ گنجینہ گوہر، گنجے فرشتے اور وے صورتیں الٰہی)''، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے ایم اے اردو، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۱۹۔
۵۷۔ علی ثنا بخاری، ڈاکٹر ''منٹو کے بارے میں چند غلط فہمیاں''، انگارے (منٹو نمبر)، جنوری ۲۰۰۵ء، ص ۲۳۔
۵۸۔ عمارہ شمشاد: ''اردو کے تین خاکہ نگار: شاہد احمد دہلوی، سعادت حسن منٹو، عبدالسلام خورشید (بحوالہ گنجینہ گوہر، گنجے فرشتے اور وے صورتیں الٰہی)''، ص ۱۲۳۔
۵۹۔ ______ ایضاً ______ ص ۱۵۹۔
۶۰۔ رضا احمد: ''سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے افسانوں کے موضوعات کا تقابلی جائزہ''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے، گورنمنٹ ایف سی کالج، لاہور ۱۹۹۳ء، ص ۹۱۔
۶۱۔ ______ ایضاً ______ ص ۲۳۸۔
۶۲۔ ______ ایضاً ______ ص ۔۲۱۷۔
۶۳۔ ______ ایضاً ______ ص ۳۲۴۔
۶۴۔ روبینہ گلزار احمد، ''منٹو اور روس کا افسانوی ادب''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد، ۲۰۰۴، ص ۱۳۔
۶۵۔ علی ثناء بخاری، ڈاکٹر: ''سعادت حسن منٹو (کتابیات)''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۶ء، ص ۵۔
۶۶۔ جگدیش چندر رودھاون: ''منٹو نامہ''، ص ۲۴۔
۶۷۔ انیس ناگی: ''سعادت حسن منٹو''، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۲۸۔
۶۸۔ Fleming Liesli,"The Life and Works of Saadat Hassan Manto", P.3
۶۹۔ علی ثنا بخاری: ''سعادت حسن منٹو (حیات اور ادبی کارنامے)''، ص ۸۶۔
۷۰۔ برج پریمی، ڈاکٹر: ''منٹو کتھا'' ص ۱۵۔
۷۱۔ روبینہ گلزار احمد: ''منٹو اور روس کا افسانوی ادب''، ص ۱۶۔
۷۲۔ کرشن چندر: ''(نئے ادب کے معمار) سعادت حسن منٹو''، کتب پبلشرز لمیٹڈ، بمبئی، ۱۹۴۸ء، ص ۴۔
۷۳۔ علی ثنا بخاری: ''سعادت حسن منٹو (حیات اور ادبی کارنامے)''، ص ۲۔

۷۴۔ ابو سعید قریشی: ''منٹو''، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۱۔

۷۵۔ علی ثنا بخاری: ''سعادت حسن منٹو (حیات اور ادبی کارنامے)''، ص ۲۸، ۳۱۔

۷۶۔ جگدیش چندر رودھان: ''منٹو نامہ''، ص ۳۴۔

۷۷۔ روبینہ گلزار احمد: ''منٹو اور روس کا افسانوی ادب''، ص ۲۲۔

۸۷۔ ______ایضاً______ص ۲۷۔

۸۹۔ یہ پروف کی غلطی ہے لیکن اسے درست کرنا بھی تو مقالہ نگار کی ذمہ داری تھی۔

۸۰۔ روبینہ گلزار احمد: ''منٹو اور روس کا افسانوی ادب''، ص ۳۳۔

۸۱۔ ______ایضاً______ص ۴۹۔

۸۲۔ حامد جلال: ''منٹو ماموں کی موت''، نقوش، منٹو نمبر، شمارہ ۵۰-۴۹، ۱۹۵۵ء، ص ۳۸۷۔

۸۳۔ i۔ وہ مختصر افسانے جو ۱۸۹۲ء اور ۱۸۹۹ء کے درمیانی عرصے میں سپرد قلم ہوئے۔

ii۔ ناول اور ڈرامے جو ۱۸۹۹ء اور ۱۹۱۲ء کے درمیانی عرصہ میں لکھے گئے۔

iii۔ ۱۹۱۳ء، گورکی کی وفات تک کی تمام تحریریں جو زیادہ تر سوانح حیات اور تذکروں میں شامل ہیں۔

۸۴۔ محمد نوید: ''منٹو شناسی کی روایت کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور ۲۰۰۵ء ص ۶۳۔

۸۵۔ دیکھئے: راقم کا مضمون: ''منٹو ماہ و سال کے آئینے میں'' مشمولہ ،انگارے'، ملتان، اکتوبر ۲۰۰۵ء، ص ۷-۱۰۔

۸۶۔ دیکھئے: اشاریہ کتب، مقالہ ہذا کے آخری صفحات پر

۸۷۔ محمد نوید: ''منٹو شناسی کی روایت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ''، ص ۶۲۔

۸۸۔ ______ایضاً______ص ۴۸۔

۸۹۔ ______ایضاً______ص ۱۱۰۔

۹۰۔ ______ایضاً______ص ۱۰۵، ۱۰۶۔

۹۱۔ ______ایضاً______ص ۱۴۳۔

۹۲۔ مقالہ پر تفصیلی بحث کتابیات کے باب میں کی گئی ہے۔ تفصیل کے لیے مقالہ ہذا کے باب دوم میں موجود مذکورہ کتاب کا تجزیہ ملاحظہ کریں۔

۹۳۔ کامران عباس کاظمی، ڈاکٹر، سعادت حسن منٹو بطور مضمون نگار اور خاکہ نگار (تحقیقی و تنقیدی جائزہ) منظور شدہ مقالہ برائے ایم فل اردو، شعبہ اردو، انٹرنیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لنگویجز، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۹۔

۹۴۔ ______ایضاً______ص ۲۱۔

۹۵۔ ______ایضاً______ص ۲۲۔

۹۶۔ ______ایضاً______ص ۸۸۔

۹۷۔ ______ایضاً______ص ۱۸۶۔

۹۸۔ ______ایضاً______ص ۱۸۹۔

۹۹۔ ________ایضاً____________ص۲۴۸۔

۱۰۰۔ انصار احمد، سعادت حسن منٹو اور سماجی حقیقت نگاری، (معاصر افسانہ نگاروں کا فنی تناظر میں) جامعہ کراچی، ۲۰۰۹ء، ص،۵۔

۱۰۱۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص۶۰۔

۱۰۲۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص۳۴۱۔

۱۰۳۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص۴۱۳۔

۱۰۴۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص۴۵۱۔

۱۰۵۔ مقالے میں شامل تمام ابواب پر تفصیلی بحث مقالہ ہذا کے باب دوم میں شامل مذکورہ کتاب ''منٹو کا سیاسی شعور'' کے ضمن میں دیکھیں۔

۱۰۶۔ ریاض قدیر، منٹو کے افسانوی ادب پر موپاساں کے اثرات، دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور، ۲۰۱۲ء، ص۱۶۔

۱۰۷۔ ________ایضاً____________ص۲۰۔

۱۰۸۔ ________ایضاً____________ص۴۱۔

۱۰۹۔ ________ایضاً____________۱۰۹۔

۱۱۰۔ ________ایضاً____________۱۹۷۔

۱۱۱۔ ________ایضاً____________۳۰۶۔

۱۱۲۔ ان مقالہ جات کی تفصیل کے لیے متعلقہ ضمیمہ ملاحظہ کریں۔

باب پنجم:

اردو میں منٹو شناسی کی روایت:
نتائج و سفارشات

باب پنجم:

اردو میں منٹو شناسی کی روایت:

نتائج وسفارشات

وقت انسان کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے اور کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ اپنے اکلوتے پسندیدہ شاعر غالب کی طرح سعادت حسن منٹو بھی اپنے معاصر ادبی حلقوں کے ہاتھوں اسی کیفیت سے دوچار رہے جس کا اظہار احمد ندیم قاسمی نے کچھ یوں کیا ''عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہل وطن، یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ''۔ لیکن منٹو کو تو اعزاز کے ساتھ دفن ہونا بھی میسر نہ آیا۔ باری علیگ کے اخبار ''مساوات'' میں ایک فلمی تبصرے سے تحریر و تصنیف کی دنیا میں رکھنے والے پہلے قدم سے مہدی علی صدیقی کے نام لکھے گئے آخری خط تک، درمیانی سفر میں منٹو نے ادبی دنیا میں اپنی تخلیقات کے ذریعے تہلکہ مچائے رکھا۔ سعادت حسن منٹو ادبی اور تخلیقی دنیا میں تراجم کے راستے داخل ہوئے اور روسی، فرانسیسی شعر و ادب کے تراجم کے ساتھ ساتھ مختلف شعرا و ادباء مثلاً میکسم گورکی، موپساں، پشکن وغیرہ کے متعلق شخصی اور فکری و فنی جائزوں پر مشتمل مضامین بھی لکھے۔ یہ بات درست ہے کہ منٹو نے تراجم کے ذریعے ادبی سفر کی شروعات کیں۔ لیکن ان تراجم کے پہلو بہ پہلو ہمیں مضمون نگار منٹو بھی کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ ہمایوں، عالمگیر، ساقی، سویرا ادب لطیف اور نقوش کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان بھر سے شائع ہونے والے دیگر ادبی اور نیم ادبی وسائل و جرائد کے صفحات منٹو کی تحریروں کے بغیر مکمل نہ ہوتے۔ ان تمام رسائل نے مختلف اوقات میں منٹو کی تحریروں کو بڑھ چڑھ کر شائع کیا خاص طور پر شروع کے دنوں میں ہمایوں، عالمگیر اور ساقی نے جس تسلسل کیساتھ پہلے تراجم اور پھر منٹو کی تخلیقات کو شائع کیا، لائق تحسین ہے۔ منٹو شناسی کے سنجیدہ حلقے ان رسائل کو منٹو شناسی کا اولین نمونہ گردانتے ہیں۔ ان رسائل و جرائد کے مدیران کی فکری سطح کی بلندی کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے موقر جرائد میں ایک نوزائیدہ مترجم کو مستقل بنیادوں پر شائع کر کے اردو کی ادبی دنیا سے متعارف کروایا۔ شاید وہ اس مترجم کے پیچھے چھپے اصل فنکار کو اپنی دور بین نگاہوں سے شناخت کر چکے تھے ''ہمایوں'' اور ''عالمگیر'' کے روسی اور فرانسیسی نمبروں کی اشاعت کے بعد منٹو تراجم سے توجہ ہٹا کر افسانے کی دنیا میں داخل ہو گئے۔ منٹو کی تخلیقی زندگی کا وہ موڑ بہت اہم ہے جب اُنھوں نے اپنے افسانوں میں جنس کو بطور موضوع پیش کیا۔ یہ وہ جرم تھا جس کی سزا منٹو کو مرتے دم تک ملتی رہی۔ ایک طوفان بد تمیزی تھا جو رکنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ مولوی، سیاستدان، صحافی، ادیب، سبھی غلغلہ ہائے الاماں برپا کیے ہوئے تھے۔ اگرچہ کہ جنس یا اس سے متعلقہ موضوع اس زمانے کا عام چلن تھا، منٹو سے پہلے اور معاصر فکشن میں انگارے کے علاوہ عزیز احمد، ایم اسلم، محمد حسن عسکری، ممتاز مفتی، عصمت چغتائی، کسی نہ کسی حد تک نیاز فتح پوری اور حجاب امتیاز علی سمیت دیگر بہت سے افسانہ نگاروں پر ان کے معاصر نقاد مثلاً بشیر ساجد، مولانا صلاح الدین احمد، آفتاب احمد، وقار عظیم، ذکی الدین پامال، علی سردار

جعفری اور خود عزیز احمد جنسی بے راہ روی کا الزام عائد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن جو ردعمل سعادت حسن منٹو کے خلاف سامنے آیا دیگر افسانہ نگار اس سے بالکل محفوظ رہے، سوائے عصمت چغتائی کے۔

جنسی آلودگی کے الزام میں چلنے والے مقدمات نے منٹو شناسی کی اولین روایت کے خدوخال مرتب کیے۔ اس زمانے کے مختلف اخبارات مثلاً پربھات، خیام، آئینہ، اخوت، دین ودنیا وغیرہ، نے اپنی صحافیانہ بلیک میلنگ کے تحت منٹو کے افسانوں کی بے ہودہ تشریح کر کے حکومت سے سخت سزا کا مطالبہ کیا تو دوسری طرف منٹو پر مقدمہ کروانے والے اخلاقیات کے علمبرداروں خاص طور پر چودھری محمد حسین، عبدالماجد دریا آبادی اور راجہ صاحب آف محمود آباد کی زبان بولنے والے وکلا اور گواہان استغاثہ کے وہ دلائل یا بیانات جو منٹو کے افسانوں کو فحش ثابت کرنے کے لیے دلوائے گئے منٹو شناسی کے باب میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی صفائی کے گواہان کی ان فحش افسانوں کی حمایت میں کی گئی تعبیر اور تشریح منٹو شناسی کا ایک دوسرا اور مثبت رویہ ہمارے سامنے لاتی ہے۔ اردو زبان وادب کی ان معتبر شخصیات، خلیفہ عبدالحکیم، عابد علی عابد، چراغ حسن حسرت، فیض احمد فیض ودیگر نے منٹو کی فنی وفکری خوبیوں کو جس طور عدالتوں میں اجاگر کیا انہیں اصول وضوابط کو لے کر منٹو پر کی جانے والی تنقید آج بھی گامزن ہے۔ اس ضمن میں فاضل جج صاحبان کے تحریر کیے گئے۔ فیصلہ جات، ان کی علمی اور فکری بلوغت کے ساتھ ساتھ ملکی اور عالمی قوانین اور اخلاقیات کی روشنی میں منٹو کے ان افسانوں کی تفہیم کے بھی عکاس ہیں۔ منٹو کے افسانوں پر قائم ان مقدمات نے منٹو کے ساتھ ساتھ ادب، قانون اسلام اور اخلاقیات کے نقطہ نظر سے فحش اور غیر فحش تحریروں کے دائرہ کار پر بھی خوب بحث اٹھائی۔ اخبارات اور استغاثہ کے ساتھ ساتھ بعض جج صاحبان کا رویہ بھی عدل وانصاف کی بجائے تعصب کے تقاضوں کو پورا کرتا دکھائی دیتا ہے۔ کسی جج کو سماعت کے دوران یہ الفاظ دہرانا زیب نہیں دیتے کہ ''ان لوگوں کا وجود ہی ننگ ادب ہے'' منٹو کے خلاف زہر اگلنے والے اخبارات اشخاص اور جج صاحبان نے منٹو دشمنی کی وہ مضبوط بنیاد رکھی جس کے تحت منٹو کو ضدی، سنکی اور فحش نگار، جب کہ اس کے افسانوں کو مخرب الاخلاق قرار دیا گیا۔ انھی مقدمات سے جڑا سب سے بڑا منٹو شناس خود سعادت حسن منٹو کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ منٹو نے بطور ملزم جو بیانات عدالتوں میں جمع کرائے وہ کسی بھی فنکار کے فن کی تفہیم کے لیے بلند مرتبہ تنقید سے کم نہیں۔ جنس اور ادب کے بارے میں منٹو کے نقطہ نظر کی وضاحت کے ساتھ ساتھ زیر مقدمہ افسانوں میں پوشیدہ فکری وفنی اسرار ورموز کی جو گتھیاں منٹو نے سلجھائی ہیں وہ ان کے سنجیدہ تنقیدی مزاج کے ساتھ ساتھ منٹو شناسی کا بھی روشن پہلو ہیں۔ عدالتوں میں جمع کرائے گئے ان بیانات کے علاوہ لذت سنگ میں شامل مضامین اور زحمت مہر درخشاں بھی منٹو شناسی کے اولین لیکن پختہ نقوش ہیں۔ ان مضامین اور بیانات کی روشنی میں یہ بات بغیر کسی تردد کے کہی جاسکتی ہے کہ خود سعادت حسن منٹو ہی ایسا پہلا باضابطہ اور سنجیدہ نقاد ہے جس نے منٹو ایسے فنکار کے حق میں قلم اٹھایا۔ ترقی پسند تحریک کے ساتھ منٹو کا نکاح تو نہیں ہوا تھا البتہ طلاق ضرور ہوئی، یہ بات حیران کن ہے کہ ترقی پسند تحریک کے اکابرین نے منٹو جیسے حقیقت نگار، روشن خیال اور انقلاب کے خواہشمند افسانہ نگار کو رجعت پسند قرار دے کر نہ صرف اپنی صفوں سے نکال باہر کیا بلکہ ترقی پسند نظریات کے حامل رسائل وجرائد میں اس کی اشاعت بھی ممنوع قرار دے دی۔ نہ صرف یہ بلکہ دیگر رسائل وجرائد کے مدیران پر بھی اس پابندی کے لیے دباؤ ڈالا۔ کھلے خط لکھ کر منٹو کے ضمیر کی مسجد کا امام بننے کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ اسے رجعت پسند تک کہہ ڈالا۔ ترقی پسند ناقدین، اکابرین اور معاصرین منٹو کی تحریروں کے متعلق دوہرے یادوغلے پن کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ سجاد

ظہیر، علی سردار جعفر، احمد ندیم قاسمی اور وقار عظیم جہاں منٹو کے فن کے قدردان دکھائی دیتے ہیں وہیں اسے جنسی آلائشوں میں گھرا ہوا بھی کہہ جاتے ہیں۔ عزیز احمد نے جنس کو منٹو کا مذہب قرار دے کر سب کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ حالانکہ ان کے اپنے لکھے گئے ناولوں ہوس اور گریز وغیرہ میں موجود جنسی تلذذ منٹو کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ ترقی پسندوں کی ان زقندوں نے منٹو کو تمام عمر پریشان کیے رکھا۔ حسن عسکری ''مخصوص'' مدت کے لیے منٹو کے دفاع میں ضرور اترے، سیاہ حاشیے کا دیباچہ لکھ کر اُنھوں نے منٹو کے تقسیم کے موضوع پر لکھے گئے افسانوں کو انسانی دستاویز تو ثابت کر دیا لیکن اس اکلوتے معاصر نقاد کے تین چار مضامین ترقی پسند تحریک کے مچائے گئے شور شرابے کا مقابلہ کہاں تک کرتے؟ بلکہ ترقی پسندوں کے منٹو پر غیض و غضب کی ایک بڑی وجہ حسن عسکری اور منٹو کی قربت کا شاخسانہ ہی تو تھی۔ ترقی پسند افسانہ نگار کرشن چندر جو احمد ندیم قاسمی کی طرح بہر حال منٹو کے دوستوں میں شمار کیے جاتے ہیں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اُنھوں نے منٹو کے متعلق سب سے پہلی کتاب ''سعادت حسن منٹو'' لکھی۔ یہ واحد کتاب ہے جو سعادت حسن منٹو کی زندگی میں منظر عام پر آئی منٹو نے اپنے متعلق معاصر ادیبوں کے تاثرات پر مبنی کتاب ''ناخن کا قرض'' اور دستور'' کے خصوصی نمبر کی اشاعت کی بھرپور کوشش کی تھی لیکن ناکام رہے۔ کرشن چندر کی یہ کتاب نئے ادب کے معمار کے سلسلے کی ایک کڑی تھی جسے کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی نے ۱۹۴۸ء میں شائع کیا۔ شخصی نوعیت کے اس مضمون میں کرشن چندر نے منٹو کی شخصی اور فنی خوبیوں کو افسانوی انداز میں پیش کیا۔ اگرچہ منٹو کی شخصیت کا پہلو پورے مضمون پر غالب ہے لیکن کسی ترقی پسند ادیب کا منٹو کے ساتھ یہ کھلا اظہار محبت تھا جس کی جرأت کم از کم احمد ندیم قاسمی کے پاس نہیں تھی۔ منٹو کے متعلق شائع ہونے والی اس کتاب میں کرشن چندر کے مضمون کے علاوہ منٹو کی تین تحریریں، ترقی یافتہ قبرستان، نیا قانون اور باتیں بطور انتخاب شامل ہیں۔

منٹو شناسی کے یہ اولین نقوش ہمیں بکھری ہوئی حالت میں ملتے ہیں۔ کسی مدون، یا محقق نے ابھی تک انہیں یکجا نہیں کیا۔ اس بکھری صورت میں منٹو شناسی کی جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے اس کے مطابق منٹو کی تفہیم فنی بنیادوں کی بجائے سیاسی، سماجی، فکری، مذہبی اور ''ادبی نظریوں'' کی بنیاد پر کی گئی۔ منٹو نے چونکہ ان تمام مکاتیب فکر کو اپنی تحریروں کے ذریعے چیلنج کر رکھا تھا چناں چہ ''دائیں، بائیں'' کا امتیاز ختم کر کے یہ سب قوتیں منٹو کے خلاف متحد ہو گئیں اور اسے وہ سب کچھ ثابت کرنے کی کوشش کی جو اس کی فکر اور فن کے متضاد تھا۔

منٹو شناسی کا اصل باب اس کی وفات کے بعد شروع ہوتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تمام ادیب، نقاد اور صحافی اس کے مرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اس دور کے اخبارات اور رسائل منٹو کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں۔ منٹو کی وفات کے بعد تین زمانے ایسے آئے جب ان کی شخصیت اور فن کا بھرپور انداز میں جائزہ لیا گیا۔ ایک منٹو کی وفات کے بعد، دوسرے منٹو کی پچاسویں برسی یعنی ۲۰۰۵ء میں اور تیسرا موقع ہمارے ناقدین، مرتبین اور محققین کے ہاتھ اس کی ۱۰۰ ویں برسی کے موقع پر لگا۔ وہ منٹو جس کی شخصیت اور فن پر اس کی زندگی میں صرف ایک کتابچہ بمشکل شائع ہوا تھا اب کتابوں کی سنچری پوری کر چکا ہے۔ سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن پر سو کے لگ بھگ کتابیں لکھی گئی ہیں یہ کتابیں دو زمروں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔ ایک زمرہ کتابوں کی طبع زاد صورت جب کہ دوسرا ایسی کتابوں پر مشتمل ہے۔ جو مرتبہ ہیں۔ ہر دو اقسام پر مشتمل کتب یا تو منٹو کی سوانح سے تعلق رکھتی ہیں یا پھر فن سے۔ سوانح سے متعلق منٹو کی وفات کے فوراً بعد، ابو سعید قریشی کی کتاب منٹو، اسد اللہ کی ''منٹو میرا دوست'' اور اوپندر ناتھ اشک کی کتاب ''منٹو

میرا دشمن'' نقوش میں ادھوری اشاعت کے بعد یکے بعد دیگرے شائع ہوئیں۔ ان تینوں کتابوں کا بنیادی موضوع اگرچہ منٹو کی شخصیت کے گوناگوں پہلو ہی ہیں مگر منٹو کی تخلیقی زندگی بھی زیر بحث آ ہی جاتی ہے۔ ویسے بھی منٹو کی شخصیت اور فن ایک دوسرے کے لیے حوالے کا کام دیتے ہیں۔ ان تینوں کتابوں میں انتہائی جذباتی انداز اختیار کیا گیا۔ ابو سعید قریشی اور سعادت حسن منٹو زمانہ طالب علمی سے تادم مرگ ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست رہے۔ منٹو کی موت پر لکھی گئی ان کی یہ کتاب دراصل ایک مخلص دوست کے جذبات کی عکاسی ہے جن کی رو میں بہتے ہوئے مصنف نے کسی ترتیب کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے شخصیت اور فن کا الگ الگ جائزہ لینے کے باوجود انہیں گڈمڈ کر دیا۔ اسی خامی کے سبب انیس ناگی نے ابو سعید قریشی کی کتاب کو چوں چوں کا مربہ قرار دیا۔

اوپندر ناتھ اشک نے نقوش، کے منٹو نمبر میں منٹو میرا دشمن کے عنوان سے جو مضمون چھپنے کے لیے دیا تھا، ادھوری اشاعت کے غصے نے اسے کتابی شکل میں شائع کروا دیا۔ اوپندر ناتھ اشک کی اس کتاب میں شامل طویل مضمون کا بڑا حصہ دونوں معاصر ادیبوں کے درمیان پائی جانے والی چشمک اور اس سے جڑے واقعات کی عمدہ داستان ہے۔ کتاب کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ دشمن کی بجائے کسی دوست کی لکھی ہوئی تحریر ہے۔ جب کہ منٹو کی دوستی کے دعویدار محمد اسداللہ کی کتاب پڑھ کر یہ تاثر الٹ ہو جاتا ہے۔ محمد اسداللہ کی منٹو سے دوستی اور ''منٹو میرا دوست'' میں درج واقعات کی صداقت از خود تحقیق طلب ہے مصنف نے منٹو کی شخصیت کے کمزور پہلو ڈھونڈ ڈھونڈ کر جس طرح پیش کیے ہیں ان سے کتاب کی اشاعت کا مقصد منٹو فہمی کی بجائے، منٹو کشی دکھائی دیتا ہے۔ محمد حسن عسکری اور منٹو کے تعلقات پر انہیں وہی اعتراضات ہیں جو بیشتر ترقی پسندوں کو تھے۔ شاید اسی لیے آصف فرخی نے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ 'منٹو میرا دوست' کی اشاعت منٹو کی کردار کشی کے لیے کہیں ترقی پسندوں کی کوئی ترکیب تو نہیں تھی۔ میرا دوست، میرا دشمن عصمت چغتائی کی کتاب ہے۔ ان کا یہ مضمون سب سے پہلے نقوش کے منٹو نمبر میں اسی عنوان کے تحت چھپا تھا۔ بعد میں ۱۹۷۲ء میں ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی نے پانچ افسانوں کے انتخاب کے ساتھ اسے کتابی شکل میں شائع کیا۔

ڈاکٹر برج پریمی نے اپنے تحقیقی مقالے کی کتابی صورت سعادت حسن منٹو حیات اور کارنامے کا ایک باب منٹو کی سوانح کے لیے مخصوص کیا جب کہ ان کی ایک اور کتاب منٹو کتھا کے ابتدائی ۶۴ صفحات میں بھی منٹو کے سوانحی خدوخال کا نقشہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ڈاکٹر برج پریمی کی یہ کتابیں بالترتیب ۱۹۸۴ اور ۱۹۹۴ء میں اشاعت پذیر ہوئیں۔ جگدیش چندر ودھاون کی تصنیف ''منٹو نامہ'' کے ۵۱۹ صفحات میں سے ۳۷۵ صفحات میں منٹو کی سوانح کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ ان تینوں مصنفین کی چاروں کتابوں میں بیان کیے گئے حالات و واقعات عموماً وہی ہیں جو منٹو کے مختلف دوستوں اور ادیبوں نے اس کی وفات کے بعد مختلف اخبارات، رسائل و جرائد وغیرہ میں لکھے، یا پھر خود منٹو کی خود نوشت تحریروں سے واقعات کو اخذ کر لیا گیا۔ ہر حال ان دونوں مصنفین کا منٹو کے ساتھ رویہ عموماً عقیدت مندانہ رہتا ہے جس کی وجہ سے دونوں منٹو کی کمزوریوں سے آنکھیں چرانے لگتے ہیں۔

۲۰۰۶ء میں ڈاکٹر علی ثناء بخاری نے اپنے تحقیقی مقالے کو بائیس سال بعد بالآخر ''سعادت حسن منٹو، تحقیق'' کے نام سے شائع کر دیا۔ مقالے کی طرح ان کی کتاب کا باب اول ''احوال''، منٹو کی سوانح سے متعلق ہے اور ۱۱۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر علی ثناء بخاری نے منٹو کی سوانح حیات کا بہت سنجیدہ مطالعہ کرتے ہوئے منٹو کی سوانح سے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کو دور کیا۔ منٹو کی سوانح سے متعلق مصنف کی پیش کردہ تفصیلات تحقیق کے بنیادی اصولوں کو مدنظر رکھ کر ترتیب دی گئی ہیں۔

''گنجا فرشتہ'' کے عنوان سے یورش قمر کا ایک مضمون بھی ۲۰۰۷ء میں کتابچے کی صورت میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس مضمون میں منٹو کے ساتھ عمر کے بالکل آخری حصے میں مصنف کی ہونے والی ملاقاتوں اور شراب نوشی کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا جب کہ ابوالحسن نغمی کی کتاب بھی ذاتی یادداشتوں ہی پر مبنی ہے۔ پاکستانی ادب کے معمار کے سلسلہ میں شائع ہونے والی مبین مرزا کی کتاب سعادت حسن منٹو شخصیت اور فن کا ایک باب منٹو کے سوانحی خاکے سے مخصوص ہے۔ منٹو کی سوانح حیات کے متعلق لکھی گئی ان کتب کے مطالعے کے بعد بہت افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ابتدا سے لے کر تا حال ایک بھی ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی جس میں منٹو کی مکمل سوانح حیات پر روشنی ڈالی گئی ہو، پرویز انجم نے ''امرتسر کا منٹو'' میں سعادت حسن منٹو کے امرتسر میں گزارے گئے اوقات کا عمدہ اور مفصل جائزہ ضرور لیا۔ لیکن ان کی یہ کتاب بھی مکمل کی بجائے منٹو کی زندگی کے ایک مخصوص عہد اور علاقے سے تعلق رکھتی ہے۔ کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، محمد اسد اللہ، عصمت چغتائی اور یورش قمر کی تفصیلات۔ منٹو کی زندگی کے چیدہ چیدہ پہلو ضرور ہمارے سامنے لے آتی ہیں مگر منٹو کی شخصیت کا مکمل ارتقاء پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ ویسے بھی یہ کتابیں جذباتی ردعمل کے طور پر سامنے آئی تھیں۔ جہاں تک برج پریمی، جگدیش چندر ودھاون، علی ثناء بخاری اور مبین مرزا کا تعلق ہے، اُنھوں نے بھی محض ایک ایک باب میں روایتی قسم کی باتوں کو ہی دہرا دیا ہے۔ دستیاب تعداد کے مطابق منٹو کی شخصیت اور فن پر طبع زاد تصنیفات کی تعداد چالیس ہے۔ ان تمام تصنیفات میں منٹو کی سوانح پر صرف دس کتابیں ہی منظر عام پر آئیں۔ یہ تمام کتابیں کسی سوچے سمجھے منصوبے کی بجائے محض ذاتی تعلقات اور یادداشتوں کی بنا پر انتہائی جذباتی انداز میں لکھی گئیں۔ مسلسل مضمون کی صورت میں لکھی گئی ان کتابوں میں ہر مصنف نے اپنے ذاتی تجربات کو کف افسوس ملتے ہوئے جہاں سے جو بات یاد آئی لکھنا شروع کر دیا۔

سوانح کے مقابلے میں منٹو کے فکر و فن پر لکھی گئی طبع زاد کتب کی تعداد اور معیار نسبتاً زیادہ اور بہتر ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ محمد اسد اللہ کی کتاب مطبوعہ ۱۹۵۶ء کے بعد منٹو کے نقاد ایک طویل خاموشی کے شکار دکھائی دیتے ہیں۔ اس ۲۶ سالہ سکوت کو سید وقار عظیم کے پہلے سے شائع شدہ مضمون منٹو کا فن کی کتابی صورت میں اشاعت نے توڑا۔ وقار عظیم استادانہ انداز میں افسانے کی تکنیک کے مختلف مراحل کا منٹو کی افسانہ نگاری میں استعمال سمجھاتے رہے۔ ایک سال بعد سید محمد محسن نے سعادت حسن منٹو اور ان کے افسانوں کا نفسیاتی تجزیہ کر کے منٹو شناسی کے باب میں پائے جانے والے جمود میں زبردست ارتعاش پیدا کر دیا۔ سید محمد محسن کے اس سنجیدہ مطالعے کے اگلے ہی سال یعنی ۱۹۸۵ء نے منٹو کو ایک ایسا نقاد فراہم کیا جس کے مطالعے کی گونج نہ صرف یہ کہ دور دور تک سنائی دی بلکہ آج بھی اس کے آثار باقی ہیں۔ منٹو، نوری نہ ناری، ممتاز شیریں کی ایک ایسی کتاب ہے جو نامکمل ہونے کے باوجود منٹو شناسی کی اہم اور سنجیدہ کوشش ہے۔ معترضین کے اس اعتراض کے باوجود کہ مصنفہ نے منٹو کے افسانوں میں موجود انسان کا جائزہ لیتے ہوئے جو تعقلاتی نظام ترتیب دیا ہے، سامی مذاہب مستعار ہے اور محض یہی حقیقت اسے کسی جنوبی ایشیائی تخلیقی ادب کو سمجھنے کے لیے غیر متعلق بنا دیتی ہے۔ اگرچہ کہ ترقی پسند تحریک اور محمد حسن عسکری کے مخالفین نے تحریری اور مجلسی تنقید میں ممتاز شیریں کے اس تعقلاتی نظام کو مسترد کر دیا جس کی بنیاد پر اُنھوں نے منٹو کے مطالعہ کی بنیاد استوار کی۔ لیکن اس سب کے باوجود مصنفہ نے جس وسیع عالمی ادبی تناظر میں منٹو کا فکری و فنی جائزہ لیا اور اس کے کرداروں کا مغربی افسانے اور ناول کے کرداروں سے تقابل کیا، اس کی مثال منٹو کے مطالعے میں وارث علوی کے علاوہ اور کسی نقاد کے ہاں نہیں ملتی۔ انیس ناگی کی کتابیں ''سعادت حسن منٹو'' اور ''معمار افسانہ

نگار سعادت حسن منٹو'' کے نام سے اشاعت پذیر ہوئیں۔ دونوں کتابیں منٹوانہ تنقید کے باب میں محض حجمی اضافے کے سوا کوئی خاص کردار ادا نہ کر سکیں ''سعادت حسن منٹو'' پہلی بار ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی۔ دو درجن کے لگ بھگ عمومی نوعیت کے تنقیدی مضامین میں کوئی خاص یا نئی بات کرنے کی بجائے انیس ناگی محض رسمی قسم کے مضامین کو ہی دہراتے رہے۔ مصنف کی عجلت کا اندازہ لگانے کے لیے صرف یہی بات کافی ہے کہ اُنھوں نے منٹو کی موت کو اٹھارہ کی بجائے سترہ جنوری کا واقعہ قرار دیتے ہوئے موت سے ایک دن قبل منٹو سے اپنی ملاقات کی تفصیلات بھی درج کر دیں۔ ڈاکٹر علی ثناء بخاری سعادت حسن منٹو (تحقیق) میں اسے ایک من گھڑت اور جھوٹ پر مبنی واقعہ قرار دے چکے ہیں۔ کتاب کے آخر میں منٹو کی کتابوں کے کیٹلاگ میں بھی تحقیقی نوعیت کی سنگین اغلاط موجود ہیں۔ انیس ناگی کی دوسری تصنیف ''معمار افسانہ نگار سعادت حسن منٹو'' بھی تحقیقی نوعیت کی درجنوں اغلاط سے بھری پڑی ہے۔ یہاں تک کہ منٹو کا سال پیدائش اور تاریخ وفات تک غلط درج ہیں۔ اُنھوں نے یہ کتابیں بہت عجلت میں لکھی ہیں چناں چہ بہت سے مقامات پر وہ خود اپنے ہی استدلال اور معلومات کی نفی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

جگدیش چندر ودھاون نے ''منٹو نامہ'' کے عنوان سے منٹو کی شخصیت اور فکر و فن کے مختلف پہلوؤں کا نسبتاً تفصیلی لیکن ہمدردانہ قسم کا مطالعہ کر کے منٹو سے اپنی دلچسپی اور محبت کا اظہار تو ضرور کیا لیکن ان کی تنقید منٹو کے باب میں نئے مباحث کو جنم دینے میں کوئی خاص کردار ادا نہ کر سکی۔

ممتاز شیریں اور سید محمد محسن کے بعد فکری اعتبار سے منٹو کا سنجیدہ مطالعہ وارث علوی کی کتاب منٹو ایک مطالعہ کے نام سے ۱۹۹۷ء میں منظر عام پر آیا۔ منٹو کے ادبی و تنقیدی شعور کے ساتھ ساتھ اس کے افسانوں کے جنسی، نفسیاتی عشقیہ اور سنسنی خیزی پر مشتمل موضوعات کے علاوہ افسانوی کرداروں کا بھی عمدہ تجزیہ اس کتاب میں پڑھنے کو ملتا ہے۔ اسی سال یعنی ۱۹۹۷ء ہی میں وارث علوی کے ساتھ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کی تصنیف منٹو شناسی بھی اشاعت پذیر ہوئی۔ منٹو کے منتخب افسانوں کے تجزیات کی یہ ایک سنجیدہ کاوش ہے۔

امجد جاوید کی تصنیف منٹو کے نسوانی کردار میں منٹو کی مختلف کہانیوں میں شامل تیرہ نسوانی کرداروں کا سطحی اور بغیر کسی ذہنی مشقت کے غیر سنجیدہ جائزہ لیا گیا ہے۔ منٹو کے ان نسوانی کرداروں کو وسیع تناظر میں دیکھنے کی بجائے ان کا طالب علمانہ قسم کا خلاصہ پیش کر دیا گیا ہے۔ اور یہ تک نہیں بتایا گیا کہ منٹو کے یہ کردار ان کے کس کس افسانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کچھ اسی قسم کی بلکہ اس سے بھی بدتر صورت ڈاکٹر اورنگزیب عالمگیر کی تصنیف ''سعادت حسن منٹو، تحقیقی و تنقیدی مطالعہ'' میں دکھائی دیتی ہے۔ جہاں اس کتاب میں شامل تجزیے بہت سطحی ہیں وہیں کتاب کا تحقیقی حصہ بھی بے حد ناقص، نامکمل اور اغلاط سے بھرپور ہے۔ سعادت حسن منٹو کی پچاسویں برسی کے موقع پر صرف دو طبع زاد کتابیں منظر عام پر آئیں۔ فتح محمد ملک کی تصنیف ''سعادت حسن منٹو ایک نئی تعبیر'' کی اشاعت کا اصل موضوع منٹو کی پاکستانی شہریت ثابت کرنا ہے۔ اس ضمن میں مصنف سے جو بن پایا اُنھوں نے کیا۔ منٹو کی پاکستانیت کے حق میں دیے گئے دلائل اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کی نئی تعبیر کہ ''قیام پاکستان کا مقصد پاگلوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتا'' کے خلاف ردعمل نے اختلافی کی بجائے احتجاجی صورت اختیار کر لی تھی۔ بہت سے ادیبوں، دانشوروں اور ناقدین نے فتح محمد ملک کے قائم کیے گئے استدلال کو کمزور قرار دیا البتہ اتنا ضرور ہوا کہ اس کتاب کی اشاعت سے منٹو شناسی کے باب میں تحرک ضرور پیدا ہوا انیس ناگی کی

''سعادت حسن منٹو کی کہانی''، مصنف کی اس سے قبل لکھی گئی دو کتابوں ''سعادت حسن منٹو'' اور ''سعادت حسن منٹو کے مقدمات'' میں شامل مضامین کا مجموعہ ہے۔ اُنھوں نے کتاب منٹو کی پچاسویں برسی کے موقع کی مناسبت کا فائدہ اٹھانے کے لیے ہی شائع کر دی۔

منٹو کی سوانح اور فن پر مستند اور تحقیقی اعتبار سے واحد بہترین کتاب ''سعادت حسن منٹو (تحقیق)'' ۲۰۰۶ء میں اشاعت پذیر ہو کر منٹو کے باب میں دخیل بہت سی گمراہیوں کا قلع قمع کرنے کا باعث بنی۔ خاص طور پر منٹو کی سوانح اور ضمیمہ جات والے حصے بہت عمدہ اور تحقیقی و تنقیدی بصیرت کے غماز ہیں۔ سجاد شیخ نے منٹو کی کتاب سیاہ حاشیے کا تجزیاتی مطالعہ کر کے ان چھوٹے چھوٹے افسانوں میں پوشیدہ انسانی فطرت کے بڑے بڑے رازوں سے خوب پردہ اٹھا کر ثابت کیا کہ منٹو کی چھوٹی چھوٹی کہانیوں پر بھی بڑی بڑی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ جب کہ ڈاکٹر روش ندیم کی کتاب ''منٹو کی عورتیں'' منٹو کے نسوانی کرداروں کا سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر میں کیا گیا بہترین تجزیہ ہے۔

سال ۲۰۱۲ء منٹو کی ۱۰۰ ویں سالگرہ کی وجہ سے عام سالوں کی نسبت زیادہ مشہور ہوا۔ ہندوستان اور پاکستان سمیت دنیا بھر کے اردو حلقوں نے اسے منٹو صدی کے طور پر منایا۔ پورا سال منٹو کو مختلف حوالوں سے خراج تحسین پیش کیا گیا۔ درجنوں کتابیں تصنیف و تالیف کے مراحل سے گزر کر زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔

ان طبع زاد کتابوں میں منٹو کو ایک نئے احساس، نئے تاثر اور نئے سیاسی و سماجی تناظر میں پرکھنے کی مخلصانہ کوششیں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کتابوں کے مصنفین مصلحت اور تعصب سے بے نیاز ہو کر منٹو کی کہانیوں کی تفہیم اور اس کی فکر کا ادراک اپنے زمانے کے سیاسی و سماجی اور ادبی تناظر میں کرتے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ روایتی قسم کی کتابیں بھی بہت شائع ہوئیں لیکن آج کا نقاد منٹو کے باب میں کی گئی روایتی تنقید سے خاطر خواہ مطمئن نہیں دکھائی دیتا۔ منٹو صدی کی مناسبت سے شائع ہونے والی شمیم حنفی، شمس الحق عثمانی، شمس الرحمٰن فاروقی اور حمید شاہد کی کتابیں اپنے موضوع اور اسلوب بیان کی وجہ سے نسبتاً زیادہ معروف ہیں۔ شمیم حنفی کی کتاب ''منٹو، حقیقت سے افسانے تک'' میں نئے مضامین کے ساتھ پرانے مضامین بھی شامل ہیں۔ لیکن ان کے کسی بھی مضمون سے پرانے پن کی مخصوص بو نہیں آتی۔ شمس الحق عثمانی نے غالب اور منٹو لکھ کر دونوں نابغہ روزگار ہستیوں میں موجود مماثلتوں کے ساتھ ساتھ منٹو کی غالب پرستی کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا۔ اس سے قبل اس موضوع پر بعض ناقدین نے مضامین تو ضرور لکھے لیکن کتابی صورت میں اس موضوع پر یہ اکلوتی کتاب ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اشعر نجمی کے منٹو سے متعلق اٹھائے گئے سوالات کا جواب لکھتے لکھتے ''ہمارے لیے منٹو صاحب'' لکھ ڈالی۔ اس کتاب میں منٹو کی معروف اور بڑی کہانیوں پر مصنف کے کھلے اعتراضات کے باوجود غصے کی وہ شدت جو ماضی کی تنقید کا خاصا رہی ہے، سرے سے محسوس نہیں ہوتی۔ آج کا نقاد ماضی کے مقابلے میں بہت شائستہ اور وضع دار ہو گیا ہے۔ چناں چہ منٹو کے مقبول افسانوں پر ایک کے بعد ایک اعتراض کرنے کے باوجود بھی مصنف کا رویہ ہمدردانہ دکھائی دیتا ہے۔ جواب آں غزل کے طور پر محمد حمید شاہد نے اس مکالمے کو آگے بڑھاتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی کے نقطہ ہائے اعتراض کا بالکل اسی شائستگی سے جواب دیا، جس کا مظاہرہ اول الذکر مصنف کر چکے تھے ''سعادت حسن منٹو۔ ''جادوئی حقیقت نگاری اور آج کا افسانہ'' دراصل ''ہمارے لیے منٹو صاحب'' ہی پر اختلافی اور اتفاقی نوٹ ہے۔ طاہرہ اقبال کی تصنیف ''منٹو کا اسلوب، روبینہ یاسمین کی ''منٹو کا سیاسی شعور، پرویز انجم کی ''سعادت حسن مر گیا، ''منٹو نہیں مرا'' اور حمیرا خان کی تصنیف'' منٹو کے باغی کردار'' اپنے موضوع کے

لحاظ سے پہلی مرتبہ کتابی صورت میں شائع ہوئیں۔ منٹو کی تنقید میں ان موضوعات پر مضامین ضرور ملتے ہیں لیکن پوری کتاب کو ان میں سے کسی بھی موضوع کے لیے اس سے قبل مخصوص نہیں کیا گیا۔ منفرد نوعیت کے یہ بہت اہم مطالعے ہیں۔

منٹو کی شخصیت اور فن کے متعلق مرتب کی گئی کتابوں کی صورتحال مقدار کے لحاظ سے خاصی حوصلہ افزا ہے۔ لیکن معیار کے حوالے سے بہت افسوس ناک ہے۔ چند ایک کتابوں کو چھوڑ کر بیشتر مرتبین نے گویا بغیر سوچے سمجھے اور بلا کسی مقصد خاص کے سوائے اس کے کہ ان کے کھاتے میں ایک کتاب کا اضافہ ہو جائے گا، کتابیں ترتیب دے ڈالیں۔ ان کتابوں میں منٹو کی شخصیت اور فن پر لکھے گئے ایسے مضامین جو خاص طور پر منٹو کی وفات کے بعد مختلف رسائل کے خصوصی و عمومی شماروں میں اشاعت پذیر ہوئے، تھوک در تھوک نقل کیے گئے۔ ۱۹۵۵ء سے لیکر تاحال مرتب ہونے والی حالیہ کتابوں کا موازنہ کریں تو ماضی اور حال میں حیرت انگیز مشابہت دکھائی دیتی ہے۔ یہ صورتحال زیادہ تر پاکستان سے مرتب ہونے والی کتب کا خاصہ ہے۔ پاکستان سے شائع ہونے والی ان کتابوں میں شامل مضامین کا بنیادی ذریعہ رسائل ہوں یا کوئی اور، مرتب کی یہ اخلاقی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے ماخذات کی نشاندہی کرے۔ لیکن سوائے پرویز انجم کے دیگر مرتبین نے ترتیب و تدوین کے تمام اصولوں کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ انیس ناگی کی مرتبہ سعادت حسن منٹو، ایک مطالعہ، میں شامل چوبیس میں سے بیس مضامین اس سے قبل مختلف رسائل اور کتب میں بار بار اشاعت پذیر ہو چکے تھے۔ لیکن اُنھوں نے کسی قسم کی رسید دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ یہ الزام صرف اکیلے انیس ناگی ہی کے سر نہیں، فرید احمد، دائیں بائیں اوپر نیچے، صہبا لکھنوی، منٹو ایک کتاب''۔ ضیا ساجد، سعادت حسن منٹو'' غلام زہرہ، ''منٹو کیا تھا'' ''اور مبین مرزا/ ڈاکٹر رؤف پاریکھ''، ''سعادت حسن منٹو''، کے ہاں بھی کچھ اسی قسم کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ احمد سلیم اور طاہر اصغر اس سلسلہ میں سب سے بازی لے گئے۔ احمد سلیم نے منٹو، ہمارے عہد کا تخلیقی ضمیر'' اور ''منٹو، میرا دوست میرا دشمن'' میں منٹو کی شخصیت اور فن کے متعلق ایک مرتبہ پھر وہی پرانے اور بار بار شائع ہونے والے مضامین کو از سر نو شائع کر کے اور اپنی کتابوں کی تعداد میں مزید اضافہ کر کے چلتے بنے۔ مختلف رسائل و جرائد یا کتب سے مضامین نقل کروا کر از سر نو شائع کرانے کی یہ روش قطعاً ناجائز نہیں بشرطیکہ ماخذات کی نشاندہی کی جائے۔ لیکن احمد سلیم صاحب نے یہ ظلم کیا کہ اپنی مرتب کردہ کتاب ''سعادت حسن مر گیا، منٹو زندہ ہے'' میں شامل مواد کا تین چوتھائی حصہ محض ''افکار'' کراچی کے منٹو نمبر سے اٹھا کر اپنے نام سے بغیر کسی اعترافی بیان کے شائع کر دیا۔ طاہر اصغر نے منٹو صدی کی مناسبت سے دو کتابوں کا ''نذرانہ'' منٹو اور اس کے قارئین کی خدمت میں ''یہ ہے منٹو شخصیت'' اور ''یہ ہے منٹو فن'' کے عنوان سے پیش کیا۔ یہ دونوں کتابیں بھی دیگر کتابوں کی طرح چبائے ہوئے لقمے ہی ثابت ہوئیں۔

ابھی ان کتابوں کو شائع ہوئے تین ایک سال ہی گزرے تھے کہ مرتب موصوف کو کچھ اور کتابیں شائع کرنے کا شوق چڑھ آیا۔ چناں چہ اُنھوں نے مذکورہ بالا دو کتابوں کو چار حصوں میں تقسیم کر کے منٹو شناسی کے باب میں چار نئی کتابوں ''منٹو کی پہچان''، ''نامور منٹو''، اور ''سب سے بڑا افسانہ نگار'' کے عنوانات کے تحت اضافہ کر دیا۔ ''منٹو کا انکار'' کے مرتب کا نام کسی مصلحت یا منافقت کے تحت دانش علی لکھ دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ فاضل مرتب یعنی طاہر اصغر ہی کی ''کاوش خاص'' ہے۔ مقام افسوس ہے کہ ماخذات کی عدم نشاندہی کے ساتھ ساتھ مذکورہ بالا تمام مرتبین نے اتنا تکلف بھی نہ کیا کہ کم از کم ایسے مضامین یا تحریریں ہی منتخب کر لیتے جو کم کم چھپے ہوں۔ چناں چہ بیشتر کتب میں شامل مضامین ایک دوسرے کی تکرار محض کے سوا کچھ بھی نہیں۔ البتہ ''منٹو کے

افسانے'' انتخاب اور مطالعات'' مرتبہ قاضی افضال حسین، ''منٹو اور ہم'' مرتبہ الطاف احمد قریشی، ''سعادت حسن منٹو، ''پچاس برس بعد'' مرتبہ شمشیر حیدر شجر/نوید الحسن، ''منٹو ایک نیا مطالعہ'' مرتبہ صالحہ زریں اور سعادت حسن اور منٹو مرتبہ، ابدال احمد جعفری میں سابقہ روایت سے یکسر مختلف نئے اور تازہ مضامین کی مہک ایک خوشگوار تاثر چھوڑتی ہے۔ تحقیق و تالیف کے حقیقی تقاضوں کو اگر کسی مرتب نے صحیح معنی میں اپنایا ہے تو وہ پرویز انجم ہیں۔ روایتی قسم کی ترتیب کے بجائے اُنھوں نے منفرد اور اچھوتے موضوعات کو اپنی مرتبہ کتب، ''منٹو باتیں''، ''منٹو نامے''، ''منٹو، غالب کا پرستار''، اور ''منٹو اور سینما'' کی زینت بنایا۔ منٹو کی سوانح کا وہ حصہ جو امر تسر سے متعلق ہے، منٹو اور اس کے معاصر ادیبوں اور دوستوں کی تحریروں اور خطوط کی مدد سے کشید کیا گیا ہے۔ ''امر تسر کا منٹو'' کے نام سے ان کی یہ کتاب منٹو کے امر تسر میں گزارے گئے شب و روز کا عمدہ بیانیہ ہے۔ خدا کرے وہ جلد ہی 'دہلی'، بمبئی اور لاہور کا منٹو، لکھ کر سعادت حسن منٹو کی سوانح حیات کا باب مکمل کر لیں۔ ہندوستان سے مرتب ہونے والی کتابیں پاکستانی طرز ترتیب کے بر عکس زیادہ تر نئے مضامین کے انتخاب اور مطالعات پر مشتمل ہیں۔ قاضی افضال حسین کی مرتبہ ''منٹو کے افسانے'' اور صالحہ زریں کی ''منٹو، ایک نیا مطالعہ'' میں شامل مضامین کم از کم پاکستان کے قارئین کے لیے بالکل نئے ہیں۔ البتہ ''منٹو ایک لیجنڈ'' کے مرتب نے منٹو کے متعلق ہر اس تحریر کو شائع کر دیا جو ان کے ہاتھ لگی۔ اسی طرح پریم گوپال متّل کی کتابیں ''سعادت حسن منٹو'' اور ''منٹو شخصیت اور فن'' میں شامل مضامین بھی مرتب کی تساہل پسندی کے غماز ہیں۔

ادبی رسائل جنھوں نے منٹو کی ذاتی خواہش اور سنجیدہ کوشش کے باوجود زندگی میں اس پر کوئی شمارہ شائع نہ کیا، وفات کے بعد ایک دوسرے پر برتری لینے کے چکر میں سر گرداں دکھائی دیتے ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں منٹو کی وفات کے فوراً بعد نقش، کراچی، افکار کراچی، گل خنداں، لاہور، نقوش، لاہور، پگڈنڈی، امر تسر اور شاعر، بمبئی نے منٹو کی شخصیت اور فن سے مخصوص شمارے یکے بعد دیگرے شائع کر دیے۔ اس سلسلہ میں اولیت کا تاج کراچی سے شائع ہونے والے رسالے نقش کے سر سجا۔ نقش کا یہ خصوصی شمارہ سب سے پہلے مارچ ۱۹۵۵ء میں سامنے آیا۔ ان رسائل و جرائد میں شامل تمام مضامین اور دیگر تحریروں میں منٹو کی بے وقت موت سے پیدا ہونے والے ادبی خلا کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ منٹو کی موت پر جذباتی، ہمدردانہ، پشیمانہ اور عقیدت مندانہ رنگ غالب ہے۔ ان رسائل کی اشاعت سے منٹو شناسی کے کئی در وا ہوئے۔ ''افکار''، اور ''نقوش''، اس سلسلہ میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ہر دو رسائل میں منٹو کی شخصیت اور فن پر ادبی، نیم ادبی، غیر ادبی، صحافتی اور فلمی حلقوں کے تاثرات، تبصرے، اداریے نظمیں اور مضامین شائع کر کے منٹو کی ان حلقوں میں مقبولیت اور اثرات کا ثبوت پیش کیا گیا۔

''نقوش'' لاہور نے منٹو کی بیس غیر مطبوعہ کہانیاں شائع کر کے انہیں ہمیشہ کے لیے منٹو کا نام دے دیا۔ اس بات سے اتفاق کیا جانا چاہیے کہ ان ادبی رسائل نے منٹو پر خصوصی شمارے شائع کر کے اس داغ کو اپنی پیشانی سے دھو ڈالا جو ابتک ان کے دامن پر بد نما دھبے کی طرح موجود تھا۔

ان رسائل کی اشاعت ۱۹۵۵ء کے بعد ایک مرتبہ پھر منٹو کے باب میں پچیس سالہ طویل خاموشی اختیار کر لی گئی۔ اکا دکا مضامین اگرچہ مختلف رسائل میں ضرور شائع ہوتے رہے لیکن کسی بھی رسالے نے منٹو کی کسی بھی سالگرہ یا برسی کے موقع کو اس قابل نہ گردانا کہ اس مناسبت سے کوئی خاص نمبر نکالے۔ لاہور سے سید قاسم محمود اور دہلی سے بلراج مینرا نے ''قافلہ'' اور ''شعور'' کے

منٹو مبر شائع کر کے ۱۹۵۵ء سے قائم اس منٹوانہ جمود کو ۱۹۸۰ میں توڑا۔ قافلہ کے پانچ مرتبین نے مل کر حامد جلال کے پہلے سے شائع شدہ تاثراتی مضمون اور منٹو کی سترہ کہانیوں کے انتخاب کو شائع کر کے سہل انگاری کا ثبوت دیا۔ سہ ماہی، دانشور، لاہور کے منٹو نمبر میں منٹو کے سال پیدائش اور تاریخ وفات کے باب میں کی گئی سنگین غلطی، اور منٹو کی تصنیفات کے ترتیب دیے گئے کیٹلاگ میں موجود بہت سی تحقیقی لغزشوں کے باوجود، اس میں شامل تنقیدی مضامین منٹو شناسی کے باب میں اچھا اضافہ ہیں۔ اس کے برعکس ماہنامہ ''سپوتنک'' لاہور کا منٹو پر نکالا گیا خصوصی شمارہ تمام کا تمام گزشتہ منٹو نمبروں کا چربہ اور تکرار محض ہے۔ مزدور ''جدوجہد'' لاہور نے بھی اوسط درجے کے پانچ مضامین اور منٹو کی پانچ کہانیوں کے انتخاب پر ہی اکتفا کیا۔

منٹو کی وفات کے فوراً بعد ایک ہی سال یعنی ۱۹۵۵ء میں تو چھ رسالوں نے منٹو کے متعلق خصوصی شمارے شائع کیے۔ لیکن اس کی وفات کے پچاس برس یعنی ۲۰۰۴ء تک صرف پانچ رسائل اور ان کے مدیران کو منٹو پر خصوصی نمبر نکالنے کی توفیق نصیب ہوئی۔ لیکن اس سے بھی افسوسناک پہلو یہ ہے کہ منٹو کی پچاسویں برسی ۱۸ جنوری ۲۰۰۵ء کے اہم موقع کی مناسبت سے ہندوستان اور پاکستان سے شائع ہونے والے کسی معروف ادبی رسالے نے منٹو پر خصوصی شمارہ شائع کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ حالانکہ اردو کے ادبی حلقے اس سال کو سال منٹو تعبیر کرتے رہے۔ ہفت روزہ، مزدور، جدوجہد، لاہور اور انگارے ملتان دو ایسے رسائل ہیں جنھوں نے اس موقع کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے ذمہ داری کا ثبوت دیا۔ غیر ادبی ہونے کے باوجود مزدور جدوجہد کے مدیران نے غیر معمولی منٹو غیر شائع کیا۔ اس رسالے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں پیشہ ور اور ثقہ نقادوں کے روایتی نوعیت کے مضامین کی بجائے منٹو کی کہانیوں پر بننے والی فلموں، ٹی وی اور اسٹیج ڈراموں، ان ڈراموں کی رپورٹس۔ ریہر سلیں اور ان میں شامل اداکاروں اور دیگر متعلقہ افراد کے انٹرویوز، منٹو فہمی کا ایک منفرد انداز لیے ہوئے ہیں۔

ادبی رسائل و جرائد کی تاریخ میں انگارے کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کے مدیر نے ایک ہی سال یعنی جنوری اور دسمبر ۲۰۰۵ء میں منٹو پر دو خصوصی نمبر شائع کر کے اس کی پچاسویں برسی پر بہترین خراج عقیدت پیش کیا۔ پہلے شمارے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں شامل تمام مضامین بالکل نئے اور خاص طور پر لکھوائے گئے ہیں، دوسرے یہ کہ ان مضامین میں منٹو کی شخصیت کی روایتی جھلکیوں کی بجائے محض اس کے فن ہی کو موضوع بنایا گیا۔ تیسرے یہ کہ اس میں کسی بھی قسم کے تعصب، جانبداری یا مخصوص نقطہ ء نظر کی بجائے ہر دو قسم (مخالفت / مدافعت) کے مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں ان مضامین کے مطالعہ سے یہ اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ منٹو اپنی فکری جولانیوں کے سبب فی زمانہ بھی اتنا ہی متنازعہ ہے جتنا کہ وہ اپنی زندگی میں تھا۔

انگارے کے دوسرے شمارے میں گوجرانوالہ میں منعقد منٹو سیمینار کی روداد بھی خاصے کی چیز ہے۔ اس سیمینار میں کیے گئے مباحث میں بھی ہمیں واضح طور پر دو مختلف نقطہ ہائے نظر دکھائی دیتے ہیں۔ سیمینار میں شامل منٹو مخالف لابی ماضی کے بزرگوں کی طرح منٹو کو ادنی درجے کا افسانہ نگار، مضحکہ خیز خاکہ نگار اور ناکام ڈرامانویس قرار دینے اور منوانے پر مصر دکھائی دیتی رہی تو منٹو کے حق میں بھی بہت سے سینے سپر ہوئے۔ یوں انگارے کے ان شماروں میں منٹو کے باب میں ہر دو قسم کے نقطہ ہائے نظر کا مشاہدہ بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ منٹو صدی کے موقع پر ہندوستان اور پاکستان سے محض تین ادبی جرائد ''حرف جعفر''، ''فکر و تحقیق''اور ''زیست''، ضخیم قسم کے خصوصی شمارے شائع ہوئے ان رسائل میں شامل مضامین جدید ادبی تناظر میں منٹو کے متعلق کیے گئے مطالعات پر مبنی ہیں،

روشنائی، نیا ورق، ''ایوان اُردو'' اور سپوتنک نے بالترتیب، ۲۰۱۳ء، ۲۰۱۶ء میں خصوصی شمارے اور خصوصی گوشوں کی مدد سے اپنا حصہ شامل کیا۔ منٹو کے متعلق خصوصی شماروں میں ایک نام غیر ادبی رسالے ''روبی'' کا بھی لیا جاتا ہے۔ افسوس کہ اسے گمشدہ لکھنا پڑ رہا ہے۔ ان خصوصی شماروں کے علاوہ زیست، انگارے اور تناظر نے مختلف اوقات میں منٹو کے متعلق خصوصی گوشے چھاپ کر منٹو شناسی کی روایت کو مسلسل آگے بڑھائے رکھا۔

ان رسائل اور جرائد کے منٹو پر مرتب شدہ خاص نمبروں کے مطالعے سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ کسی بھی فنکار کی اپنے زمانے اور اس کے بعد کی معنویت اس تخلیق کار پر شائع ہونے والے ان خاص نمبروں سے کماحقہ آشکار ہوتی ہے۔ منٹو فہمی کی روایت میں ان جرائد کا ایک اہم کردار ہے۔ ''افکار''، ''نقوش''، ''گل خنداں''، ''پگڈنڈی''، ''شاعر''، ''دانشور''، ''سپوتنک''، ''مزدور جدوجہد''، ''زیست''، ''حرف جعفر''، ''فکر و تحقیق''، ''ایوان اُردو'' روشنائی اور انگارے'' نے ان خاص نمبروں کے ذریعے نہ صرف منٹو کی زندگی کے اہم نقش کو محفوظ کیا ہے بلکہ منٹو کی تخلیقات کو سمجھنے کے لیے ایک نیا تنقیدی تناظر بھی مختلف اوقات میں مہیا کیا ہے۔ ان رسائل کی وجہ سے کئی لوگوں کی توجہ منٹو پر لکھنے کی طرف گئی ہے اور کئی لوگوں کی توجہ ان رسائل کی اشاعت کے بعد منٹو کو سمجھنے اور بار دگر سمجھانے پر مائل ہوئی ہے۔ منٹو پر لکھی گئی اچھی تنقید ''افکار'' کے منٹو نمبر سے لے کر ایوان اُردو کے آخری خاص نمبر کے توسط سے ادبی دنیا کے سامنے آئی۔ حتیٰ کہ جن لوگوں نے بعد میں منٹو پر کتابیں لکھیں/مرتب کیں یا منٹو پر لکھے گئے اپنے مضامین کو کتابی صورت میں شائع کیا ان سب کے ابتدائی نقوش انہی رسائل و جرائد کے ذریعے ہی سامنے آئے۔ یوں منٹو شناسی کا دروازہ انہی رسائل و جرائد کے ذریعے کھلا اور یہ باب کھلا ہی رہے گا۔ مستقبل کے منٹو شناس انہی رسائل کے وسیلے سے منٹو فہمی کو آگے بڑھاتے رہیں گے۔

یہ ایک بدیہی امر ہے جس کی سچائی سے انکار کسی طور پر بھی ممکن نہیں کہ پاکستان یا ہندوستان کی جامعات میں اپنی وفات کے بیس برس بعد تک سعادت حسن منٹو (پی ایچ ڈی کی سطح پر) موضوع تحقیق نہیں بن سکا۔ اس کی وجہ جو بھی ہو، جامعات کے شعبہ ہائے اُردو میں مذہب پسند محققین اور ادباء کا غلبہ، مجموعی طور پر اُردو فکشن کی تحقیق اور تنقید سے محققین اور ناقدین کی بے اعتنائی یا پھر منٹو کے اندر کی وہ کڑواہٹ جسے برداشت کرنے کے لیے ایک خاص وضع کا ظرف درکار تھا۔ پاکستان میں سعادت حسن منٹو کی وفات کے وقت تین جامعات میں اُردو کے شعبے کھل چکے تھے۔ ان شعبوں میں تحقیق کی جو دنیا آباد تھی، اس میں زیادہ تر شعری متون کی تدوین یا پھر قدیم شعرا اور تذکرہ نگاروں کے احوال و آثار کی 'ترتیب' کی طرف زیادہ توجہ دی گئی۔ اُردو نثر کے اُس خاص حصے کی طرف جسے ہم فکشن کے نام سے موسوم کرتے ہیں، توجہ کی بھی گئی تو یہاں بھی زیادہ سے زیادہ فورٹ ولیم کالج کے متون کی تدوین کی اِکاّدُکاّ مثالیں ہی ملتی ہیں۔ جامعات سے منسلک اُردو کے اساتذہ نے زیادہ تر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو 'باغ و بہار'، 'فسانۂ عجائب' کے مباحث کی نذر کرنے میں عافیت محسوس کی۔ یہ بات بھی حیران کن ہے کہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے ڈاکٹر عبادت بریلوی اور سیّد وقار عظیم جیسے فکشن پرستوں کے منسلک رہنے کے باوجود جدید ناول، افسانے اور ڈرامے پر کوئی قابل ذکر تحقیقی کام نہ کرایا جاسکا۔

یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن کے متعلق ایم۔اے، ایم۔ فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر لکھے جانے والے اوّلین تحقیقی مقالے ہندوستان کی مختلف جامعات میں لکھے گئے۔ اس ضمن میں سب سے پہلا تحقیقی مقالہ ''منٹو بحیثیت

افسانہ نگار'' اجیت کمار بخشی نے معروف منٹو شناس ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کی نگرانی میں ۱۹۶۰ء میں جموں و کشمیر یونیورسٹی، سری نگر سے مکمل کیا۔ ٹھیک ایک سال بعد یعنی ۱۹۶۱ء میں نصرت یاسین نے ''منٹو کے افسانے'' کے عنوان سے سیّد وقار عظیم کی نگرانی میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور میں پانچ ابواب پر مشتمل اپنا مقالہ جمع کرا کے دونوں ممالک کی جامعات میں منٹو شناسی کی بنیاد رکھی۔ یہ مذکورہ بالا دونوں مقالہ جات ایم۔ اے اُردو کی ڈگری کے حصول کے لیے لکھے گئے۔ دستیاب اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان اور پاکستان کی جامعات میں اب تک منٹو شناسی کے باب میں سات پی ایچ ڈی، چھے ایم فل جب کہ ایم۔اے کی سطح پر گیارہ تحقیقی مقالات لکھے گئے۔ یقیناً یہ تعداد ہمارے اعداد و شمار سے کہیں زیادہ ہے۔ گزشتہ صدی میں سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن کے متعلق موضوع اور ترتیب کے لحاظ سے ملتے جلتے پی ایچ ڈی کی سطح کے دو مقالہ جات لکھے گئے۔ منٹو کی شخصی وفنی تفہیم کے متعلق پی ایچ ڈی کی سطح کا پہلا تحقیقی مقالہ بہ عنوان ''سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے'' برج کیش ایمہ (برج پریمی) نے پروفیسر حامدی کاشمیری کی نگرانی میں کشمیر یونیورسٹی، سری نگر سے ۱۹۷۶ء میں مکمل کر کے منٹو پر پہلی ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ چھ ابواب پر مشتمل اس مقالے میں برج کیش ایمہ نے سوانح حیات کے تفصیلی جائزے کے بعد منٹو کے فن کی تمام جہات کا، جن میں افسانہ، مضامین، انشائیے، خاکے، مکتوبات، تراجم، ناول اور ڈراموں کے علاوہ منٹو کی صحافتی زندگی شامل ہے کی تفصیلات بھی پیش کی ہیں۔

پاکستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں منٹو پر سب سے پہلا پی ایچ ڈی کا مقالہ علی ثناء بخاری نے پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے ڈاکٹر وحید قریشی کی نگرانی میں ۱۹۸۶ء میں مکمل کیا۔ برج کیش ایمہ کی طرح ان کا مقالہ بھی چھ ابواب پر مشتمل ہے اور کم و بیش وہی انداز اختیار کیے ہوئے ہے جو اس سے قبل مذکورہ بالا مقالے کا تھا۔ لیکن برج کیش ایمہ کے برعکس علی ثناء بخاری کے ہاں تحقیقی پختگی کا عنصر غالب ہے۔ سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن کے متعلق لکھا جانے والا یہ پہلا مقالہ ہے جس میں تحقیق و تنقید دونوں کا معیار بہت عمدہ ہے۔ پہلا باب جو منٹو کی سوانح حیات سے متعلق ہے، مقالے کا سب سے اہم حصہ ہے۔ اُنھوں نے منٹو کے متعلق پائی جانے والی بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا۔ منٹو کی تعلیمی زندگی کے حوالے سے مقالہ نگار نے جو ریکارڈ فراہم کیا ہے وہ یقیناً ستائش کے قابل ہے۔ خصوصاً میٹرک کے امتحان میں منٹو کی چار بار شرکت کو دستاویزات/ریکارڈ سمیت ثابت کیا گیا ہے۔ منٹو کی سوانح سے متعلق یہ ضخیم باب ۱۶۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ باب دوم 'افسانہ' میں منٹو کے افسانوی مجموعوں کے سنِ اشاعت، پبلشرز اور شامل افسانوں کی مکمل فہرست پر زیادہ توجہ صرف کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ مذکورہ کتابوں کے سائز تک بتائے گئے ہیں البتہ تنقیدی پہلو خاصا کمزور ہے۔ البتہ مقالے کے اگلے تین ابواب، ڈراما، خاکہ اور مضمون نگاری میں اس کمی پر قابو پالیا گیا ہے۔ ضمیمہ جات اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت اہم اور مقالہ نگار کی تحقیق و جستجو کے غماز ہیں۔ ۱۹۸۷ء میں فرید الدین احمد انصاری نے منٹو کی شخصیت اور فن کے عمومی جائزے کی بجائے ''سعادت حسن منٹو کے افسانوں میں کردار نگاری'' کا خصوصی مطالعہ کیا۔ اپنے اس مقالے میں اُنھوں نے بہت تفصیل سے منٹو کے نسوانی اور مرد کرداروں کا جائزہ لیتے ہوئے منٹو کو واحد افسانہ نگار قرار دیا جنھوں نے اُردو افسانے کو درجنوں آفاقی کردار دیے۔ فرید الدین احمد انصاری نے یہ مقالہ باب صاحب بھیم راؤ، امبیڈکر بہار یونیورسٹی، مظفر پور سے ۱۹۸۷ء میں مکمل کیا۔ بیسویں صدی کا آخری پی ایچ ڈی کی سطح کا مقالہ ''منٹو کی افسانہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ'' مہر نگار نے ڈاکٹر محمد حنیف قریشی کی نگرانی میں جواہر لعل یونیورسٹی، نئی دہلی سے ۱۹۹۴ء میں مکمل کیا۔ یہ خصوصی مطالعہ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے سعادت حسن منٹو کی فن افسانہ نگاری کا احاطہ کرتا ہے۔

گزشتہ صدی میں سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں پر مجموعی اعتبار سے پی ایچ ڈی کی سطح کے چار مقالہ جات تحریر کیے گئے۔ ان میں سے تین مقالے ہندوستان کی مختلف جامعات میں جب کہ ایک مقالہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور پاکستان میں تحریر کیا گیا۔

اکیسویں صدی کے اوّلین عشرے میں پی۔ ایچ ڈی کی سطح پر دو مقالہ جات سامنے آئے ہیں۔ پہلا مقالہ محمد ندیم اسلم (روش ندیم) نے ڈاکٹر رشید امجد کی نگرانی میں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لنگویجز، اسلام آباد سے جب کہ دوسرا مقالہ انصار احمد نے ڈاکٹر یونس حسنی کی نگرانی میں جامعہ کراچی کے شعبہ اُردو سے ۲۰۰۹ء میں مکمل کیا۔ محمد ندیم اسلم نے اپنے مقالے ''بیسویں صدی کے سیاسی اور سماجی حوالے سے منٹو کے افسانوں میں عورت کا کردار'' کو پانچ ابواب میں منقسم کیا ہے۔ باب اوّل ''تاریخی پس منظر'' دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ پانچ ہزار سالہ ہندوستانی ناری جب کہ دوسرے حصے میں بیسویں صدی میں پائے جانے والے تصور عورت کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس تاریخی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر کے بعد مقالہ نگار نے دیگر چار ابواب میں منٹو کا شعور اور اس کی عورتیں، منٹو کی عورتوں کا ارتقاء، منٹو کا تصورِ عورت اور منٹو کی عورتیں اور فحاشی و عریانی کا مسئلہ کو موضوعِ بحث بنایا۔

''سعادت حسن منٹو اور سماجی حقیقت نگاری (معاصر افسانہ نگاروں کے فنی تناظر میں)'' انصار احمد کا یہ مقالہ درج ذیل سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اوّل حقیقت نگاری، باب دوم اُردو نثر میں حقیقت نگاری، باب سوم منٹو کے حالاتِ زندگی، باب چہارم منٹو کا عہد، باب پنجم منٹو کی حقیقت نگاری اور معاصر افسانہ نگار، باب ششم منٹو اور فحاشی، باب ہفتم حقیقت نگاری کے حوالے سے اُردو ادب میں منٹو کا مقام۔ پہلے اور دوسرے باب کو اصولاً ایک ہی باب ہونا چاہیے تھا جب کہ دوسرے اور تیسرے باب کی اوّل تو ضرورت ہی نہیں تھی۔ مقالہ نگار اگر اسے اتنا ہی ضروری سمجھتے تھے تو بھی الگ الگ باب کی گنجائش نہیں نکلتی۔ انصار احمد کے مقالے کو پڑھتے ہوئے اکثر مقامات پر یہ احساس تقویت پکڑتا ہے کہ مقالہ نگار اپنے موضوع ''سماجی حقیقت نگاری'' کی بجائے سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن میں موجود تمام خوبیوں کو زیر بحث لے آئے ہیں۔ غیر متعلق مباحث کی بھرمار نے مقالہ نگار کو کنفیوز کیا ہو یا نہ کیا ہو قاری ضرور پریشان ہو جاتا ہے۔ منٹو کے حالاتِ زندگی اور تصانیف کی مکمل فہرست اور ان تصانیف میں شامل تحریروں کا اشاریہ تکرار محض کے سوا کچھ نہیں۔ جب کہ یہ تمام تفصیلات ان سے پہلے برج کیش ایمہ اور علی ثناء بخاری پہلے ہی اپنے مقالات کا حصہ بنا چکے ہیں۔

''سعادت حسن منٹو کے افسانوی ادب پر موپاساں کے اثرات'' اب تک منٹو پر لکھا جانے والا پی ایچ ڈی کی سطح کا آخری مقالہ ہے۔ ریاض قدیر نے یہ مقالہ ڈاکٹر عقیلہ شاہین کی سربراہی میں دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاول پور سے ۲۰۱۲ء میں مکمل کیا۔ پانچ ابواب پر مشتمل اس مقالے کا پہلا باب ''فرانسیسی اور اُردو افسانے کی روایت''، فرانسیسی اور اُردو افسانے کی روایت کی بجائے منٹو اور موپاساں کے حالات اور تخلیقات کے گرد ہی گھومتا دکھائی دیتا ہے۔ دوسرے باب میں منٹو اور موپاساں کے افسانوی ادب کے موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ تیسرے باب ''منٹو پر موپاساں کے اثرات، اشتراک اور اختلافات'' اور چوتھے باب ''منٹو اور موپاساں کے تقابلی مباحث'' کو الگ الگ ابواب میں تقسیم کرنا بھی سمجھ سے بالاتر ہے۔ آخری باب میں دونوں افسانہ نگاروں کا تقابلی مطالعہ مقالہ نگار کے قائم کیے گئے مفروضے کی نفی کرتا ہے۔ منٹو کے افسانوی ادب پر موپاساں کے اثرات کا جائزہ لیتے لیتے مقالہ نگار

نے اسلوب، موضوعات اور کردار نگاری کے حوالے سے منٹو کو موپاساں سے بڑاافسانہ نگار قرار دے دیا ہے۔ حالانکہ ان کا مقالہ اس کے متضاد نتائج کا متمنی اور متقاضی تھا۔ منٹو کے والد کا نام میاں غلام حسین اور منٹو کی تاریخ وفات ۱۸/اگست ۱۹۵۴ء کے اندراج سے مقالہ نگار کی موضوع مطالعہ سے وابستگی اور دلچسپی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ۳۱۴صفحات پر مشتمل اس مقالے کے ہر صفحے پر سولہ سطور کا مطلب مقالے کی ضخامت میں کم از کم ۶۲ صفحات کے اضافہ کے سوا کچھ نہیں اور ضرورت سے زیادہ اقتباسات بھی تعجب خیز ہیں۔

ایم۔ فل کی سطح پر لکھے گئے مقالہ جات کی تعداد چھ ہے۔ خورشید زاہد عابدی اور غلام احمد ڈار نے ایک ہی سال یعنی ۱۹۸۵ء میں بالترتیب ''سعادت حسن منٹو کے افسانوں میں کردار نگاری'' اور ''منٹو، بیدی، کرشن چندر کے افسانوں میں سماجی پس منظر'' کے عنوانات کے تحت مقالہ جات تحریر کیے۔ خورشید زاہد نے پنجاب یونیورسٹی، پٹیالہ سے محمد صدیق الرحمٰن قدوائی جب کہ غلام احمد ڈار نے محمد زمان آزردہ کی نگرانی میں یہ مقالہ جات مکمل کیے۔ ایم۔ فل کی سطح کا زمانی ترتیب کے لحاظ سے تیسرا مقالہ بھی ہندوستان ہی سے لیاقت علی نے ''منٹو کے شاہکار افسانے'' کے عنوان کے تحت پٹیالہ یونیورسٹی، پٹیالہ سے ۱۹۹۱ء میں تحریر کیا۔ ان تینوں مقالہ جات میں سعادت حسن منٹو کے افسانوی کرداروں، سیاسی و سماجی پس منظر کے حامل افسانوں اور منٹو کی افسانوی خوبیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پاکستان میں کامران حسین کاظمی اور روبینہ یاسمین نے بالترتیب ''سعادت حسن منٹو بطور مضمون نگار اور خاکہ نگار'' اور ''منٹو کے سیاسی شعور کا تحقیقی مطالعہ'' جب کہ طاہرہ اقبال کے تحقیقی مقالے میں سعادت حسن منٹو کے اسلوبیات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ پانچ ابواب پر مشتمل کامران حسین کاظمی کا مقالہ احمد جاوید کی نگرانی میں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لنگویجز، اسلام آباد سے ۲۰۰۸ء میں جب کہ روبینہ یاسمین نے ڈاکٹر علی ثناء بخاری کے زیر نگرانی علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد سے ۲۰۱۰ء میں اپنے مقالے کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ تینوں مقالہ نگاروں نے اپنے اپنے موضوعات کے ساتھ خوب انصاف کیا۔ ان کے یہ مقالے منٹو شناسی کے باب میں اچھا اضافہ ہیں۔

تعدادی اعتبار سے منٹو شناسی کے باب میں سب سے زیادہ مقالے ایم۔ اے کی ڈگری کے حصول کے لیے لکھے گئے۔ اب اسے اتفاق سمجھیے یا منٹو شناسی کے باب میں وژن کا فرق کہ ہندوستان اور پاکستان کی جامعاتی تحقیق کے تینوں مدارج یعنی ایم۔ اے، ایم۔ فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر کی جانے والی تحقیق کی شروعات ہمیشہ ہندوستان کی جامعات نے کیں۔ ایم۔ اے کی سطح پر سب سے پہلا مقالہ اجیت کمار بخشی نے ۱۹۶۰ء میں ''منٹو بحیثیت افسانہ نگار'' کے موضوع پر جموں و کشمیر یونیورسٹی سے معروف منٹو شناس ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کی نگرانی میں مکمل کیا جب کہ پاکستان سے اس موضوع پر ''منٹو کے افسانے'' کے عنوان سے نصرت یاسین نے ۱۹۶۱ء میں ایک سال بعد سیّد وقار عظیم کی نگرانی میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے تحریر کیا۔ ان اوّلین مقالہ جات کے بعد لکھے گئے ایم اے کے مقالہ جات کی فہرست زمانی سے کچھ اس طرح ہے:

فرحت وشیر ''منٹو، غلام عباس اور احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں حقیقت نگاری''، ۱۹۷۲ء
توصیف اختر، ''منٹو کے افسانوں میں معاشرتی مسائل''، ۱۹۷۳ء
زاہد رحیم زاہد، ''سعادت حسن منٹو کے افسانوں کے چند اہم کردار''، ۱۹۷۴ء
سید علمدار حسین بخاری، ''سعادت حسن منٹو، شخصیت اور فن''، ۱۹۷۹ء

نبیلہ عصمت، ''منٹو اور غلام عباس کے فنی وسائل کا تقابل''، ۱۹۹۰ء

عمارہ شمشاد، ''اُردو کے تین خاکہ نگار شاہد احمد دہلوی، سعادت حسن منٹو، عبدالسلام خورشید''، ۱۹۹۱ء

رضا احمد، ''سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے افسانوں کے موضوعات کا تقابلی جائزہ''، ۱۹۹۳ء

روبینہ گلزار احمد، ''منٹو اور روس کا افسانوی ادب''، ۲۰۰۴ء

محمد نوید ''منٹو شناسی کی روایت کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ''، ۲۰۰۵ء

منٹو کی شخصیت پر لکھے گئے ان مقالہ جات کے مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ بآسانی نکالا جاسکتا ہے کہ اُردو کے اس عظیم افسانہ نگار کے متعلق جامعاتی سطح پر کی جانے والی تحقیق و تنقید مکمل معنی میں منٹو کی شخصیت اور فن کا احاطہ نہیں کر پائی۔ ڈاکٹر برج کیش ایمہ اور ڈاکٹر علی ثناء بخاری کے مقالوں کو اس اعتبار سے ضرور فضیلت حاصل ہے کہ دونوں نے مجموعی اعتبار سے منٹو کی شخصیت اور فن کے تمام پہلوؤں کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حصول کے لیے لکھے گئے ان دو مقالوں کے علاوہ دیگر پانچ مقالہ نگاروں نے منٹو کی شخصیت اور فن کے تمام پہلوؤں کی بجائے فن کے جن تخصیصی گوشوں کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ اُن میں منٹو کی افسانہ نگاری، مضمون نگاری، خاکہ نگاری، کردار نگاری، نسوانی کردار اور حقیقت نگاری شامل ہیں۔ یقیناً منٹو کے فن کے ابھی بہت سے پہلو جامعاتی تحقیق و تنقید کے متقاضی ہیں۔ مثلاً منٹو کے ڈرامے، فلم نگاری، مکتوب نویسی، صحافتی زندگی اور تراجم نگاری پر سنجیدگی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ایم۔ فل کے لیے لکھے گئے مقالہ جات بھی انہی موضوعات کے گرد گھومتے دکھائی دیتے ہیں البتہ طاہرہ اقبال، روبینہ اشرف اور کامران حسین کاظمی نے منٹو کے اسلوب، سیاسی تصورات اور مضمون و خاکہ نگاری کو پہلی مرتبہ خصوصی مطالعے کا موضوع بنایا۔ ایم۔ اے کی سطح پر سوائے دو ایک کے علاوہ دیگر تمام مقالہ جات ناقص تحقیق اور بودی تنقید کا نمونہ ہیں۔ بیشتر محققین نے دیگر مقالوں، رسائل اور مضامین سے صفحات جوں کے توں نقل کر دیے ہیں۔ تحقیقی طور پر بھی ان میں بہت سی اغلاط ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ مقالہ جات ادنیٰ قسم کی ناکام طالب علمانہ کوششیں ہیں جنھوں نے منٹو کے باب میں تفہیم کی بجائے بہت سی غلط فہمیوں کو جنم دیا ہے۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ منٹو شناسی کے باب میں ابھی ہماری جامعات پر بہت سا قرض واجب الادا ہے۔

منٹو شناسی کی اس روایت میں مرتب اور تدوین کی گئی ان کتابوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جن میں منٹو کی تحریروں کو محفوظ کرنے کے جتن کیے گئے ہیں۔

سنگ میل، لاہور، امجد طفیل، ہمایوں اشرف اور شمس الحق عثمانی نے اپنے اپنے طور پر منٹو کی کلیات کی تدوین کر کے قارئین کو منٹو کے قریب ترین کرنے کی اپنی سی کوشش ضرور کی۔ شمس الحق عثمانی کی تدوین کردہ پورا منٹو اس تناظر میں سب سے عمدہ تدوین کہلائے جانے کی مستحق ہے۔ فاضل مدون نے تدوین کے اصولوں کی پاسداری دیگر مدونین کے مقابلے کافی بہتر انداز سے کی ہے۔ اسی طرح محمد سعید کی نوادرات منٹو جب کہ اسد فیض اور شہزاد منظر کے اشتراک سے منٹو کی گمشدہ کڑیاں کے نام سے شائع ہونے والی کتابیں بھی منٹو شناسی کا ایک خاص رنگ لیے ہوئے ہیں۔

اس مختصر جائزے کے بعد منٹو شناسی کی روایت بنیادی طور پر درج ذیل دھاروں میں منقسم ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ایک تو وہ دھارا ہے جو تنقید کو فتویٰ فروشی کے مماثل کوئی شے سمجھ کر محض چند لفظوں کی جگالی کرتے ہوئے، کچھ اعلیٰ درجے کے فنکاروں کے

بارے میں فیصلے صادر کرتے رہتے ہیں۔ان کی تنقیدی لغت کے معروف ترین الفاظ فحش نگار، جنسی، غیر محب وطن، غدار وغیرہ وغیرہ ہیں۔ناقدین کی اس فہرست میں چودھری محمد حسین، عبدالماجد دریا آبادی، مولانا تاجور نجیب آبادی اور راجہ صاحب آف محمود آباد کے علاوہ عزیز احمد اور علی سردار جعفری، سجاد ظہیر، ممتاز حسین تک کے نام لیے جا سکتے ہیں۔دوسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جنھوں نے ان فتویٰ فروشوں کے اثر کو اس طور پر قبول کیا کہ وہ ان کی لغت تو استعمال نہیں کرتے، لیکن فیصلہ وہی دیتے ہیں جس کا ذکر قبل ازیں کیا گیا۔گویا وہ ایسے مجہول الفکر ناقدین ہیں جو اپنی کوئی ذاتی رائے نہیں رکھتے بلکہ دوسروں کی سخت رائے کو نسبتاً نرم اور گوارا بنا کے پیش کرنے کے ڈھنگ سے شناسائی کا ثبوت دیتے ہیں۔اس ضمن میں بہت سے ترقی اور اصلاح پسند ناقدین کا شمار کیا جا سکتا ہے۔تیسری قبیل ان لوگوں کی ہے جنھوں نے منٹو پر بغیر سوچے سمجھے لکھا۔ان کی تنقید منٹو شناسی کی روایت میں محض حجمی یا کمیتی اضافہ کر سکی ہے۔اس قطار میں معروف اور غیر معروف ناموں کا ایک جمّ غفیر دکھائی دیتا ہے۔

منٹو شناسی کے باب میں چوتھی، آخری اور معتبر ترین قبیل ان ناقدین پر محیط ہے جنھوں نے اپنی خلقی ذہانت، طباعی، اوریجنلٹی اور تازہ فکری سے منٹو شناسی کی روایت میں نہ صرف نمایاں اضافے کیے بلکہ پہلے تین زمروں کی پھیلائی ہوئی گرد کو بھی صاف کرنے کی کوشش کی۔ان ناقدین نے منٹو کو نئے تناظر میں دریافت کر کے اس کی تعبیر نو کی۔انہی ناقدین کی وجہ سے منٹو شناسی کی روایت یقیناً اس قدر توانا ہے کہ اُردو افسانے پر لکھی جانے والی سب سے قیمتی تنقید کہلائے جانے کی مستحق ہے۔ان سربرآوردہ ناقدین میں محمد حسن عسکری، ممتاز شیریں، وارث علوی، سید محمد محسن، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، شمس الحق عثمانی، ڈاکٹر برج پریمی ڈاکٹر علی ثناء بخاری کے علاوہ جگدیش چندر ودھاون، سجاد شیخ اور پرویز انجم کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

منٹو کی شخصیت اور فن پر لکھی گئی سو کے لگ بھگ طبع زاد اور مرتبہ کتب، چوبیس تحقیقی مقالہ جات، بیس رسائل کے خصوصی شماروں، مختلف اخبارات ورسائل میں چھپنے والے سیکڑوں مضامین اور کلیات کی تداوین کے باوجود یہ سوال اپنی جگہ موجود ہے کہ اب تک منٹو جیسے نابغہ روزگار ادیب کی باقاعدہ سوانح عمری نہیں لکھی گئی۔پرویز انجم نے امرتسر کا منٹو میں ایک مخصوص عہد اور علاقے کے منٹو کو تو ضرور محفوظ کر لیا ہے لیکن مکمل سوانح حیات کا باب ابھی تک بند ہے جس کی کمی منٹو صدی کے موقع پر خاص طور سے محسوس کی گئی۔زیادہ تر ناقدین، محققین، مرتبین اور مدونین ایک ہی دائرے میں گھومتے دکھائی دیتے ہیں۔حالانکہ منٹو کی شخصیت اور فن کے بے شمار گوشے ابھی تک پوشیدہ ہیں۔ مثلاً ''منٹو کی شخصیت'' اور فن کے متعلق مختلف اخبارات میں مختلف اوقات میں خصوصاً پیدائش اور وفات کے مخصوص ایام میں بہت سے کالم، اداریے اور خصوصی ایڈیشن شائع ہوتے رہے، اسی طرح منٹو کی مختلف کہانیوں کو اسٹیج ڈراموں، ٹیلی ویژن ڈراموں اور فلموں کی شکل میں پیش کیا گیا۔ فلم کے علاوہ صحافت کے ساتھ بھی منٹو ایک طویل عرصہ تک جڑے رہے۔اپنی صحافتی زندگی میں اُنھوں نے مختلف اخبارات اور رسائل کا پیٹ بھرنے کے لیے بہت سی تحریریں لکھیں جو تاحال منظر عام پر نہیں آئی۔مزید برآں منٹو کی مکتوب نویسی اور تراجم کا باب بھی اچھی خاصی تشنگی کا شکار ہے۔ان حوالوں سے منٹو کے فن کو جانچنے کی اشد ضرورت اور گنجائش ہے۔

گویا ۱۰۰ سال گزرنے کے بعد بھی سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن کے بہت سے پہلو ایک غیر جانبدارانہ اور سنجیدہ تحقیقی مطالعے کے متقاضی ہیں۔

کتابیات

تحقیق و تنقیدی کتب:

۱۔ آزاد کوثری: ''نئے افسانے کی سماجی بنیادیں''روہتاس بکس، لاہور، ۱۹۹۱ء۔

۲۔ آصف فرخی، منٹو کا آدمی نامہ، شہرزاد، کراچی، ۲۰۱۲ء۔

۳۔ آغا مسعود رضا خاکی، ڈاکٹر: ''اردو افسانے کا ارتقاء''مکتبہ خیال، لاہور، اگست ۱۹۸۷ء۔

۴۔ آلِ احمد سرور: ''تنقیدی اشارے''، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۶۳ء۔

۵۔ ابدال احمد جعفری، سعادت حسن اور منٹو، نگارشات، لاہور، ۲۰۱۳ء۔

۶۔ ابوالحسن نغمی، سعادت حسن منٹو (ذاتی یادداشتوں پر مبنی اوراق)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء۔

۷۔ ابو سعید قریشی: ''منٹو''، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، بار دوم، ۱۹۸۸ء۔

۸۔ ابوالخیر کشفی، سید: ''جدید ادب کے دو تنقیدی جائزے''، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، طبع اوّل، ۱۹۶۳ء۔

۹۔ ابواللّیث صدیقی، ڈاکٹر: ''آج کا اردو ادب''، فیروز سنز، لاہور، پہلی بار، ۱۹۷۰ء۔

۱۰۔ احمد سلیم: ''سعادت حسن مر گیا منٹو زندہ ہے''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء۔

۱۱۔ احمد سلیم، منٹو ہمارے عہد کا تخلیقی ضمیر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء۔

۱۲۔ احمد سلیم، منٹو میرا دوست، میرا دشمن، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء۔

۱۳۔ احمد ندیم قاسمی، منٹو کے خطوط ندیم کے نام، کتاب نما، لاہور، ۱۹۶۲ء۔

۱۴۔ احمد ندیم قاسمی: ''سعادت حسن منٹو''، ''میرے ہم سفر''اساطیر، لاہور، ۲۰۰۲ء۔

۱۵۔ اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، منٹو اور مزاح، بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۰۷ء۔

۱۶۔ اصغر ندیم سید: ''طرز احساس''سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۸ء۔

۱۷۔ اطہر پرویز، ڈاکٹر ''منٹو کے شاہکار افسانے''شعبہ اُردو، علی گڑھ، ۱۹۹۴ء۔

۱۸۔ اعجاز حسین، ڈاکٹر: ''مختصر تاریخ ادب اردو''، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۲ء۔

۱۹۔ افضال حسین، قاضی، منٹو کے افسانے (انتخاب و مطالعات)، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۱۳ء۔

۲۰۔ افضال حسین قاضی، سعادت حسن منٹو (ایک صدی بعد)، سنٹر آف ایڈوانس اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۱۳ء۔

۲۱۔ الطاف احمد قریشی، منٹو اور ہم، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور، ۲۰۱۳ء۔

۲۲۔ امتیاز بلوچ: ''حاصل مطالعہ''، بیکن بکس، ملتان، ۱۹۸۸ء۔

۲۳۔ امجد جاوید: ''منٹو کے نسوانی کردار''، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۴ء۔

۲۴۔ انتظار حسین: ''چراغوں کا دھواں''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء۔

۲۵۔ انوار احمد، ڈاکٹر، ''منٹو کی بیس کہانیاں''، کاروانِ ادب ملتان، ۱۹۸۶ء۔

۲۶۔ انوار احمد، ڈاکٹر: ''اردو افسانہ تحقیق و تنقید''، بیکن بکس ملتان، ۱۹۸۸ء۔
۲۷۔ انور سجاد: ''تلاش وجود''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۶ء۔
۲۸۔ انیس ناگی: ''سعادت حسن منٹو''فیروز سنز، لاہور، ۱۹۸۹ء۔
۲۹۔ انیس ناگی: ''پاکستانی ادب کی تاریخ''، جمالیات، لاہور، ۲۰۰۴ء۔
۳۰۔ انیس ناگی: ''سعادت حسن منٹو کی کہانی''، جمالیات، لاہور، ۲۰۰۵ء۔
۳۱۔ انیس ناگی: ''سعادت حسن منٹو، ایک مطالعہ''، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۱ء۔
۳۲۔ انیس ناگی: ''سعادت حسن منٹو کے مقدمات''، جمالیات، لاہور، ۱۹۹۹ء۔
۳۳۔ انیس ناگی: ''معمار افسانہ نگار، سعادت حسن منٹو''، جمالیات، لاہور، ستمبر ۱۹۹۹ء۔
۳۴۔ اوپندر ناتھ اشک: ''منٹو میرا دشمن''جمشید کتاب گھر، حیدر آباد، ۱۹۵۵ء۔
۳۵۔ اورنگ زیب عالمگیر، ڈاکٹر: ''سعادت حسن منٹو، تحقیقی و تنقیدی مطالعہ''سنگت پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۵ء۔
۳۶۔ اے حمید: ''یادوں کے گلاب''، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۸ء۔
۳۷۔ اے حمید: ''سنگ دوست، جودت پبلی کیشنز، لاہور اشاعت اوّل، ۱۹۸۴ء۔
۳۸۔ برج پریمی، ڈاکٹر، سعادت حسن منٹو، حیات اور کارنامے، دیپ پبلی کیشنز، سری نگر، کشمیر، ۱۹۸۶ء۔
۳۹۔ برج پریمی، ڈاکٹر: ''منٹو کتھا''، دیپ پبلی کیشنز، باغ باہو، جموں، ۱۹۹۴ء۔
۴۰۔ بلراج منیرا، دستاویز، شعور پبلی کیشنز، دہلی، ۱۹۸۲ء۔
۴۱۔ بلونت گورکی: ''منٹو کے بہترین افسانے''، مکتبہ شعر و ادب، لاہور، س ن۔
۴۲۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ (مرتب): ''اردو افسانہ روایت اور مسائل''، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، طبع اوّل، ۱۹۸۸ء۔
۴۳۔ پرویز انجم، سعادت حسن مر گیا، منٹو نہیں مرا، مکتبہ جدید، لاہور، ۲۰۱۵ء۔
۴۴۔ پرویز انجم، منٹو غالب کا پرستار، مثال پبلیشرز فیصل آباد، ۲۰۱۲ء۔
۴۵۔ پرویز انجم، منٹو نامے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء۔
۴۶۔ پرویز انجم، منٹو باتیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء۔
۴۷۔ پرویز انجم، امرت سر کا منٹو، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء۔
۴۸۔ پرویز انجم، میں نے منٹو کو کیسا پایا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء۔
۴۹۔ پرویز انجم، منٹو اور سینما، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء۔
۵۰۔ پریم گوپال متل، منٹو شخصیت اور فن، ماڈرن پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء۔
۵۱۔ پریم گوپال متل، سعادت حسن منٹو، ماڈرن پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء۔
۵۲۔ تنویر عباس نقوی، منٹو کے سیاسی افسانے، دعا پبلی کیشنز، لاہور، س۔ن۔
۵۳۔ جگدیش چندر ودھاون: ''منٹو نامہ''، مکتبہ شعر و ادب، لاہور، ۱۹۸۹ء۔
۵۴۔ جیلانی کامران: ''کلاسیک''، ظہیر ایسوسی ایٹ، راولپنڈی، جنوری ۱۹۸۶ء۔

۵۵۔ حامدی کاشمیری، ڈاکٹر: ''تفہیم و تنقید''، نئی آواز، جامعہ نگر، نئی دلی، باراوّل، ۱۹۸۸ء۔

۵۶۔ حمایت علی شاعر: ''شخص و عکس''، المصنّفین، کراچی ۱۹۸۴ء۔

۵۷۔ حمید کاشمیری: 'منٹو ادبی عدالت میں''، مقبول اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۳ء۔

۵۸۔ حمیرا خان، منٹو کے باغی کردار، شمع بکس، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء۔

۵۹۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، فسانے منٹو کے اور پھر بیاں اپنا، ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء۔

۶۰۔ دانش علی، منٹو کا انکار، بک ایج، لاہور، ۲۰۱۶ء۔

۶۱۔ روبینہ یاسمین، منٹو کا سیاسی شعور، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۲ء۔

۶۲۔ روش ندیم، ڈاکٹر، منٹو کی عورتیں، پورب اکادمی، اسلام آباد ۲۰۰۹ء۔

۶۳۔ ریاض قدیر، ڈاکٹر، منٹو اور موپاساں، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء۔

۶۴۔ سبط حسن: ''افکار تازہ'' مرتبہ، سید جعفر احمد، سہیل احمد، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۸۸ء۔

۶۵۔ سجاد شیخ، پروفیسر، سیاہ حاشیے، تجزیاتی مطالعہ، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء۔

۶۶۔ سجاد شیخ پروفیسر: ''دستاویز''، اثبات پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۱۹۸۵ء۔

۶۷۔ سجاد حارث: ''ادب اور ریڈیکل جدیدیت''، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۸ء۔

۶۸۔ سجاد ظہیر، سیدّ: ''روشنائی''، لاہور، مکتبہ اردو، دوسری بار، ۱۹۷۶ء۔

۶۹۔ سراج منیر: ''کہانی کے رنگ''، جنگ پبلشرز، لاہور، اکتوبر ۱۹۹۱ء۔

۷۰۔ سلام سندیلوی ڈاکٹر: ''ادب کا تنقیدی مطالعہ''، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۷۲ء۔

۷۱۔ سلیم احمد: ''نئی نظم اور پورا آدمی''، ادبی اکیڈمی سندھ، کراچی، طبع اوّل، ۱۹۶۲ء۔

۷۲۔ سلیم احمد: ''نگاہ اور نقطے''، جدید ناشرین، لاہور باراوّل، ۱۹۶۸ء۔

۷۳۔ سلیم اختر: ''افسانہ حقیقت سے علامت تک''، مکتبہ عالیہ لاہور، طبع اوّل، ۱۹۷۶ء۔

۷۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: ''افسانہ اور افسانہ نگار''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء۔

۷۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ''، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۷۱ء۔

۷۶۔ سہیل احمد ڈاکٹر: ''طرفیں''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء۔

۷۷۔ شاہد احمد دہلوی: ''گنجینہ گوہر'' مکتبہ نیا دور، کراچی، ۱۹۶۲ء۔

۷۸۔ شکیل الرحمٰن، ڈاکٹر، منٹو شناسی، اردو مرکز، عظیم آباد، پٹنہ، ۱۹۹۷ء۔

۷۹۔ شمس الحق عثمانی، غالب اور منٹو، غالب اکیڈمی، نئی دہلی، ۲۰۱۳ء۔

۸۰۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ہمارے لیے منٹو صاحب، شہرزاد کراچی، ۲۰۱۲ء۔

۸۱۔ شمیر حیدر شجر۔ نوید الحسن: ''سعادت حسن منٹو، پچاس برس بعد'' (مرتبہ) شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۵ء۔

۸۲۔ شمیم حنفی، منٹو حقیقت سے افسانے تک، شہرزاد کراچی، ۲۰۱۲ء۔

۸۳۔ م حنفی: ''کہانی کے پانچ رنگ''، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۶ء۔

۸۴۔ شہزاد منظر: ''مطلع''، مطلع پبلی کیشنز، خانیوال، س۔ن۔

۸۵۔ شہزاد منظر/اسد فیض، منٹو کی گم شدہ تحریریں، ظفر اکیڈمی، اُردو بازار، کراچی، ۲۰۱۴ء۔

۸۶۔ شیما مجید: ''مقالات فیض''(مرتبہ)، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۹۰ء۔

۸۷۔ صابرہ سعیدہ، ڈاکٹر: ''اردو ادب میں خاکہ نگاری''، مکتبہ شعر و حکمت، حیدر آباد، باراوّل، ۱۹۷۸ء۔

۸۸۔ صالحہ زرین، منٹو ایک نیا مطالعہ، ادبستان پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۲ء۔

۸۹۔ صدیق الرحمٰن قدوائی: ''تاثر نہ کہ تنقید''، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، دسمبر ۱۹۹۱ء۔

۹۰۔ صدیق جاوید: ''متاعِ عزیز''، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء۔

۹۱۔ صہبا لکھنوی: ''منٹو ایک کتاب''، مکتبہ افکار، ۱۹۹۴ء۔

۹۲۔ ضیا ساجد: ''سعادت حسن منٹو''، قابلِ تحسین شمس قادری، گاف روڈ، لاہور، س ن۔

۹۳۔ طاہر اصغر، یہ ہے منٹو شخصیت، مکتبہ جدید، لاہور، ۲۰۱۲ء۔

۹۴۔ طاہر اصغر، یہ ہے منٹو فن، مکتبہ جدید، لاہور، ۲۰۱۲ء۔

۹۵۔ طاہر اصغر، نامور منٹو، بک ایج، لاہور، ۲۰۱۶ء۔

۹۶۔ طاہر اصغر، منٹو کی پہچان، بک ایج، لاہور، ۲۰۱۶ء۔

۹۷۔ طاہر اصغر، منٹو کا انکار، بک ایج، لاہور، ۲۰۱۶ء۔

۹۸۔ طاہر اصغر، سب سے بڑا افسانہ نگار، بک ایج، لاہور، ۲۰۱۶ء۔

۹۹۔ طاہرہ اقبال، منٹو کا اُسلوب، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء۔

۱۰۰۔ عابد حسن منٹو: ''نقطہ نظر''، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۳ء۔

۱۰۱۔ عارف عبدالمتین: ''امکانات''، لاہور ٹیکنکل پبلشرز، طبع اوّل، ۱۹۷۵ء۔

۱۰۲۔ عامر سہیل، ڈاکٹر، کون ہے یہ گستاخ، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور، ۲۰۱۵ء۔

۱۰۳۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر: ''تنقیدی تجربے''، اردو دُنیا، کراچی، طبع اوّل، ۱۹۵۹ء۔

۱۰۴۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر: ''تنقیدی زاویے''، اردو اکیڈمی، کراچی، طبع اوّل، ۱۹۵۱ء۔

۱۰۵۔ عبداللہ، سیدّ، ڈاکٹر: ''اردو ادب''، مکتبہ خیابانِ ادب، لاہور، طبع اوّل، ۱۹۶۷ء۔

۱۰۶۔ عزیز احمد: ''ترقی پسند ادب''، اشاعت اردو، حیدر آباد دکن، طبع اوّل ۱۹۴۵ء۔

۱۰۷۔ عزیز احمد: ''متاعِ عزیز'' مرتبہ صدیق جاوید، مکتبہ جاوید، لاہور، ۱۹۴۱ء۔

۱۰۸۔ علی احمد فاطمی، کامریڈ منٹو، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۴ء۔

۱۰۹۔ علی ثنا بخاری، سعادت حسن منٹو، تحقیق، منٹو اکادمی، لاہور، ۲۰۰۶ء۔

۱۱۰۔ علی ثنا، بخاری، ڈاکٹر: ''سعادت حسن منٹو، کتابیات''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء۔

۱۱۱۔ عصمت چغتائی، میرا دوست میرا دشمن، ماڈرن پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۷۲ء۔

۱۱۲۔ غلام زہرا: ''منٹو کیا تھا''، برائٹ بکس، لاہور، ۲۰۰۳ء۔

۱۱۳۔ فاروق سلہریا، منٹو از عالم بالا، گڈ بکس، لاہور، ۲۰۱۰ء۔

۱۱۴۔ فتح محمد ملک، پروفیسر: ''سعادت حسن منٹو ایک نئی تعبیر''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء۔

۱۱۵۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر: ''اردو افسانہ نگاری کے رجحانات''، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۰ء۔

۱۱۶۔ فرید احمد: ''دائیں بائیں اوپر نیچے''، المسلم پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۵ء۔

۱۱۷۔ فیض الرحمٰن اعظمی: ''افکارِ نو'' اردو مرکز، اردو بازار دہلی مارچ ۱۹۶۲ء۔

۱۱۸۔ قمر یورش، گنجا فرشتہ، الفاظ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء۔

۱۱۹۔ کرشن چندر: ''سعادت حسن منٹو (نئے ادب کے معمار)'' کتب پبلشرز، ممبئی، ۱۹۴۸ء۔

۱۲۰۔ کہکشاں پروین، ڈاکٹر: ''منٹو اور بیدی کا تقابلی مطالعہ''، ایجوکیشن پبلشرز، دہلی، ۲۰۰۴ء۔

۱۲۱۔ لیزلی فلیمنگ، میرے مطابق منٹو، مکتبہ جدید پبلی کیشنز، لاہور، س۔ن۔

۱۲۲۔ مبین مرزا/رؤف پاریکھ، سعادت حسن منٹو (منٹو صدی مضامین)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، ۲۰۱۱ء۔

۱۲۳۔ محمد اسد اللہ: ''منٹو میرا دوست''، منٹو میموریل سوسائٹی، لاہور و کراچی، ۱۹۵۶ء۔

۱۲۴۔ محمد حسن عسکری: ''ستارہ یا بادبان''، مکتبہ سات رنگ، کراچی طبع اوّل، ۱۹۶۳ء۔

۱۲۵۔ محمد حسن عسکری: ''انسان اور آدمی''، علی گڑھ بک ڈپو، علی گڑھ، ۱۹۷۶ء۔

۱۲۶۔ محمد حسن عسکری ''عسکری نامہ''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء۔

۱۲۷۔ محمد حسن، ڈاکٹر: ''شناسا چہرے''، غضنفر اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء۔

۱۲۸۔ محمد حسین پرکار، سعادت حسن منٹو (عصر حاضر کے آئینے میں)، ہندوستان پرچار سبھا، بمبئی، ۲۰۱۳ء۔

۱۲۹۔ محمد حمید شاہد، سعادت حسن منٹو، جادوئی حقیقت نگاری اور آج کا افسانہ، شہرزاد کراچی، ۲۰۱۳ء۔

۱۳۰۔ محمد سعید، نوادرات منٹو، ادارہ فروغ اُردو، لاہور، ۲۰۰۹ء۔

۱۳۱۔ محمد خالد اختر: ''کھویا ہوا افق''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء۔

۱۳۲۔ محمد طفیل: ''صاحب''، ادارۂ فروغِ اردو، لاہور، بار اوّل، ۱۹۵۵ء۔

۱۳۳۔ محمد غیاث الدین شیخ: ''ہندو مسلم فسادات اور اردو افسانہ''، نگارشات، لاہور، ۱۹۹۹ء۔

۱۳۴۔ محمد محسن، پروفیسر: ''سعادت حسن منٹو، اپنی تخلیقات کی روشنی میں'' (ایک نفسیاتی تجزیہ)، دار الاشاعت ترقی دہلی، ۱۹۸۲ء۔

۱۳۵۔ محمود بریلوی، پروفیسر: ''مختصر تاریخِ ادبِ اردو'' شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور طبع اوّل، ۱۹۸۵ء۔

۱۳۶۔ ممتاز حسین، پروفیسر: ''نقدِ حیات''، الٰہ آباد پبلشنگ ہاؤس، الٰہ آباد، ۱۹۵۰ء۔

۱۳۷۔ ممتاز حسین، پروفیسر: ''ادب اور شعور''، ادارہ نقد و ادب، کراچی، ۱۹۹۲ء۔

۱۳۸۔ ممتاز شیریں: ''معیار''، لاہور، نیا ادارہ طبع اوّل، ۱۹۶۳ء۔

۱۳۹۔ ممتاز شیریں: ''منٹو نوری نہ ناری'' (مرتبہ: آصف فرخی)، مکتبہ اُسلوب، کراچی، ۱۹۸۵ء۔

۱۴۰۔ منیر احمد شیخ: ''حرف بیاں''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء۔
۱۴۱۔ مہدی علی صدیقی: ''بلا کم و کاست''، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی، ۲۰۰۲ء۔
۱۴۲۔ میمونہ انصاری: ''تنقیدی رویے''، مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۸۹ء۔
۱۴۳۔ نگار عظیم، منٹو کا سرمایہ فکر و فن، بزم ہم قلم، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء۔
۱۴۴۔ نظیر صدیقی: ''تاثرات و تعصّبات''شعبۂ تحقیق و اشاعت، مدرسہ عالیہ، ڈھاکہ، دسمبر ۱۹۶۲ء۔
۱۴۵۔ نصر اللہ خان: ''کیا قافلہ جاتا ہے''، مکتبہ تہذیب و فن، کراچی، ۱۹۸۴ء۔
۱۴۶۔ وارث علوی: ''دو ادیب'' (سعادت حسن منٹو۔ راجندر سنگھ بیدی)، شاہد پبلی کیشنز، لاہور س ن۔
۱۴۷۔ وارث علوی: ''منٹو۔ ایک مطالعہ''، مکتبہ جدید، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء۔
۱۴۸۔ وحید قریشی، ڈاکٹر (مرتب): ''اردو کا بہترین انشائی ادب''، میری لائبریری، لاہور، باراوّل، ۱۹۶۴ء۔
۱۴۹۔ وقار عظیم سید ''داستان سے افسانے تک''، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، طبع اوّل، ۱۹۶۰ء۔
۱۵۰۔ وقار عظیم، سیّد: ''نیا افسانہ''، جناح پریس، دہلی، ۱۹۶۴ء۔
۱۵۱۔ وقار عظیم، سیّد: ''داستان سے افسانے تک''، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء۔
۱۵۲۔ وقار عظیم، سید، منٹو کا فن، اعجاز پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۲ء۔
۱۵۳۔ وہاب اشرفی: ''آگہی کا منظر نامہ''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دلّی، ۱۹۹۱ء۔
۱۵۴۔ ہمایوں اشرف، سعادت حسن منٹو ایک لیجنڈ، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۷ء۔
۱۵۵۔ یونس جاوید: ''حلقہ اربابِ ذوق''، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۴ء۔

رسائل و جرائد:

۱۔ ''آئندہ'' کراچی، جلد ۱۰، شمارہ ۳۷، جنوری تا مارچ ۲۰۰۵ء، جلد ۲۔ شمارہ ۸ نومبر دسمبر ۱۹۹۷ء، جلد ۳، شمارہ ۱۲ نومبر ۱۹۹۸ء، جلد ۹، شمارہ ۳۴، جولائی ۲۰۰۴ء، جلد ۹، شمارہ ۳۵-۳۶، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۴ء۔
۲۔ ''ادب لطیف''، جلد ۴۰، شمارہ ۱۱، ۱۰، اکتوبر نومبر ۱۹۷۶ء، جلد ۵۱، شمارہ ۱۱-۱۹۸۵ء، جون ۱۹۶۶ء۔
۳۔ ''ادبیات، اسلام آباد، جلد ۲، شمارہ ۸-۹، اپریل ستمبر ۱۹۸۹ء، جلد ۱۶، شمارہ ۶۶، ۲۰۰۴ء، جلد ۱۶، شمارہ ۶۶، ۲۰۰۴ء، جلد ۱۶، شمارہ ۶۶، ۲۰۰۴ء، جلد ۱۶، شمارہ ۶۶، ۲۰۰۴ء، جلد ۱۳، شمارہ ۵۵، ۲۰۰۱، شمارہ ۱۶، جلد ۴۶، ۲۰۰۴ء، جلد ۱۷، شمارہ ۶۸، ۲۰۰۵ء، شمارہ ۶۶، ۲۰۰۴ء، جلد ۱۶، شمارہ ۶۶، ۲۰۰۴ء۔
۴۔ ''افکار'' کراچی، جلد ۴۷، شمارہ ۲۴۶، ستمبر ۱۹۹۰ء۔
۵۔ ''افکار'' (منٹو نمبر) کراچی، ۱۹۵۵ء، افسانہ نمبر، مارچ ۱۹۵۳ء۔
۶۔ ''انگارے'' (منٹو نمبر) ملتان، جنوری ۲۰۰۵ء، دسمبر ۲۰۰۵ء۔
۷۔ ''اوراق'' لاہور (افسانہ وانشائیہ نمبر) جلد ۷، شمارہ ۴-۳، ۱۹۷۲ء، جلد ۲۲، شمارہ ۴-۵، اپریل مئی ۱۹۸۷ء، جلد ۲، سالنامہ، جنوری ۱۹۶۷ء، خاص نمبر، جلد ۸، شمارہ ۳-۴ مارچ اپریل ۱۹۷۳ء، فروری ۱۹۸۶ء، خاص نمبر، جلد ۲ شمارہ، ۱۲-۱۱ نومبر دسمبر

۱۹۸۴ء، خاص نمبر، مئی جون ۱۹۸۳ء، شمارہ ۱۱۔ ۱۲، نومبر ۱۹۸۳ء، افسانہ نمبر، دسمبر ۱۹۶۹ء، شمارہ ۱، ۲، جنوری فروری ۱۹۷۷ء۔

۸۔ ''اُسلوب'' کراچی، جلد ۸، شمارہ ۴، اکتوبر ۱۹۸۵ء۔

۹۔ ایوان اُردو (سعادت حسن منٹو نمبر)، دہلی، فروری، ۲۰۱۳ء۔

۱۰۔ ''بادبان''، کراچی، جلد ۱، شمارہ ۱، ۱۹۹۵ء۔

۱۱۔ ''بازیافت''، شعبۂ اردو جامعہ کشمیر، سری نگر، ۱۹۷۷ء۔

۱۲۔ ''پاکستانی ادب''، کراچی جلد ۲، شمارہ ۷، جولائی ۱۹۷۵ء۔

۱۳۔ ''پگڈنڈی (منٹو نمبر)، امرتسر، اپریل مئی ۱۹۵۵ء۔

۱۴۔ ''تجدید نو''، لاہور، شمارہ ۲، جلد ۴، فروری ۱۹۶۴ء۔

۱۵۔ ''تخلیقی ادب''، لاہور شمارہ ۵۔

۱۶۔ ''تمثال'' کراچی، جلد ۱۔ ۲۔ ۳۔ ۱۹۹۲ء۔

۱۷۔ تناظر، گجرات، کتابی سلسلہ، ۲، جولائی تا دسمبر، ۲۰۱۲ء۔

۱۸۔ حرف جعفر (بسلسلہ منٹو صدی)، فیصل آباد، اپریل، مئی، ۲۰۱۲ء۔

۱۹۔ ''دانشور'' (منٹو نمبر) لاہور، س ن۔

۲۰۔ ''دریافت'' اسلام آباد، جون ۱۹۹۱ء، شمارہ ۷، ستمبر اکتوبر، ۱۹۹۰ء۔

۲۱۔ ''دنیازاد''، کراچی، کتابی سلسلہ نمبر ۱۳، ۲۰۰۴ء۔

۲۲۔ روشنائی (منٹو نمبر)، کراچی، مارچ، ۲۰۱۳ء۔

۲۳۔ زیست (منٹو صدی نمبر)، کراچی، کتابی سلسلہ ۴، نومبر، ۲۰۱۲ء، کتابی سلسلہ نمبر ۱، جنوری، ۲۰۱۰ء، کتابی سلسلہ نمبر ۲، اگست، ۲۰۱۰ء، کتابی سلسلہ نمبر ۸، مئی، جون، ۲۰۱۵ء، کتابی سلسلہ نمبر ۱۱، مئی ۲۰۱۷ء۔

۲۴۔ ''ساقی'' کراچی، سالنامہ، جلد ۵۰، شمارہ ۶ ۱۹۵۶ء، جلد ۴۹، شمارہ ۱، سالنامہ جنوری ۱۹۵۴ء۔

۲۵۔ ''سپوتنک'' (منٹو نمبر) لاہور، فروری ۱۹۹۴ء۔

۲۶۔ ''سرِ آب''، مرتبہ: شرافت عباس، سالانہ مجلّہ شعبۂ اُردو جامعہ بلوچستان، ۱۹۸۷ء۔

۲۷۔ ''سویرا'' کراچی، شمارہ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱، ۱۹۷۱ء۔

۲۸۔ ''سیارہ'' لاہور، جلد ۵۴، سمارہ ۳، ۴، ۱۹۸۸ء۔

۲۹۔ ''سیپ'' کراچی، شمارہ ۲۶، شمارہ ۵۸، سالانہ ۱۹۹۲ء، افسانہ نمبر، شمارہ ۳۳، مارچ ۱۹۷۶ء، شمارہ ۰۷، خاص نمبر ۲۰۰۱ء، شمارہ ۶۴، جولائی ۱۹۹۶ء، شمارہ ۲۶، شمارہ ۱۸، جولائی اگست ۱۹۷۰ء۔

۳۰۔ ''شاعر'' (منٹو نمبر)، بمبئی، مارچ اپریل، ۱۹۵۵ء۔

۳۱۔ ''شعور'' (سوگندھی) (منٹو نمبر)، دہلی، مارچ ۱۹۸۰ء۔

۳۲۔ ''طلوع افکار'' کراچی، جلد ۲۳، شمارہ ۸، ستمبر ۱۹۹۲ء، شمارہ ۸، جلد ۲۲، اگست ۱۹۹۱ء۔

۳۳۔ ''فنون''لاہور، جلد۳، شمارہ۴، جنوری ۱۹۶۴ء، خاص نمبر، شمارہ ا، جلد۳،اکتوبر ۱۹۶۳ء، شمارہ ۳۴جنوری تا دسمبر ۲۰۰۵ء، شمارہ۲۹،نومبر دسمبر۱۹۸۹ء، مئی تاجون ۱۹۶۸ء، جنوری،اپریل ۱۹۹۳ء، شمارہ ۲۲، مئی جون ۱۹۸۵ء۔
۳۴۔ فکر و تحقیق (منٹو نمبر)، نئی دہلی، جلد، ۱۵، شمارہ، ۳، جولائی،اگست، ستمبر، ۲۰۱۲ء۔
۳۵۔ قافلہ (منٹو نمبر)،لاہور، ۱۹۸۰ء۔
۳۶۔ ''قومی زبان'' کراچی، جلد ۵۷، شمارہ ا، جنوری ۱۹۸۶ء، جلد ۶۵، شمارہ ۹، ۱۹۹۳ء، جلد ۷۴، شمارہ ۵، مئی ۲۰۰۲ء، جلد ۵۷، شمارہ ۵، مئی ۱۹۸۶ء۔
۳۷۔ ''کتاب نما''، دہلی، جلد ۳۲، شمارہ ۱۱، نومبر ۱۹۹۲ء۔
۳۸۔ ''گل خنداں''(منٹو نمبر)،لاہور، ۱۹۵۵ء۔
۳۹۔ ''ماہ نو''لاہور، جلد ۵۷، شمارہ ۱۱، نومبر ۲۰۰۴ء، مارچ ۱۹۵۵ء، جون ۱۹۸۱ء، اکتوبر ۱۹۹۴ء۔
۴۰۔ ''مخزن''، ص ۶۷-۸۲، جلد ۴، شمارہ ۲، ۲۰۰۴ء۔
۴۱۔ ''مزدور جدوجہد''(منٹو نمبر)،لاہور جنوری ۲۰۰۵ء، جنوری ۱۹۹۹ء۔
۴۲۔ ''مشرب''، کراچی، خاص نمبر، ۱۹۵۵ء۔
۴۳۔ ''معاصر''کراچی، جلد ۲۔ شمارہ ۴-۳، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۲ء، جلد ۲، شمارہ ۳۔ ۴، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۲ء، ۱۹۹۴ء۔
۴۴۔ ''مکالمہ'' کراچی (مرتبہ: مبین مرزا)، کتابی سلسلہ ۱۵، نومبر ۱۹۹۹-۲۰۰۰ء۔
۴۵۔ ''مہر نیم روز''، کراچی جلد ا۔ شمارہ ۹، اکتوبر ۱۹۵۶ء۔
۴۶۔ ''نخلستان''، گورنمنٹ کالج، ملتان، ۱۹۷۷ء۔
۴۷۔ ''نقش''(منٹو نمبر)، کراچی، مارچ ۱۹۵۵ء۔
۴۸۔ ''نقوش''لاہور، بیسویں سالگرہ نمبر، جون ۱۹۶۸ء۔
۴۹۔ ''نقوش''(منٹو نمبر)، لاہور، شمارہ نمبر ۴۹، ۵۰، افسانہ نمبر، شمارہ ۳۷، جنوری ۱۹۵۴ء، شمارہ ۲۵، ۲۶، جولائی ۱۹۵۲ء، شمارہ ۴۷، ۴۸، شخصیات نمبر، جنوری ۱۹۵۵ء، افسانہ نمبر، شمارہ ۵۳، ۵۴، جولائی، ۱۹۵۵ء، محمد طفیل نمبر، شمارہ ۱۳۵، جولائی ۱۹۸۷ء، شمارہ ۳۱-۳۲، مئی جون ۱۹۵۳ء۔
۵۰۔ ''نگار''، افسانہ نمبر، شمارہ ۲، ۳، فروری ۱۹۸۱ء، شمارہ ا، ۲، جنوری فروری ۱۹۴۹ء، افسانہ نمبر، سالنامہ ۱۹۸۱ء۔
۵۱۔ ''نئی قدریں'' کراچی سالنامہ شمارہ ۲-ا، جلد ۲۱، ۱۹۶۹ء، شمارہ ۶-۵، جلد ۳۰ مئی جون ۱۹۸۵ء۔
۵۲۔ ''نیا دور''، افسانہ نمبر، شمارہ ۴۳، ۴۷، شمارہ ۳۶-۳۵۔
۵۳۔ ''نیا ورق''، ممبئی، جلد ۱۴، شمارہ ۳۸، اپریل تا ستمبر، ۲۰۱۲ء۔
۵۴۔ ''نیرنگ خیال'' راولپنڈی، جلد ۶۳، شمارہ ۱۵، ۱۹۸۷ء، جلد ۶۲، شمارہ ۳، سالنامہ جون ۱۹۸۶ء، جلد ۶۱، شمارہ ۶۸۵، سالنامہ ۱۸۸۴ء۔

مقالہ جات:

۱۔ آغا مسعود رضا خاکی: ''اردو افسانے کا ارتقاء''، پی ایچ۔ڈی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۱ء۔

۲۔ افروز اسماعیل: ''ترقی پسند افسانہ نگاروں میں رومانی عناصر''، ایم۔اے، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۲ء۔

۳۔ انصار احمد، سعادت حسن منٹو اور سماجی حقیقت نگاری، معاصر افسانہ نگاروں کے فنی تناظر میں، پی ایچ۔ ڈی، جامعہ کراچی، ۲۰۰۹ء۔

۴۔ انوار احمد، ڈاکٹر: ''اردو مختصر افسانہ سیاسی و سماجی تناظر میں''، پی ایچ۔ڈی، بہاءُالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۱۹۸۳ء۔

۵۔ ابجت کمار بخشی، منٹو بحیثیت افسانہ نگار، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے ایم اے اُردو، جموں و کشمیر یونیورسٹی سرینگر، ۱۹۶۰ء۔

۶۔ برج کرشن ایمہ (برج پریمی)، سعادت حسن منٹو حیات اور کارنامے، پی۔ ایچ ڈی، شعبہ اُردو، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر، ۱۹۷۶ء۔

۷۔ توصیف اختر: ''منٹو کے افسانوں میں معاشرتی مسائل''، ایم۔اے، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۳ء۔

۸۔ خلجی جی۔ایم: ''تقسیم کے بعد اردو افسانہ''، ایم۔اے، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۵۷ء۔

۹۔ خورشید زاہد عابدی، سعادت حسن منٹو کے افسانوں میں کردار نگاری، ایم۔فل، پنجاب یونیورسٹی پٹیالہ، ۱۹۸۵ء۔

۱۰۔ رشیدہ خواجہ مظہر: ''اردو افسانے میں حقیقت پسندی کی روایت''، ایم۔اے، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۷۳ء۔

۱۱۔ رضا احمد: ''سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے افسانوں کے موضوعات کا تقابلی جائزہ''، ایم۔ اے، ایف سی کالج، لاہور، ۱۹۹۳ء۔

۱۲۔ روبینہ گلزار احمد: ''منٹو اور روس کا افسانوی ادب''، ایم۔اے، جی سی یونیورسٹی فیصل آباد، ۲۰۰۴ء۔

۱۳۔ روبینہ یاسمین، منٹو کے سیاسی شعور کا تحقیقی مطالعہ، ایم۔فل، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء۔

۱۴۔ ریاض قدیر، منٹو کے افسانوی ادب پر موپاساں کے اثرات، پی ایچ۔ڈی، دی اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور، ۲۰۱۲ء۔

۱۵۔ زاہد رحیم زاہد: ''سعادت حسن منٹو کے چند اہم کردار (تنقیدی و تحقیقی مقالہ)''، ایم۔ اے، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۹ء۔

۱۶۔ زکریا فضل الٰہی: ''اردو میں ترقی پسند افسانہ''، ایم۔اے، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۳ء۔

۱۷۔ سمیرا بشیر: ''اردو فکشن پر تقسیم ہند کے اثرات'' (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)، پی ایچ۔ڈی، جامعہ کراچی، س ن۔

۱۸۔ شازیہ طارق پنہاں: ''اردو افسانے میں فطرت نگاری''، ایم۔فل، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء۔

۱۹۔ شعیب عتیق خان: ''فسادات ۱۹۴۷ء اور اردو کا افسانوی ادب''، پی ایچ۔ڈی، بہاءُالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۱۹۷۸ء۔

۲۰۔ ظفر اقبال: ''اردو افسانہ اور فسادات'' ایم۔فل، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۶۵ء۔

۲۱۔ عامر فہیم ثناءاللہ: ''اردو ناول اور افسانے میں طوائف کا کردار''، ایم۔اے، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۳ء۔

۲۲۔ علمدار حسین بخاری: ''سعادت حسن منٹو، شخصیت اور فن''، ایم۔اے، بہاءُالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۱۹۷۹ء۔

۲۳۔ علی ثناء بخاری، ڈاکٹر: ''سعادت حسن منٹو، سوانح اور ادبی کارنامے'' پی ایچ۔ڈی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۸۴ء۔

۲۴۔ عمارہ شمشاد: ''اردو کے تین خاکہ نگار (شاہد احمد دہلوی، سعادت حسن منٹو، عبدالسلام خورشید) اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور، ۱۹۹۱ء۔
۲۵۔ غلام احمد ڈار، منٹو، بیدی، کرشن چندر کے افسانوں میں سماجی پس منظر، ایم۔ فل، جامع ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) ۱۹۸۵ء۔
۲۶۔ غلام حسین: ''اردو افسانے کا نفسیاتی مطالعہ'' پی ایچ۔ ڈی، سندھ یونیورسٹی، جام شورو، ۱۹۷۵ء۔
۲۷۔ فرحت وشیر: ''منٹو اور غلام عباس کے فنی وسائل کا تقابل''، ایم۔ اے، بہاءُالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۱۹۹۰ء۔
۲۸۔ فرید الدین احمد انصاری، ''سعادت حسن منٹو کے افسانوں میں کردار نگاری''، پی۔ ایچ ڈی، باباصاحب بھیم راؤ، امبیڈکر بہار یونیورسٹی، مظفر پور، بہار۔
۲۹۔ کامران حسین کاظمی، ''سعادت حسن منٹو بطور مضمون نگار و خاکہ نگار''، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لنگویجز، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء۔
۳۰۔ لیاقت علی، ''منٹو کے شاہکار افسانے (تحقیق و تجزیہ)''، ایم۔ فل، پٹیالہ یونیورسٹی، پٹیالہ، ۱۹۹۱ء۔
۳۱۔ محمد انوار الدین سدید: ''اردو ادب کی تحریکیں''، پی ایچ۔ ڈی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۸۳ء۔
۳۲۔ محمد ندیم اسلم، ''بیسویں صدی کے سیاسی و سماجی تناظر میں منٹو کے نسوانی کردار''، پی ایچ۔ ڈی، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لنگویجز، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء۔
۳۳۔ محمد نوید: ''منٹو شناسی کی روایت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' جی سی یو، لاہور، ۲۰۰۵ء۔
۳۴۔ مہر نگار، منٹو کی افسانہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ، پی۔ ایچ ڈی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، ۱۹۹۴ء۔
۳۵۔ نبیلہ عصمت: منٹو اور غلام عباس کے فنی وسائل کا تقابل،''، ایم۔ اے، بہاءُالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۱۹۹۰ء۔
۳۶۔ نصرت یاسین: ''منٹو کے افسانے''، ایم۔ اے، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۱ء۔